پارہ پہلا

تصنیف لطیف:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم:

صاحبزادہ پیر سید محمد محفوظ الحق شاہ چشتی صابری قادری

نوریہ رضویہ پبلی کیشنز

11- داتا گنج بخش روڈ لاہور 042-7313885

نام کتاب	——	تفسیر عزیزی (پہلا پارہ)
مصنف	——	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ
مترجم	——	صاحبزادہ سیّد محمد محفوظ الحق شاہ صاحب چشتی صابری قادری
زیراہتمام	——	صاحبزادہ پیر سیّد محمد محمود الحق شاہ قادری
کمپوزنگ	——	**ورڈز میکر**
اشاعت	——	جمادی الاوّل ۱۴۲۹ھ/جون ۲۰۰۸ء
تابع	——	سیّد محمد شجاعت رسول شاہ قادری
مطبع	——	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
کمپیوٹر کوڈ	——	1N-131
قیمت (کامل 4 جلد)	——	1200 روپے

ملنے کے پتے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھمّ

صلّ علیٰ سیّدنا و مولانا محمّدٍ وّ علیٰ اٰلہٖ

وصحبہٖ و بارک وسلّم

مولای صلّ وسلّم دائمًا ابدًا

علیٰ حبیبک خیر الخلق کلّھم

محمّدٌ سیّد الکونین والثّقلین

والفریقین من عربٍ وّمن عجم
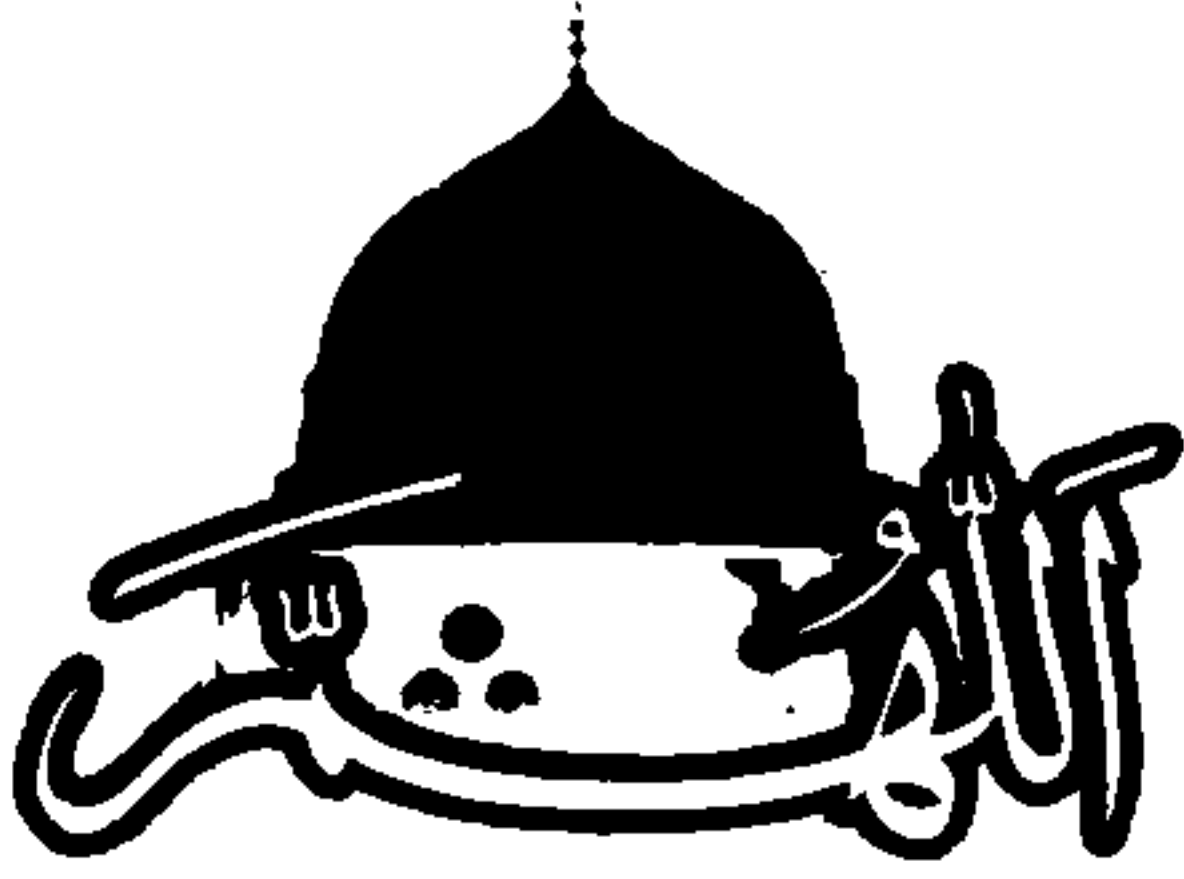
انتساب

ان شخصیات کے نام جن کی نسبت اور جن سے علاقہ تلمذ کی بناء پر اس فقیر حقیر کو اس عظیم تفسیر کا زبان فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

ورنہ من آنم کہ من دانم

زینۃ الاصفیاء جمال الاولیاء حضرت پیر شاہ محمد غوث صاحب چشتی صابری قادری،

استاذی وملاذی عزۃ الفقہاء حضرت مولانا مفتی محمد عبدالعزیز صاحب نقشبندی مجددی

استاذی وشیخی حضور شیخ القرآن استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا غلام علی صاحب اوکاڑوی قاری رضوی برکاتی اشرفی ضیائی، قدسنا اللہ تعالیٰ باسرارہم

احب الصالحین ولست منهم

لعل الله یرزقنی صلاحا

انا الفقیر الحقیر

سید محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ

واصلح الله له فی ذریته

فہرست مضامین

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

متعلقات علم تفسیر

قرآن کریم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام پاک ہے۔ اسی تناسب سے اس سے متعلق علوم اہم اور افضل، خصوصاً علم تفسیر اجل العلوم ہے۔ چنانچہ امام اصفہانی فرماتے ہیں کہ بزرگ ترین مصروفیت جسے انسان اپناتا ہے تفسیر قرآن کریم ہے اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ پیشے کی بزرگی یا تو اس کے موضوع اعتبار سے ہوتی ہے جیسے زرگری، یہ رنگائی سے زیادہ قابل احترام ہے۔ کیونکہ زرگری کا موضوع کے سونا اور چاندی ہے اور یہ دونوں چیزیں رنگائی کے موضوع سے کہیں محترم ہیں جو کہ مردا کا چمڑا ہے۔ یا اسکی عزت غرض کی بزرگی کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے طب۔ پس یہ جاروب کشی سے کہیں محترم ہے۔ کیونکہ طبیب کی غرض افادۂ صحت ہے جبکہ جاروب کشی کی غرض بیت الخلاء کی صفائی ہے۔ یا عزت اسکی طرف شدت حاجت کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے فقہ۔ پس اسکی طرف حاجت طب کی ضرورت سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ کیونکہ خلق کا اس کائنات میں کوئی واقعہ نہیں جو کہ فقہ کا محتاج نہ ہو۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے دنیا و دین کے احوال کی درستگی کا انتظام ہے۔ بخلاف طب کے کیونکہ اسکی بعض لوگوں کو بعض اوقات میں ضرورت ہوتی ہے۔ پس فن تفسیر تینوں جہتوں سے ہی محترم ہے۔

موضوع کی جہت سے بھی کیونکہ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو کہ ہر حکمت کا سرچشمہ اور ہر فضیلت کا معدن ہے۔ اس میں ماقبل کی خبر، مابعد کا بیان، معاشرتی مسائل کا حکم ہے۔ کثرت تکرار سے بوسیدہ نہیں ہوتا۔ اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔

غرض کی جہت سے بھی محترم کیونکہ اس سے غرض عروہ وثقیٰ سے وابستگی، سعادت حقیقی تک رسائی ہے جس کے بغیر چارہ نہیں اور اسکی طرف شدت ضرورت کی وجہ سے بھی محترم

ہے کیونکہ دینی یا دنیوی اس جہان کا یا جہان آخرت کا ہر کمال علم شریعہ اور معارف دینیہ کا محتاج ہے اور یہ سب کتاب اللہ تعالیٰ کے علم پر موقوف ہیں۔

علم تفسیر کے دس مبادیات

ہر فن کی ابتداء کرنے والے کیلئے دس بنیادی چیزوں کی معرفت ضروری ہے تاکہ اس کے متعلق اسے بصیرت حاصل ہو۔ اسکی حد، موضوع، واضع، استمداد، اسم، حکم، مسائل، نسبت، فائدہ اور اس کا مقصد۔

پس علم تفسیر کی تعریف یہ ہے کہ یہ ان اصول کا علم ہے جن کے ساتھ طاقت بشری کے مطابق کلام الٰہی کے معانی کی پہچان ہو اور لغوی طور پر اس کا معنی فسر سے ماخوذ ہے اور یہ کشف ہے۔

اس کا موضوع آیات قرآن کریم ہیں اس حیثیت سے کہ ان کے معنوں کی پہچان ہو۔

اس کے واضع تحقیق کے مطابق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارکت سے لے کر اب تک کے راسخین فی العلم ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسکی گواہی دی ہے۔

اس کی استمداد کتاب وسنت، آثار اور عرب عرباء کے فصحاء ہیں۔

اس کا نام علم التفسیر ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ یہ واجب علی الکفایہ ہے۔

اس کے مسائل امر ونہی اور موعظت وغیرہ کی حیثیت سے اس کے فیصلے ہیں۔

اس کی نسبت یہ ہے کہ علوم شرعیہ سے افضل اور ان کی اصل ہے۔

اس کا فائدہ علی وجہ الکمال کلام الٰہی کے معنوں کی معرفت ہے۔

اور اس کا مقصد دارین کی سعادت کے حصول میں کامیابی ہے۔ دنیا میں تو اوامر کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب کی وجہ سے ہے اور آخرت میں جنت اور نعیم جنت کے ساتھ ہے۔

یہاں تک فقیر حقیر نے فضیلۃ الشیخ شیخ القران حضرت علامہ مولانا غلام علی قادری رضوی اوکاڑوی نور اللہ مرقدہ کے رسالہ ''اشرف التحریر فیما یتعلق بالتفسیر

"سے استفادہ کیا ہے۔

طبقات مفسرین

قرآن کریم کے مفسرین کے حسب استعداد و صلاحیت مختلف طبقات ہیں۔ طبقہ محدثین ان حضرات نے آیات کے مناسب آثار کی روایت کا قصد کیا ہے۔ حدیث مرفوع یا موقوف قول تابعی ہو یا اسرائیلی خبر۔

طبقہ متکلمین نے آیات صفات واسماء کی تاویل کا قصد کیا۔ پس جو مذہب تنزیہہ کے موافق نہ ہوا سے ظاہر سے پھیر دیا اور انہوں نے بعض آیات کے ساتھ مخالفین کے تعلق کا رد فرمایا۔

طبقہ فقہاء نے احکام فقہیہ اور بعض اجتہادی مسائل پر بعض کی ترجیح کا استنباط فرمایا اور مخالف کے استدلال کے جواب کا قصد فرمایا۔ لغوی نحویوں کے طبقہ نے قرآن کریم کی نحو اور اسکی لغت کی وضاحت فرمائی اور ہر باب میں کلام عرب کے پورے پورے شواہد پیش کئے۔

ادیبوں کے طبقہ نے معانی اور بیان کے نکات کو خوب خوب بیان کیا ہے اور یوں وہ حق کلام پورا کرتے ہیں۔

طبقہ قراء قرآن کریم کی اساتذہ قرات سے ماثورہ قرأت روایت کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔

طبقہ صوفیاء یہ حضرات علم سلوک کے متعلقہ نکات پر، یا علم الحقائق کے بارے میں ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے گفتگو فرماتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ وسیع میدان ہے۔ ہر کوئی قرآن کریم کا معنی سمجھانے کا قصد کرتا ہے اور ہر ایک کسی فن میں غور وفکر کرتا ہے پس اپنی فصاحت کی قوت اور اپنے فہم کے مطابق کلام کرتا ہے۔

اسی لئے تفسیر میں اس قدر وسعت ہے کہ اسے محدود نہیں کیا جاسکتا۔ پس اس فن میں بے حد وحساب کتابیں پائی جاتی ہیں جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔

(مستفاد از الفوز الکبیر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

تفسیر عزیزی کی خوبیاں

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے مشمولات میں کس قدر وسعت اور گنجائش ہے کہ کائنات کے تمام علم کا جامع ہے۔ لیکن سردست خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر فتح العزیز کے متعلق جسے عام طور پر تفسیر عزیز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چند ایک گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بزبان فارسی قرآن کریم کے متعلق حضرت مفسر قدس سرہ العزیز کا ایک عظیم تحفہ ہے کہ اپنی مثال آپ ہے اور قرآن پاک کی لفظی اور معنوی خوبیوں کے بیان کا انداز اس قدر اثر انگیز اور دلچسپ ہے کہ بنظر انصاف دیکھنے والا اور پڑھنے والا اس کے کلام الٰہی اور معجز بیان ہونے کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے متعلق قدرے وضاحت تفسیر مذکور کے حوالوں سے آ رہی ہے۔

یہ بات بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ دیگر آسمانی کتب متعلقہ رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کی صورت میں نہ تھیں۔ جبکہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہے۔ بطور تحدی اس کے نزول کی وجہ سے تمام کفار اس کے مقابلے سے عاجز رہے۔ صرف ایک آیت پاک کا ہی اثر انگیز اعجاز دیکھیں جس نے پوری دنیائی کفر کو پیوند خاک کر دیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین** (البقرہ آیت ۲۳) ''اور اگر تمہیں اس میں شک ہو جو ہم نے اپنے عبد خاص پر نازل کیا تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو''۔ اور پھر ساتھ ہی انہیں ہمیشہ کے لئے چیلنج کر دیا کہ ایسا نہیں کر سکو گے۔ حضرت مفسر قدس سرہ نے خصوصیت کے ساتھ اپنی اس تفسیر میں قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کو احسن انداز میں بیان فرمایا۔ اگرچہ بقدر کفائت مسائل بھی اور فضائل بھی بیان ہوئے لیکن اس کتاب عزیز کے اعجاز فصاحت و جامعیت پر نہایت بامقصد بحث کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم حقائق کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ مثلاً شیان حق مشتاقان معرفت اور شیفتگان حقیقت کو نوازا جاتا ہے اور قرآنی آیات کیا ہیں جواہر عرفان کا جہان مسلسل ہے۔ یہ محض الفاظ کی

بندش نہیں انوار و تجلیات کا سحاب کرم ہے جس کی بارش ازل سے ابد تک کائنات کو مستفید کر رہی ہے۔

تفسیر عزیزی اور جمال قرآن

جنانچہ شاہ صاحب موصوف نور اللہ مرقدہ فاتوا بسورۃ من مثلہ کے تحت فرماتے ہیں یعنی اے کافرو! اس کلام کی مثل ایک چھوٹی سورت جس کی کم از کم تین آیات ہوں لاؤ۔ جو کہ فصاحت و بلاغت میں اس کلام جیسی ہو جس کی ہر ترکیب بر موقع واقع ہو۔ اس میں ہر تشبیہ، ہر مجاز اور ہر کنایہ حسن و لطافت کے ساتھ مستعمل ہو اور اس کے باوجود اکتاہٹ، وحشت اور ترکیبات کی پیچیدگی سے پاک ہو تا کہ پتہ چلے کہ یہ کلام بھی تالیف بشری اور سلیقہ شعری سے ہے اور یہ ان کے لئے آسانی پیدا کرنے کے لئے ہے ورنہ فصاحت و بلاغت کے علاوہ دیگر محاسن بھی ہیں کہ اگر ان کے تتبع کا تم سے مطالبہ کیا جائے تو تم سے یہ کبھی نہ ہو سکے۔

اول یہ کہ اس کلام کا اسلوب بشری اسلوب کلام سے کہیں جدا گانہ ہے خصوصاً سورتوں کے آغاز اور اختتام میں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کلام تناقض اور اختلاف سے مبرا اور پاک ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس کتاب میں گزشتہ زمانوں کے گزرے ہوئے واقعات بغیر کسی کتاب کے مطالعہ اور تواریخ کی طرف رجوع کے پوری تفصیل سے مذکور ہیں اور آئندہ کے واقعات بھی کہیں صراحتاً اور کہیں اشارۃً اس سے معلوم ہوتے ہیں اور وہ واقعات بالکل اسی طرح رونما ہوتے ہیں جس طرح اس میں مذکور ہیں۔

نقصان فصاحت کی متقاضی وجوہ کے باوجود کمال فصاحت

پھر جب ہم اس کلام میں غور و فکر کریں تو اس میں کئی ایسی وجوہ ہیں جو کہ نقصان فصاحت کا تقاضا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ فصاحت کے درجات کی انتہاء کو پہنچا ہوا ہے۔ یہاں سے یہ بات معلوم کی جا سکتی ہے کہ یہ ذی قوت قادر کے علاوہ کسی کا کام نہیں کہ اس قسم کے موانع کے باوجود بلاغت کی انتہاء کو پہنچا ہوا کلام تالیف ہو سکے۔

چند موانع فصاحت کا ذکر

ان موانع میں سے ایک یہ امر ہے کہ عربوں اور ان کے علاوہ ان سے پہلی دیگر اقوام عالم کی فصاحت میں صرف ان چیزوں کی تعریف میں پیش رفت ہوتی ہے جو انہوں نے دیکھی اور سنی ہوں جیسے اونٹ، گھوڑا، غلام، لونڈی، عورت، بیٹا، بادشاہی، جنگ، غارت گری وغیرہ ذالک۔ جبکہ اس کلام میں ان چیزوں کا ذکر بہت قلیل مقدار میں ہے۔ اس کلام میں زیادہ ان چیزوں کا ذکر ہے کہ انہیں کسی نے دیکھا نہ سنا۔ ان چیزوں کے بیان میں دقیق تشبیہات اور بلیغ استعارات کو ملحوظ رکھنا کسی گروہ کی طاقت میں نہیں۔

اور ان میں سے ایک یہ امر ہے کہ اس کلام میں طریق صدق کی رعایت اور جھوٹ سے اجتناب انتہاء کو پہنچا ہوا ہے۔ اس طریقہ کی رعایت اور جھوٹ اور مبالغہ سے پرہیز کا پایا جانا نظم ونثر میں پستی پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ احسن الشعر کذبہ۔ یعنی اچھا شعر وہ ہے جس میں جھوٹ ہو۔ یعنی شعر میں جس قدر مبالغہ زیادہ ہو اسی قدر پر لطف ہوتا ہے۔

اور ایک امر یہ ہے کہ ناظم شعر اور اسی طرح نثر نویس جب واقعہ بیانی اور مضمون بندی میں کلام کا تکرار کرتا ہے تو دوسری مرتبہ اس کا کلام بلندی کے درجہ سے گر جاتا ہے اور ناقص ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کلام یعنی قرآن کریم میں جہاں بھی تکرار فرمایا گیا ہے لطف میں کہیں اضافہ ہوا ہے۔

نیز جب کلام طویل ہو جائے تو اس میں فصاحت و بلاغت کی رعایت بہت مشکل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بعض مقامات میں درجہ بلند سے اس کا گرنا لازم ہو جاتا ہے۔ جبکہ یہ کلام پاک اس طوالت کے باوجود درجۂ بلند سے کہیں بھی ساقط نہیں ہوتا۔

ان موانع میں سے ایک امر یہ ہے کہ اس کلام کے مضامین یہ ہے۔ مشقت طلب عبادات واجب کرنا۔ لذیذ چیزوں کو اور نفس کی خواہشات کو حرام قرار دینا۔ لوگوں کو دنیا میں زہد اختیار کرنے، مال خرچ کرنے، مصیبتوں پر صبر کرنے، موت یاد رکھنے اور آخرت کی طرف متوجہ رہنے پر ابھارا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان امور کے بیان سے بلاغت کا دائرہ

نہائت تنگ ہو جاتا ہے۔

نیز یہ کہ کوئی شاعر اور نثر نویس نہیں مگر اس کے کلام میں ایک مضمون کا ادا کرنا غالب ہوتا ہے۔ یعنی بعض لوگ معشوقوں کے حسن کے بیان میں پوری دسترس رکھتے ہیں۔ بعض بزم میں، بعض جنگ میں اور بعض ہجو میں۔ اسی لئے اساذان عرب نے کہا ہے کہ امرء القیس عورتوں کے حسن اور گھوڑوں کی تعریف میں بے مثل ہے۔ نابغہ جنگ کے بیان میں خوب ہے۔ اعشٰی، مجلس شراب اور رقص اور اس کے تماشا کو خوب بیان کرتا ہے اور زہیر مطلب پیش کرنے اور طمع کے اظہار میں بہت دسترس رکھتا ہے اور جب ہم اس کلام پاک کو پوری توجہ سے دیکھیں تو ہر قابل تحسین فن میں بے مثال ہے۔ چنانچہ ترغیب میں اسکی یہ ایک آیت ہی کافی ہے۔ فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین (السجدہ آیت ۱۸) ''پس کوئی شخص نہیں جانتا جو نعمتیں ان کے لیے چھپا کر رکھی گئی ہیں جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی''۔

اور ترھیب میں یہ آیت وخاب کل جبار عنید من ورائه جهنم ویسقٰی من ماء صدید یتجرعه ولا یکاد یسیغه ویاتیه الموت من کل مکان وما هو بمیت۔ (ابراہیم آیت ۱۵ تا ۱۷) ''اور نامراد ہو گیا ہر سرکش منکر حق، اس کے بعد جہنم ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ بمشکل گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا اور اس کے پاس ہر سمت سے موت آئے گی اور وہ مرے گا نہیں۔

اور ڈانٹ ڈپٹ میں یہ آیت فکلا اخذنا بذنبه ، فمنهم من ارسلنا علیه حاصبا ومنهم من اخذته الصیحة ومنهم من خسفنا به الارض ومنهم من اغرقنا۔ (العنکبوت آیت ۴۰) ''پس ہر سرکش کو ہم نے اس کے گناہ کے باعث پکڑا، پس ان میں سے بعض پر ہم نے پتھر برسائے اور ان میں سے بعض کو شدید کڑک نے آلیا اور بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو ہم نے پانی میں غرق کر دیا''۔

اور وعظ اور عبرت میں یہ آیت افرأیت ان متعناهم سنین ثم جاءهم ما کانوا یوعدون ما اغنٰی عنهم ما کانوا یمتعون۔ (الشعراء آیت ۲۰۵ تا ۲۰۷) ''کیا تم نے

غور کیا اگر ہم انہیں چند سال لطف اندوز ہونے دیں پھر ان پر وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا تو کیا انہیں وہ ساز و سامان نفع دے گا جس سے لطف اندوز ہوتے تھے"۔

اور الٰہیات میں یہ آیت اللہ یعلم ما تحمل کل انثی وما تغیض الارحام وما تزداد وکل شیء عندہ بمقدار، عالم الغیب والشھادۃ الکبیر المتعال۔ (الرعد آیت ۸) اللہ جانتا ہے جو اٹھائے ہوتی ہے کوئی مادہ اور جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے، وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو، سب سے بڑا عالی مرتبہ ہے"۔

اور ان میں سے ایک یہ امر ہے کہ یہ کلام دقیق علوم کی اصل ہے جیسے عقائد، باطل ادیان والوں سے مناظرہ، علم اصول فقہ، علم فقہ، علم احوال، علم اخلاق اور دیگر باریک علوم اور اس قسم کے گہرے مسائل کے بیان میں بلاغت کی راہ چلنا بشر کی طاقت سے باہر ہے اور اگر کسی بلیغ نثر نویس سے فرمائش کریں کہ منطق کے ایک دو مسائل رنگین عبارت کے ساتھ لکھے یا وراثت کے ایک دو مسئلے کلام بلیغ کے ساتھ ادا کرے، اس کے لئے یہ ہرگز ممکن نہ ہو گا۔ پس ان چیزوں سے انہیں یقیناً دریافت ہوگا کہ یہ بشری کلام نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں مذکور بعض حکمتیں

یوں تو تفسیر عزیزی کے صفحات اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کے اسرار اور حکمتوں کے بیان سے معمور و منور ہیں جن سے قاری کے ذوق عرفان کو جلا ملتی ہے اور آپ محسوس کریں گے کہ گلستان معرفت کی سیاحت روحانی سے مستفید ہو رہے ہیں جو کہ حضرت مفسر قدس سرہ العزیز کا ایک منفرد اور انوکھا انداز ہے جس کے لئے حضرت حق جل شانہ نے انہیں شرح صدر سے نوازا صرف تشویق و ترغیب مطالعہ کے لئے جستہ جستہ اقتباسات نقل کر رہا ہوں۔ پڑھئے اور ایمان کو جلا بخشیے۔

الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کے حق میں رحمت کی حقیقت، خیر پہنچانا اور شر دور کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دو قسمیں ہیں۔ ذاتی اور صفاتی۔ پھر ذاتی کی دو قسمیں ہیں عام اور خاص، عام

رحمت' وجود کا فیض عطا کرنا ہے۔ جس سے ہر موجود کو ایک حصہ ملا ہے۔ جبکہ خاص رحمت' قرب الٰہی بخشنا ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے بندوں کو مخصوص فرمایا ہے اور صفاتی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عام اور خاص۔ عام رحمت' ہر موجود کو صفات و اعراض میں سے وہ کچھ بخشنا ہے جو اس کے لائق ہے۔ جبکہ خاص رحمت' ہر موجود کو وہ چیز عطا کرنا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں پر فضیلت حاصل کر سکتا ہے۔ پس یہاں سے معلوم ہوا کہ تسمیہ یعنی بسم اللہ میں رحمٰن و رحیم دونوں اسموں کے مذکور ہونے کے باوجود اس سورت میں یعنی سورۃ الفاتحہ میں انہیں پھر لانے میں تکرار نہیں۔ کیونکہ جو رحمت تسمیہ میں مذکور ہے وہ ذاتی ہے جبکہ جو رحمت کہ یہاں مذکور ہے صفاتی ہے۔ اور جب ذاتی کی دو قسمیں ہیں عام اور خاص تو ان دو قسموں پر دلالت کے لئے دو اسم رحمٰن اور رحیم تسمیہ میں ذکر فرمائے گئے اور چونکہ صفاتی کی بھی دو قسمیں ہیں عام اور خاص۔ تو ان دونوں قسموں پر دلالت کے لئے بھی دو اسم رحمٰن اور رحیم اس سورت میں لائے گئے۔

دوسری حکمت

اور بعض نے فرمایا ہے کہ تسمیہ میں رحمٰن اور رحیم کا ذکر اس ہیبت کی تسکین کے لئے ہے جو کہ اسم جلالت ''اللہ'' سے اٹھتی ہے اور دل کو مدہوش کر دیتی ہے۔ جبکہ یہاں بندوں کو امیدوار کرنے کے لئے ہے تاکہ مالک یوم الدین سے بیتاب نہ ہوں اور چونکہ اگلی عبارت میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت (نفس پہ) ایک نہایت ناگوار فعل ہے اس لئے ضروری ہے کہ امید کا قائد اور خوف کا سائق ہمراہ دے دیا جائے اور ہر مقام پر دونوں اسم اس لئے لائے گئے ہیں کہ ایک اسم عوام کی ہیبت کی تسکین پر دلالت کرے اور عوام کو امید دلائے اور دوسرا اسم خواص کے لئے۔

تیسری حکمت

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظہور عالم کی ابتداء ایک رحمت کے ساتھ جو عام اور خاص ہے، جبکہ اس کی انتہاء بھی ایک رحمت کے ساتھ ہے جو کہ عام اور خاص ہے۔ پس تسمیہ میں ابتدائی رحمتوں کا اشارہ ہے جبکہ یہاں انتہائی رحمتوں کا اشارہ ہے۔ نیز حمد کا مبداء رحمتہائے

عام وخاص ہے۔ عام رحمتیں عام کی نظر میں جبکہ خاص رحمتیں خاص کی نظر میں۔ پس چاہیے کہ منتہائے حمد بھی اسی تفصیل کے مطابق دو رحمتیں ہی ہوں۔ علاوہ ازیں دیگر حکمتیں بھی مذکور ہیں جو مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

ذات حق کے ساتھ اختصاص عبادت کی وجہ

ایاک نعبد پر کلام فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ذات پاک کے ساتھ عبادت مخصوص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت عبادت اپنے غیر کی انتہائی تعظیم کے لئے انتہائی عاجزی کا نام ہے جبکہ اختیار کے ساتھ صادر ہو۔ پس تسخیری عاجزی (جیسے کہ جانور مسخر ہیں) یا تسخر یا انتہائی تعظیم سے کم تر درجہ کی تعظیم عبادت نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب عاجزی کسی مجبوری کی وجہ سے ہو تو بھی عبادت میں شمار نہیں ہوتی۔ پس حقیقت عبادت بداھتاً اس لائق نہیں کہ کسی کے لئے کی جائے مگر صرف اسی کے لئے جس کی طرف سے اسے انتہائی انعام پہنچا ہو اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بندے کے تین حال ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ رہا ماضی تو اس میں بندہ محض معدوم ہے اور اسے عدم کے پردے سے شرف وجود کے ساتھ مشرف فرمایا گیا۔ وقد خلقتك من قبل ولم تك شيئا۔ (مریم آیت ۹) ''اور میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا حالانکہ تو کچھ نہ تھا''۔ پھر نطفہ کی حالت میں مردہ تھا اسے زندہ فرمایا گیا۔ وكنتم اموانا فاحياكم۔ (البقرہ آیت ۲۸) ''اور تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ فرمایا''۔ پھر وہ جاہل تھا اسے تعلیم دی گئی اور اسے اسباب علم جو کہ حواس وعقل ہیں بخشے گئے۔ والله اخرجكم من بطون امهاتكم لا تعلمون شيئا وجعل لكم السمع والابصار والافئدة۔ (النحل آیت ۷۸) ''اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے نکالا درانحالیکہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے''۔

رہا زمانہ حال تو اسکی ضرورتیں حدوشمار سے باہر ہیں۔ عمر کی ابتداء سے اسکی انتہاء تک اسکی احتیاج کی وجوہ کو قیاس کرنا چاہیے کہ کہاں تک پہنچتی ہیں اور قسم قسم کی تقصیرات اور نافرمانیوں کے باوجود جو کہ اس سے صادر ہوتی ہیں اس کی حاجت روائی اور فضل واحسان

منقطع نہیں ہوتا۔

رہا مستقبل تو موت کی ابتداء سے لے کر جنت کی رسائی تک وجوہ انعام اور قسم قسم کے عذاب وعقاب سے حفاظت کی صرف اسی جناب سے توقع ہے۔ پس بندے کے لئے کسی حالت میں اس کی ذات پاک کے سوا پناہ گاہ نہیں۔ پس بندے کی عبادت کے لئے بھی اس ذات کے سوا کوئی مستحق نہیں۔

موجودات سے انتفاع کی حقیقت

اور جہان میں جو کچھ دیکھا سنا جاتا ہے یا تو وہ ایسی چیز ہے کہ اس سے صرف فی الوقت نفع حاصل ہوتا ہے۔ وجود سے پہلے تھا نہ موت کے بعد ہوگا جیسے سورج، چاند، دریا، زمین اور پہاڑ یا جو نفع اس سے ماضی میں حاصل ہوا منقطع ہو گیا۔ جیسے آباء واجداد اور دودھ پلانے والی اور ان جیسی دوسری چیزیں، یا اس سے آئندہ زمانے میں توقع ہے جیسے ارواحِ طیبہ کی امداد اور وہ ذات جس کا نفع بندے کی تینوں حالتوں کو محیط ہو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ ہے وہ مسکین اور اسکی جناب کا محتاج ہے اور محتاج اپنے نفس کی حاجت کا پابند ہے۔ پس اسے کسی دوسرے کو فائدہ پہنچانا غنی مطلق کی امداد کے بغیر نہیں ہو سکتا اور غنی مطلق جو کہ ہر مخلوق کی حاجت پوری کرتا ہے وہی ذات مقدس ہے۔ پس استحقاق عبادت اسی کی ذات میں منحصر ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے وقضٰی ربك الا تعبدوا الا ایاہ۔ (بنی اسرائیل آیت ۲۳) ''اور آپکے رب نے حکم فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔

مالک یوم الدین کے ساتھ ایاک نعبد کی مناسبت اور ربط

ایاك نعبد کی مالك یوم الدین کے ساتھ کیا مناسبت اور کیا رابطہ ہے کہ اسے مالك یوم الدین کے بعد لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کے تین درجے ہیں۔ اول یہ کہ حور وقصور اور جنات وانہار کے ثواب کی رغبت کے لئے واقع ہو اور یہ درحقیقت کاروبار اور باہمی تبادلہ ہے۔ کیونکہ عاقل جب یقین کے ساتھ جان لے کہ دنیا، لذیذ

چیزیں اور ساز و سامان سب فانی ہے اور رنج والم سے آلود اور نقصانات سے ملوث اور دوسرا جہان جو کہ اس سے کہیں بہتر اور باقی رہنے والا ہے پیش آنے والا ہے تو اپنے اوقات عزیز کو اس فانی سے پھیر کر اس باقی کے حصول میں صرف کرتا ہے اور اس عبادت کا ثمرہ روز جزا ہی کو ملے گا کیونکہ ثواب کی تمام اقسام کا حصول اسی روز ہوگا۔

عبادت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ سزا کے خوف سے ہو۔ کیونکہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے تشریف فرما ہو کر اس سے ڈرایا ہے کہ اگر بندے عبادت نہ کریں تو سزا کے مستحق ہوں گے اور ایک شخص جب صادق اور امین ہو تو اس کی خبر یقین کا فائدہ دیتی ہے چہ جائیکہ ایک لاکھ ۲۴ ہزار (یا کم وبیش) حضرات جو کہ پیغمبران صادق اور راست گو ہیں کی خبر ہو۔ پس یہ عبادت اس غلام اور لونڈی کی اطاعت جیسی ہے جو کہ پٹائی اور کوڑے کے ڈر سے چار و ناچار اپنے مالک کی خدمت میں کمی نہیں کر سکتے اور اس عبادت کے ثمرہ کا ظہور بھی جو کہ عتاب اور سزا سے خلاصی اور نجات ہے' روز جزا کے ساتھ متعلق ہے۔

عبادت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ مشاہدۂ حق کے لئے واقع ہو اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اسی لئے نماز کی نیت میں یہی تعلیم دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ثواب کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خلاصی کے لئے تعلیم نہیں دی گئی۔

نماز کی نیت میں محض خلوص کی تعلیم کی حکمت

درحقیقت اللہ تعالیٰ اور بندے میں جو رابطہ ہے وہ ثواب، عذاب سے قطع نظر عبادت کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ الٰہیت موجب عزت و ہیبت ہے جبکہ عبودیت خضوع اور عاجزی کی متقاضی ہے اور ظاہر ہے کہ مشاہدہ حق صرف اسی روز کامل ہوگا۔ دنیا کے مشاہدہ کو اس مشاہدہ سے کوئی نسبت نہیں۔ اگرچہ شیفتگان جمال نے حالت سکر میں اس کے برخلاف دم مارا ہو۔ جس طرح کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے۔ امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر ست، درحیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست یعنی آج جب تیرا جمال بے پردہ ظاہر ہے تو میں حیران ہوں کہ کل کا وعدہ کس لئے ہے۔

پس عبادت کے لئے تینوں درجات میں سے ہر ایک میں روز جزا کے ساتھ تعلق ہے۔اسی لئے ایاك نعبد کو مالك یوم الدین پر مرتب فرمایا گیا ہے۔

نعبد کا صیغۂ جمع لانے کی حکمت

نیز جاننا چاہیے کہ عبادت کرنے والا ایک شخص ہے جبکہ نعبد جمع کے لئے ہے۔یعنی ہم سب عبادت کرتے ہیں یہ صیغہ اختیار کرنے میں نکتہ کیا ہے؟۔نکتہ یہ ہے کہ بندہ اپنی ناقص عبادت کو تمام عبادت گزاروں کی عبادات میں ملا کر بارگاہ اقدس میں پیش کرتا ہے تاکہ مقتضائے کرم عبادات میں تمیز نہ فرمائی جائے اور بعض کے ناقص ہونے کی وجہ سے سب کو رد نہ کیا جائے۔ بلکہ انبیاء،اولیاء بلکہ ملائکہ مقربین کی عبادت کے ہمراہ اس ناقص عبادت کو بھی قبول کرلیا جائے۔ چنانچہ فقہ میں درج ہے کہ اگر ایک شخص دس چیزوں کو ایک ہی قیمت کے ساتھ فروخت کرتا ہے جبکہ ان چیزوں میں سے بعض ناقص ہیں اور بعض نفیس۔تو خریدار کو حق نہیں کہ نفیس لے لے اور ناقص لوٹا دے۔ بلکہ یا تو سب کو قبول کرے یا سب کو لوٹا دے اور چونکہ معاملہ اکرم الاکرمین کے ساتھ ہے اس لئے رد کرنے کا تصور نہیں ہوسکتا۔ لازماً قبولیت ہوگی۔چنانچہ کیا اچھا شعر کہا گیا ہے۔

پذیرند بداں را بطفیل نیکاں رشتہ وا پس ندہد ہر کہ گہر میگرد

یعنی بروں کو نیکوں کے طفیل قبول کر لیتے ہیں کیونکہ جو موتی لیتا ہے وہ دھاگا واپس نہیں کرتا۔نیز جمع کا صیغہ لانے میں باجماعت نماز کی فضیلت کا اشارہ ہے۔گویا مقام عبادت مقام اجتماع ہے اور اجتماع کے بغیر عبادت ناقص ہوتی ہے۔

نیز صیغہ جمع کی تلقین میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بندے کو عزت بخشی گئی ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا ہے جب تو نے اپنی بندگی میرے ساتھ درست کرلی اور میری بندگی سے تو نے عار نہیں کی تو ہم نے تجھے ایک امت کے حکم میں لے لیا اور ہم نے لفظ جمع کی تلقین فرمائی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان ابراهيم كان امة قانتا لله۔(النحل آیت ۱۲۰)''بے شک ابراہیم ایک امت یعنی امام تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع''۔

نیز اگر ایاک اعبد کہا جاتا تو اس کا مضمون یہ ہوتا کہ میں تیرا بندہ ہوں۔جبکہ ایاک نعبد

میں مضمون یوں ہو گیا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں اور یہ مضمون مقام ادب وتواضع کے بالکل مناسب ہے۔

میت کو جلانے کی بجائے زمین میں دفن کرنے کی حکمت

کفار کی جبلت ہے کہ وہ دین اسلام اور دینی مسائل پر اپنی بے عقلی اور بے شعوری کی بنا پر معترض رہتے ہیں اور تنقید کرتے ہیں۔ جس سے ان کی شکست خوردہ ذہنیت کی بے مائیگی کا پتہ چلتا ہے اور خود انہیں حسد کی جلن سے ان کے خیال میں سکون حاصل ہوتا۔ غیر منقسم ہندوستان میں اسلام کے خلاف بے دینوں کی اس مہم کی تحریکیں عروج پر تھیں۔ جس کا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، آپ کے مستفیدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ہر میدان میں ان بے دینوں کا تعاقب کیا، مقابلہ کیا۔ انہیں پیوند خاک کیا۔ اس سلسلے میں حضرت مفسر علامہ قدس سرہ کی عظیم خدمات ہیں۔ اسکی جھلک آپ کی اس تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

چنانچہ سورت عبس میں زیر آیت ثم اماته فاقبرہ موت کے نعمت ہونے کے دلائل کے بعد آپ نے میت کو ہندوؤں کی طرح جلانے کی بجائے زمین میں دفن کرنے کی خوبیوں پر ایمان افروز بحث کی ہے اور اس مسئلہ شرعی پر ان اشرار کے اعتراض کے تار و پود بکھرے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وصال کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کو فرشتوں کے ذریعے آپ کو قبر میں دفن کرنے کی تعلیم دی۔ جو کہ اولاد آدم علیہ السلام کے لئے ایک عظیم نعمت اور بہت بڑا اعزاز ہے۔ کیونکہ اگر جانوروں کے متعلق دستور کی طرح فوت ہونے والے آدمی کو سطح زمین پر چھوڑ دیا جاتا تو متعفن ہونے کی وجہ سے بدبو پھیلتی، معاشرہ پورا گندا ہوتا۔ جانور اسے نوچ ڈالتے اور مردار کھانے والے جانور اسے اپنا لقمہ بنا لیتے اور اسے بہت بڑی حقارت لاحق ہوتی۔ لہٰذا ابن آدم کی تکریم کے لئے اس طریقہ دفن کی غیب سے تعلیم دی گئی۔

میت کو جلانے اور دفن کرنے کا تقابلی جائزہ

ہندو اپنے مردے کو جلا دیتے ہیں اور دفن نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ آگ ہر ناپاک کو

پاک کرنے والی اور ہر بدبو کو دور کرنے والی ہے اور جسے بدبودار کرنا اور متعفن کرنا منظور ہو اسے دفن کرتے ہیں۔ پس آگ کے ساتھ جلانا بہتر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آگ خیانت کرنے والی ہے۔ اسے جو کچھ سپرد کیا جائے اسے کھا جاتی ہے جبکہ زمین امانت دار ہے۔ اس میں جو دفن کریں، باقی رہتا ہے اور مردہ کو زمین کے پاس چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ اسے خائن کے حوالے کیا جائے۔ لہٰذا آدمی کی بلکہ دوسرے جانوروں کی جبلّت ہے کہ جب کسی چیز کو محفوظ کرنا چاہیں تو اسے زمین میں دفن کرتے ہیں جیسے اموال اور خزائن اور جب اسے نیست و نابود کرنا چاہیں تو اسے آگ میں جلاتے ہیں۔ جبکہ آدمی کو روز حشر اور ارواح کے ترک کیے جسموں کے ساتھ اس کے تعلق کی انتظار ہے جو کہ اسے درپیش ہے جب کہ مردہ کو آگ میں جلانا اس انتظار کے خلاف ہے۔

نیز میت کی انتہائی بے قدری ہے کہ اسے آگ میں جلا کر ہوا میں اڑا دیں۔ کیونکہ یہ معاملہ تو گھٹیا اور ناپاک چیزوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جبکہ قیمتی چیزوں کو جنہیں باقی رکھنا مطلوب ہے انہیں زمین میں دفن کرنے کے بغیر کوئی معمول نہیں ہے اور یہ جو ہندو کہتے ہیں کہ آگ بدبو کو دور کرتی ہے جبکہ اس کے برعکس زمین بدبودار اور متعفن کرتی ہے۔ یہ تو اس وقت ہے جب کہ اس چیز کو زمین سے باہر لانا منظور ہو اور جب اس چیز کو زیر زمین رکھنا مقصود ہو تو تعفن سے کیا ڈر کہ زمین والوں کو اصلاً کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں دفن کی صورت میں جسم کی کئی رطوبتیں متعفن ہو کر خشک ہو جاتی ہیں اور بدن کے اعضاء و اجزاء سب کے سب اپنی شکل اور مقدار پر رہتے ہیں۔ گویا ایک شخص جس طرح زندگی کی حالت میں نیند کرتا تھا اسی طرح اس حالت میں باقی رہتا ہے۔ بخلاف آگ کے ساتھ جلانے کے کہ اعضاء کو جلا کر شکل، مقدار، رنگ اور صورت میں سے کچھ نہیں چھوڑتی۔

نیز آدمی کی خلقت خاک سے ہے اور **کل شیء یرجع الی اصله** کے حکم کے مطابق اسے اس کی اپنی اصل میں لوٹانا چاہیے۔ بخلاف آگ کے جو کہ شیطانوں اور جنوں کی خلقت کا مادہ ہے۔ پس جب آدمی کے بدن کو موت کے بعد اس کے ساتھ جلائیں تو اسکی ارواح لطیفہ آگ کے دھوئیں کے ساتھ آمیزش حاصل کر کے شیاطین اور جنات کے ساتھ

پوری مشابہت پیدا کرتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کی ارواح جو کہ جلائی جاتی ہیں موت کے بعد شیاطین کا حکم لے لیتی ہیں اور آدمیوں کو چمٹ جاتی ہیں اور تکلیف دیتی ہیں۔ پس دفن کرنے میں شے کو اس کی حقیقت کی طرف لوٹانا ہے جبکہ جلانے میں حقیقت کو بدلنا ہے۔

زمین میں دفن کی دلچسپ دلیل اور ہندو کے قائل ہونے کا واقعہ

یہاں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ایک اسلامی لشکر سرزمین سیستان میں وارد ہوا۔ ایک دانا ہندو اسلامی لشکر کی بود و باش دیکھنے کے لئے وہاں پہنچا کیونکہ اسلام ابھی ایک نیا دین تھا۔ ان کے احوال، طور طریقے اور اہل اسلام کے آئین کی تفتیش کے بعد اس نے اعتراض کیا کہ تمہاری سب چیزیں اچھی ہیں مگر تم مردے کو دفن کرتے ہو آگ میں نہیں جلاتے۔ حالانکہ قبر میں دفن کرنا ناپاکی اور بدبو کا باعث ہوتا ہے۔ جبکہ جلانا پاکی اور بدبو زائل ہونے کا موجب۔ فقہائے اسلام میں سے ایک فقیہ وہاں حاضر تھے۔ انہوں نے ہندو سے کہا کہ میں تم سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں۔ اس کا جواب دو۔ ازاں بعد میں تمہارے اعتراض کا جواب دوں گا۔

کہنے لگا پوچھیں، فقیہ نے کہا کہ بتاؤ اگر شخص کسی ملک میں وارد ہوتا ہے اور ایک عورت بغرض نکاح حاصل کرتا ہے جبکہ دوسری عورت صرف باورچی گری کے لئے حاصل کرتا ہے۔ اس منکوحہ سے اس کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ کسی ضرورت کے لئے سفر پر جانے لگتا ہے چاہتا ہے کہ بچہ کسی کے سپرد کر کے جاؤں تا کہ واپسی پر اس سے لے لوں۔ کس عورت کے سپرد کرے۔ اس کے جو اس بچے کی ماں ہے یا اسے سونپے جو باورچی ہے؟ ہندو کہنے لگا: ظاہر ہے کہ ماں کے ہوتے ہوئے اسے باورچی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ بیٹا ماں سے ہے باورچی عورت سے نہیں۔ فقیہ نے فرمایا: تو نے خوب کہا۔ اب اپنے اعتراض کا جواب سن۔ روح آسمانی جب دنیا میں آئی تو زمین سے مخلوق کر کے ایک بدن اسے عطا فرمایا گیا اور غذا، دوا، لباس، سکونت اور دیگر منافع ہمیشہ کے لئے زمین سے اس تک پہنچا دیئے گئے۔ جبکہ آگ آدمی کے حق میں باورچی گری کے سوا کوئی کام نہیں رکھتی۔ آگ کا انتہائی فائدہ یہی ہے کہ کچھ چیزیں جو کہ زمین سے اگتی ہیں انہیں پکائے۔ پس آدمی کی ماں زمین

ہے۔ اس کا باورچی آگ۔ جب روح نے جو کہ بدن کے باپ کی مانند ہے چاہا کہ عالم برزخ کو جائے تو ناچار اپنے بیٹے کو جو کہ بدن ہے اسکی ماں کے سپرد کرے گا نہ کہ کسی دوسری عورت کے جو کہ باورچی ہے۔ ہندو نے یہ کلام سن کر داد انصاف دی اور قائل ہو گیا۔

خیرات، فاتحہ خوانی، تلاوت کا میت کے لئے نافع ہونا

نیز آگ کے ساتھ جلانے میں میت کے بدن کے اجزاء کو جدا جدا کرنا ہے جس کی وجہ سے روح کا بدن سے تعلق پورے طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور اس جہان کے آثار اس روح کو کمتر پہنچتے ہیں اور اس روح کی کیفیات اس جہاں تک کمتر سرایت کرتی ہیں۔ جبکہ دفن کرنے میں چونکہ اجزائے بدن سب کے سب ایک ہی جگہ ہوتے ہیں اس لئے از راہ نظر و عنایت روح کا تعلق بدن کے ساتھ بحال رہتا ہے اور روح کی توجہ انس کے طالب زائرین اور فائدہ حاصل کرنے والوں کے ساتھ سہولت کے ساتھ ہوتی ہے۔ کیونکہ بدن کا مکان متعین ہونے کی وجہ سے گویا روح کا مکان بھی متعین ہے اور اس جہان کے آثار جو کہ صدقات، فاتحہ خوانی اور تلاوت قرآن مجید ہیں جب اس جگہ واقع ہوں جو کہ بدن کا مدفن ہے سہولت کے ساتھ نفع بخش ہوتے ہیں۔ پس جلانا گویا روح کو بے مکان کرنا ہے اور دفن کرنا گویا روح کے لئے ایک مسکن تیار کرنا ہے۔

مدفون اولیائے وصلحاء سے نفع اور فائدہ حاصل کرنا

اسی بناء پر مدفون اولیاء اور دیگر صلحاء مومنین سے نفع اور استفادہ جاری ہے اور ان حضرات کا نفع پہنچانا اور مدد کرنا بھی صورت پکڑتا ہے۔ بخلاف جلائے گئے مردوں کے کہ یہ چیزیں ان کے اہل مذہب کی نسبت سے بھی واقع نہیں ہیں۔ قصہ مختصر قبر اور دفن آدمی کے حق میں ایک عظیم نعمت ہیں۔

اہل اللہ کے زمین میں دفن کی وجہ سے زمین متبرک اور بوسہ گاہ بنتی ہے

نیز کامل اہل ایمان کے دفن میں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے ایک عظیم نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ سورت نوح کی آیت واللہ انبتکم من الارض نباتا ثم

یعید کم فیھا و یخرجکم اخراجًا پر گفتگو فرماتے ہوئے آپ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے تکریم انسانی کا یوں تذکرہ فرمایا ہے کہ باوجودیکہ رب العزت نے انسان کو زمین سے اصل قریب اور اصل بعید کے واسطہ سے پیدا فرمایا لیکن تمہارے وجود میں زبردست اور عظیم رفعت پیدا فرمائی۔ دینا میں بادشاہت، سلطنت، عزت و مرتبہ ظاہری پہنچتا ہے جبکہ دین میں رفعت نبوت و رسالت، امامت، خلافت، قطبیت ارشاد اور ولایت حاصل ہوتی ہے۔ پھر اس رفعت کے باوجود جو تمہیں حاصل ہوئی تمہیں پھر زمین کی طرف لوٹاتا ہے تاکہ تمہاری رفعت کے سبب سے وہ زمین بھی ترقی اور رفعت مرتبہ حاصل کرے اور تمہارے کاملین کی قبروں کی زیارت کا قصد کیا جائے اور متبرک ہو کر وہ بوسہ گاہ عام و خاص ہو۔

روز قیامت قبروں سے اٹھنے میں عظیم اعزاز

فرماتے ہیں کہ جب قبروں سے تمہیں اٹھایا جائے گا تو تمہارے وجود میں زمینی اجزاء کے لئے ایسی عظیم ترقی رونما ہوگی کہ کسی کے خیال، وہم اور فہم میں سما نہیں سکتی اور ایک ایسی رفعت حاصل ہوگی کہ دیدار پرودگار کا استحقاق حاصل ہوگا اور ابدالآباد تک اسکی مساکنت اور مجاورت کا شرف ملے گا۔ انتہی۔

یہ ہے حضرت مفسر مکرم قدس سرہ العزیز کے بیان تفسیر کی انفرادیت اور خصوصیت کہ باطل پرستوں کا مدلل رد بھی فرمایا اور اہل ذوق وعرفان کے لئے موت، قبر اور حشر کی ایسی نفیس بحث فرمائی کہ ان سے متعلق ذہنی اضطراب اور کرب کا دفعیہ ہی نہیں فرمایا بلکہ عظمت نبوت، ولایت کا بھی عظیم عقیدہ عطا فرمایا بلکہ ان کے مزاران کو مقصود بالزیارت اور بوسہ گاہ عوام وخواص قرار دے کر نجدی خوارج کے مکروہ عقائد کی دھجیاں بکھیر دیں۔ جو کہ اہل اللہ کے مزارات کو چومنے والوں کو مشرک قرار دیتے ہوئے شرم کی حدود پھلانگ جاتے ہیں۔

انبیاء، اولیاء کی اور مزارات کی زیارت آنکھوں کی عبادت ہے

بلکہ آپ ایاک نعبد کی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ عبادت کی شرع شریف میں کئی قسمیں ہیں۔ بعض کا تعلق ظاہر کے ساتھ ہے اور آنکھ کی عبادت، مشاہدہ خیر از قبیل کعبہ شریفہ اور قرآن کریم کو دیکھنا۔ بزرگوں کی زیارت جیسے انبیاء و اولیاء اور شہداء و صالحین کے مزارات

کی زیارت کرنا آنکھ کی عبادت ہے۔ یہ ہے اہل سنت و جماعت کا عقیدہ جس کی ترویج و اشاعت ولی اللہی خاندان نے کی جس کے چشم و چراغ حضرت مفسر علامہ نور اللہ مرقدہ ہیں۔

ربط کلام معجز نظام

دیگر خوبیوں کے علاوہ کلام کی یہ خوبی مرکزی حیثیت رکھتی ہے کہ معنوی طور پر باہم مربوط ہو۔ کیونکہ اگر متکلم غیر مربوط کلام پیش کرتا ہے تو نہ تو وہ مافی الضمیر کو صحیح معنوں میں سامعین کے قلوب میں جاگزیں کرسکتا ہے اور نہ ہی سامعین اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ خصوصاً عربی زبان تو اس معاملہ میں بہت نازک اور نفیس ہے اور یہ معاملہ اس وقت مزید حساس اور نازک ہو جاتا ہے جب متکلم ایک ہی واقعہ کو تکرار سے بیان کرتا ہے تو جیسا کہ نقصان فصاحت کے اسباب میں سابقاً مذکور ہوا کہ کسی واقعہ کو تکرار سے بیان کیا جائے تو فصاحت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ لیکن اب یہاں حضرت مفسر علیہ الرحمۃ والغفر ان کے نورانی اقتباسات سے استفادہ کیجئے کہ ایک ہی واقعہ کے بیان میں قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں الفاظ کا قدرے اختلاف ہے مگر اس میں خلل فصاحت کی بجائے حسن فصاحت کے انوار چمک رہے ہیں۔

سورۃ البقرہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نوازشات اور ان کی بے اعتدالیوں کا ذکر فرمایا کہ انہیں بستی میں داخل ہونے کا حکم ملا تو یہاں سورۃ البقرہ میں اور سورۃ الاعراف میں اسے بیان فرمایا۔ لیکن الفاظ قدرے مختلف ہیں۔ لیکن عیب کی بجائے معنویت سے معمور۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہاں سورۃ البقرہ میں واذ قلنا فرمایا، یعنی جبکہ ہم نے فرمایا اور سورت اعراف میں واذا قیل لھم، فرمایا یعنی جب ان سے فرمایا گیا۔ اسکی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں شروع سے یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم میں افعال ضمیر متکلم کے ساتھ لائے گئے جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہاں بھی مناسب ہوا کہ اس قول کو اپنی طرف منسوب کیا جائے اگرچہ یہ الفاظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے تھے تا کہ بنی اسرائیل کی انتہائی بے ادبی ظاہر ہو کہ وہ ہمارے کہے ہوئے کے

ساتھ تمسخر سے پیش آئے۔ جبکہ سورت اعراف میں بیان کلام اس لئے ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کے دو گروہ تھے۔ ومن قوم موسٰی امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون۔ (الاعراف آیت ۱۵۹) ''اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو حق کے ساتھ راہ بتاتا ہے اور اسی کے ساتھ عدل کرتا ہے''۔ وامۃ ضالۃ جائرۃ۔ ''یعنی ایک گروہ گمراہ جور و جفا پیشہ''۔ اور اس مناسبت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کرامت میں ان کا جدا جدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اس انتشار میں سے ان کا گھاٹ اور پتھر سے جاری ہونے والے چشموں میں علیحدگی اختیار کرنا ہے جو کہ ان کے ذہنی طور پر منتشر ہونے پر دلالت ہے۔ اسی طرح بستی میں داخل ہوتے وقت ان کی حالت کا اختلاف ہے کہ بعض نے حسب الحکم عمل کیا اور بعض نے انتہائی بے ادبی اختیار کی اور اس کہنے میں اللہ تعالیٰ کے بلاواسطہ قول کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کی غرض برابر ہے۔ علاوہ ازیں قرائن کے ساتھ معلوم ہے کہ قائل کون ہے اور اس نے کس کے فرمان پر کہا ہے۔ پس ابہام رفع ہو گیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں اس سورت میں ادخلوا فرمایا، جبکہ سورہ اعراف میں اسکنوا۔ اسکی کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں اس آیت کا سیاق ان من وسلوی کھانے اور اس نعمت کو اجناس خوردنی اور غلوں سے بدلنے کی طلب کا ذکر ہے۔ پس یہاں مقصود بالذات اس امر کا بیان ہے کہ ہم نے انہیں اس بستی کے غلے کھانے کی اجازت عطا فرمائی۔ جبکہ داخل ہونا اس مقصود بالذات کا موقوف علیہ اور اس کا وسیلہ ہے اور شے کی اجازت دینا اس امر کی اجازت ہے جس پر یہ موقوف ہے۔ اس لئے داخل ہونے کا ذکر بھی ضروری ہوا۔ جبکہ سورۂ اعراف میں اس آیت کا سیاق سفر و حضر میں ان کا اختلاف وانتشار ہے۔ پس سفر میں پانی پینے میں انتشار کا شکار ہو گئے اور حضر میں سکونت اور اس کے طریقے میں انہوں نے اختلاف کیا۔ نیز اس سورت میں بستی کی سکونت کو بھی بطور مقصود بالذات بیان فرمایا گیا۔ کیونکہ جس طرح وہ من وسلویٰ کھانے میں ملال کا اظہار کرتے تھے اسی طرح خیموں میں رہنے سے بھی تنگ آچکے تھے اور چونکہ سورۂ بقرہ میں سکونت پر داخل ہونا مقدم ہے جو کہ سورۂ اعراف پر مقدم ہے لہٰذا داخل ہونے کا ذکر فرمایا گیا اور سورہ اعراف میں

سکونت کو بیان فرمایا گیا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہاں ''فکلوا'' فا کے ساتھ لایا گیا جبکہ سورۂ اعراف میں ''وکلوا'' یعنی واؤ کے ساتھ۔ یہ فرق کس بنیاد پر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ دخول ذکر فرمایا گیا ہے اور بستی میں داخلہ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ مقصود بالذات دوسری چیز ہوتی ہے۔ چاہیے کہ وہ داخلہ پر مرتب ہو اور وہ مرتب ہونے والی چیز غلہ کھانا تھا۔ پس ایسا لفظ لانا جو کہ ترتیب کا پتہ دے ضروری ہو گیا۔ جبکہ سورہ اعراف میں چونکہ اسکنوا کا لفظ لایا گیا اور بستی کی سکونت مقصود بالذات ہوتی ہے اس کے بغیر کہ کسی دوسری چیز کا وسیلہ ہو۔ مناسب ہوا کہ وہاں غذائی اجناس اور غلوں کا کھانا ترتیب سے خالی عطف کے طریقے سے بیان فرمایا جائے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ یہاں رغدا کا لفظ بڑھایا گیا ہے جبکہ اعراف میں یہ لفظ گرا دیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں مقصود بالذات غذائی اجناس اور غلوں کے کھانے کا جواز ہے اور اس میں وسعت دی گئی ہے۔ پس اس کی تاکید رغدا کے لفظ کے ساتھ مناسب ہوئی اور اعراف میں سکونت مقصود بالذات ہے اور کھانا اس بنیاد پر کہ سکونت اسے لازم کرتی ہے بھی جائز ہوا اور ضروری چیز کو بقدرت ضرورت ہی مقرر کیا جاتا ہے۔

نیز میووں سے پُر باغ میں داخلہ میوے سے سیر ہونے کو لازم نہیں کرتا کہ کھانے پینے کا مقام تو اس باغ کے علاوہ ہوتا ہے اور کسی مکان میں سکونت اس مکان کے طعام سے سیر ہونے کو لازم کرتا ہے۔ کیونکہ جائے سکونت کے علاوہ کوئی دوسرا مکان کھانے پینے کے لئے نہیں ہوتا۔ پس دونوں سورتوں میں لفظ ''دخول ''سکونت کا جو فرق واقع ہوا وہ ''رغدا'' کے لفظ کے ذکر اور حذف کرنے کا متقاضی ہوا۔

ایک سوال یہ ہے کہ یہاں بما کانوا یفسقون فرمایا گیا اور سورہ اعراف میں یفسقون کی بجائے'' یظلمون ''ارشاد فرمایا گیا۔ اس فرق کا نکتہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ فعل ان کے اپنے حق میں ظلم تھا کہ اس کی وجہ سے وہ معرض غضب الٰہی میں داخل ہوئے اور فسق تھا اللہ تعالیٰ کے دین کی نسبت سے۔ دونوں سورتوں میں اس فعل کو ان

دونوں بری صفات یاد کیا گیا۔ البتہ اس سورت میں فسق کے ذکر کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے حق میں ان کا ظلم اسی سورت میں عنقریب گزرا ہے۔ وما ظلمونا ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔ اگر یہاں کی وہی لفظ مذکور ہوتا تو تکرار کا وہم لاحق ہوتا۔ بخلاف اعراف کے کہ وہاں ان کا وصف ظلم کے ساتھ ذکر نہیں گزرا۔ اس لئے یہی لفظ لانا مناسب ہوا۔

ماقبل میں آپ نے ایک ہی واقعہ کے متعلق دو مختلف مقامات پر اس کے بیان میں بعض لفظی تنوعات کی حکمت کا مطالعہ کیا۔ لفظوں کے فرق میں معنوی ربط ہے۔ انتشار نہیں۔ اب آخر میں ذرا قرآن کریم کی مرتب بعض سورتوں میں معنوی اتصال کا جہان حقائق ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن پاک کی سورتوں میں باہمی ربط و تعلق

سورۃ النباء اور سورۃ والمرسلات میں اس جہت سے ربط واقع ہے کہ ہر دونوں سورتوں میں جزاء دینے کا عمل یوم الفصل کے آنے پر وابستہ بیان کیا گیا اور یوم الفصل کے کچھ احوال بیان فرماتے گئے ہیں اور کفار کا قیامت کے آنے میں جو تعجب تھا اسی مقدمہ کے ذریعے دفع کیا گیا کہ جب قیامت کا آنا یوم الفصل کے بغیر نہیں ہوتا اور یوم الفصل اس جہان کی تخریب اور نوع انسانی کے منقطع ہوئے بغیر صورت نہیں پکڑتا تو اس سے پہلے ہی جزا کا مطالبہ اسی طرح ہے جس طرح کہ موسم گرما میں موسم سرما کا میوہ چاہیں اور موسم سرما میں موسم گرما کا میوہ طلب کریں کہ یہ صریح ایذاء رسانی اور قبیح الجھاؤ ہے۔

اس کے علاوہ ان دونوں سورتوں کے متفرق مضامین میں کمال مشابہت واقع ہے۔ وہاں واذاالسماء فرجت واذاالجبال نسفت واقع ہے جبکہ یہاں وفتحت السماء فکانت ابوابا وسیرت الجبال فکانت سرابا ہے۔ وہاں الم نجعل الارض کفاتا...... وجعلنا فیھا رواسی شامخات واسقیناکم ماء فراتا واقع ہے اور یہاں الم نجعل الارض مھادا والجبال اوتادا۔ وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجا ہے۔ وہاں جہنم کی جلن اور اسکے شراروں کے شعلہ زن ہونے کا ذکر ہے۔ جبکہ

یہاں جہنم میں ٹھنڈے پانی کا قحط اور شدید گرم پانی پینے کا ذکر ہے۔ وہاں هذا یوم لاینطقون ہے جبکہ یہاں یوم یقوم الروح والملائکه صفالا یتکلمون ہے۔ وہاں ان المتقین فی ظلال وعیون وفواکه مذکور ہے جبکہ یہاں متقین کے لیے حدائق واعنابا کا وعدہ دیا گیا ہے۔ وہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر کافروں کو دنیا میں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ایک بار پشت خم کرو نہیں کرتے۔ جبکہ یہاں ارشاد ہوا کہ قیامت کے روز آرزو کریں گے کہ کاش کہ ہم خاک کے برابر ہو جائیں اور عذاب سے خلاصی پا لیں۔ اس تکبر و نخوت کو اس زاری اور ذلت سے کیا نسبت۔

اس سے اگلی سورت والنازعات کے متعلق فرماتے ہیں کہ ظاہری نظر میں اس سورت کا سورہ والمرسلات کے ساتھ ربط قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس سورت کا آغاز اس سورت کے آغاز سے کمال مشابہت رکھتا ہے۔ بلکہ پورے قرآن کریم میں اس انداز کے ساتھ پانچ سورتوں کا آغاز واقع ہے۔ پہلی سورت صافات پارہ ۲۳۔ دوسری سورت ذاریات پارہ ۲۶۔ تیسری سورت مرسلات پارہ ۲۹۔ چوتھی سورت نازعات پارہ ۳۰ اور پانچویں عادیات پارہ ۳۰۔

جبکہ صافات میں تین صفات مذکور ہیں یعنی والصافات صفا، فالزاجرات زجرا، فالتالیات ذکرا۔ ذاریات میں چار صفات مذکور ہیں۔ یعنی والذاریات ذروا، فالحاملات وقرا۔ فالجاریات یسرا، فالمقسمات امرا اور باقی تین سورتوں میں پانچ پانچ صفات مذکور ہیں۔ یعنی والمرسلات عرفا، فالعاصفات عصفا۔ والناشرات نشرا۔ فالفارقات فرقا۔ فالملقیات ذکرا اور والنازعات غرقا۔ والناشطات نشطا۔ والسابحات سبحا۔ فالسابقات سبقا۔ فالمدبرات امرا اور والعادیات ضبحا۔ فالموریات قدحا۔ فالمغیرات صبحا۔ فاثرن به نقعا۔ فوسطن به جمعا۔ البتہ سورت عادیات دو جہت سے ان دو سورتوں کے ساتھ مشابہت میں کم ہے۔ ایک جہت تو اس کا چھوٹا ہونا اور ان دونوں سورتوں کا طویل ہونا ہے۔ دوسری جہت یہ ہے کہ سورت عادیات میں دو صفات صیغہ فعل کے ساتھ مذکور ہیں یعنی فاثرن به

نقعا فوسطن به جمعًا۔ جبکہ ان دونوں سورتوں میں پانچوں صفات اسم فاعل کے صیغے کے ساتھ مذکور ہیں۔ پس یہ دونوں سورتیں مطلع کے انداز میں کمال مناسبت رکھتی ہیں۔

سورۃ المرسلات اور عم یتساء لون نیز عم یتساء لون اور نازعات میں مناسبت

لیکن دور بین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے گہری سوچ کے ساتھ دریافت کیا کہ سورت والمرسلات کا مدار یوم الفصل اور اس کے احکام کے بیان پر ہے۔ جبکہ سورت عم یتسائلون بھی یوم الفصل کے واقعات کی کیفیات کی شرح ہے۔ پس گویا سورت عم یتساءلون، سورت مرسلات کی شرح اور بقیہ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل لکھ دیا گیا۔ اس کے بعد مطلع کی مناسبت کی رعایت کی بناء پر اس سورت کو لایا گیا۔ نیز گہری نظر دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے مضامین کو عم یتساء لون کے مضامین کے ساتھ اس حد تک مناسب ہے کہ ایک ہونے تک نوبت جا پہنچی۔ اس مناسبت کے ہوتے ہوئے مناسبت مطلع کی رعایت اس قدر اہم نہیں۔

عم یتساء لون اور والنازعات کے مضامین کی مناسبت کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ وہاں احوال قیامت کے متعلق کفار کا سوال کرنا ایک دوسرے سے مذکور ہے۔ جبکہ یہاں ان کے متعلق سوال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے کہ یسئلونك عن الساعة ایان مرساها۔

پھر وہاں الم نجعل الارض مهادا واقع ہے جبکہ یہاں والارض بعد ذالك دحاها ہے۔ وہاں والجبال اوتادا ہے جبکہ یہاں والجبال ارساها ہے۔ وہاں وجعلنا اليل لباسا وجعلنا النهار معاشا ہے۔ جبکہ یہاں واغطش ليلها واخرج ضحاها ہے۔ وہاں سبعا شدادا تو یہاں ء انتم اشد خلقا ام السماء بناها ہے۔

وہاں بارش کے پانی کا ذکر ہے جو کہ آسمان کی طرف سے آتا ہے اور نباتات اگاتا

ہے۔جبکہ یہاں چشموں کے پانی کا ذکر ہے جو کہ زمین سے پھوٹتا ہے اور اگانے میں مدد کرتا ہے۔اخرج منها ماءها ومرعاها۔

وہاں یوم ینفخ فی الصور ہے۔جبکہ یہاں تبتعها الرادفة ہے۔وہاں جہنم کے بارے میں فرمایا للطاغین مآبا جبکہ یہاں فاما من طغٰی وآثر الحیوة الدنیا فان الجحیم هی الماوٰی ہے۔وہاں جہنم میں دوزخیوں کا طویل عرصہ تک ٹھہرنا اس عبارت کے ساتھ ارشاد فرمایا لٰبثین فیها احقابا،جبکہ یہاں اس سورت میں جہنمیوں کا برزخ اور دنیا میں قلیل مدت تک ٹھہرنا اس عبارت سے بیان ہوا۔ لم یلبثوا الاعشیة اوضحاها۔وہاں جنت اور اسکی نعمتوں کے بارے میں فرمایا۔ ان للمتقین مفازا۔جبکہ یہاں فرمایا واما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوٰی فان الجنة هی الماوٰی۔علاوہ ازیں دیگر مناسبتیں بھی ہیں جو کہ غور وفکر سے ظاہر ہوتی ہے۔مناسبات کے بیان میں مذکورہ آیات کا ترجمہ نہیں لکھا کہ آپ ان سورتوں کے ترجمہ میں اس سے مستفید ہوں گے۔

بقدر امکان عجلت اور کچھ اختصار پیش نظر۔ بنابریں چند ایک مقامات سے متعلق وضاحتیں پیش خدمت کی ہیں۔امید ہے کہ یہ اقتباسات اس عظیم تفسیر سے استفادہ کا شوق بڑھائیں گے اور رغبت دلائیں گے۔اگرچہ مضامین میں بعض مقامات پر کافی گہرائی ہے جو کہ خصوصی توجہ اور انہماک کی متقاضی ہے لیکن مثلاً شیان حقیقت کا شوق وذوق انشاء اللہ العزیز زاد سفر ہوگا۔

مشمولات فتح العزیز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوم وحقائق کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ عقل کے پرستاروں کی راست راہنمائی۔آیات اور سورتوں کے باہمی ربط ومعنوی اتصاف سے مطلع ہوکر محسوس ہوتا ہے کہ موتی پروئے ہیں جن سے عرفان وایمان کا حسن دوبالا ہوتا ہے۔فرق باطلہ از قبیل معتزلہ۔ملاحدہ اور فلاسفہ کا ایسا معقول اور پرمغز رد ہے اور ان کے اعتراضات،اشکالات کو یوں اٹھایا ہے کہ ذالک الکتاب لاریب فیہ ایک تابندہ ودرخشندہ حقیقت کی صورت میں جگمگاتا چمکتا نظر آتا ہے۔

مقام مسرت یہ ہے کہ مکمل تیس پاروں کی تفسیر دستیاب نہیں۔ البتہ حضرت مفسر علام قدس سرہ نے تکمیل کے اشارات تو دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ تکمیل نہیں ہو سکی۔ یا تکمیل ہو گئی مگر مواد کہیں ضائع ہو گیا۔ اگر مکمل تفسیر موجود ہوتی تو حقائق کا خزانہ تھا۔ اللہ اپنے دین کا محافظ ہے۔

فقیر حقیر، سید محمد محفوظ الحق غفرلہ

جامع مسجد غلہ منڈی بوریوالہ

شب ہشتم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ

۱۳۔ مئی ۲۰۰۸ء شب چہار شنبہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(اے رب کریم) حمد کو تیری ذات سے ایسی موزوں نسبت ہے کہ کسی کی تعریف کی جائے اصل میں تیرے آستان کرم ہی کی تعریف ہے۔ تمام زبانوں سے پاکیزہ شکریہ اسی کی درگاہ کی طرف لوٹتا ہے۔ اور تمام زمانوں میں کی گئی تعریف جو کہ ہر آلائش سے پاک ہے اسی کی بارگاہ کے لائق ہے۔ اعضائے مخلوق کی کیا مجال کہ خالق کی شان کبریائی میں اس کی کماحقہ تعریف کر سکیں۔ کس کے ہاتھ اور زبان سے ممکن ہے کہ اس کے شکر کی ذمہ داری پوری کر سکے؟ ہزار گناہوں سے شرمندہ' بندہ کا کیا منہ؟ کہ بے اثر حرف اور بے قدر آواز سے رب پاک کی مدح سرائی کا کام سرانجام دے سکے۔ (بیت) اس ناطے سے میری امید منقطع ہوگئی ہے کہ ذرۂ خاک' سورج کا شکریہ کیا ادا کر سکتا ہے۔

اور ازل سے ابد تک عالی صفات' مکارمِ اخلاق کو پورا کرنے والی' انفس و آفاق میں سب سے ممتاز' اقرار عالم میں سب سے بزرگ اور تمام بنی آدم سے افضل ذات پاک پر بے شمار درود ہوں۔ بیت۔ خاک دان عالم میں ہونے کے باوجود عرش کی بلندیوں پر آپ کی منزل ہے۔ کسی سے پڑھے نہیں مگر سب کتابوں کا علم دل میں ہے۔ افلاک کی وسعتوں میں تیزی سے چلنے والے' لولاک کے سمندر کے گوہر تابدار' ابھی حضرت آدم علیہ السلام پانی اور مٹی میں تھے کہ آپ کی مملکت جان و دل پر فرمانروائی تھی۔ اس لئے کہ آپ نے بت پرستی کی تاریکی میں گم اور بدمستی کے دریا میں غرق لوگوں کو شمع ہدایت کے نور کے ساتھ گمراہی اور بے راہ روی سے نکال کر سیدھی راہ دکھائی۔ اور ذات حق کے قرب وحضوری کے مقام تک پہنچانے کیلئے ان پر نور و سرور کے دروازے کھولے۔ ازل سے ابد تک آپ پر' آپ کی آل اور اصحاب پر ہزار ہزار آفریں ہو۔

امابعد! یہ عیبی' ناقص سوچ والا' باطنی خوبیوں سے خالی' حرف ترخیم کی طرح ساقط

الا اعتبار وصل کے الف کی طرح گمنام‘ شعور و تمیز سے بے بہرہ جس کا نام عبدالعزیز ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخشے اور پردہ پوشی فرمائے‘ اگر اپنے نسب کی تعریف میں ظاہری تعلق کے اعتبار سے بات کرے تو یوں کہتا ہے کہ میں عرفان کی زبان‘ ترجمان القرآن‘ خاتمۃ المحد ثین‘ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وعلیہم وبارک وسلم کے علوم کے وارث‘ امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیم‘ نبوی معجزات میں سے ایک معجزہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا بیٹا اور عظیم حالات‘ رفیع درجات والے اہل سلوک وعرفان کے مقتدا‘ مقام جذب واحسان کے جامع حضرت شیخ عبدالرحیم دہلوی کا پوتا ہوں‘ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں دونوں کے درجات بلند فرمائے۔ اور شہداء وصدیقین کے زمرہ میں دونوں کو جمع فرمائے۔

لیکن روحانی تعلق کے نہ ہونے پر نظر کرتے ہوئے ڈر ہے کہ آگ کی عار دھوئیں اور پانی کیلئے ننگ کیڑے کی طرح نہ ہو جاؤں۔ حضرت نبی کریم کی ذات پر لاکھوں درود اور لاکھوں سلام ہوں کی ہجرت مقدسہ کے ۱۲۰۸ سال میں برادر دینی‘ جوہر نتیجہ حق گزینی‘ خدا طلبی کی راہ کے سالک‘ سچائی کے طریقہ کو لازم کرنے والے‘ مقبول بارگاہ خداوندی‘ مرجع خلائق مولانا و بالفضل اولانا فخر الملہ والدین محمد قدس اللہ سرہ الامجد شیخ مصدق الدین عبداللہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رضا کی توفیق دے اور دنیا و آخرت میں اسے لطف واحسان سے نوازے کے شوق اور طلب پر پہلے سورۂ فاتحہ اور قرآن پاک کے (اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ہمیں اس کی آیات سے نفع دے) آخری دو پاروں کے معانی کی وضاحت کے لئے کہ اکثر مسلماں پانچوں نمازوں‘ جمعہ‘ انبیاء علیہم السلام اولیاء اللہ کی ارواحِ مقدسہ کی جلوہ گاہوں‘ صلحاء وعرفاء کے مزارات کی زیارت کے موقعوں پر انہیں سورتوں کی تلاوت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے مضامین کو دریافت کرنے کی تشنگی پاتے ہیں۔ پھر سورۃ بقرہ سے شروع کر کے کہ اس شعر کے مصداق کے مطابق میں نے محبت کی شراب پیالوں کے پیالے پی مگر نہ تو شراب ختم ہوئی۔ اور نہ میں سیر ہوا‘ کلام الٰہی کے حقائق و دقائق کے حل میں زیادہ رغبت ہوئی‘ میں ایسی سادہ فارسی زبان میں جو کہ ان علاقوں میں متعارف ہے۔ اور اس دور کی رائج تمثیلات استعمال کیں اور اہل عربیت کی غیر ضروری طوالت کو حذف کر کے‘

بعید از فہم توجیہات کو گرا کر اور ضعیف روایات پر تنبیہ کر کے تفسیر لکھائی۔ اور اس برادر دینی نے اس کا لفظ بلفظ لکھا جبکہ کسی کتاب کی طرف رجوع ہی نہیں کیا۔ اور نہ ہی کوئی مجموعہ مضامین مسودہ یا مضامین کا انتخاب پیش نظر تھا۔ اگرچہ استعداد بلند' فطرت ارجمند' معانی پیدا کرنے کی قدرت' خیال کے انتخاب کی قوت' فیاض ازلی سے روحانی تعلق' قوانین تصفیہ کے ساتھ ریاضت یافتہ دل' ظاہری حالات کی درستی اور سکون قلب جو کہ اس کام کی معتبر شرائط ہیں بالکل ناپید تھیں۔ اور توجہ میں خلل ڈالنے کے قسم قسم کے اسباب یکسوئی کو منتشر کرنے کے کئی عوارض' دائمی امراض و تکالیف' دل و دماغ کی کمزوری اور تنگ ظرفی اس عمل تفسیر کی راہ میں قوی رکاوٹیں ہیں جو کہ یہاں وافر طور پر موجود جب تفسیر پوری ہوگئی تو دیکھا کہ منگتوں کے کاسۂ گدائی کی طرح طرح طرح قسم کے نوالوں سے پر ہے۔ اور درویشوں کے پیوند لگے کپڑوں کی طرح مجموعی طور پر عجیب وغریب ہے تو بلند فکر و نظر والوں اور سعید فطرت کے استعداد والوں سے امید کرتا ہوں کہ جب وہ فقیرانہ لنگر کو پائیں تو جو لقمہ ان کے ذوق کے مطابق ہو اسے استعمال فرمائیں اور جو نوالہ انہیں لذت بخشے تناول فرمائیں اور اپنے ذوق کو کام میں لاتے ہوئے ادراک کے دانتوں کی زکات دیں اور ان اوراق کو جمع کرنے والے کو ایک دسترخواں کے ریزے چننے والے سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ کیونکہ بموجب حدیث پاک اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِي ' میں تو تقسیم کرنے والا ہوں عطا تو سب اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور کلام اللہ کی تفسیر جو کچھ متکلم کی ذات پاک کی طرح غیر منتہی شانوں کی جامع ہے کو ایک طریقہ پر ہی نہ سمجھیں اور اللہ تعالیٰ کے فیض کو ایک خاص نہج پر منحصر نہ جانیں اور اگر ان کے معرفت آمیز باطن کو اس سے روحانی مسرت حاصل ہو تو بارگاہ رب العزت سے دعا مانگیں۔ اور میں بھی اس کے فضل و کرم سے سوال کرتا ہوں کہ جس طرح مجھے شروع ہونے کی توفیق دی اسے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور وہ وہی ذات کہ اس کی عزت و جلال سے اچھے اعمال پورے ہوتے ہیں۔ اور تمام حالات میں اسی پر اعتماد ہے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد النبی الامی والہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ واتباعہ و خدامہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع جو بخشنے والا مہربان ہے۔ بسم اللہ شریف میں ان تین اسماء کو اختیار فرمایا تا کہ ان تینوں سے امداد حاصل ہو۔ اور انہیں اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت کا ہر کام تین چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک تو اس کام کے اسباب کا مہیا ہونا اور یہ اسم جلالت ''اللہ'' کے تصرفات سے ہے۔ کیونکہ یہ اسم پاک تمام صفات پر دلالت فرماتا ہے دوسرے اس کام کی ابتداء سے لے کر انتہاء تک ان اسباب کا باقی رہنا۔ اور یہ صفت ''رحمٰن'' کا تقاضا ہے۔ اور جہان کی بقا اسی سے وابستہ ہے۔ تیسرے اس کام کے نتائج حاصل ہونے پر اس کے ثمرات کا مرتب ہونا اور یہ صفت رحیمی کا تقاضا ہے کہ بندوں کی کوشش کو ضائع نہیں فرماتا۔

سورۂ فاتحہ کی شانِ نزول

سورۂ فاتحہ کی شان نزول یہ ہے کہ مولانا یعقوب چرخی نے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ یہ سورت مکہ شریف میں نازل ہوئی۔ اور اس واقعہ کی کیفیت یوں ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جب جنگل میں جاتا تو ایک آواز سنتا ''یا محمد'' ایک نورانی شخص کو زمین و آسمان کے درمیان لٹکتے ہوئے زریں تخت پر دیکھتا۔ اس آواز سے خوف محسوس کرتے ہوئے بھاگ جاتا جب یہ واقعہ کئی دفعہ رونما ہوا تو میں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے یہ واقعہ بیان فرمایا۔ اور وہ تورات وانجیل کے عالم تھے۔ اور انہوں نے نصرانی علماء سے کافی علم حاصل کیا تھا۔ تو انہوں نے مجھے کہا کہ اب جب آپ آواز سنیں تو بھاگیں نہیں۔ اور توجہ کیجئے کہ کہنے والا کیا کہتا ہے۔ میں نے اسی طرح کیا جب پھر آواز آئی ''یا محمد'' میں نے لبیک کہا۔ اس نے کہا میں جبرئیل ہوں۔ اور آپ اس امت کے نبی ہیں پھر اس نے کہا کہ یہ پڑھیے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ پھر اس نے کہا کہ کہیے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں نے سورۂ فاتحہ آخر تک تلاوت کی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ' تمام تعریف وثنا اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو کہ سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ سورت بندوں کی زبان پر نازل ہوئی۔ بندہ کو چاہئے کہ مناجات ودعا کی حالت میں اس طرح کہے۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی صفت اس لئے لائی گئی تاکہ تعریف وثنا ایک ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص رہے۔ کیونکہ یہ صفت اس کے غیر میں موجود نہیں ہے۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ربوبیت کا معنی ہے پالنا' یعنی کسی چیز کو درجہ بدرجہ اس کے کمال کی حدتک پہنچانا' جیسے باغبان کہ زمین میں بیج ڈالتا ہے۔ اور جب پودا بن جائے تو پانی دے کر اور شاخ کاٹ کر اس کی تربیت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کی حدتک پہنچ جائے۔ اور اسے پتے اور پھل لگیں۔ اور اسی طرح والدین اپنی اولاد کے معاملہ میں۔ اور یہ پرورش کبھی ایک آدمی یا چند آدمیوں کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ جیسے ماں باپ کہ وہ اپنی اولاد کے حق میں یہ کام کرتے ہیں۔ یا باغبان جو کہ ایک باغ یا دو باغوں کے حق میں یہ کام کرتا ہے یا بادشاہ اور امیر جو کہ اپنے متعلقہ اشخاص اور لشکریوں کے بارے میں یہ عمل کرتے ہیں۔ اس قسم کی خاص پرورش کو کوئی بھی توحید پرست یا مشرک قابل عبادت نہیں سمجھتا۔ اور کبھی پرورش عام ہوتی ہے کہ ایک قسم یا دو قسم یا چند ایک قسموں کو شامل ہوتی ہے۔ جیسے چاند سورج کی پرورش' یا عناصر کی پرورش یعنی ان روحانیت کی پرورش جو کہ ان عناصر سے متعلق ہیں۔ جیسے جوالا جو کہ آگ کے ساتھ متعلق ہے۔ اور بھیروں جو کہ پانی سے متعلق ہے۔ اور اس قسم کی عام پرورشوں کو مشرکین عبادت کے لائق سمجھتے ہیں۔ اور پوجا کرتے ہیں۔ جس طرح اشراقیین کے مذہب میں ارباب انواع کہتے ہیں۔ اور فلاسفہ کے مذہب میں ارواح ونفوس کہتے ہیں۔ اور اہل دعوت کی اصطلاح میں موکلات کا نام دیتے ہیں۔ لیکن یہ عام پرورش صرف ایک جہان میں ہے۔ مثلاً سورج کی پرورش گرمی اور خشکی اور چاند کی پرورش ٹھنڈک اور تری کے جہان میں ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔ اور جب یہ ربوبیتیں بھی خاص ہوئیں تو عبادت کے قابل اور ثنا وتعریف کے لائق نہ رہیں۔ کیونکہ انہیں خاص

کرنے والا کوئی اور ہے۔ جو کہ حقیقت میں قابل عبادت اور ثنا و تعریف کے لائق ہے۔ اور وہ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ہے کہ سب جہانوں میں اس کی پرورش جاری و ساری ہے۔ اسی لئے جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ رب العالمین کون ہے؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا آسمانوں' زمینوں اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب کا رب۔ فرعون کو اس سے تعجب ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر فرمایا: رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَاءِ كُمُ الْاَوَّلِيْنَ تمہارا اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا رب۔ پہلی بار آپ نے مکانات میں عموم ربوبیت کو بیان فرمایا۔ اور دوسری بار اوقات میں ربوبیت کے عموم کا تذکرہ فرمایا۔ جب فرعون نے اس حقیقت کو ناممکن سمجھا کہ ایک ذات متعدد مقامات اور طویل زمانوں میں کس طرح ربوبیت کر سکتی ہے تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جنون کا اعتقاد پیدا کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیسری مرتبہ فرمایا: رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا مشرق و مغرب اور ان کے درمیان ہر شے کا رب۔ یعنی جس طرح کہ اس کی ربوبیت زمانوں اور مکانوں میں عام ہے۔ اسی طرح غیر متناہی شکلوں میں بھی عام ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قابل عبادت اور تعریف وثنا کے لائق اسی کی ذات ہے کہ ہر چیز اسی کی محتاج ہے۔ اور اس کی ربوبیت کسی خاص جنس یا نوع یا شخص کے ساتھ مقید نہیں۔ اور اسے اپنی شان ربوبیت میں کوئی غرض یا بدلہ پیش نظر نہیں۔ یہاں جان لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی رُبوبیتیں اگرچہ ظاہر میں ربوبیتیں ہی ہیں مگر حقیقت میں خاص و عام کی ربوبیت اس کی ذات پاک سے مخصوص ہے۔ کیونکہ ربوبیت کی حقیقت کا تصور کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانے' فائدہ اور پرورش کے اسباب پیدا کرنے' فائدہ حاصل کرنے پر قدرت دینے اور فائدہ حاصل کرنے میں رکاوٹیں دور کرنے کے بغیر ممکن نہیں۔ اور یہ صفات اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا غیر خدا میں ثابت نہیں۔ کیونکہ دوسرے پرورش کرنے والے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو اپنی پرورش میں استعمال کرتے ہیں۔ اور رکاوٹوں کو دور کرنے اور شرائط حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ خلاصہ یہ کہ وہ پرورش کرنے والے بجائے خود پرورش کی شرائط اور وسائل ہیں۔ اور اسی لئے

حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلوٰت اور سلامہ علیٰ نبینا وعلیہ نے ان اسباب و وسائل کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا۔ اور دین حنیف کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ان سے یہ قول منقول ہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس اعتقاد کو پسند فرمایا۔ اور آپ کو ملتوں کا امام قرار دیا۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جاننا چاہئے کہ دو قسم کی رحمت، پرورش کے لوازمات میں سے ہے۔ رحمت کی پہلی قسم وہ ہے جو کہ عین پرورش کے وقت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ رحمت نہ ہو تو پرورش کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اس رحمت کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے زیر پرورش کیلئے جو کچھ ضروری ہے عطا کرے۔ اس کی ہر وقت کی ضروریات کا اہتمام کرے۔ اور ہر لحہ اس کیلئے مفید و مضر چیزوں کا خیال رکھنے پر پوری توجہ کرے۔ اور اسم رحمٰن سے اسی رحمت کی تعبیر کی گئی ہے۔

اور رحمت کی دوسری قسم یہ ہے کہ پرورش کے بعد جب کمال حاصل ہو جائے تو اسی کمال کے نتائج کو اس پر مرتب فرمایا جائے۔ اور اس کمال کو ضائع نہ کیا جائے۔ ورنہ ایک کھیل تماشے سے زیادہ حیثیت نہ ہوگی۔ جیسا کہ ایک شخص نے ایک پودے پر پوری محنت سے کام کیا۔ اور اسے پھل لگا اور اس نے اس پھل سے شیرہ، سرکہ، مربہ، اچار اور اس قسم کی چیزیں نہیں بنائیں کہ اس پھل کی خاصیتیں دیر تک باقی رہتیں تو اس پھل کے حق میں یہ رحمت نہ ہوئی۔ اور اسم رحیم سے یہی رحمت مراد ہے تو اس مقام پر ان دونوں اسماء کو لانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تمام جہانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی پرورش اس جہان کی بنا موجود ہونے کے وقت بھی جاری ہے۔ اور اس بنا کے ختم ہونے کے بعد بھی اور معاش و معاد کا یہی مفہوم ہے اگر ایک عقلمند غور کرے تو ذرات عالم میں سے ہر ذرے میں معاش اور معاد کا تصور کارفرما ہے۔ مثلاً کھانا جو کہ انسان کھاتا ہے۔ غلہ کاشت کرنے سے لے کر اس کے ہضم ہونے تک معاش ہے۔ اور اس کے بعد معاد کہ اس کا ایک حصہ خون بن کر جزو بدن بن جاتا ہے۔ اور ایک حصہ دوسری، اخلاط از قبیل بلغم سودا صفراء وغیرہ بنتا ہے جو کہ ضروریات

جسم میں صرف ہوتی ہیں۔ اور ایک حصہ فضلہ بن کر بول و براز کے راستے سے باہر آجاتا ہے۔ اور کچھ ناک کا پانی' منہ کا پانی' آنکھ کی تری' جسم کے بال وغیرہ بننے میں استعمال ہوا۔ اسی طرح ہر شے میں معاش و معاد ثابت ہے۔ اور ہر چیز کے معاش کا انتظام صفت رحمانیت سے متعلق ہے۔ اور ہر چیز کے معاد کا حسن ہر زمانے میں صفت رحیمی کا تقاضا ہے۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

یوم جزا کا مالک۔ اور بعض قرأت میں ملک یوم الدین یعنی الف کے بغیر بھی آیا ہے۔ اور اس کا معنی روز جزا کا بادشاہ۔ یہاں یہ جان لینا چاہئے کہ حقیقتاً ہر وقت ہر شے کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ کیونکہ تمام اشیاء کا خالق وہی ہے۔ تو مالک بھی وہی ہوگا۔ اسی طرح ہر وقت ملکیت و بادشاہی بھی حقیقت میں اسی کا خاصہ ہے۔ لیکن روز جزا اس کی ملکیت و بادشاہی ہر خاص و عام کی نظر میں حقیقت و مجاز کے ساتھ ظاہر ہوگی۔ روز جزا کے علاوہ دوسرے اوقات میں اس کی حکمت نے تقاضا فرمایا کہ ملک و ملک میں دوسروں کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔ تا کہ کارخانہ عمل درست رہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جبلی طور پر آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی گئی ذمہ داری اور اس کے احکام کو قبول کرنے کیلئے مستعد ہے۔ اسی لئے اسے اسی کام کیلئے پیدا فرمایا گیا۔ تو اگر بعض چیزیں اس کی ملک میں نہ ہوں۔ اور بنی نوع انسان میں سے بعض پر اس کا حکم جاری نہ ہو تو اس سے اچھے یا برے عمل کا تصور کس طرح ہوگا خصوصاً ایسے اعمال میں جو کہ مال' حیوانات کو ذبح کرنے' خیرات دینے اور خرچ دینے سے متعلق ہیں۔ اسی طرح وہ اعمال جن کا تعلق رعایا کی اصلاح اور غلاموں کے معاملات سے ہے اس کی حکمرانی کے بغیر ان کا تصور نہیں ہو سکتا۔ پس ذمہ داری سونپنے کی حکمت کے تقاضا کی بنا پر اس دنیا میں اسے بھی بادشاہی اور ملکیت عطا فرمائی گئی تا کہ وہ قیامت میں اپنی بے مائیگی اور ناداری کا بہانہ نہ بنا سکے۔ اور من کل الوجوہ اس کی حجت ختم ہو جائے۔ رہا جزا کا دن تو وہ ان اعمال کے بدلے کا وقت ہے۔ اس لئے اس وقت کسی کو مالک ہونے یا حکم چلانے کا حق نہ دیا گیا۔ ورنہ جزا کا مفہوم ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی حکمت کی وجہ سے یہاں یوم الدین فرمایا جس کا معنی ہے یوم جزا' یوم قیامت' یوم البعث والنشور اور ان

کے علاوہ جو یوم قیامت کے نام ہیں ذکر نہ ہوئے تا کہ اس دن ذات پاک کے ساتھ ملک اور ملک کے مختص ہونے اور اس دن کے علاوہ باقی ایام میں ذات پاک کے ساتھ ان کے مختص نہ ہونے کی وجہ کی طرف اشارہ ہو جائے۔

نیز جاننا چاہئے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے تو حمد کو اسم ذات کے ساتھ متعلق فرمایا۔ اس کے بعد تین صفات لائی گئیں۔ پہلی صفت ربوبیت' دوسری رحمت اور تیسری صفت جزا دینا اور ان تینوں صفات کو یہاں لانے میں ایک دقیق نکتہ ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں جو شخص کسی کی تعریف کرتا ہے تین چیزوں سے باہر نہیں ہوتا۔ یا تو ماضی میں اس کا نمک خوار رہا ہے۔ اگرچہ اب اس سے کوئی نفع نہیں لیتا۔ اور نہ ہی آئندہ کسی فائدہ کی توقع ہے۔ یا اب بالفعل اس سے فائدہ لیتا ہے۔ اگرچہ ماضی میں اسی سے کوئی نفع تھا اور نہ ہی آئندہ کسی فائدہ کی امید ہے۔ یا یہ کہ اس سے کسی نفع کی امید ہے۔ اگرچہ مستقبل میں ہو۔ اور فی الحال اس سے کوئی نفع نہ لیتا ہو۔ اور دینی اور دنیوی کاموں میں ان تینوں چیزوں کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔ پس ان تینوں صفات کے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر بندے مروت کی راہ چلیں اور گزشتہ نعمتوں کو دیکھ کر اپنے خدا تعالیٰ کی حمد کریں تو درست ہے۔ کیونکہ میں ربوبیت کی صفت رکھتا ہوں۔ ماضی میں ان پر میں نے بے شمار نعمتیں انعام فرمائی ہیں۔ اور اگر موجودہ نعمتوں پر نظر کریں تو یہ بھی تقاضائے وقت کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ میں رحمٰن ورحیم ہوں۔ اور اگر آخرت کو دیکھیں اور دور اندیشی اختیار کریں تب بھی حمد میری شان کے لائق ہے۔ کیونکہ جزا کا کارخانہ مجھ ہی سے وابستہ ہے۔ اور ہر حقیر سے حقیر شے کا حساب میری ہی بارگاہ میں ہوگا۔ پس ہر صورت میں حمد وثنا میرے ہی لائق ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ

ابھی تک کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی صفت وثنا میں مشغول تھا اس سے غائب تھا۔ کیونکہ اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی طرف' اپنی طرف اور دوسری کائنات کی طرف متوجہ تھی جو کہ اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے۔ اور اب جب اس نے اس کی صفات کو خوب خوب ملاحظہ کر

لیا تو غیب سے مقام حضوری میں آ گیا۔ اور نعمت عطا فرمانے والے کی طرف متوجہ ہوا اور مخاطب ہونے کا مرتبہ پایا تو ناچار لفظ اِیَّاكَ نَعْبُدُ استعمال کیا۔ یعنی ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔ اور عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ تعظیم کے انتہائی مرتبوں کو بجالایا جائے۔ اور شرع شریف میں اس کی بے شمار قسمیں ہیں۔ بعض ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور بعض باطن سے' جو ظاہر سے متعلق ہیں وہ یہ کہ زبان سے یاد کرنا' تلاوت قرآن پاک' تسبیح وتہلیل اور دوسری دعائیں پڑھنا اور دعا کرنا۔ اور جن کا تعلق آنکھ سے ہے۔ پس مقامات خیر کو دیکھنا جیسے کعبہ شریف' قرآن پاک اور بزرگوں کی زیارت کرنا۔ جیسے انبیاء علیہ السلام' اولیاء۔ اور شہداء واولیاء کے مزارات کی زیارت کرنا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگادی اور اپنے قیمتی اوقات کو اس کی یاد میں بسر کیا۔ اور اس کی مخلوقات فلک' ستارہ' دریا' کشتی وغیرہ کو دیکھنا تاکہ اس کی قدرت وحکمت پر دلیل ہوں۔ اور کان سے قرآن پاک سننا' ذکر سننا اور ان چیزوں کو سننا جن سے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھے۔ اور اس کی اطاعت کا شوق زیادہ ہو۔ اور ہاتھ سے قرآن پاک اور اسماء حسنیٰ لکھنا اور پاؤں سے مسجد' حج' بزرگوں کی زیارت' دشمنان دین سے جہاد اور ناتوانوں کے کام سرانجام دینے کو چلنا۔ اور جو باطن سے متعلق ہیں۔ پس اس کی نشانیوں' قرآن پاک کے معانی اور شریعت کی حکمتوں میں غور وفکر کرنا۔ اور یہ سب عقل کی عبادت ہے۔ رہی نفس کی عبادت تو اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اپنی پسندیدہ چیزوں کو ترک کرنے پر صبر کرنا۔ جیسا روزہ واعتکاف اور مصیبتوں پر صبر کرنا اور جزع فزع چھوڑنے پر صبر کرنا اور حرام چیزوں اور نافرمانیوں سے صبر کرنا۔ رہی دل کی عبادت تو اللہ تعالیٰ کے محبوبوں سے محبت' اس کے دشمنوں سے بغض رکھنا۔ اس کے ثواب کی امید رکھنا اور اس کے عذاب سے ڈرنا۔ روح کی عبادت اس کے مشاہدہ میں کوشش کرنا اور اس کے مراقبہ سے انس ولذت پاتا ہے۔ اور سر کی عبادت اس کی معرفت میں غرق ہونا ہے۔ اور جو مال سے متعلق ہے تو زکوٰۃ' صدقہ اور خیرات علیٰ ہذا القیاس' یہاں سے معلوم ہوا کہ عبادت درحقیقت اپنے تمام اعضائے ظاہر اور قوائے باطن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور اس کی رضا میں مصروف کردینے کا نام ہے۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

یعنی اور ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ اور یہ لفظ اس لئے لائے گئے تا کہ عبادت کرنے کی نسبت اپنی طرف کر کے دل میں تکبر پیدا نہ ہو جائے۔ پس گویا وہ کہہ رہا ہے کہ تیری عبادت تجھ سے مدد مانگے بغیر ممکن نہیں۔ نیز دنیا میں تین گروہ ہیں۔ جبری کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی اختیار نہیں۔ اور پتھر اور لکڑی کی طرح ہم سے بے اختیار حرکات صادر ہوتی ہیں۔ قدری کہتے ہیں کہ ہم پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اور ہماری حرکات واعمال ہم سے ہماری ایجاد سے صادر ہوتے ہیں۔ اور یہ دونوں گمراہ مردود اور غیر پسندیدہ طریقے پر ہیں۔ کیونکہ پہلا گروہ احکام شرعیہ اور دینی ذمہ داریوں کو باطل کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ کارخانہ خالقیت میں شرکت کا دعویٰ کرتا ہے۔ پس یہ دونوں الفاظ ان دونوں گروہوں کے عقیدہ کے رد کیلئے لائے گئے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ عقیدہ جبر کا رد ہے۔ جبکہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ عقیدہ قدر کو رد کرتا ہے۔ اور سیدھی راہ تیسرے گروہ کو نصیب ہوتی جو کہ سنی ہیں جو کہ کہتے کہ اے رب کریم' ہم تیری بندگی کرتے ہیں۔ اور اس کی توفیق تجھ سے مانگتے ہیں۔

اور بعض اہل معرفت نے یوں فرمایا کہ اس جگہ استعانت کا معنی مدد طلب کرنا نہیں۔ بلکہ طلب عین اور معائنہ مراد ہے۔ یعنی عبادت کرنا ہماری طرف سے ہے۔ اور معائنہ کا مرتبہ دینا اور عین الیقین تک پہنچانا تیرا کام ہے۔ شیخ سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ ایک دن شام کی نماز میں امامت کر رہے تھے جب اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہوش میں آنے پر آپ سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ جب میں نے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہا مجھے ڈر لگا کہ کہیں مجھے یہ فرما دیا جائے کہ اے جھوٹ بولنے والے تو طبیب سے دوائی' امیر سے روزی اور بادشاہ سے امداد کیوں مانگتا ہے۔ اسی لئے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ آدمی کو اس سے شرم کرنی چاہئے کہ دن رات میں پانچ دفعہ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہو کر جھوٹ بولے۔

غیر اللہ سے استمداد کی حقیقت اور تائید

لیکن یہاں یہ سمجھنا چاہئے کہ غیر سے اس طرح مدد مانگنا کہ اسی پر اعتماد کرے۔ اور

اسے اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر نہ سمجھے حرام ہے۔ اور اگر توجہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ اور اسے مدد کے مظاہر میں ایک مظہر سمجھتے ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اسباب اور حکمت پر نظر کرتے ہوئے اس غیر سے ظاہری طور پر امداد مانگے تو یہ عرفان سے دور نہیں۔ اور شرع شریف میں بھی جائز ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء نے اس قسم کی امداد دوسروں سے مانگی ہے۔ اور حقیقت میں یہ غیر سے نہیں۔ بلکہ حضرت حق تعالیٰ ہی سے استمداد ہے۔

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ

ہمیں سیدھی راہ دکھا۔ جاننا چاہئے کہ اگر چہ ایک آدمی بعض امور میں راہ راست پر ہوتا ہے۔ لیکن اسے راہ راست کی طلب سے چارہ نہیں۔ کیونکہ ہر مرتبہ کمال کے بعد اس کے اوپر اور مرتبہ ہے۔ نچلے مرتبہ والا اوپر مرتبہ کے راہ راست کا طالب ہوتا ہے۔ اسی طرح آگے تک جس کی کوئی حد نہیں' راستے کا سیدھا ہونا چند وجہ سے ہوسکتا ہے۔ پہلے تو راہ کا قریب ہونا۔ کیونکہ نزدیکی راہ' دور کی راہ سے زیادہ سیدھی ہوتی ہے۔ دوسرے سفر کا صاف ہونا اور پتھر' مٹی اور کانٹوں وغیرہ کا نہ ہونا اور انہیں معنوں میں کہا ہے جس نے کہا کہ سیدھی راہ چلو اگر چہ دور ہو' تیسرے ڈاکوؤں' درندوں' آب و دانہ نہ ملنے اور دوسری ایذا دینے والی چیزوں سے امن میں ہونا۔ اور تینوں معنوں سے راہ کا درست ہونا مطلب تک پہنچنے کے لئے شرط ہے۔ اور اگر کوئی شخص ایک معنی سے راہ راست پر ہو اسے لازم ہے کہ وہ باقی دو معنوں سے بھی راستی طلب کرے' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خاص قصد کے ساتھ توجہ کرنے' ذکر کی وجہ سے نفسانی رکاوٹوں کو دور کرنے اور مشاہدہ میں استغراق کرنے کی راہ' عبادت اور انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی آیات میں غور و فکر کی راہ کی نسبت زیادہ قریب ہے۔ اور شریعت کی پیروی کی راہ' قصد خاص کے ساتھ نری توجہ کرنے سے زیادہ پر امن ہے۔ اور رخصت پر عمل اور شریعت کے آسان احکام کی تعمیل کی راہ رہبانیت و تشدد کی راہ سے زیادہ صاف ہے۔

استقامت کی تین اقسام

نیز استقامت کی یہی تین قسمیں ہیں۔ استقامت اقوال' استقامت افعال اور

استقامت احوال اور ایک قسم کی استقامت والے کو باقی استقامتوں کی طلب بھی لازم ہے۔ پس ابتداء والوں' انتہا والوں اور درمیان والوں میں سے کوئی شخص بھی راہ راست کی طلب سے بے نیاز نہیں ہے۔ اور اسی لئے مناجات کے وقت اس دعا کو اختیار کر کے بندوں کو تعلیم دی گئی ہے۔ اور استقامت بمعنے اعتدال اور کمی زیادتی سے بچنا ہر باب میں پسندیدہ ہے۔ مثلاً عقائد کے معاملہ میں جو شخص تشبیہ میں مبالغہ کرتا ہے۔ اور اپنے معبود کو مخلوقات کے رنگ میں خیال کرتا ہے کہ کسی مکان یا سمت میں مقید اور اسباب کا محتاج ہے تو اس کا مذہب باطل ہے۔ اور اس کو تفریط لازم ہوئی۔ اور جس نے تنزیہہ میں مبالغہ کیا۔ اور اپنے معبود کو معطل سمجھتا ہے اس نے افراط کی راہ اختیار کی۔ اور اسی طرح دوسرے عقائد کے بارے میں قیاس کرے۔ اخلاق میں توسط یہ ہے کہ بولنے کی قوت کو اس کے افراط یعنی یاوہ گوئی سے محفوظ رکھے۔ اور تفریط سے جو کہ جہالت ہے پرہیز کرے اسی طرح قوت شہویہ کو بدکاری سے جو کہ اس کی افراط ہے۔ اور بے حمیتی سے جو کہ اس کی تفریط ہے محفوظ رکھے۔ اسی طرح قوت غضبیہ کو بے جا جرأت اور بزدلی سے بچائے تا کہ اس کا مرتبہ اعتدال جو کہ شجاعت ہے حاصل ہو۔ اور اعمال میں بھی استقامت اور اعتدال مطلوب ہے۔ کیونکہ اعمال کی کثرت روح اور اس کے لطائف کے روشن کرنے کے سبب سے ہوتی ہے۔ اور یہ تاثیر ہیشگی کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اور ہیشگی' اعتدال کے بغیر ممکن نہیں۔

اور جب بندہ کو تعلیم دی گئی کہ راہ راست کی ہدایت طلب کرے تو لازم ہوا کہ ان لوگوں کا ذکر ہو جن کے واسطہ سے راہ راست بندوں تک پہنچی اور ان کے اعمال دیکھ کر اور اقوال سن کر سیدھی اور ٹیڑھی راہ میں تمیز واضح ہوئی۔ ورنہ تو مختلف مذاہب کا ہر شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں راہ راست پر ہوں۔ پس اپنے ذہن میں ایسی جماعت کا تعین کر لینا چاہئے جو کہ راہ راست کو بیان کرنے والی ہے لہٰذا اس طریقہ سے راہ راست کے بیان کی تعلیم دی۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ اور اس لفظ کی قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر چار گروہوں سے تفسیر فرمائی جو کہ انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ سیدھی راہ انہیں چار گروہوں کی راہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات کے وقت بندے کو چاہئے کہ ان چاروں گروہوں کو اجمالی طور پر نظر میں رکھے۔ اوران کی راہ طلب کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں سورۃ نساء میں فرمایا وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا یعنی جس نے اللہ اور رسول علیہ السلام کی اطاعت کی۔ اور دونوں کے حکم پر عمل کیا۔ پس وہ ان لوگوں کے ساتھ چلتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ اور وہ چار گروہ ہیں انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین اور یہ گروہ بہترین رفیق ہیں۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں راہ حق ڈھونڈنا ہے۔ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں رفیق طلب کرنا ہے کہ پہلے ساتھی پھر راستہ۔

اہل اللہ سے توسل کی وجہ

یہاں جاننا چاہئے کہ عوام مومنین کو نیکوں کا ساتھ طلب کرنا چاہئے۔ اور نیکوں کو شہیدوں کی شہیدوں کو صدیقوں کی۔ اور صدیقوں کو انبیاء علیہم السلام کی رفاقت طلب کرنا چاہئے۔ اگر عوام مومنین میں سے کوئی انبیاء علیہم السلام کی رفاقت چاہے اسے ان تینوں گروہوں کی درجہ بدرجہ رفاقت کے بغیر چارہ نہیں۔ جس طرح کہ اگر کوئی بادشاہ کی رفاقت چاہئے تو بغیر کسی جماعت دار کی رفاقت کے جو کہ کسی رسالہ دار کی رفاقت میں ہو۔ اور وہ کسی امیر کی رفاقت میں ہو ممکن نہیں۔ اسی لئے اہل اللہ کے راستہ میں داخل ہوتا اوران سے وسیلہ ڈھونڈنا اہل اسلام کے ہاں پسندیدہ ہے۔ اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ جب اصل راہ راست حضرات انبیاء علیہم السلام کو عالم غیب سے تعلیم فرمائی گئی اوران سے صدیقوں کو اور صدیقوں سے شہیدوں کو اور شہداء سے صالحین کو یہ تعلیم پہنچی تو لازم ہوا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کی معرفت ضروری ہے۔ اوراس کے بعد ان تینوں گروہوں کی پہچان ہوتا کہ ان کی رفاقت کی طلب حاصل ہو۔

نبی کی معرفت اس کی ضرورت

پس نبی علیہ السلام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہوتا ہے۔ اور ہر انسان کی دو

قوتیں ہوتی ہیں۔قوت نظریہ کہ اس سے چیزوں کی پہچان کرسکتا ہے۔قوت عملیہ کہ اس کی وجہ سے اس سے اچھے اور برے کام صادر ہوتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ اس انسان کو کسی بشری تربیت کے واسطہ کے بغیر اس طرح کامل فرماتا ہے کہ نور القدس کا اثر اس کی قوت نظریہ میں اس طرح واقع ہوتا ہے کہ اس کی معلومات میں کسی قسم کی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی اور اس کی قوت عملیہ میں وہ ملکہ پیدا فرماتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس سے اعمال صالحہ پوری رغبت سے صادر ہوتے ہیں۔اور برے کاموں سے پوری نفرت کے ساتھ محفوظ رہتا ہے۔ اور جب اس کی بدنی قوتیں حد کمال کو پہنچتی ہیں۔اور تجربہ کی عقل انتہا کو پہنچتی ہے تو اسے مخلوق کی تکمیل کیلئے مبعوث فرماتا ہے۔اور پھر معجزات کے ساتھ اس کی تصدیق فرمائی جاتی ہے۔اور معجزہ کبھی تو اقوال کی جنس سے ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید اور کبھی افعال کی جنس سے جیسے انگلیوں سے پانی جاری کرنا اور معجزات کے ساتھ ساتھ اسے عقلی نشانیاں بھی دی جاتی ہیں جو کہ خاص قسم کے لوگوں کے ایمان لانے کا موجب بنتی ہیں۔ جس طرح کہ معجزات عوام کے ایمان لانے کا سبب بنتے ہیں۔اور آیات عقیلہ چند قسم کی ہوتی ہیں۔ان میں سے اخلاق کریمہ ہیں۔اور ان میں سے سچے علوم ہیں۔ نیز اطمینان بخش بیان، واضح دلیل اور انوار صحبت بھی ان ہی میں سے ہیں۔اور جبکہ ہمت لوگ معجزات سے استدلال کرتے ہیں تو کامل لوگ کمالات سے استدلال کرتے ہیں خصوصاً جب ان سے روحانی بیماریوں کے علاج، ناقص نفوس کی تکمیل اور صحبت میں بیٹھنے والوں پر انوار کی شعاعوں کے فیضان کا مشاہدہ ہوتا ہے تو ان کی نبوت پر پختہ یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام بعض اوقات ایسی چیز کو بیان کرتے ہیں کہ عقل بھی اسے تسلیم کرتی ہے۔جیسا کہ حضرت حق جل مجدہ کا وجود اور اس کی صفات وکمال اور بعض اوقات ایسی چیز بیان فرماتے ہیں کہ مستقل طور پر عقل اسے نہیں سمجھ سکتی۔ جیسا کہ بندوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کے ہر روز کے احکام۔ اعمال صالحہ پر ثواب اور برے اعمال پر عذاب کی تفصیلات کا بیان اور ایسے افعال کے حال کا بیان جو کبھی اچھے ہوتے ہیں۔اور کبھی برے تو اگر انبیاء علیہم السلام کے ہمراہ معجزات اور آیات عقلیہ کی تصدیق نہ ہو تو صرف عقل خصوصاً عوام کی عقل

ان کی باتوں پر یقین نہ کرے۔ اور بعثت کا فائدہ ثابت نہ ہو۔ اور جب بقدر ضرورت نبی علیہ السلام کا مفہوم سمجھ لیا گیا تو اب صدیق کا معنی سمجھنا چاہیے۔

صدیق' شہید اور صالح کا معنی

صدیق وہ ہے کہ جس کی قوت نظریہ' انبیاء علیہم السلام کی قوت نظریہ کی طرح کامل ہو۔ اور شروع عمر سے ہی جھوٹ بولنا اور دو رُخی بات کرنا اس کی شان کے لائق نہ ہو۔ اور دینی معاملات میں اس سے پورا اخلاص ظاہر کہ اس میں نفس کا قطعاً کوئی حصہ نہ ہو۔ اور صدیق کی علامات میں یہ ہے کہ وہ اپنے ارادہ میں پختگی رکھے۔ اور دوران نماز چاہے کتنا ہی سخت حادثہ پیش آ جائے دائیں بائیں توجہ نہ کرے۔ اور س کا ظاہر و باطن برابر ہو۔ اور کسی پر لعنت نہ کرے۔ اور خواب کی تعبیر کا علم خوب رکھتا ہو۔

شہید وہ ہے جس کا دل مشاہدہ سے موصوف ہو۔ اور انبیاء علیہم السلام نے اسے جو کچھ پہنچایا ہے اس کا دل اسے اس طرح قبول کرے کہ گویا دیکھ رہا ہے۔ اسی لئے دین کی خاطر جان دینا اس کیلئے آسان کام ہوتا ہے۔ اگرچہ ظاہراً وہ قتل نہیں کیا گیا۔ اور اس کی قوت عملیہ مرتبہ کمال میں انبیاء علیہم السلام کی قوت کے قریب ہوتی ہے۔ اور صالح وہ ہے جس کی دونوں قوتیں انبیاء علیہم السلام کے مرتبہ کمال سے نیچے ہوں۔ لیکن کمال پیروی کی وجہ سے اس نے اپنے ظاہر کو گناہوں سے پاک کر لیا ہو۔ اور اپنے باطن کو اعتقادات فاسدہ اور برے اخلاق سے دور رکھ کر یاد حق کے ساتھ اس طرح معمور کیا ہو کہ اس میں کسی دوسری چیز کی گنجائش باقی نہ رہی ہو۔ اور ولی کا نام اگرچہ ان تینوں گروہوں کو شامل ہے۔ لیکن یہ لفظ زیادہ تر صالحین پر بولا جاتا ہے۔

ان چار گروہوں کی علامات ان کے توسل سے حاجت روائی

اور نشانیوں میں سے جو چیز ان چاروں گروہوں یعنی انبیاء علیہم السلام' صدیقوں' شہیدوں اور صالحین کو شامل ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دوست رکھتا ہے۔ اور ان کے رزق کی اس طرح کفالت فرماتا ہے کہ تمام لوگوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور اپنے دشمنوں

سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔اور سفر میں خود ان کا انیس ہوتا ہے۔اور ان کے دلوں میں عزت کا ایسا احساس عطا فرماتا ہے کہ اس کی وجہ سے یہ نفوس قدسیہ بادشاہوں۔اور سرداروں کی خدمت پر راضی نہیں ہوتے۔اور ان کی ہمت بلند فرمادیتا ہے۔پس یہ اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ دنیا کی نجاستوں سے آلودہ ہوں۔اور ان کے دلوں کو منور فرمادیتا ہے۔پس انہیں ایسی چیزوں کا علم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ ارباب نظر وفکر۔اپنی طویل عمروں میں شدید کوشش کے بغیر انہیں نہیں جان سکتے۔اور ان کے سینوں کو اس قدر فراخ فرمادیتا ہے کہ دنیوی مشقتوں' مصیبتوں سے' قریبیوں کے مرنے اور دیگر تکالیف اور سختیوں کی وجہ سے دل تنگ نہیں ہوتے۔نیز انہیں ایسا رعب عطا فرماتا ہے کہ سرکشوں اور ظالموں کے دلوں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔اور ان کی گفتگو' ان کے انفاس وافعال میں ان کے مکانات' ان کے ہم نشینوں' ان کی اولاد اور نسل میں اور ان کی زیارت کرنے والوں میں پے در پے برکت ظاہر فرماتا ہے۔اور اپنی بارگاہ میں انہیں ایسا مرتبہ بخشتا ہے کہ ان کی دعا مقبول ہوتی ہے۔بلکہ جو کوئی کسی حاجت میں ان کا وسیلہ اختیار کرے اس کی حاجت پوری فرمادیتا ہے۔اور وہ خصوصیتیں اور علامات جو کہ انہیں عالم برزخ' میدان قیامت اور عالم ملکوت میں دی جاتی ہے۔اور وہ اس قبیل سے نہیں کہ عوام ان سے استدلال کرسکیں مگر اس وقت جبکہ وہ ان جہانوں کا مشاہدہ کریں گے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور یہاں ایک شبہ طاری ہوتا ہے جس کی وجہ سے صراط مستقیم اور غیر مستقیم مشتبہ ہو جاتے ہیں۔اور ان میں تمیز نہیں رہتی۔اس کی تفصیل یوں ہے کہ بعض گروہ اپنے آپ کو صراط مستقیم والے ان گروہوں میں سے ایک کی طرف منسوب کرتے ہیں۔اور اپنے آپ کو اس بزرگ سے فیض پانے والا سمجھتے ہیں۔حالانکہ اس راہ کو چھوڑ کر وہ شیطانی راستہ پر گامزن ہوتے ہیں۔پس اس نسبت سے ان کا ٹیڑھا راستہ لوگوں کو صراط مستقیم نظر آتا ہے۔جبکہ حقیقت میں اس کا صراط مستقیم سے کوئی تعلق ہی نہیں۔جیسے یہود ونصاریٰ جو کہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما السلام کے پیروکاروں میں سے خیال کرتے ہیں۔

حالانکہ وہ ان دونوں بزرگوں کی راہ سے مشرق و مغرب کی دوری پر ہیں۔ اور ہماری امت میں شیعہ فرقہ اپنے آپ کو ائمہ اہل بیت کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ حالانکہ ان میں ان بزرگوں کے عقائد' اعمال اور اخلاق کی بو تک نہیں۔ اور اسی طرح مداریہ' جلالیہ اور دوسرے آزاد منش اور بے دین لوگ جو کہ اپنے آپ کو سہروردی' قادری اور چشتی کہتے ہیں۔ جبکہ اپنے اعمال واشغال میں ان سلاسل والوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ پس اس الجھن کو دور کرنے کیلئے ایک اور عبادت لائی گئی۔ فرمایا

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

یعنی نہ وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا ہے۔ اور نہ گمراہ۔ گویا تعلیم فرمائی گئی کہ سیدھی راہ کی طلب میں احتیاط کرنا چاہئے۔ اور گمراہوں۔ اور خدا کا غضب پانے والوں کی راہ کو صراط مستقیم نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو صراط مستقیم والوں' نبیوں' ولیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں بلکہ اس طلب میں اس خراب راستہ سے بچاؤ زیر نظر رہنا چاہئے۔

غضب کی حقیقت

اور غضب' آدمی میں ایسی کیفیت ہے کہ اس کی وجہ سے خون دل جوش کرتا ہے۔ اور روح حیوانی اس کے برے اثر اور قہریت کو دور کرنے کیلئے بدن کے خارج کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور یہ معنی حق تعالیٰ کی ذات پاک میں محال ہے۔ اور غضب الٰہی کی حقیقت یہ ہے کہ مغضوب کے حق میں اسباب حکمت کو کمزور کر دیتا ہے۔ تاکہ اپنی انتہا کو نہ پہنچنے پائے اور غضب کی ابتداء کفران نعمت ہے۔ اور اس کا اثر لعنت و مذمت ہے۔ اور اس کے مقابل رضا ہے کہ اس کی حقیقت' اسباب حکمت کو اس کی انتہا تک پہنچانا ہے۔ اور اس کی ابتداء شکر ہے۔ اور اس کا اثر ثناء و عطا ہے۔

ضلال کی حقیقت

ضلال ایسی راہ کو اختیار کرنا ہے جو کہ مطلب تک نہ پہنچائے اور یہ اختیار کرنا کبھی غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے جسمانی لذت کو روحانی لذت پر ترجیح دینا۔ اسی لئے بچے

کے نزدیک کھیل کوڈ بادشاہی سے بہتر ہے۔ اور کبھی شبہ اور غلط فہمی کی وجہ سے جو کہ اسے پیش آتی ہے نفس کے اپنی خواہش پر مطمئن ہونے کی وجہ سے اختیار کرتا ہے۔ جس طرح کہ لوگ کہتے ہیں کہ ادھار سے نقد بہتر ہے۔ اور دنیا نقد ہے۔ اور آخرت ادھار۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ دس روپے ادھار ایک روپیہ نقد سے بہتر ہے۔ جبکہ یہ ادھار یقینی ہو۔ اور انبیاء و اولیاء اور علماء کے نزدیک آخرت یقینی ہے۔ اور اگر کم ہمت لوگ کہیں کہ ہمارے نزدیک آخرت یقینی نہیں ہے تو ہم کہیں گے کہ تم پر انبیاء و اولیاء کی تقلید لازم ہے۔ اگرچہ تمہیں اس میں شک ہو۔ کیونکہ مریض دوا کی تلخی پر یقین رکھتا ہے۔ اور شفا میں اسے شک ہوتی ہے۔ لیکن اس پر طبیب کی تقلید واجب ہے۔ اور کبھی یہ اختیار کرنا خواہش نفس کے دل پر غالب آنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور وہ غلبہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اچھا عمل کرنے سے تنگدل ہوتا ہے۔ اور برا کام کرنے سے اس کا دل خوش ہوتا ہے۔ اور یہ بیماری بہت خطرناک ہے۔ کیونکہ یہ بیماری باقی رہے تو رین (زنگ) کی حد تک پہنچا دیتی ہے کہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کی کمائی نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا۔ اس کے بعد نوبت غشاوۃ (پردہ) تک پھر طبع پھر ختم اور پھر قفل تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر دل کی موت کا مرتبہ ہے کہ اس کے بعد نہ آیات نفع دیتی ہیں نہ ہی ڈر سنانے والے۔

اور اس کے برعکس اگر نفس خوشی کے ساتھ نیکیوں پر صبر کرے تو انشراح صدر حاصل ہو گا۔ پھر تقویٰ کیلئے دل کے امتحان کی حد حاصل ہوتی ہے۔ پھر نزول سکینہ کا مرتبہ ہے۔ اور جب یہ مرتبہ انتہا کو پہنچتا ہے تو عصمت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ دو لفظ یعنی غضب و ضلال اس لئے لائے گئے کہ صراط مستقیم سے پھر جانا دو قسموں سے ہوتا ہے پہلی قسم کا سبب غضب قرار دیا گیا اگرچہ نوبت کفر تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ اور دوسری قسم کو گمراہی کا حکم دیا گیا خواہ حد کفر تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ پس مغضوب علیہ وہ ہے جو کہ کفر کو لازم کرلے اور دیدہ دانستہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے یا جان بوجھ کر گناہوں کا مرتکب ہو۔ جس طرح کہ یہودیوں کے متعلق مذکور ہے اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ

فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں۔ جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور ان میں کا ایک گروہ البتہ حق کو چھپاتا ہے جان بوجھ کر) اور یہ بھی فرمایا وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ اور تحقیق انہیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا خریدا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ نیز فرمایا ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون اور حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ۔ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔

اور ضال وہ ہے جو کہ فکر وفہم میں کمی کی وجہ سے یا اپنے آباؤ واجداد اور بڑوں کی تقلید میں کفر میں پڑ جائے چنانچہ نصاریٰ کے متعلق فرمایا اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا۔ اور خود سیدھی راہ سے گمراہ ہو گئے۔ یا ضال وہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور عفو پر اعتماد کی وجہ سے یا بے موقع ومحل کسی نیکی کا قصد کرنے کی وجہ سے معصیتوں میں گر جائے جیسے اس شخص کو شراب پلانا جو کہ نشہ کی وجہ سے بے تاب اور بے قرار ہے۔ علی ہذا القیاس

لطائف سورۂ فاتحہ

جب ہم سورۃ فاتحہ کی تفسیر سے فارغ ہوئے تو لازم ہوا کہ اس سورت سے متعلق چند لطائف اور نکات بیان ہو جائیں۔ جاننا چاہیئے کہ قرآن پاک کے لطائف اور نکات کا علم ایسا علم ہے کہ اس کی حد نہیں۔ ہر روز ترقی میں ہے۔ کیونکہ ہر صاحب فن اس فن کے متعلق اپنے حوصلہ اور استعداد کے مطابق قرآن مجید سے اس کا استفادہ کرتا ہے۔ پس اس علم کا من کل الوجوہ حاصل کرنا دنیا میں ممکن نہیں۔ اسی لئے تفسیر میں اس علم کے ذکر سے خاموشی اختیار کی گئی لیکن نمونہ کے طور پر اس سورت میں چند چیزیں بیان کی جاتی ہیں۔ اب سننا چاہیئے کہ اس سورت کے نکات ولطائف کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو کہ اس کی آیتوں سے علیحدہ علیحدہ تعلق رکھتی ہے۔ اور دوسری قسم وہ جو مجموعی طور پر پوری سورۃ سے تعلق رکھتی ہے۔

بسم اللہ کے لطائف ونکات

پس پہلی قسم وہ لطائف ونکات ہیں جو کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ساتھ متعلق ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام علوم اللہ تعالیٰ کی چار کتابوں میں درج ہیں۔ اور قرآن پاک ان تمام علوم پر حاوی ہے۔ اور علوم قرآن سورۃ فاتحہ میں اور سورۃ فاتحہ کے علوم بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں۔ اور بِسْمِ اللّٰہِ کے علوم حرف با میں۔ اس ابہام کی وضاحت یہ ہے کہ تمام علوم سے مقصود بندے کی حضرت حق جل مجدہ تک رسائی ہے۔ اور اس وجہ سے کہ بندہ طبعی نجاستوں سے ملوث ہونے کی وجہ بہت گہرائی میں واقع ہے۔ جبکہ حق سبحانہ و تعالیٰ کمال نزاہت وتقدس میں ہے تو اس تک بغیر اس کے اسماء حسنی کے ذکر کے رسائی ممکن نہیں۔ اور اس کے نام پاک کے ساتھ وابستگی اور اس کی یاد میں اس حد تک محویت ہو کہ ذکر' ذاکر اور مذکور ایک ہو جائیں۔ اور درمیان سے دوئی اٹھ جائے۔ اور جو چیز اس وابستگی پر دلالت کرتی ہے یہی حرف با ہے جو کہ ملانے اور چپکانے کیلئے وضع کیا گیا۔

نیز بچوں کی تعلیم کی ابتداء حرف الف سے کی جاتی ہے۔ اور کتاب اللہ کی ابتداء حرف با سے۔ اس لئے کہ الف لمبا اور اونچا ہونے کی وجہ سے رحمت الٰہی کا محل نظر نہ ہو سکا۔ جبکہ حرف ب اپنی انکساری اور عاجزی کی وجہ سے جناب کبریا میں مقبول ہوا۔ کہ من تواضع للہ رفعہ اللہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے تواضع کرے اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتا ہے۔ نیز عادت ہے کہ جب بادشاہ اپنے لئے کوئی سامان خریدتے ہیں تو اس پر مہر لگا دیتے ہیں۔ تاکہ اس میں چوروں کو طمع نہ رہے۔ اور جب جانوروں کو خاص شاہی اصطبل میں داخل کرتے ہیں تو انہیں داغ لگاتے ہیں۔ تاکہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ انہیں لوٹنے سے کوتاہ رہیں۔ پس جب بندے نے عمل اور طاعت کو شروع کیا تو چاہئے کہ اسے خدائی مہر کے نیچے کر دے۔ اور اس پر داغ لگا دے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا یہی مضمون ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علی نبیاء علیہ السلام جب کشتی پر سوار ہوئے تو اس کے ڈوبنے کے خوف سے پریشان تھے۔ بچاؤ کیلئے انہوں نے بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖھَا وَمُرْسٰھَا کہا تو ان کی کشتی ڈوبنے سے بچ گئی تو جب اس کلمہ کے نصف کی برکت سے نجات کا حصول ہوا تو

جو شخص ساری زندگی ہر کام کی ابتداء میں پورا کلمہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہمیشہ پڑھے وہ نجات سے کیسے محروم رہ سکتا ہے؟

کفن میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ رکھنے کی وصیت

بعض نے فرمایا کہ ایک عارف نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھوا کر وصیت فرمائی کہ اسے میرے کفن میں رکھ دینا۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا میں نے سنا ہے کہ ایک گدا نے ایک بہت بڑے اور اونچے دروازہ پر کھڑے ہو کر سوال کیا۔ اسے تھوڑی سی خیرات دی گئی۔ وہ چلا گیا۔ اور ایک تیشہ لا کر اس دروازہ کو گرانا شروع کر دیا۔ صاحب خانہ نے باہر آ کر پوچھا کہ کیا کرتا ہے۔ اس نے کہا یا تو دروازہ اپنی خیرات کے مطابق کر یا پھر خیرات اپنے دروازے کے مطابق کرے۔ جب یہ آیت کتاب اللہ کا دروازہ ہے۔ قیامت کے دن یہ میری مضبوط دست آویز ہے کہ اس کی وجہ سے معاملہ رحمت کی درخواست کروں گا۔

(اہل اللہ نے) فرمایا کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ۱۹ حروف ہیں۔ اور دوزخ پر ڈیوٹی والے فرشتے بھی ۱۹ ہیں۔ اس کے ہر حرف کی برکت سے ان میں سے ہر ایک کی طرف سے آنے والی تکلیف دفع ہو سکتی ہے۔

نیز فرمایا دن رات کے ۲۴ گھنٹے ہیں۔ پانچ گھنٹوں تو پانچ نمازیں مقرر فرمائی گئیں اور باقی ۱۹ گھنٹوں کیلئے یہ ۱۹ حروف دیئے گئے تا کہ ہر اٹھنے بیٹھنے اور حرکت و سکون میں ان ۱۹ گھنٹوں کو اللہ تعالیٰ کے اسی ذکر سے معمور کرے جو کہ ان ۱۹ حروف میں ہے۔

نیز فرمایا کہ سورۃ برأت کو جو کہ کفار کو قتل کرنے کے حکم پر مشتمل ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے خالی رکھا گیا۔ اور ذبح کے وقت بھی فرمایا کہ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہیں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نہ کہیں۔ کیونکہ ذبح کا وقت ایک صورت قہر ہے۔ اور رحمت اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ پس جو شخص اس رحمت بھرے کلمہ کو ہر وقت اور ہر آن یاد کرے یا کم از کم ہر روز نماز فرض میں ۱۷ بار اپنی زبان پر جاری کرے تو یقین ہے کہ وہ غضب اور عذاب سے محفوظ اور رحمت و ثواب کے ساتھ محظوظ ہو گا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ کی خصوصیت

اور اس آیت کی خصوصیتوں میں سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی بیت الخلاء میں جائے تو (داخل ہونے سے پہلے) بِسۡمِ اللّٰهِ کہے۔ تاکہ اس کے ستر اور جنوں کی نظر کے درمیان ایک پردہ واقع ہو جائے۔ اور جب یہ کلمہ ایک شخص اور اس کے دینوی دشمنوں کے درمیان حجاب ہوا تو اس شخص کے اور عذاب اخروی کے درمیان ہی پردہ ہوگا۔

لطائف اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ

اور وہ لطائف جو کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ سے متعلق ہیں یہ ہیں کہ یہاں تین چیزیں ہیں حمد، مدح، شکر۔ پس مدح زندہ یا غیر زندہ کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ باغ، بوستان، شہر، جواہر اور دوسرے جمادات کی مدح رائج اور مشہور ہے۔ اور حمد صرف زندہ کی ہوتی ہے۔ نیز مدح کبھی احسان سے پہلے ہوتی ہے۔ اور کبھی اس کے بعد اور حمد نہیں ہوتی مگر احسان کے بعد۔ نیز مدح کبھی ممنوع ہوتی ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے مداحوں کے منہ میں خاک ڈالو۔ اور حمد ہمیشہ جائز بلکہ مستحب ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو لوگوں کی تعریف نہیں کرتا اس نے اللہ تعالیٰ کی تعریف نہیں کی۔ اور شکر صرف اسی نعمت پر ہوتا ہے جو کسی کی طرف سے ملی ہو۔ اور حمد ایسی نعمت پر بھی ہوتی ہے جو دونوں صورتوں میں ہوتی ہے اس نعمت پر جو کہ مل چکی اور اس پر جو ابھی نہیں ملی۔ بلکہ کسی شخص کے ذاتی کمال پر بھی ہوتی ہے۔ پس ان صورتوں کے پیش نظر مدح اور شکر کے مقابلہ میں حمد کو اختیار فرمایا گیا۔

نیز اس مقام کا تقاضا تھا کہ بندے کی زبان سے احمد اللہ کہلوایا جائے یعنی میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں۔ لیکن آدمی بہر حال اس سے عاجز ہے کہ حمد الٰہی کی حد تک پہنچے۔ پس مناسب نہ ہوا کہ اسے اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دی جائے۔ بلکہ یہ عبارت کہلوائی گئی کہ الحمد للہ۔ یعنی کمال حمد اسی کا حق اور اسی کی ملک ہے۔ خواہ بندہ اس کی ادائیگی پر قادر ہو یا

نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے باری تعالیٰ کے حضور عرض کی یا ربّ کیف اشکرك میں تیرے شکر کی ذمہ داری سے کیسے عہدہ براں ہو سکتا ہوں؟ کیونکہ شکر کرنا بھی تو تیری توفیق و تعلیم سے ہی ہے۔ اور یہ ایک دوسرا انعام ہوا۔ اس پر اور شکر چاہئے۔ پس تسلسل لازم آیا۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: اے داؤد! جب تو نے اپنے آپ کو میرے شکر سے عاجز جانا تو تو نے میرا شکر ادا کر دیا۔ نیز اگر احمد اللہ کہا جاتا تو اس پر دلالت کرتا کہ یہ کہنے والا حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی حمد کرنے والے کی حمد سے پہلے محمود ہے۔ اس لئے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یعنی حمد وثنا اسی کے لائق ہے ازل سے ابد تک۔ حمد کرنے والا موجود ہو یا نہ ہو۔

اور وہ جو لوگ سوچتے ہیں کہ ہر صاحب نعمت۔ اس شخص کی طرف سے حمد کا مستحق ہوتا ہے جس پر اس نے نعمت کی ہے۔ مثلاً پیر' مرید سے استاذ' شاگرد سے۔ عادل بادشاہ' رعیت سے اور والدین' اولاد سے تو تمام حمد کس طرح اللہ تعالیٰ کا حق اور ملک ہوئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان صورتوں کے پردہ میں منعم حقیقی وہی ہے۔ اس لئے کہ ہر صاحب نعمت کے دل میں انعام کا ارادہ پیدا کرنا اور یہ نعمت اسے دینا اور اسے اس نعمت پر قابض کرنا کہ دوسرے کو بخشے اور جسے وہ نعمت پہنچی ہے اس کے فائدہ سے بہرہ ور کرنا اور اس کے فوت ہونے اور منقطع ہونے کے خوف سے بچانا اسی کا کام ہے۔ اور اسی لئے فرمایا گیا وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پس دوسرے تو درحقیقت خدمتگاروں اور بوجھ اٹھانے والوں کی طرح ہیں جو کہ مالک کے حکم سے کھانے کے برتن اٹھا کر کسی تک پہنچاتے ہیں۔ نعمت ان کی طرف منسوب نہیں ہے۔

نیز ہر مخلوق جو اپنے ہم جنس کو کوئی نعمت پہنچائے وہ لازماً اس نعمت کے عوض کی طلب رکھتی ہے۔ یا ثواب' یا اچھا نام' یا خلق سخاوت کا حصول' یا دفع بخل یا اپنے آپ سے جنسیت کی رقت کو دور کرنا۔ اور جو عوض کا طالب ہوا منعم نہ رہا۔ اور حقیقت میں وہ مستحق حمد نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کامل لذاتہ ہے کسی وجہ سے بھی طلب کمال اور دفع نقصان اس کے پیش نظر نہیں۔ کیونکہ تحصیل حاصل محال ہے۔ پس اس کا انعام صرف اور صرف جود ہے۔ اور اس کی

ذات کے سوا کوئی مستحق حمد نہیں۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں ایک اور شبہ ہے کہ ہر جگہ تسبیح کو تحمید سے پہلے لایا گیا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ ۔ اور اس سورۃ میں حمد کو پہلے کیوں لائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تسبیح کو تحمید پر اس وقت مقدم کیا جاتا ہے جہاں کلام میں دونوں مذکور ہوں۔ اور اس سورت میں صرف تحمید مذکور ہے۔ تسبیح کا ذکر ہی نہیں۔ البتہ صرف تحمید لانے کی کوئی وجہ ہونی چاہئے جو یہ ہے کہ تسبیح کا مضمون، تحمید کے مضمون میں داخل ہے۔ کیونکہ تسبیح کا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات تمام نقائص سے مبرا اور پاک ہیں۔ اور مضمون تحمید یہ ہے کہ بشر کے ذہن اور خیال میں جو کمال اور نعمت ہے وہ اسی ذات پاک سے ہے۔ اور جب اعتقاد کر لیا کہ تمام کمالات اور نعمتیں اسی کی ہیں تو اس سے لازم آیا کہ اس میں کوئی نقصان نہ ہو۔

(بزرگوں نے) فرمایا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے آٹھ حرف ہیں۔ جنتی دروازوں کی گنتی کے برابر۔ اور حمد کو دو چیزوں سے تعلق ہے پہلے زمانہ گزشتہ کے ساتھ کہ حمد کہنے سے گزشتہ نعمتوں کا شکر ادا ہوتا ہے۔ دوسرے مستقبل کے ساتھ کہ یہ کلمہ شکر ہے۔ اور شکر نعمتوں میں وسعت کا تقاضا کرتا ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ اگر تم شکر کرو گے تو میں نعمتیں اور زیادہ کروں گا۔ پس پہلے تعلق کی وجہ سے حمد کرنے والے پر جہنم کے دروازے بند ہو گئے۔ کیونکہ شکر ادا کرنے کی وجہ سے مواخذہ اور عتاب نہ رہا۔ اور دوسرے تعلق کی وجہ سے بہشتی دروازوں کے کھلنے کا مستحق ہو گیا۔

- عقلاء نے کہا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بہت بڑا کلمہ ہے۔ لیکن چاہئے کہ کسی موزوں مقام پر بولا جائے۔ تا کہ اچھی طرح اس کا ثمرہ حاصل ہو۔ حضرت سری سقطی قدس اللہ سرہ العزیز سے منقول ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا ہے اور اس کے بعد تیس سال ہو گئے ہیں کہ استغفار کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ بغداد میں آگ لگ گئی اور جس بازار میں میری دکان تھی سارا جل گیا۔ کسی نے میرے پاس آ کر کہا

کہ تمام دکانیں جل گئی ہیں لیکن تیری دکان بچ گئی۔ میں نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا۔ پھر جب میں نے سوچا تو پتہ چلا کہ یہ کلمہ مجھ سے دین اور مروت کے حق کے خلاف صادر ہوا۔ کہ مسلمانوں اور دوستوں کی مصیبت پر مجھے غم نہ ہوا اور اپنی تھوڑی سی منفعت پر میں نے خوشی کی۔ اسی لئے استغفار میں مشغول ہوں۔

مواقع حمد

اسی بنا پر بزرگوں نے فرمایا کہ دنیا کی نعمتوں پر حمد کے بجائے دینی نعمتوں پر حمد کرنا بہتر ہے۔ اور بدن کے اچھے اعمال پر حمد کی بجائے دل کے اچھے حالات پر حمد بہتر ہے۔ اور نعمتوں پر اس نسبت سے حمد کرنا کہ لذیذ ہیں۔ اور نفس کیلئے خوش کن ہیں اس سے بہتر وہ حمد ہے جو کہ اس حیثیت کی جائے کہ یہ نعمتیں محبوب حقیقی کے عطیات ہیں۔ پس یہ کلمہ کہنے میں ان مقامات کی رعایت کرنا چاہئے تا کہ موزوں مقام پر یہ کلمہ ادا ہو۔ اور منقول ہے کہ ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی روح ناف تک پہنچی تھی کہ انہیں چھینک آئی۔ آپ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہا اور قرآن مجید میں ہے کہ جنتیوں کے کلام کا آخر بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ہے۔ پس عالم انسانی کی ابتداء حمد پر مبنی ہے۔ اور اس کا خاتمہ بھی حمد پر مبنی ہوا۔ بندۂ خدا کو چاہئے کہ اپنے اعمال کے اول و آخر کو کلمۂ حمد کے ساتھ ملائے۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اس سورت کا نزول بندوں کی تعلیم کیلئے ہے۔ تا کہ مناجات الٰہی کے مقام پر یہ کلمات کہیں۔ پس چاہئے تھا کہ یوں فرمایا جاتا قولو االْحَمْدُ لِلّٰہِ لیکن قولوا کو چھپا کر رکھا اور صریحاً نہ فرمایا۔ ایسا ایک نکتہ کی وجہ سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر صریحاً فرمایا جاتا اور لوگ اس امر صریح کی تعمیل میں کمی کرتے تو سخت عتاب کے مستحق ہوتے۔ جس طرح باپ اگر اپنے بیٹے سے کہے کہ فلاں کام کر اور بیٹا اس کی تعمیل نہ کرے تو اس پر نافرمانی کا داغ لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے کہ باپ کہے فلاں چیز اچھی ہے یا فلاں کرنے کا کام ہے ایسی صورت میں تعمیل نہ کرنے کی صورت میں صریح نافرمانی نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ نے تقاضا فرمایا کہ بندوں کے سامنے تلقین کی صورت میں اپنی ثنا بیان فرمائی تا کہ حکم بندگی سے اس پر عمل کریں۔

متعلقات رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

اور وہ جو لفظ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے متعلق ہے یہ ہے کہ جو کچھ اس جہان میں دیکھا' سنا اور پایا جاتا ہے دو حال سے باہر نہیں۔ یا تو وہ واجب لذاتہ ہے۔ یعنی ایسا موجود جو کہ خود بخود موجود ہے۔ اور اس کا نہ ہونا محال اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ یا ممکن لذاتہ ہے کہ اس کی دونوں طرفیں یعنی وجود و عدم برابر ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے ایجاد کرنے سے موجود ہوتا ہے۔ پس اس قسم میں سے جو موجود ہے یا ہوگا اس کو عالم کہتے ہیں۔ اور عالم' علامت سے مشتق ہے۔ اور اس قسم کا نام عالم اس لئے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی علامت ہے۔ کیونکہ اس کے افراد میں سے ہر فرد کسی اسم یا صفت کا مظہر ہے۔ اور اس کی اجناس و انواع اسمائے کلیہ اور صفات اطلاقیہ کے مظاہر ہیں۔ اور جب افراد عالم کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی اسم خاص کا مظہر ہے۔ پس اس جہت سے جہاں غیر متناہی ہیں۔ رہے عالم کے اصول و کلیات تو جو کچھ شریعت میں مقرر ہے اس کے موافق بیان کئے جاتے ہیں۔

عالمین کی بحث

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو کچھ عالم موجودات میں ہے' ذات ہے یا صفات اور ذات وہ ہے کہ اپنے وجود میں کسی دوسری چیز کی محتاج نہیں۔ جیسے آسمان و زمین۔ اور صفت وہ شے ہے جو کہ اپنے وجود میں کسی دوسری چیز کی محتاج ہو جیسے رنگ' بو' مزہ وغیرہ اور معقولیوں کے عرف میں ذات کو جوہر کہتے ہیں۔ اور صفت کو عرض کا نام دیتے ہیں۔ اور ذات کی بھی دو قسمیں ہیں جسم اور روح۔ جسم وہ ہے جو کہ ایک معین مقدار اور شکل رکھتا ہے۔ اور وہ اس مقدار اور شکل کو نہیں چھوڑتا اور روح وہ ہے جس کی کوئی معین مقدار اور شکل نہیں۔ اور مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جسم کی بھی دو قسمیں ہیں۔ علوی۔ سفلی۔ علوی کی کئی قسمیں ہیں' عرش ہے' کرسی ہے' سدرۃ المنتہیٰ' لوح و قلم' معدن بہشت' معدن دوزخ' ستارے کچھ ثابت و قائم ہیں۔ اور کچھ چلتے ہیں۔ اور ساتوں آسمان۔

سفلی کی دو قسمیں ہیں بسیط جیسے عناصر اربعہ کہ زمین' پانی' ہوا اور آگ ہیں۔ مرکب

اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ کیونکہ تمام عناصر سے مرکب ہے یا بعض سے' پہلے کو کامل اور دوسرے کو ناقص کہتے ہیں۔ اور مرکب کامل تین عالم میں منحصر ہے عالم معدنیات' عالم نباتات' عالم حیوانات اور ان تینوں میں سے ہر ایک کئی عالموں پر مشتمل ہے۔ کہ اس کی تفصیل بہت طوالت چاہتی ہے۔ اور مرکب ناقص کی بھی تین قسمیں ہیں' بخارات یعنی آب دہوا غبار یعنی مٹی اور ہوا اور دھواں یعنی آگ اور ہوا اور ان تینوں میں سے ہر ایک سے بے شمار عالم پیدا ہوتے ہیں۔ پس صرف غبار سے اندھیاں اٹھتی ہیں۔ اور مختلف رنگوں کے بگولے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بخارات سے بارش برستی ہے۔ اور جب بخارات زیادہ اونچے چلے جاتے ہیں۔ اور سردی کے مقام پر پہنچتے ہیں تو منجمد ہو کر ژالہ اور برف پیدا ہوتی ہے۔ اور دھوئیں سے چمکنے والی بجلی اور گرنے والی بجلی اور شعلے اور نیزے کی شکل میں دم دار ستارے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب بخارات اور دھواں منعکس ہو کر زمین میں بند ہو جاتے ہیں تو زمین کے نیچے سے ہوا کا طوفان اٹھتا ہے۔ اور اس کو زلزلہ کہتے ہیں۔ اور جب بخارات زمین کے نیچے جا کر بند ہو جاتے ہیں۔ اور ہوا کی قوت کے ساتھ باہر آتے ہیں تو چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔ اور اگر لطیف بخارات آسمان اور زمین کے درمیان رات کی سردی کی وجہ سے جم جائیں۔ اور پھر زمین پر گرے تو اسے شبنم کہتے ہیں۔ اور اگر جم کر آسمان و زمین کے درمیان پھیلے رہیں تو اسے صقیع کا نام دیتے ہیں۔ اور لغت ہندی میں اسے کہل کہتے ہیں۔ اور بعض شہروں میں یہی تھوڑے سے بخارات لطیفہ منجمد ہو کر شکر سفید اور سرخ کے رنگ میں زمین پر برستے ہیں۔ اور اسے ترنجبین اور خشک انگبین اور من اور شیر خشت کہتے ہیں۔ یہ عادت کے مطابق مرکب ناقص کی قسمیں ہیں۔ اور کبھی عادت کے خلاف عجیب اور مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان لٹکتی رہتی ہیں۔ اور کبھی زمین پر گر پڑتی ہیں۔ اور اس کی تفصیل اپنے مقام میں مذکور ہے۔ اور کائنات الجو کے عجائب کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔

ارواح کا بیان اور ملائکہ کی اقسام

اور روح یا بالکل نیک ہوتی ہے۔ اور اسے فرشتہ کہتے ہیں یا بالکل بد اور اسے شیطان

کہا جاتا ہے یا نیکی و برائی دونوں ہوں۔ اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ جن' ارواح بنی آدم اور فرشتوں کی بھی تین قسمیں ہیں۔ اول وہ فرشتے جو کہ جسموں کے ساتھ معلق ہیں۔ خواہ ان کا تعلق اجسام علوی سے ہو جیسے حاملان عرش' خازنان کرسی' جنت اور دوزخ کے داروغے' ساکنان سدرۃ المنتہیٰ' مجاوران بیت المعمور' ستاروں کو کھینچنے والے' آسمانوں کی حرکت دینے والے اور ان کے دربان۔ اور خواہ اجسام سفلی سے تعلق رکھتے ہو۔ جیسا کہ وہ فرشتے جو کہ بادل اور ہوا کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور ہر قطرہ کے ساتھ نازل ہوتے ہیں۔ اور دریا' پہاڑ اور درختوں کے مؤکل اور بنی آدم کی حفاظت' ان کے اعمال لکھنے' اللہ تعالیٰ کے اسماء کی تلاوت کرنے والوں اور ورد کرنے والوں کی امداد و اعانت کیلئے رابطہ رکھتے ہیں۔

دوسرے وہ فرشتے ہیں جو کہ عبادت میں محو رہتے ہیں۔ اور ان کی ڈیوٹی اپنے مالک کو یاد کرنا ہے۔ اور وہ کثرت میں اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں واقع ہے کہ آسمانوں میں ایک بالشت جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ مشغول عبادت نہ ہو یا قیام میں یا رکوع میں یا سجدہ میں۔ تیسرے وہ مقرب فرشتے ہیں کہ جہان میں عظیم کام' ان کی تدبیر اور ان کے واسطے سے رونما ہوتے ہیں۔ جیسا کہ وحی و شریعت کی تعمیل کرنا' رزق اور دولت پہنچانا مدد کرنا حکومتوں اور ملکوں کو زیروزبر کرنا بنی آدم کی روحیں قبض کرنا۔ اور چار فرشتے یعنی جبرئیل' میکائیل' اسرافیل اور عزرائیل۔ ان کے لشکر اور امدادی' فرشتوں کی اسی قسم میں داخل ہیں۔ اور سب فرشتوں کے حال اور کثرت کے بیان میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اور صفت کے بھی کئی جہان ہیں۔ جیسے مکان' زمان' کیفیت' وضع' نسبت اور سمت اور ان جہانوں کا مکمل بیان حکمت کی مفصل کتابوں میں ہے۔ بہر حال جسے موجودات کے احوال اور ان کی تفاصیل کا احاطہ جتنا زیادہ ہوگا اسے رَبِّ الْعَالَمِينَ کی تفسیر کا اتنا زیادہ علم ہوگا۔

ایک خیال اور اس کا جواب

اس جگہ دل میں ایک خیال آتا ہے کہ جب اس سورت کا نزول اس لئے ہے کہ

بندے اپنے پروردگار کی مناجات کے مقام میں اس کی نعمتوں کا شکر اس طرح بجالائیں۔تو یہاں تمام جہان کی تربیت کے ذکر کی کیا مناسبت ہے؟ یہاں تو صرف عالم انسانی کی تربیت کا ذکر فرمانا چاہئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ ربوبیت الٰہی نے ہر عالم کو دوسرے عالم کے ساتھ ایسا رابطہ عطا فرمایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔پس عالم انسانی کی ربوبیت کا تصور تمام عوالم کی ربوبیت دریافت کئے بغیر ممکن نہیں۔اور جب بندے جان لیں کہ تمام عوالم کو ہماری تربیت میں مصروف کر دیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر ان کے ذہنوں میں عظمت پیدا کرے گی۔اور اسی کے مطابق اس کے شکر سے عاجزی ظاہر ہوگی۔ اور منعم حقیقی کے انعام کے پہلو میں نفس کی انکساری حاصل ہوگی جو کہ شکر کا مغز اور حمد کا خلاصہ ہے۔اور اس اجمال کی تفصیل بہت طوالت چاہتی ہے۔پھر بھی نمونہ کے طور پر اس سے کسی قدر بیان کیا جاتا ہے۔مثلاً تربیت الٰہی جو کہ آدمی کے بارے میں ظاہر ہوئی ہے اس کی ابتدا اس کے وجود سے ہے۔اور اس کی انتہا سعادت ابدی کے حصول تک ہے۔

ابدی سعادت کی تین چیزیں اور دیگر فروعات

اور جب ہم نے سعادت ابدی کو کھنگالا تو تین چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اعتقاد حق' عمل صالح' نیک عادات اور ہر چیز بدنی کی چار چیزوں کے بغیر پوری نہیں ہوتی صحت' طاقت' خوبصورتی' لمبی عمر اور یہ چار چیزیں دوسری چار چیزوں پر موقوف ہیں۔ مال' اہل وعیال' مرتبہ' قبیلہ جو کہ مددگار اور معاون ہوں۔اور نفسی فضائل جو کہ سعادت ابدیہ کے اجزاء ہیں کے ساتھ بدنی فضائل کے رابطے کا تصور نہیں ہوسکتا مگر پانچ دوسری چیزوں کے ساتھ کہ ان میں سے پہلی چیز ہدایت ہے۔یعنی عقل وشرع کے ساتھ خیر وشر کے راستے کو پہچاننا' دوسری چیز مجاہدات کا نتیجہ یعنی ایسے نور کی چمک جو کہ کمال مجاہدہ کے بعد عالم نبوت اور عالم ولایت سے ظاہر ہوتی ہے۔تیسری چیز مرشد یعنی وہ چیز جو کہ سعادت کی طرف متوجہ ہونے کا باعث ہو۔ چوتھی توفیق وتائید یعنی حق وصواب کے مطابق حرکت کا آسان ہونا۔اور اسباب کی موافقت کی وجہ سے مختصر وقت میں مطلب تک پہنچ جانا۔ پانچویں استقامت یعنی پختہ ارادے کا آخر تک باقی رہنا۔اور اس کام میں بصیرت کی کشادگی۔پس یہ سولہ چیزیں ہیں

جن پر آدمی کی تربیت موقوف ہے۔ اور ان سب میں سے ادنیٰ صحت ہے۔ اور صحت کے کئی اسباب ہیں کہ ان کی تفصیل کتب طب میں موجود ہے۔ اور ان اسباب میں سے سب سے ادنیٰ کھانا ہے۔ اور جب کھانا اختیاری فعل ہے۔ تو یہ ایک جسم کا محتاج ہے کہ اس میں قدرت' ارادہ اور علم درکار ہے۔ اگرچہ نباتات کہ ان میں قدرت ارادہ اور علم نہیں انہیں بھی پٹھوں کے ذریعے غذا کھینچنے کی قوت دی گئی ہے۔ اور اسی حیثیت سے نباتات کو جمادات کے مقابلہ میں کامل تر گردانا گیا ہے۔ لیکن نباتات غذائے بعید کی طلب سے عاجز ہیں۔ کیونکہ نہ تو انہیں غذائے بعید کے مکان کی معرفت ہے۔ اور نہ ہی وہ منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پس حیوان کو پانچوں حواس دیئے گئے ہیں کہ ان میں ایک لامسہ یعنی چھونے کی قوت ہے۔ تاکہ اس کی وجہ سے آگ کی گرمی' برف کی ٹھنڈک اور تلوار کی کاٹ کا احساس کرے۔ پس بھاگ جائے۔ اور محفوظ رہے۔ لیکن وہ حیوان جس میں صرف یہی ایک قوت ہے۔ اور بس مثل کیڑے کے کہ دشمن بعید سے بھاگنے سے عاجز ہوتا ہے یا دور پڑی ہوئی مرغوب چیز کو طلب کرے۔ پس دور کی چیزوں کو دریافت کرنے کیلئے ایک اور قوت عطا فرمائی گئی جسے شامہ یعنی سونگھنے والی کہتے ہیں۔ تاکہ وہ بو کا ادراک کرے۔ اور جب بو کے ادراک سے مطلوب یا مکروہ کی کماحقہ دریافت نہ ہو سکے تو ایک اور قوت عطا فرمائی جسے باصرہ کہتے ہیں یعنی دیکھنے والی' اور اس کی وجہ سے اشیاء مطلوبہ ومکروہہ کی سمت کا ادراک ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ قوت بھی۔ پس پردہ شے کا ادراک نہیں کر سکتی۔ پس اس کی طلب یا نفرت متصور نہ ہو گی مگر اس کے قریب جانے کے بعد۔ پس پردہ کے پیچھے چھپی اشیاء کے ادراک کیلئے ایک اور قوت دی گئی کہ اسے سمع یعنی سننا کہتے ہیں۔

اور اگر کسی شخص کو کسی غذا کی رغبت ہو جو کہ اس کے حواس خمسہ سے غائب ہو تو اسے بنی نوع انسان سے طلب کرنے کیلئے کلام کرنے کی صلاحیت دی گئی جو کہ حروف سے مل کر بنتی ہے۔ تاکہ وہ فرمائش کرے کہ فلاں فلاں چیز بازار سے لاؤ۔ اور اسے اچھی طرح بناؤ۔ جب غذا میسر آ گئی تو اس کی لذت دریافت کرنے کیلئے اسے قوت ذائقہ یعنی چکھنے والی قوت بخشی گئی تاکہ لذت کی وجہ سے اس غذا پر طبیعت زیادہ متوجہ ہو۔ اور طبیعت کو اس کا جذب

کرنا آسان ہو جائے۔ پھر مشترک حس اور قوت خیال بھی بخشی گئی تا کہ تمام محسوسات کو خیال میں رکھے۔ اور رغبت کے وقت اس کی خواہش کرے۔ جیسے سنگترہ کہ اس کی مٹھاس' زردی اور خوشبو تین حواس سے دریافت کر کے اس کی مرکب صورت کو خیال میں رکھا تا کہ حاجت کے وقت اس کی طلب کرے۔ پھر قوت شہوانیہ تا کہ مطلوب کو پانے کیلئے حرکت دے۔ قوت کارہہ کہ مطلوب کی ضد سے بھاگنے کا سبب ہو۔ اور قوت غضب اس دشمن کو روکنے کیلئے جو کہ حاصل کی گئی غذا کو لوٹنا چاہے بھی بخشی گئی اور پاؤں اس لئے دیئے گئے تا کہ طلب یا ہرب کا آلہ بنیں۔ اور ہاتھ پکڑنے اور منہ تک پہنچانے کو۔ اور منہ معدہ تک طعام پہنچانے کو اور دونوں جبڑے اور دانت طعام کو پیسنے کو۔ تا کہ اس کا نگلنا آسان ہو۔ اور زبان منہ میں طعام کو حرکت دینے' مزہ چکھنے اور طلب کے وقت اس کا نام لینے کو اور لعاب اسے گوندھنے کو اور مری اور حجرہ معدے کی طرف کھانا منتقل کرنے کو اور معدہ کو۔ تا کہ کھل جائے۔ اور کھانے کو اپنے اندر لے لے پھر بند ہو جائے۔ تا کہ کھانا اس میں کچھ وقت تک رہے۔ اور پک جائے۔ اور متشابہ اجزاء جوش دیئے ہوئے جو کے پانی کی طرح ہو جائیں۔ اور کھانے کو معدہ میں پکانے کے لیے جگر کی گرمی' تلی اور وہ چربی ضروری ہوتی جو کہ معدہ اور آنتوں میں ہوتی ہے۔ یہ اعضاء بھی اسے مہیا کیے گئے۔ نیز اس لئے کہ کھانا پکنے کے بعد ایک مخصوص شکل حاصل کر کے نسوں کی گزرگاہوں سے جگر میں پہنچتا ہے۔ اور وہاں ایک اور جوش حاصل کر کے خون بن جاتا ہے۔ اور اس جوش کی گرمی سے اس میں کچھ سودا بن جاتا ہے مثل میل کے۔ اور اسے تلی جذب کر لیتی ہے۔ اور کچھ صفرا بن جاتا ہے مثل جھاگ کے اور اسے پتہ اپنے اندر جذب کر لیتا۔ اور ابھی خون میں زیادہ رقت اور رطوبت باقی ہے ضرورت ہے کہ اسے پھر صاف کیا جائے۔ پس اس کام کیلئے دو گردے دیئے گئے تا کہ رطوبت کو جذب کریں۔ اور جب خون غذا پہنچانے کے قابل ہو گیا تو لازم ہے کہ اسے تمام بدن میں تقسیم کیا جائے۔ اور اس کام کیلئے رگیں عنایت فرمائی گئیں۔ بڑی رگوں سے لے کر بالوں کی نسوں تک' پھر پہلی بار کے پکنے والا فضلہ اگر معدہ میں رہ جاتا تو سخت بیماریوں کا سبب بن جاتا' انتڑیوں میں ڈال دیا گیا۔ اب پتے کو اتنی طاقت ضروری دی گئی اور ایک راہ کھولی گئی تا کہ

کچھ صفراء کو انتڑیوں میں بھیجے اور وہ صفرا انتڑیوں کو بخارات دے تا کہ فضلہ دور کرنے کی حاجت پیدا ہو۔ اور چونکہ بدن ہمیشہ تحلیل کے عمل میں مصروف رہتا ہے۔ تو ضروری ہوا کہ وہ سودا جسے تلی نے جذب کیا تھا اور اس میں کچھ ترشی اور قبض آ گئی تھی اسے وہاں سے دوبارہ معدہ کے منہ تک پہنچایا گیا۔ تا کہ خواہش کی قوت حرکت میں آئے۔ اور طبیعت غذا طلب کرے۔ اور گردے نے جو رطوبت جذب کی تھی اپنی غذا کی مقدار رکھ کر باقی مثانہ کو دے دیتا ہے۔ تا کہ باریک راہ جو کہ پیشاب گاہ تک پہنچتی ہے میں گرے۔

پیشۂ کاشتکاری

پھر آدمی کو کھانے کی چیزوں کی جنس سے بہت سی چیزیں درکار ہیں کہ ان کا بیج محفوظ رکھے۔ اور ان بیجوں کے ضائع ہونے کی صورت میں آدمی بھوکا رہتا ہے۔ پس اسے لازماً ایک اور پیشے کی تعلیم دی گئی کہ اس کی وجہ سے بیج کو نشو ونما حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ پیشہ کاشتکاری ہے۔ اور اس میں تین رکن ہیں۔ اول مٹی کہ اس میں بیج کی حفاظت ہو' دوسرا اور تیسرا رکن آب و ہوا تا کہ وہ بیج پھولے اور شاخ اور پتے باہر لائے۔ اور ہوا کیلئے ضروری ہے کہ قوت سے حرکت دے تا کہ زمین میں اور بیج کے اجزاء میں داخل ہو۔ اور تینوں آپس میں گھل مل جائیں۔ اس کے علاوہ بہار اور موسم گرما کی گرمی بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ گرمی کے بغیر ہوا بیج کے اجزاء کو بکھیر نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ ٹھنڈی ہوا جمود کا باعث ہوتی ہے نہ کہ جوش کا۔ پھر پانی کو زراعت کی زمین تک پہنچانے کیلئے نہر کھودنے' چشمے جاری کرنے اور کنویں سے پانی نکالنے کیلئے آلات کی ضرورت پیش آئی اور وہ اونچی زمینیں جن تک نہروں' چشموں اور کنوؤں کا پانی نہیں پہنچ سکتا ان کیلئے بادل پیدا فرمائے۔ اور ان بادلوں پر ہواؤں کو مسلط فرمایا تا کہ انہیں ہر طرف چلا کر لے جائیں۔ اور جب بارش کا پانی ہر وقت میسر نہیں ہو سکتا تو پہاڑوں کو بارش کے پانی کا خزانہ بنایا۔ تا کہ ان سے نہریں اور چشمے درجہ بدرجہ جاری رہیں۔ اور آبادیاں اور شہر غرق نہ ہوں۔ اور گرمی کیلئے ضرورت کے وقت سورج کو مسخر فرمایا تا کہ نزدیک آ جائے۔ اور ہوا میں اس کی گرمی کا اثر پیدا ہو جائے۔ اور جب پودا زمین سے بلند ہوتا ہے۔ اور مضبوط و مستحکم ہوتا ہے۔ تو آب و ہوا کی

رطوبت اسے بہت کم پہنچتی ہے۔ حالانکہ ابھی اسے کافی رطوبت درکار ہے۔ اس رطوبت کیلئے چاند کو مسخر فرمایا۔ اسی طرح آسمان میں جو ستارہ بھی ہے زراعت میں اس کا فائدہ ہے کہ تفتیش کے وقت معلوم ہوتا ہے۔ اور سورج' چاند اور آسمان کے دوسرے ستاروں کی تسخیر کا حرکات افلاک کے بغیر تصور نہیں ہو سکتا۔ اور افلاک کی حرکات کی ڈیوٹی فرشتے سرانجام دیتے ہیں۔ اور بعض فرشتے آدمی کے بدن میں غذا کے پروگرام کو چلانے کیلئے بھی مقرر ہیں۔ اس لئے کہ غذا کا فائدہ یہ ہے کہ کھانے کا کچھ حصہ جزو بدن ہے جو کہ حرکات کی وجہ سے تحلیل ہو چکا ہے۔ پس ایسا فرشتہ لازماً چاہئے جو کہ غذا کو گوشت اور ہڈی کی طرف کھینچ کر لے جائے۔ کیونکہ طبعاً غذا ایک ثقیل جسم سے نیچے کی طرف حرکت کرتا ہے نہ کہ اطراف کی طرف اور ایک اور فرشتہ چاہئے جو کہ اس غذا کی عضو میں حفاظت کرے۔ اور تیسرا فرشتہ بھی چاہئے تا کہ اس غذا سے شکل خون کو جدا کرے۔ اور چوتھا بھی تا کہ گوشت اور ہڈی کی صورت بنائے۔ اور پانچواں بھی تا کہ فضلہ کو دور کرے۔ اور چھٹا بھی تا کہ جنس کو جنس سے ملا کر یکساں کر دے۔ اور ساتواں بھی تا کہ مقدار کا خیال کرے۔ اور عضو کی شکل میں اونچ نیچ پیدا نہ ہو۔ پس یہ سات فرشتے ہر عضو کی غذا کیلئے درکار ہیں۔

اور بعض اجزائے بدن کو سو سے زیادہ فرشتوں کی ضرورت ہے۔ جیسے آنکھ اور دل اور ان تمام زمینی فرشتوں کو آسمانی فرشتوں کی مدد پہنچتی ہے۔ اور انہیں عرش اٹھانے والے فرشتوں کی طرف سے مدد پہنچتی ہے۔ پس یہ تربیت الٰہی کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے جو کہ کھانے کی صورت میں ظاہر ہوا اور کھانا صحت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اور صحت ایک ادنیٰ چیز ہے کہ تربیت کی غایت اسی پر موقوف ہے۔ اور جو شخص صحت کے تمام اسباب پر تربیت کے تمام لوازمات سمیت تفصیلی نظر سے مشاہدہ کرے تو وہ یقیناً اس بات پر یقین کرے گا کہ ایک عالم کے دوسرے عالم کے ساتھ رابطہ کے بغیر تربیت کی حقیقت کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے نعمت الٰہی کے احسان جتلانے کے وقت لفظ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لایا گیا۔ تا کہ اس طرف اشارہ ہو کہ تمام عالم کی تربیت ہر فرد کی تربیت میں داخل ہے۔ اور درحقیقت تمام عالم کی تربیت اسی کی تربیت ہے۔ اور کیا اچھا کہا گیا۔ بادل' ہوا' چاند' سورج

اور آسمان کام میں ہیں۔ تا کہ تو ایک روٹی حاصل کرے۔ اور غفلت سے نہ کھائے۔ اور تمام تیری خاطر مصروف اور فرمانبردار ہیں۔ اور یہ انصاف کی شرط نہیں کہ تو فرمانبرداری نہ کرے۔

لفظ ربّ کے معانی

جاننا چاہئے کہ لفظ ربّ عربی لغت میں کئی معنوں میں آیا ہے۔ اور وہ تمام معنے یہاں مناسب ہیں بمعنی مالک اور اللہ تعالیٰ کا تمام جہانوں کا مالک ہونا ظاہر ہے۔ اس لئے کہ جب ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ تو مملوک بھی اسی کی ہوگی۔ اور آدمی کی ملک اول تو مطلق نہیں دوسرے مالک حقیقی سے عاریتاً ہے۔ دوسرا معنی موجد یعنی خالق اور اس معنی میں بھی مقام حمد کے مطابق ہے۔ بلکہ خالق ہونا تمام خوبیوں میں سے سب سے زیادہ کامل خوبی کو لازم ہے۔ کیونکہ اس کی نعمتیں مستحق ہونے سے پہلے مخلوقات کو ملی ہیں۔ اور ملتی ہیں۔ تیسرا معنی سید یعنی جماعت کا سردار۔ اور اسی معنی میں ربّ النوع کہا جاتا ہے۔ اور اس معنی کی حقیقت بلندیٔ مرتبہ ہے۔ اور وہ بھی اعلیٰ خوبیوں کو چاہتی ہے۔ اور چوتھا معنی مربی یعنی کاموں کا اصلاح کرنے والا۔ اور ہر چیز کو اس کے اونچے مرتبہ پر پہنچانے والا' مثلاً نطفہ کو خون کے ساتھ ملا کر لوتھڑا بنایا۔ اور اسے منجمد کر کے گوشت کا ٹکڑا بنایا۔ اور گوشت کو مختلف اعضاء عطا فرمائے۔ پھر فیض روح پہنچایا اور ہر عضو کو اس کے لائق طاقت بخشی۔ پھر روح کو شریعت' طریقت اور حقیقت کے ساتھ مکمل فرمایا۔ پس اسے کامل خوبیوں کا مستحق بنایا۔

تربیت کی دو قسمیں

نیز جاننا چاہئے کہ تربیت دو قسم کی ہے ایک یہ کہ ایک آدمی کسی چیز کی پرورش اپنے لئے کرے تا کہ وہ چیز اس کے کام آئے۔ اور اس قسم کی تربیت شان مخلوقات ہے کہ اپنے اغراض اور ضروریات کی پابند ہیں۔ اور دوسری قسم تربیت کی یہ ہے کہ اس چیز کی تربیت اسی چیز کے فائدہ کیلئے کی جائے۔ اور خالق سبحانہ وتعالیٰ کی یہی شان ہے۔ کیونکہ اس کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے ذریعے کمال حاصل کرے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی شان

میں حدیث پاک میں وارد ہے ان اللہ یحب الملحین فی الدعآء اللہ تعالیٰ دعا میں مبالغہ کرنے والے کو پسند فرماتا ہے۔ نیز حدیث شریف میں وارد ہے کہ من لم یسئل اللہ یغضب علیہ جس نے اللہ تعالیٰ سے نہ مانگا وہ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ اور اسی مقام سے معلوم ہوا کہ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اس کی صفات سے اکمل صفت ہے جل شانہ کیونکہ نور وجود کے ظہور کی ابتداء سے لے کر ہر کوئی اپنے معاد کو پہنچنے تک اسی اسم اعظم کے احاطہ میں ہے۔ اور ہر نسبت اور تعلق جو اس جہان میں دیکھا سنا جاتا ہے اسی اسم مبارک کے انوار کا سایہ ہے۔ اسی لئے اسم مبارک اللہ کے بعد اس نام کو مقام حمد میں لائے ہیں۔ کیونکہ اسم اللہ تمام و کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ نام تمام و کمال سے مافوق دلالت کرتا ہے۔

متلعقات رحمٰن ورحیم

اور جو کچھ رحمٰن ورحیم کے ساتھ متعلق ہے یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے حق میں حقیقت رحمت خیر پہنچانا اور شر کو دفع کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دو قسمیں ہیں ذاتی و صفاتی اور ذاتی کی بھی دو قسمیں ہیں عام اور خاص' عام رحمت وجود کا فیض عطا کرنا ہے کہ ہر موجود اس سے ایک حصہ رکھتا ہے۔ اور رحمت خاص اللہ تعالیٰ کی طرف قرب کی استعداد بخشنا ہے۔ کہ اپنے بعض بندوں کو اس سے مخصوص فرمایا ہے۔ اور صفائی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عام اور خاص' عام رحمت' ہر موجود کو صفات و اعراض میں سے جو اس کے لائق ہو عطا فرماتا ہے۔ اور خاص' ہر موجود کو ایسی چیز عطا کرنا کہ اس کی وجہ سے وہ دوسروں پر برتری اور فضیلت حاصل کر سکے۔ پس یہاں سے معلوم ہوا کہ باوجودیکہ رحمٰن ورحیم تسمیہ میں بھی موجود ہیں۔ لیکن انہیں اس سورت میں دوبارہ لانے میں تکرار نہیں۔ کیونکہ وہ رحمت جو تسمیہ میں مذکور ہے ذاتی ہے۔ اور جو رحمت کہ یہاں مذکور ہے صفائی ہے۔ اور جب ذاتی کی دو قسمیں ہیں عام اور خاص تو ان دو قسموں پر دلالت کے دو اسم رحمٰن ورحیم تسمیہ میں لا کر فرمائے۔ اور جب صفائی کی بھی دو قسمیں ہیں عام و خاص۔ تو ان دونوں پر دلالت کیلئے بھی دو نام لائے گئے رحمٰن و رحیم۔

اور بعض نے کہا ہے کہ تسمیہ میں رحمٰن ورحیم کا ذکر اس ہیبت کی تسکین کیلئے ہے جو کہ اسم

اللہ کے ذکر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور دل کو مدہوش کر دیتی ہے۔ اور یہاں بندوں کو امیدوار بنانے کو ہے۔ تاکہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے خوف سے بے تاب نہ ہو جائیں۔ اور چونکہ آئندہ کلام میں عبادت کا ذکر ہے۔ اور عبادت ایک نہایت مشکل کام ہے۔ تو لازم ہوا کہ امید کا قائد اور خوف کا سائق ہمراہ دیئے جائیں۔ اور ہر مقام پر دو اسم لانا اس لئے ہے کہ ایک تو عوام کی ہیبت کی تسکین کرے۔ اور عوام کو پر امید کرے۔ اور دوسرا خواص کیلئے۔ نیز یہ بھی کہا ہے کہ ظہور عالم کی ابتداء ایک رحمت پر ہے عام اور خاص اور اس کی انتہا بھی ایک رحمت پر ہے عام اور خاص۔ پس تسمیہ میں ابتدائی رحمتوں کی طرف اور یہاں انتہا کی رحمتوں کی طرف اشارہ ہے۔ نیز حمد کی ابتداء عام اور خاص رحمتیں ہیں۔ عام کی نظر میں عام اور خاص کی نظر میں خاص۔ پس چاہئے کہ اسی تفصیل کے ساتھ منہائے حمد۔ نیز دو قسم کی رحمت ہو۔ نیز اشارہ ہے اس پر کہ اگر چہ حمد کامل اور پوری ہو لیکن اسے اللہ تعالیٰ کی سابقہ نعمتوں چاہے عام ہوں یا خاص کا بدلہ قرار نہیں دے سکتے۔ چہ جائیکہ رحمت جزائے مزید کا موجب بن سکتی ہے مگر اس کے ساتھ کہ اس حمد کے ساتھ دو قسم کی۔ اور رحمت کو ملا دیں اور وہ جزائے مزید کا موجب بن جائے۔ عام مزید عام کیلئے اور خاص مزید خاص کیلئے۔

دنیا و آخرت کی رحمت کی دو دو قسمیں

نیز اس بات پر بھی اشارہ ہے کہ جس طرح رحمت دنیا دو قسم ہے عام جو کہ ایجادی ہے۔ اور خاص جو کہ تفضلی ہے۔ اسی طرح رحمت آخرت دو قسم ہے عام جو کہ سبب نجات ہے۔ اور خاص جو کہ سبب قرب ہے۔ یا اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی حمد کا سبب ہے۔ خاص رحمت حمد خاص کا وسیلہ ہے۔ اور عام حمد عام کا ذریعہ۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے مضمون کو ملاحظہ کرنے کے واسطے سے وہی رحمت موجب عبادت ہے رحمت عام عبادت عام کیلئے اور خاص عبادت خاص کیلئے۔ پس حمد کو دو جہتوں سے ضرور جاننا چاہئے اول یہ کہ رحمت کا مقتضی ہے۔ دوسرے یہ کہ عبادت کا مقصد ہے۔ اور خلق انسان سے مقصود عبادت ہے۔ اور خلق عالم کا مقصود خلق انسان ہے۔

لفظ رحمٰن اور رحیم میں فرق

ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ رحمٰن ورحیم دولفظ ہیں۔ لیکن معنی ایک ہی ہے۔ جیسے فرمان اور ندیم۔ پس ان دولفظوں کو جمع کرنا صرف تاکید کیلئے ہے۔ مثلاً کہتے ہیں فلاں تندوتیز ہے۔ اور بعض نے کہا کہ رحمٰن رحیم کی بہ نسبت رحمٰن زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ لفظ کی زیادتی معنوں کی زیارت پر دلالت کرتی ہے۔ رحمٰن پانچ حرفی ہے۔ اور رحیم چار حرفی اسی لئے رحمٰن ذات پاک حضرت حق کے ساتھ مخصوص اسم ہے۔ اور اس نے غلبہ کے طریقے سے اسم علم کا حکم حاصل کرلیا۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے غیر کو رحمٰن کہے کافر ہو جائے گا۔ اور رحمٰن میں جو مبالغہ ہے تین طریقوں سے سمجھا جاسکتا ہے اول رحمت ایجادی کے افراد کی کثرت' دوم رحمت پانے والے افراد کی کثرت اور یہ دونوں قسمیں کمیت میں زیادتی کے قبیلے سے ہیں۔ سوم کیفیت میں زیادتی کہ اسم رحمت خاص ہے ان رحمتوں سے جو بڑی اور ہمیشہ ہیں۔ اور وہ جو بعض نے کہا رحمٰن الدنیا والاخرۃ ورحیم الدنیا تو مبالغہ کی ان تین وجوہ میں سے ایک طرف اشارہ ہے۔ اور بعض نے کہا رحمن الدنیا ورحیم الآخرۃ۔ اسی لئے کہتے ہیں دنیا کی رحمت عام ہے مومن وکافر۔ نیک وبد اس میں شریک ہے بخلاف رحمت آخرت کے۔

نیز کہا گیا ہے کہ رحمٰن لفظ میں خاص ہے۔ اور معنی میں عام کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کو اس سے موصوف نہیں کرتے۔ پس اس کا لفظ خاص ہوگا۔ اور چونکہ خالقیت' رازقیت اور نفع پہنچانا تمام موجودات کو شامل ہے اس کا معنی عام ہوگا۔ اور رحیم لفظ میں عام ہے۔ اور معنی میں خاص۔ کیونکہ مخلوق کو بھی اس کے ساتھ موصوف کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں رحیم ہے۔ اور لطف وتوفیق جو کہ اس اسم کا مدلول ہے وہ ایمان والوں کے ساتھ خاص ہے۔ ضحاک کہتے ہیں کہ رحمٰن آسمان والوں پر اس کی رحمت کے ظہور کی طرف اشارہ ہے۔ اور رحیم' زمین والوں پر اس کی رحمت کے نزول کی طرف اشارہ ہے۔ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ رحمٰن وہ ذات ہے کہ جب اس سے سوال کریں تو عطا فرمائے۔ اور رحیم وہ ہے کہ جب اس سے کچھ نہ مانگیں تو ناراض ہو جائے۔ اور بعض نے کہا کہ دنیا وآخرت کی

رنگا رنگ نعمتیں رحمت رحمانی کے نشانات ہیں۔ اور دونوں جہانوں بلیات و آفات کو دور کرنا رحمت رحیمی کا مقتضیٰ ہے۔ ہر صورت میں اگر رحمٰن' رحیم سے زیادہ بلیغ ہے۔ تو اللہ پھر رحمٰن پھر رحیم کے ذکر کی ترتیب میں تنزیلی مناسبت ہے کہ پہلے اسم ذات کا ذکر فرمایا پھر اسمائے صفات میں سے اس اسم کا ذکر جو کہ خصوصیت میں اسم ذات کی مانند ہے۔ پھر اسمائے صفات میں سے ایک اور اسم جو کہ عام ہے۔

ایک شبہ کا جواب

لیکن یہاں ایک شبہ وارد ہے کہ جب لفظ رحمٰن کا ذکر ہو چکا جو کہ کمال رحمت پر دلالت کرتا ہے۔ پھر لفظ رحیم کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ رحیم کا ذکر تکمیل کے طور پر ہے۔ اس لئے کہ لفظ رحمٰن میں بڑی نعمتوں' کلیات اور منفعتوں کے اصول کو سمیٹا گیا۔ جیسا کہ اور لفظ رحیم چھوٹی نعمتوں۔ جزئیات اور فروغ کو شامل ہے۔ اور یہ تکمیل اس لئے ہے کہ بندے کو حقیر حاجتیں جیسے نمک' جوتا' جانوروں کا چارہ اس دربار عالی سے مانگنے میں شرم' دامن گیر نہ ہو۔ اور بلا جھجک اس جناب عالی سے مانگے۔ گویا فرمایا کہ اگر ہم اپنے آپ کو صرف رحمٰن کہتے تو تو ہم سے مرعوب سا رہتا اور ہم سے آسان سی چیزوں کے مانگنے کو بے ادبی سمجھتا۔ اب جبکہ ہم نے خود کو رحمٰن و رحیم فرمایا تو ہم نے اجازت دے دی کہ ہر امر عظیم و حقیر ہم سے مانگ اور یہ بادشاہوں' امیروں اور زمین کے سرداروں کی عادت کے خلاف فضل و کرم ہے۔ ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک آسان سے مقدمہ میں بادشاہ کی خدمت میں عرض پیش کی۔ بادشاہ نے اسے سزا دینے کا حکم دیا کہ آسان کام عام آدمیوں سے طلب کرنے چاہئیں۔ اس جگہ رحمت الٰہی کا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ کو یہاں تک دلیر فرمایا۔

بعض نے کہا ہے کہ رحمٰن ان نعمتوں پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا بندوں کی طرف سے ملنا متصور نہیں۔ جیسے زندگی دنیا' سننے کی طاقت اور بینائی عطا کرنا اور اولاد عطا کرنا۔ اور رحیم ان نعمتوں پر دلالت کرتا ہے کہ بندوں کے خیال میں انہیں بندوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جیسے مرض کی تشخیص۔ دوا کے ساتھ علاج کرنا' روزانہ کا خرچ' خون بہا' امور معاش و

معاد میں مدد کرنا۔ پس گویا کہ فرمایا کہ میں رحمٰن ہوں کہ ناپاک قطرے کو تو میرے حوالے کرتا ہے۔ اور میں اسے اچھے قد اور اچھی شکل والا بنا کر تجھے دیتا ہوں۔ اور خشک پرانے بیج کو تو میرے سپرد کرتا ہے۔ اور میں اسے شاخ' پتے اور پھلدار کر کے تجھے عطا فرماتا ہوں۔ اور تو ناقص اطاعت میری طرف بھیجتا ہے۔ اور میں اسے بلند محل بنا کر جو کہ حور و قصور' اشجار و انہار پر مشتمل ہے تیرے حوالہ کرتا ہوں۔ اور میں رحیم بھی ہوں کہ جو کچھ تجھے تیرے والدین' خاوند و مالک' استاد اور پیر' طبیب و عطار' آقا و مربی دے سکتے ہیں مجھ سے امید رکھ۔ اسی لئے کہا ہے ہر شے جسے تو چھوڑ دے اس کا عوض ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دے تو اس کا کوئی بدل نہیں۔

ایک بہت مشکل شبہ اور اس کا جواب

اس جگہ ایک بہت مشکل شبہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ تو اس نے برائیاں اور قباحتیں کیوں پیدا فرمائیں اور مذموم افعال' ردی اخلاق' غموں' پریشانیوں' افکار اور حاجتوں کو ہم تک کیوں راہ دی؟ یہ رحمت کا کونسا تقاضا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم ان چیزوں کو خلاف رحمت جانیں تو یہ ہماری کوتاہ نظری ہے۔ اگر شفیق باپ بیٹے کو سزا نہ دے تو حقیقتاً اس نے رحمت کا تقاضا پورا نہیں کیا۔ حالانکہ یہ سزا عذاب کی صورت ہے۔ بچے سے پوچھنا چاہئے کہ جب بھی وہ صبح اٹھتا ہے۔ اور اس کو گھر سے کھینچ کر اور مانوس ماحول سے باہر لا کر مکتب میں لے جاتے ہیں جہاں ترش رو معلم ہاتھ میں ڈنڈا لئے اور پیشانی پر بل ڈالے بیٹھا ہے۔ اور اسے اتنی مہلت نہیں دیتا کہ ایک لمحہ کیلئے کھیل کود کرے یا آرام کرے۔ اور جب جمعہ کے دن اس مصیبت سے خلاصی پاتا ہے۔ تو اسے حجام کے سپرد کر دیتے ہیں۔ تاکہ اس کے ناخن اتارے اور سر کے بال کاٹے پھر جب گھر میں آتا ہے۔ تو اسے گرم پانی سے نہلاتے ہیں۔ اور اس کے جسم سے میل کو کپڑے کی تھیلی سے مل مل کر دور کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی اسے ہیضہ اور بدہضمی ہو جائے تو اس پر کھانا پینا بند کر دیتے ہیں وہ تمام اہلخانہ کو دیکھتا ہے کہ وہ اچھے کھانے کھاتے ہیں۔ اور لذیذ شربت پیتے ہیں۔ اور یہ ایک لقمہ اور ایک گھونٹ کو ترستا ہے وہ جتنا بھی چیختا ہے اس کی کوئی نہیں سنتا۔ یہ صورت کمال

عذاب کی صورت ہے۔ اور حقیقت میں عین رحمت ہے۔ جسے والدین ادب نہ سکھائیں اسے زمانہ سزا دیتا ہے۔ اگرچہ ناقص العقل ہرگز نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ اس کے حق میں رحمت ہے۔ پس دنیا میں جو بھی مشقت و تکلیف ہے حقیقت میں وہ رحمت و نعمت ہے۔

عسٰی ان تکرھوا شیئا وھو خیرلکم وعسٰی ان تحبوا شیئا وھو شرلکم واللہ یعلم وانتم لاتعلمون. ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو۔ حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور کسی چیز کو پسند کرو۔ حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اور تم نہیں جانتے۔

اس مقام پر عبرت کیلئے حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا واقعہ کافی و شافی ہے جہاں اتنے عظیم اولوالعزم پیغمبر علیہ السلام پر بعض افعال الٰہی کے اسرار ظاہر نہ ہوئے۔ اور ان کاموں میں حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ انکار سے پیش آئے۔ وہاں ان لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو سمجھنے کیلئے کیا امکان کہ جن پر ابھی تک عالم کے ظاہر کا انکشاف نہیں ہوا ہے۔ عام اور خاص راستہ یہی ہے کہ اسے رحیم مطلق اور رحمٰن برحق مانے اور اپنے آپ کو ناقص العقل اور انجام سے ناواقف بچے کی طرح سمجھے کہ وہ بچہ جتنی بھی کوشش کرے اپنے والدین کی طرف سے ملنے والی سزا اور عذاب کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا۔

دنیا میں مخلوق پر پہنچنے والی چار قسم کی چیزیں

یہاں جاننا چاہئے کہ وہ چیزیں جو کہ دنیا میں مخلوق پر آتی ہیں چار قسم کی ہیں پہلی قسم جو کہ نفع بھی دیتی ہے۔ اور ضروری بھی ہے۔ جیسے دنیا میں سانس لینا کہ اگر لمحہ بھر کیلئے دم رک جائے تو آدمی مر جائے۔ اور آخرت میں معرفت الٰہی کہ اگر ایک لحظہ کیلئے دل سے زائل ہو جائے تو ہمیشہ کے عذاب کا ذریعہ بنے۔ دوسری قسم وہ جو نافع ہے مگر ضروری نہیں۔ جیسے دنیا میں مال اور آخرت میں کثرت علوم و معارف' کثرت نوافل و طاعات' تیسری قسم وہ ہے جو ضروری ہے مگر نافع نہیں۔ جیسے دنیا میں آفات و امراض اور اس قسم کی آخرت میں کوئی نظیر نہیں۔ چوتھی قسم جو نہ نافع اور نہ ہی ضروری ہے۔ جیسے دنیا میں فقر اور آخرت میں عذاب۔ پس جو کہ نافع ہے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں وہ رحمت خاص کا مقتضی ہے۔ اور جو ضروری

ہے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں وہ رحمت عام کا تقاضا ہے کہ اس کا تعلق سارے جہان سے ہے۔ اور جو نہ نافع ہے نہ ضروری' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی وہ رحمت اضافی کا تقاضا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر دنیا میں چاندی نہ ہو تو غنی ہونے اور اس کے لوازمات بادشاہی اور اسیری کی صورت نہیں بنتی۔ کیونکہ کسی کو کسی تک کوئی احتیاج نہ ہوگی تو وہ اس کے کام سرانجام دینے میں اپنے آپ کو کیوں ذلیل کرے گا۔ اور اپنے اوقات کو اس کے اوامر و نواہی میں کیونکر صرف کرے گا۔ پس یہ تمام مرتبے زیر و زبر ہو جائیں۔ اور دنیا کا انتظام جڑ سے اکھڑ جائے گا بلکہ تمدن اور بنی آدم کا اجتماع اور باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی امداد فوراً ختم ہو جائے گی۔ اور انسانی تخلیق جانوروں کی تخلیق کی طرح منتشر اور بے مقصد ہو جائے۔ پس اللہ تعالیٰ کی رحمت اضافی جس کا ہر منصب' ہر مرتبہ' ہر پیشہ اور ہر صنعت کی نسبت سے تعلق ہے فقر' محتاجی' بیماریاں لگنے اور مختلف اوقات کی مصیبتوں کی متقاضی ہوئی۔

فرض کرنا چاہئے کہ اگر جہان میں چور نہ ہو تو پہریدار کیا کرے گا۔ اور اگر بیماری نہ ہو تو طبیب' عطار' جراح اور ڈاکٹر بے فائدہ ہو جائیں گے۔ اور اگر فقیری اور محتاجی نہ ہو تو بادشاہ لشکر کے بغیر' امیر خدمتگار کے بغیر' تاجر نوکر کے بغیر اور دفتر میں کام کرنے والا افسر پیشکار کے بغیر کیا کرے گا؟ یہاں سے رحمت الٰہی کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو کہ ہر تکلیف اور آفت میں چھپی ہوئی ہے۔ اور اس کے باوجود آفتوں اور تکلیفوں کو عام طریقے سے تمام اہل دنیا میں پھیلا دیا ہے کئی اقتدار والے بادشاہ ہیں جو بیماریوں میں گرفتار ہیں۔ اور طبیبوں' عطاروں اور دوائیں بنانے والوں کے محتاج ہیں۔ اور کئی غریب ایسے ہیں جو کسی سے خوف نہیں رکھتے اور پورے امن سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لشکر اور پہریداروں کی حاجت نہیں رکھتے اور بادشاہ' امیر اور غنی لوگ ان کے حال پر رشک کرتے ہیں۔ پس بادشاہ کی بیماری طبیبوں کے حق میں عظیم رحمت ہے۔ اور طبیبوں کی غربت اور محتاجی بادشاہوں کے حق میں ایک قسم کی رحمت ہے اسی پر دوسری تکلیفوں اور آفتوں کو قیاس کرنا چاہئے جو کہ ظاہر میں رحمت کے خلاف نظر آتی ہیں ہاں مخلوقات میں سے کسی کو تمام اقسام کی رحمت نہیں دی گئی ورنہ نظام کی خرابی ظاہر ہو جائے۔ اور صفت قہر و غضب کا کوئی مظہر نہ رہے۔

ایک لطیف نکتہ

اور یہاں ایک لطیف نکتہ ہے کہ حضرت مریم علیہ السلام کو ایک رحمت دی گئی جس کی وجہ سے انہیں کفار فجار کے طعنوں سے نجات ملی چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا: وَلِنَجْعَلَهٗ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا (ترجمہ) اور تاکہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کو لوگوں کیلئے نشانی بنائیں اور ہماری طرف سے رحمت' اور تمام امت مصطفوی کو ایک عمدہ نعمت عطا فرمائی گئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ پس کیا بعید ہے کہ اس رحمت کی برکت سے دوزخ کے عذاب سے خلاصی پائیں۔

متعلقات مالك يوم الدين

اور جو کچھ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے متعلق ہے' یہ ہے کہ عدل کا تقاضا اچھے' برے' تابع فرمان اور نافرمان اور موافق اور مخالف کے درمیان فرق کرنا ہے۔ اور یہ فرق یوم جزاء کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر دنیا میں نیکوں کو نعمت' دولت اور عافیت عطا فرمائیں اور بروں کو محتاجی' مصیبت اور بیماری دے دیں تو طبعی طور پر لوگ دولت' عافیت اور صحت کے حصول کی طمع میں نیکی کی راہ پکڑیں۔ اور برائی سے پرہیز کریں۔ اور جہت ایمان درمیان میں نہ رہے۔ پس امر تکلیف برہم ہو جائے۔ اور یہ نیک کام مجبوری کے ساتھ اور بے اختیار لوگوں سے ظاہر ہوں نہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اسی لئے روز جزاء کو روز عمل سے جدا اور علیحدہ کر دیا گیا۔ تاکہ ہم پر مکلف کرنے کی حقیقت اور امتحان کا معاملہ ثابت ہو سکے۔

مالک کی قرأت کی ارجحیت کے دلائل

جاننا چاہئے کہ یہاں مالک اور ملک دو متواترہ صحیحہ قرأتیں ہیں۔ اور اس لفظ کو دونوں طریقوں سے پڑھنا درست ہے۔ لیکن علماء نے ان میں سے ایک قرأت کو دوسری پر ترجیح کے بارے میں کئی باتیں کہی ہیں۔ وہ جو مالک کی قرأت پڑھتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ قرأت چند وجوں سے زیادہ ترجیح رکھتی ہے۔ کہ مالکیت انسانوں کے ساتھ عام ہے۔ اور غیر انسان بھی متعلق ہوتے ہیں بخلاف ملک اور بادشاہت کے کہ وہ انسانوں کے ساتھ خاص

ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ مالک کو مملوک پر پورا اختیار ہوتا ہے اگر چاہے۔ تو اپنے مملوک کو بیچ دے۔ یا کسی کو بخش دے۔ بخلاف بادشاہ کے کہ وہ اپنے رعیت پر یہ اختیار نہیں رکھتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مالکیت کی نسبت بادشاہت کی نسبت سے زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ مملوک کو مالک کی ملک سے باہر آنا ممکن نہیں ہے۔ اور رعیت کیلئے ممکن ہے کہ وہ بادشاہ کی رعایا ہونے سے اپنے اختیار کے ساتھ باہر آ جائے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ مالک کے مرتبے کی اپنے مملوک کے مرتبہ پر بلندی بادشاہ کے اپنی رعیت پر مرتبے سے زیادہ ہے۔ کیونکہ غلام رعیت کے مقابلہ میں زیادہ نچلی حالت اور زیادہ پستی میں ہے۔ پس مالکیت میں غلبہ اور قہر بادشاہت سے زیادہ ہوتا ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ غلام کو اپنے سردار کی خدمت واجب ہے۔ جبکہ رعیت پر بادشاہ کی خدمت واجب نہیں۔ چھٹی وجہ یہ ہے کہ غلام اپنے مالک کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا جبکہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر رعیت کا عمل اس سے جدا ہے۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ غلام کو اپنے مالک سے طمع لازم ہے۔ اور اس کے برعکس بادشاہ کو رعیت میں طمع ہوتی ہے۔ آٹھویں وجہ یہ ہے کہ بادشاہ سے جو کچھ متوقع ہے اس کی انتہا عدل وانصاف اور ہیبت اور حکومت ہے۔ جبکہ غلام کو اپنے مالک سے خوراک' پوشاک کی طلب اور آفت ورحمت میں تربیت کی زیادہ توقع ہے۔ پس مالک کی قرأت امید سے زیادہ قریب ہے۔ اور آدمی کو ہیبت' حکومت اور عدل وانصاف کے مقابلے میں معافی' پرورش' نرمی اور رحمت کی زیادہ ضرورت ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں واقع ہے **یعبادی کلکم جائع الامن اطعمته فاستطعمونی اطعمکم یعبادی کلکم عار الامن کسوته فاستکسونی اکسکم** یعنی اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو مگر جسے میں کھلاؤں۔ پس مجھ سے کھانا مانگو تاکہ میں تمہیں کھانا دوں' اے میرے بندو! تم سب برہنہ ہو مگر جسے میں لباس پہناؤں۔ پس مجھ سے لباس مانگو تاکہ میں تمہیں لباس پہناؤں' نوین وجہ یہ ہے کہ بادشاہ جب اپنے لشکر کے حاضرین کو دیکھتا ہے۔ تو بوڑھے' کمزور' پریشان حال' بیمار اور عاجز کو ہٹانے کے قابل قرار دیتا ہے۔ اور مالک جب اپنے غلاموں کے حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ تو کمزوروں' بیماروں اور بوڑھوں پر زیادہ رحمت فرماتا ہے۔ اور علاج و امداد

میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پس مالک کا مرتبہ بادشاہ سے بہتر ہے دسویں وجہ یہ ہے کہ مالک میں ملک کے مقابلہ میں ایک حرف زیادہ ہے۔ پس اس کا ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ گیارہویں وجہ یہ ہے کہ غلام کا اپنے مالک کے ساتھ تعلق رعیت کے اپنے بادشاہ سے تعلق زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ فقہ میں بیان کیا گیا ہے کہ غلام کا مالک سفر یا اقامت کی نیت کرے تو غلام اختیار کے بغیر مسافر اور مقیم ہو جاتا ہے بخلاف رعیت کے۔

ملک کی قرأت کی ارجحیت کی وجوہ

اور وہ لوگ جو ملک پڑھتے ہیں کہتے ہیں کہ ہر بادشاہ مالک ہے۔ جبکہ ہر مالک بادشاہ نہیں ہے۔ پس بادشاہی کی وصف مالکیت کی وصف سے بہتر ہے۔ نیز بادشاہ کا حکم مالک پر نافذ ہے۔ اور مالک کا حکم بادشاہ پر نافذ نہیں ہے۔ نیز بادشاہ کی حکومت زیادہ قوی' زیادہ مکمل' زیادہ شامل اور زیادہ عام ہے ہزار مالک ایک بادشاہ کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اور ایک شہر میں کئی مالک ہوتے ہیں۔ اور بادشاہ ایک کے سوا نہیں ہوتا اور رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا لفظ مالکیت پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر یہاں بھی لفظ مالک پڑھا جائے تو تکرار لازم آئے گا۔ نیز لفظ ملک ننانوے اسمائے حسنیٰ میں واقع ہے۔ جبکہ مالک وہاں نہیں ہے ہاں مَالِكَ الْمُلْكِ واقع ہے جو کہ بمعنی ملک ہے۔ نیز لفظ ملک قرآن شریف کے آخر میں مذکور ہے (مَلِكِ النَّاسِ) اور کلام اشرف چیز پر ختم ہوتا ہے۔ تو افتتاح کلام اسی چیز کے ساتھ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

قرأت مالک کی وجوہ پر بحث

اور بادشاہ کی اطاعت سب پر واجب ہے۔ اور مالک کی اطاعت سوائے اس کے غلاموں کے کسی پر واجب نہیں۔ یہ وہ وجوہ ہیں جو کہ دونوں قرأتوں کی ترجیح کیلئے ذکر کی جاتی ہیں۔ اور اس میں کئی بحثیں ہیں۔ کیونکہ بادشاہت انسانوں کے بغیر متعلق نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے سوا بادشاہ کے امر و نہی کے بھید کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کو عام بادشاہی حاصل تھی۔ نیز بادشاہی میں ایک اور

وجہ سے بھی عموم ہے۔ کیونکہ بادشاہ کو آزاد اور غلام دونوں پر قبضہ ہوتا ہے۔ اور آزادوں پر غلبہ زیادہ کامل ہے۔ اور رعایا کو جو بادشاہ کی ولایت سے نکلنا ممکن ہے۔ اس صورت میں ہے کہ اس کی ولایت عام نہ ہو اور یہاں جب یوم الدین کی اضافت واقع ہوئی تو عموم ولایت سمجھا گیا۔ اور حربی کافر کے غلام کو جائز ہے کہ وہ بھاگ کر دارالاسلام میں آ جائے۔ اور اپنے مالک کی ملک سے باہر آ جائے بلکہ اس کو شرعاً جائز ہے کہ اپنے مالک کو مجبور کر کے غلام بنا لے۔ اور جس طرح غلام پر اپنے آقا کی خدمت واجب ہے۔ اسی طرح رعیت کو بادشاہ کے حکم کی فرمانبرداری واجب ہے۔ اور یہ بھی خدمت کی ایک قسم ہے۔ اور غلام کو بھی اپنے مالک کی اجازت سے کمائی کرنے کا مستقل حق مل جاتا ہے۔ جس طرح کہ عبد ماذون کی بحث میں کتب فقہ میں مذکور ہے۔ اور رعایا کو بادشاہ کی اجازت کے بغیر حقوق حاصل کرنے اور حدود کی جزاء اور قصاص کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اور مالک کو اگرچہ غلام کے مال میں طمع نہیں ہے۔ لیکن غلام کی خدمت اور دوسرے منافع میں وہ ہمیشہ طمع رکھتا ہے۔ اور نیز اسے اپنے غلاموں پر رعب اور حکومت ہوتی ہے۔ اور معافی، نرمی، رحمت اور رعیت کے ضعیفوں کی تربیت بادشاہ سے بھی متوقع ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے ذمہ واجب ہے کہ کمزوروں کو کھانا اور لباس اور دوسری ضروریات صدقات کے مال سے مہیا کرے۔ اور اس کے ساتھ تمدن اور اجتماع کے مسئلہ میں رعب اور حکومت کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے بادشاہ دشمنوں سے رعیت کو محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہ تربیت اور حفاظت کی بہترین قسم ہے۔ اور حروف کی کثرت سے ثواب کی کثرت اس وقت ہے۔ جبکہ دونوں ثواب میں برابر ہوں۔ لیکن اگر تھوڑے حروف والا کلمہ زیادہ حروف والے کلمے سے افضل ہو تو ثواب کی توقع اس کے برعکس ہے۔ جیسا کہ دوسری سورتوں کے مقابلہ میں سورت اخلاص میں ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ لفظ ملک لفظ مالک سے چھوٹا ہے۔ پس یہ بہتر ہے۔ کیونکہ لفظ مالک پڑھنے سے آرزو کا لمبا کرنا لازم آتا ہے۔ کیونکہ جائز ہے کہ تلفظ پورا ہونے سے پہلے موت آ جائے۔ اور اسے پورا کرنا ممکن نہ ہو۔ یہ وہ بحثیں ہیں جو کہ مالک کی قرأت کی وجوہ میں کی جا سکتی تھیں۔

قرأت مِلک کی وجوہ پر بحث

رہ گئی وہ بحث جو کہ قرأت ملک کی ترجیح کی وجوہ میں ہے وہ یہ ہے کہ بادشاہ کی بادشاہی مالک کی مالکیت کے مقابلہ میں اس صورت میں عام ہوتی ہے۔ جبکہ مالک کو تمام موجودات کی طرف منسوب نہ کریں۔ جبکہ یہاں جب مالک کو یوم الدین کی طرف اضافت دی جو کہ ظرف محیط کائنات ہے۔ تو عموم میں مالک برابر ہو گیا۔ اور مالک کا حکم بادشاہ میں نافذ نہیں یہ اس صورت میں ہے کہ بادشاہ ملک میں داخل نہ ہو۔ اور یہاں اس مالک کا ذکر ہے کہ اس کی مالکیت تمام بادشاہوں۔ اور رعایا کو شامل ہے۔ اور مالک کی حکومت چونکہ جرمانہ نہیں رکھتی تو زیادہ قوی ہے۔ اور مالک جو کہ بادشاہ کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس سے مراد وہ مالک ہے جس کی مالکیت عام نہیں۔ اور وہ جو کہا گیا کہ شہر میں کئی مالک ہوتے ہیں۔ اور بادشاہ ایک کے سوا نہیں ہوتا۔ یہ بھی اسی مالک کے متعلق ہے کہ جس کی ملک کامل نہ ہو۔ اور یہاں جو مذکور ہے وہ مالک علی الاطلاق ہے۔ کہ ایک ذات کے سوا نہیں ہو سکتا۔ اور رَبّ الْعَالَمِیْنَ کے بعد مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ عام کے بعد خاص کے ذکر کے قبیل سے ہے۔ تکرار نہیں ہے۔ اور لازم نہیں کہ جو ننانوے اسماء حسنیٰ میں مذکور ہو وہ دوسرے اسماء سے افضل و اعلیٰ ہو۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ اور جب مالک الملک ننانوے ناموں میں ہے۔ تو مالک نام ساتھ شامل ہوا۔ کیونکہ مقید کے ضمن مطلق کا مذکور ہونا لازم ہے۔ اور ملک کا قرآن پاک کے آخر میں ذکر ہونا اس وقت شرف وفضیلت کا فائدہ دیتا ہے۔ جبکہ اس مقام پر اس نام کی تخصیص میں کوئی دوسرا فائدہ پیش نظر نہ ہو۔ اور یہاں دوسرا فائدہ پیش نظر ہے۔ جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا انشاء اللہ العزیز۔

بہرحال وجوہ ترجیح ہر طرف موجود ہیں۔ اور تواتر ہر طرف واقع۔ پس یہاں کلام کو طویل کرنا فضول ہے مجبوراً ہم دوسری تحقیق میں مصروف ہوتے ہیں۔

لفظ یوم کی تحقیق

جاننا چاہئے کہ عرف میں یوم طلوع آفتاب کی ابتداء سے لے کر اس کے غروب

ہونے تک کو کہتے ہیں۔ اور شرع شریف میں صبح صادق کے طلوع سے لے کر سورج کے غروب تک یوم ہے۔ اور کبھی مطلق وقت کے معنوں میں بھی آتا ہے خواہ دن ہو خواہ رات' خواہ سال ہو خواہ ماہ' جس طرح کہ کہتے ہیں کہ جس دن فلاں آئے تو یوں ہوگا۔ یعنی جس وقت کہ فلاں آئے۔ نیز کہتے ہیں کہ یوم صیفن اس طرح کے واقعات ہوئے۔ اور یوم خندق اس قسم کا اتفاق ہوا۔ حالانکہ یہ کئی مہینوں اور دنوں کی مدتیں تھیں۔ پس اس جگہ جب یوم کو دین کی طرف مضاف کیا تو معلوم ہوا کہ مطلق وقت مراد ہے۔ اور اس وقت کی حد دوسری بار صور پھونکنے کی ابتداء سے ہے۔ اور اس کی انتہا اس وقت ہوگی جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے۔ اور اگرچہ اس دوران کئی واقعات اور بے شمار حالات رونما ہوں گے لیکن چونکہ ان تمام واقعات سے مقصود جزا ہے۔ اس لئے اس دن کی دین کی طرف اضافت فرمائی۔ جس کا معنی جزا ہے۔ اگرچہ دنیا میں بھی بعض اوقات جزا کی صورت واقع ہوتی ہے۔ لیکن حقیقی بدلہ جو کہ صرف انعام یا صرف انتقام ہے دنیا میں متصور نہیں۔ اس لئے کہ ہر وہ انعام جو کہ دنیا میں ہے کسی نہ کسی قسم کے انتقام سے ملا ہوا ہے۔ اور انتقام جو کہ دنیا میں ہے وجود انعام میں لپٹا ہوا ہے۔

حمد کا اس مالکیت سے تعلق اور استحقاق حمد کی وجہ

باقی رہ گئی یہ بات کہ حمد کو اس مالکیت کے ساتھ کیوں متعلق فرمایا۔ اور اس مالکیت پر استحقاق حمد کی وجہ کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس روز حضرت خالق جل جلالہ کے فضل احسان کی بندگی کامل طور پر ظہور فرما ہوگی۔ کہ ایک کلمہ پر اور ایک گھڑی کے عمل پر غیر متناہی ابدی ثواب عطا ہوگا۔ نیز اس کا کمال عدل ظاہر ہوگا کہ اسباب غضب اور انتقام پر پوری قدرت کے باوجود جزا میں افعال و اعتقادات کے مناسب حد سے تجاوز نہیں ہوگا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی حکمت ظہور فرمائے گی کہ اچھے اور برے کے درمیان جدائی کمال حکمت کا تقاضا ہے۔ نیز اپنی ذات میں جزا ایک عمدہ نعمت ہے کہ ظاہر و باطن کی اصلاح کرتی ہے۔ اور شہوت و غضب کی پیروی سے تاریکی کے پردے جو کہ تہہ بہ تہہ ہو جاتے ہیں دور کرتی ہے۔ اور اس سے تمدن و اجتماعیت کا کام صورت پکڑتا ہے۔ نیز مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ایک ایسی صفت ہے

جو کہ رحمٰن ورحیم پر مرتب ہوئی ہے۔ کیونکہ رحمت خاص حقیقت میں ابدی سعادت ہے کہ اس کا ظہور یوم الدین کو ہوگا۔ نیز ربوبیت پر بھی متفرع ہے۔ کیونکہ ربوبیت کا منتہی انسان کے ظاہر و باطن کی اصلاح ہے۔ تا کہ اسے سعادت ابدیہ تک پہنچائے اور ربوبیت مقتضائے الوہیت ہے۔ پس ہر صف اپنے سے پہلی صفت پر مرتب اور متفرع ہے۔

یہاں مذکور دو مضامین کا مذکورہ پانچ اسماء سے کمال ربط

اب جاننا چاہئے کہ اس سورت میں دو مضمون ہیں پہلے حمد وثنا جو کہ بندے کی زبان سے بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتی ہے۔ دوسرے مطلب کی خواہش جو کہ حمد وثنا پوری کرنے کے بعد زیر نظر رکھتا ہے۔ اور اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے پانچ نام ذکر فرمائے گئے اللہ، رب، رحمٰن، رحیم، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جو کہ ریان کے معنوں میں ہے۔ ان پانچ ناموں کو ہر دو مضامین کے ساتھ کامل ربط ہے۔ اس لئے کہ پہلے تو حمد اللہ تعالیٰ کے ذاتی کمال کے اعتبار سے ہے جو کہ لفظ اللہ سے مفہوم ہے۔ اس کے بعد وجود اور اس توابع کا فیض دینے کے اعتبار سے ہے جو کہ اسم ربّ کا مفاد ہے اس کے بعد اسباب معاش اور دنیا میں باقی رہنے کے اسباب کو مہیا کرنے کی نعمت کے اعتبار سے ہے جو کہ لفظ رحمٰن سے مفہوم ہے۔ اور اس کے بعد اصلاح معاد کی توفیق کے اعتبار سے ہے جو کہ لفظ رحیم کا مضمون ہے۔ اس کے بعد حمدِ نعمت جزا پر ہے جو کہ حمد وشکر کو پورا کرنے یا ان میں خلل ڈالنے پر مرتب ہوتی ہے۔

اور جن چیزوں کی طلب منظور ہے وہ چند چیزیں ہیں۔ پہلی عبادت اور وہ الوہیت کا مقتضیٰ ہے۔ دوسری امداد طلب کرنا اور وہ ربوبیت کا تقاضا ہے۔ تیسری طلب ہدایت اور وہ رحمانیت کا تقاضا ہے۔ چوتھی استقامت راہ اور وہ رحیمیت کا تقاضا ہے۔ پانچویں انعام اور وہ مالکیت کا مقتضا ہے مگر استقامت کے ساتھ۔ جس طرح استقامت نہ ہونے کی صورت میں غضب بھی مقتضائے مالکیت ہے۔

ان پانچ اسماء کی تخصیص کی ایک اور وجہ

اور تعلیق حمد کے ساتھ ان پانچ ناموں کو مخصوص کرنے کی وجہ میں اس طرح یہی کہا

گیا ہے کہ آدمیوں کے درمیان تعریف وستائش چار میں سے ایک وجہ کیلئے ہوتی ہے۔ ایک تو محمود کے کمال ذاتی کی وجہ سے اگر چہ صاحب احسان نہ ہو۔ دوسری وجہ اس شخص کے احسان کا حمد کرنے والے تک پہنچنا۔ تیسری وجہ اس سے احسان کی طمع اور توقع کرنا۔ چوتھی اس کی ناراضگی کے خوف اور خطرہ کی وجہ سے۔ پس کمال ذاتی کو اسم ذات یعنی لفظ مبارک 'اللہ' سے بیان فرمایا جو کہ تمام کمالات کا جامع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور وجود اور اس کے توابع عطا کرنے کا احسان پہنچنے کو لفظ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ اور معاش و معاد کی اصلاح کو جس کی بندے کو جناب الٰہی سے امید ہے رحمٰن ورحیم کے دولفظوں سے واضح فرمایا۔ اور روز جزا کے خوف وخطرہ پر مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے دلالت فرمائی۔ گویا اس طرح ارشاد فرمایا گیا اگر بندے میرے کمال ذاتی کی وجہ سے میری تعظیم کریں تو میرے لائق ہے۔ کیونکہ میرا نام اللہ ہے۔ اور اگر احسان پہنچنے پر نظر کرتے ہوئے میری تعظیم کریں۔ نیز میرے شایاں ہے۔ کیونکہ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ میری صفت ہے۔ اور اگر دنیا و آخرت میں میرے احسان اور انعام کی توقع کی وجہ سے میری تعریف کریں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ کیونکہ میں رحمٰن ورحیم ہوں۔ اور اگر عذاب کے خوف کا لحاظ کر کے ثناء وحمد کریں تو بھی جائز ہے کہ یوم جزا کا مالک میں ہی ہوں۔ رباعی

میں تیری بندگی بجا نہیں لا سکتا کیا کروں۔ تیرے احسان کے بوجھ تلے ہوں کیا کروں تجھی کو حمد ہے۔ اور خوف وامید بھی تجھ سے ہے میں ہیچ ہوں کہ تجھی سے میرا وجود ہے کیا کروں۔

نیز کہا گیا ہے کہ ان پانچ ناموں کی تخصیص اس لئے ہے کہ آدمی پر عمدہ نعمتیں ان ہی پانچ ناموں کے نشانات ہیں۔ اس لئے کہ پہلے اس کو عدم کے مخفی مقام سے مقتضائے الوہیت کے ساتھ جلوہ ظہور میں لائے۔ پھر اسے کئی اقسام کی نعمتوں کے ساتھ مقتضائے ربوبیت کی وجہ سے پالا۔ پھر اس کی نافرمانی اور عیب کو چھپایا گیا۔ اور رسوائی نہ فرمائی اور یہ رحمانیت کی صفت کا تقاضا ہے۔ پھر توبہ کی گنجائش رکھی گئی اگر وہ توبہ کرے تو قبول فرمائی جاتی ہے۔ اور صاف کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ صفت رحیمی کا تقاضا ہے۔ پھر اسے اس کے اعمال کے

مطابق جزا دی گئی اور یہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا مضمون ہے۔

متعلقات اِيَّاكَ نَعْبُدُ

اور جو کچھ اِيَّاكَ نَعْبُدُ سے متعلق ہے یہ ہے کہ اہل عربیت کے نزدیک مفعول کو پہلے لانا تخصیص کا معنی دیتا ہے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اور نعبدك کے لفظ سے یہ خصوصیت سمجھ نہیں آتی۔ اور اس ذات پاک کے عبادت کے مخصوص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت اپنے غیر کی انتہائی تعظیم کیلئے انتہائی عاجزی کرنا ہے۔ جبکہ یہ اپنے اختیار سے صادر ہو۔ پس مسخر ہو کر عاجزی کرنا، تمسخر اور انتہائی تعظیم سے کم تعظیم کرنا عبادت نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح جب مجبوراً عاجزی ہو تو وہ بھی عبادت میں شمار نہیں ہوتی۔ اور حقیقت عبادت ظاہری طور پر اس لائق نہیں کہ کسی کیلئے کی جائے مگر اس ذات کیلئے جس سے اسے انتہائی انعام پہنچا ہو اور وہ ذات پاک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ بندے کے تین حال ہیں ماضی، حاضر، مستقبل، ماضی میں بندہ محض معدوم تھا اسے عدم کے پردے سے وجود کی عزت سے مشرف فرمایا گیا۔ وقد خلقتك من قبل ولم اتك شيئا حالانکہ میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا فرمایا جبکہ تو کچھ بھی نہ تھا پھر نطفہ کی حالت میں مردہ تھا اسے زندہ کیا گیا وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ تم مردہ تھے۔ پس اس نے تمہیں زندہ فرمایا۔ پھر وہ جاہل تھا اسے تعلیم دی گئی اور اسباب علم جو کہ حواس اور عقل ہیں اسے بخشے گئے۔ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور اس نے تمہیں کان، آنکھیں اور دل عطا فرمائے۔

اور رہا حال تو اس کی حاجتیں گنتی کی حد سے باہر ہیں۔ اور اس کی عمر کی ابتداء سے لے کر آخر تک اس کی ضرورت کی وجہوں کا اندازہ کرنا چاہئے کہ کہاں تک پہنچتی ہے۔ اور باوجود کئی قسم کی تقصیروں اور نافرمانیوں کے جو کہ ہر وقت اس سے صادر ہوتی ہیں اس کی حاجتوں کو رفع کرنے میں اس کا فضل اور احسان منقطع نہیں ہوتا۔ رہا مستقبل۔ پس موت کی ابتداء سے لے کر جنت میں پہنچنے تک وجوہ انعام اور کئی قسم کے عذاب سے حفاظت کی۔

صرف اسی دربار سے امید ہے۔ پس بندے کو کسی حالت میں بھی اس کے سوا جائے پناہ نہیں (اقول وباللہ التوفیق نبوت وولایت کی پناہ گاہیں دراصل اس کی پناہیں ہیں کیونکہ نبوت و ولایت اسی کی عطا ہے محمد محفوظ الحق غفرلہ)۔ پس بندے کی عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہے نہ کہ کوئی اور۔

جو کچھ دنیا میں دیکھا اور سنا جاتا ہے یا کوئی بھی چیز ہے کہ اس سے فی الوقت نفع حاصل ہوتا ہے نہ وجود سے پہلے تھا نہ موت کے بعد ہوگا جیسے سورج' چاند' دریا' زمین اور پہاڑ یا کوئی نفع اس سے ماضی میں پہنچا ختم ہو گیا۔ مثل آباؤ اجداد' دودھ پلانے والی وغیرہ یا اس سے آئندہ نفع کی توقع ہے مثل پاکیزہ ارواح کی امداد کے۔ اور وہ ذات جس کا نفع تینوں حالتوں میں بندے کو محیط ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں۔ نیز اس کے ماسوی جو کچھ ہے مسکین اور فقیر یعنی اسی کے دربار کا محتاج ہے۔ اور ہر محتاج اپنے نفس کی حاجت میں گرفتار ہے۔ پس اس سے غیر کو فائدہ پہنچانا غنی مطلق کی امداد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور غنی مطلق جو کہ ہر مخلوق کی حاجتوں کو پورا فرماتا ہے وہی ذات مقدس ہے۔ اور استحقاق عبادت اسی کی ذات میں منحصر ہے۔ اور اسی لئے فرمایا وَقَضٰی رَبُّکَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ تیرے رب نے فیصلہ فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت مت کرو۔

ملحدوں کے اعتراض کا جواب

ہم یہاں پہنچے کہ بعض بے دین اعتراض کے طریقہ سے کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ غنی مطلق ہے ہماری عبادت کی پرواہ نہیں رکھتا۔ پس ہمیں کیا ضرورت ہے کہ بے فائدہ مشقت اٹھائیں اور اس ذات پاک کے لئے جس پر تمام ادیان متفق ہیں عبادت واجب کرنے میں راز کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمال ذاتی' صفاتی اور فعلی کے اعتبار سے تقاضا فرماتا ہے کہ جو نقصان سے خالی نہ ہو وہ اس کے حضور عاجزی کرے۔ اور اس کی انتہائی تعظیم کرے۔ اس حکمت کی رعایت کرتے ہوئے کہ ہر شے کو اس کے اصل مقام پر رکھنا چاہئے۔ پس عبادت کا واجب کرنا مقتضائے حکمت ہے نہ کہ نفع حاصل کرنے اور ضرورت ہونے کی وجہ سے۔

اور ظاہر ہے کہ ہر کمال تقاضا کرتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں نقصان والا عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرے۔ ورنہ نقصان اور کمال دونوں کا برابر ہونا لازم آتا ہے۔ اور وہ خلاف حکمت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر صاحب کمال کی اس سے کم مرتبے والے تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ نیز جب دنیا میں اللہ تعالیٰ کا انعام خاص کر نوع انسانی پر انتہا کو پہنچا ہوا ہے کہ اس سے اوپر کا تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ اسے دفتر الوہیت کا خلاصہ بنایا گیا ہے۔ اور اپنی صفات کاملہ وجود' حیات' علم' ارادہ' قدرت' سمع' بصر اور کلام کا جلوہ اس پر ڈالا گیا۔ اور عالم کو اپنے تمام اوصاف سمیت اس میں ودیعت رکھا گیا۔ جیسا کہ اس میں سے کچھ حصہ پہلے بیان ہوا۔ پس لازم ہوا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اسی کے ساتھ مصروف رکھے۔ اور وہ نعمتیں جن چیزوں کیلئے پیدا کی گئیں انہیں میں صرف کرے۔ پس عقل' معرفت کیلئے دی گئی اور جسمانی آلات اس لئے کہ اعضاء کو عبادت کی شکل میں ڈھالیں اور عبادت کو معرفت کا نگہبان بنایا گیا کہ اگر عبادت نہ ہوگی تو معرفت کا تخم محفوظ نہیں رہے گا بلکہ اگر سوچا جائے تو آدمی کا اصل سرمایہ ہی معرفت ہے۔ اور عبادت تو اسے باور آور کرنے اور بڑھانے کا طریقہ ہے۔ اس لئے کہ جب بدن کے اعمال دل کے اعمال کی موافقت کریں تو حضور اور توجہ کی طاقت زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ ان میں قوی رابطہ قائم ہے ہر عمل قلبی کو عمل بدنی میں ایک خاص تاثیر ہے۔ اور ہر عمل بدنی کو عمل قلبی میں خاص تاثیر ہے۔ پس انسان جو کہ معرفت و عبادت کیلئے پیدا کیا گیا اگر ان دونوں چیزوں کو خلل میں ڈال دے تو انسان نہیں رہتا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ جس طرح عبادت حکمت کل کا مقتضیٰ ہے اس طرح انسان کی صورت نوعیہ کا بھی مقتضیٰ ہے۔

شرع کی ضرورت

اور اگر ملحدوں میں سے کوئی کہے پھر شرع کی کیا ضرورت ہے معرفت و عبادت میں عقل کافی ہے ہم کہیں گے کہ عقل کو اپنے آپ کھلا نہیں چھوڑا گیا بلکہ وہم و خیال اس کے پیچھے ہیں۔ اور وہ مقام نزاع و معارضہ میں رہتی ہے اگر شرع شریف کی تائید نہ ہو تو صرف

عقل معرفت وعبادت سے متعلق اکثر امور کو سمجھنے میں عاجز رہے۔ پس عقل بمنزلہ نظر ہے۔ اور شرع سورج کی شعاع کی طرح کہ اس کے بغیر۔ جیسا کہ چاہئے چیزوں کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ نیز آدمی اپنی زندگی میں معاملات کا محتاج ہے۔ اور اس کی زندگی جانوروں کی زندگی کی طرح نہیں کہ اپنی نوع کی امداد کے بغیر تنہا ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔ اسی لئے اسے مدنی الطبع کہتے ہیں۔ اور تمدن اجتماع اور معاملات جو کہ آدمیوں میں جاری ہیں اس وقت پائیدار اور قائم رہ سکتے جبکہ عدل کے قاعدے جاری کئے جائیں۔ اور عدل کے قاعدوں پر تمام لوگوں کا اتفاق میسر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قواعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوں۔ اور لوگ جان لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس سے پھرنا نہیں چاہئے۔ اور یہ معنی پورا نہیں ہوتا مگر امید ثواب اور خوف عذاب کے ساتھ اور کسی کی امید اور خوف دل میں پائیدار نہیں ہوتا مگر جبکہ اس شخص کی صفات کو تکرار اور ہمیشگی کے ساتھ دل پر رکھیں اور ذکر قلبی کامل نہیں ہوتا اور استمرار اور ہمیشگی کی صورت نہیں بنتی مگر جبکہ اعضاء کے افعال بھی اس کے ساتھ موافقت کریں۔ اور بھی عبادت ہے۔

کمال انسانی کا معیار اور عبادت کی اہمیت

نیز کمال انسانی یہ ہے کہ اس کے دل کا آئینہ صاف اور روشن ہو۔ اور جلوہ گاہ حق کے سامنے ہو۔ اور ملائکہ کے دلوں کی صفائی کی حد کو پہنچ جائے ورنہ تاریک خواہشات کی دم بدم پیروی کی وجہ سے اس آئینے پر زنگ تہہ بہ تہہ ہو کر اسے چارپایوں کی حد تک پہنچا دے گا اور دل کی جلا اور صفائی مجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اور حقیقت مجاہدہ روحانی تاریکیوں کو دور کرنا ہے جو کہ دل کی بیماریاں ہیں۔ اور بدن سے جدا ہونے کے وقت روح کو شدید تکلیف پہنچاتی ہیں اور ان بیماریوں کا قلع قمع عبادت کے بغیر متصور نہیں ہوتا۔ عبادت کی ہمیشگی ہی وہ شے ہے جو کہ مشاہدہ کی وجہ سے دل کو نورانی کر دیتی ہے۔ اور زبان کو ذکر سے مشرف کرتی ہے۔ اور اعضاء و جوارح کو خدمت سے مزین کرتی ہے۔ پس عبادت اگرچہ ظاہر میں عاجزی ہے۔ لیکن باطن میں کمال عزت وحسن ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جو شخص عبادت میں مشغول ہوتا ہے اسے ایک خاص لذت اور تازگی حاصل ہوتی ہے کہ بیان میں نہیں آتی۔

آنکھ کی ٹھنڈک، دل کی نورانیت اور روح کی تازگی سب اس میں موجود ہے۔ اور جو شخص عبادت کی لذت کا انکار کرتا ہے وہ جو ہر مردی سے عاری آدمی کے مشابہ ہے کہ مقاربت کی لذت کو نہ پہنچانتے ہوئے انکار کرتا ہے یا مادرزاد اندھے کی طرح جو کہ آنکھوں کی لذت کا انکار کرتا ہے۔

اور عبادت کی حقیقت عالم غرور سے عالم سرور کی طرف منتقل ہونا ہے یا ظلمت کدۂ خلق سے دربار نورحق کی طرف سفر کرنا ہے۔ اور جمال ازلی کا مشاہدہ ہے۔ اور نسبت امکان کا اثبات ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ شرح صدر کا ذریعہ بنتی ہے۔ جس طرح کہ قرآن مجید میں اس کا اشارہ فرمایا گیا۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ اور ہم جانتے ہیں کہ ان کے کہنے سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے۔ تو اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں۔ اور سجدہ گزاروں میں سے ہو جائیں۔ اور اپنے ربّ کی عبادت کیجئے یہاں تک یقین آ جائے۔

ایاك نعبد کی مالك یوم الدین سے مناسبت اور درجات عبادت

باقی رہی یہ بات کہ لفظ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے ساتھ کیا مناسبت و تعلق ہے کہ اس کے بعد لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کے تین درجے ہیں پہلا یہ کہ ثواب میں رغبت کیلئے ہو یعنی حور و قصور اور باغات و انہار میں اور یہ حقیقت میں معاملہ اور تبادلہ ہے۔ اس لئے کہ جب عقلمند یقین سے جانے کہ دنیا، لذتیں اور سامان سب فانی ہیں۔ اور تکالیف کے ساتھ مکدر اور نقصانات کے ساتھ ملوث اور ایک دوسرا جہان اس سے افضل اور باقی رہنے والا آگے آنے والا ہے۔ تو وہ اپنے قیمتی اوقات کو اس فانی دنیا سے پھیر کر اس باقی کو حاصل کرنے میں خرچ کرتا ہے۔ اور اس عبادت کا پھل روز جزا کے بغیر حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ثواب کی تمام قسمیں اسی روز ملیں گی دوسرا درجہ یہ کہ عبادت عذاب کے خوف سے ہو اس لئے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے تشریف لا کر ڈرایا ہے کہ اگر بندے عبادت نہیں کرتے تو عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اور ایک آدمی کی خبر جبکہ وہ سچا اور امین ہو یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ تو صادق اور سچے ایک لاکھ ۲۴ ہزار پیغمبروں کی خبر کا مقام کیا ہو

گا؟۔ پس یہ عبادت غلام اور کنیز کی فرمانبرداری کی مثل ہے جو کہ مار پیٹ اور تازیانے کے ڈر سے مجبور ہو کر اپنے مالک کی خدمت میں کمی نہیں کر سکتے۔ اور اس عبادت کے پھل کا ظہور جو کہ عتاب سے خلاصی اور عذاب سے نجات ہے یہی روز جزا کے ساتھ متعلق ہے۔ تیسرا درجہ یہ کہ عبادت مشاہدہ حق کیلئے ہو۔ اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اسی لئے نماز کی نیت میں یہی تعلیم دی گئی ہے کہ اصلی للّٰہ کے حصول میں اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے نماز پڑھتا ہوں۔ جبکہ لثواب اللّٰہ وللخلاص من عذاب اللّٰہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ثواب کیلئے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کیلئے کی تعلیم نہیں دی گئی۔

خدا اور بندے کے درمیان رابطے کا تقاضا

اور درحقیقت وہ رابطہ جو کہ بندے اور خدا کے درمیان واقع ہے ثواب وعذاب سے قطع نظر کر کے عبادت کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ معبودیت غلبہ اور ہیبت کا سبب ہے۔ اور عبودیت خضوع اور ذلت کا تقاضا کرتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس روز کے سوا مشاہدہ حق پورا نہ ہوگا دنیا کے مشاہدہ کو اس مشاہدہ کے ساتھ کیا نسبت؟ اگرچہ مشاق نے حالت سکر میں اس کے خلاف دم مارا ہے۔ چنانچہ کہنے والے نے کہا آج جبکہ تیرا جمال بے حجاب ظاہر ہے۔ تو میں حیرت میں ہوں کہ کل کا وعدہ کس لئے ہے۔ پس عبادت کو ان تینوں درجوں میں روز جزا سے تعلق ہے۔ اور اسی لئے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پر مرتب فرمایا گیا۔

معبود کا ذکر یعنی ایاک پہلے لانے کی حکمت

اور معبود کا ذکر پہلے فرمایا تاکہ خوف واجلال کا ذریعہ ہو۔ اور دوران عبادت دائیں بائیں کی طرف توجہ نہ رہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ نامی گرامی پہلوانوں میں سے ایک پہلوان نے اپنے سے کم تر آدمی سے کشتی کی۔ اور عین کشتی کے دوران لوگوں نے اس کم تر آدمی سے کہا کہ تجھے کچھ علم ہے کہ یہ کون ہے؟ فلاں پہلوان اور استاد ہے صرف اسی قدر کہنے سے وہ گر گیا۔ اور مغلوب ہو گیا جب پہلوانوں کے استاد کا نام اس قدر خوف واجلال کا سبب ہوا

ہوگا تو قوی ومتین کا نام کس قدر خوف واجلال کا موجب ہوگا۔

نیز اللہ تعالیٰ کے ذکر کو پہلے لانے میں یہ بھی حکمت ہے کہ آدمی کو ایک قوت حاصل ہو جائے کہ اس قوت کی وجہ سے بندگی کا بوجھ آسان ہو جائے جس طرح کہ کوئی طاقت والا کام کرنا چاہے۔ تو وہ اس سے پہلے یاقوت یا طاقت دینے والی غذا استعمال کرتا ہے۔ تاکہ اس بھاری کام کے کرنے پر امداد کرے۔ نیز جب اللہ تعالیٰ کا نام عبادت سے پہلے لیا تو محبوب حقیقی کا معنوی قرب حاصل ہوگا۔ اور اپنے محبوب کی بارگاہ میں عاشق کو کسی قسم کی تکلیف ادراک واحساس نہیں ہوتا۔ پس بندے کو اپنے محبوب کی بارگاہ میں دوران عبادت کسی قسم کی تکلیف اور ملال نہ ہو۔ اور وہ اسے شوق وذوق سے ادا کرے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے ذکر کی خاصیت ہے کہ وہ دل سے شیطان کو بھگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ بے شک جو متقی ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال مس کرے فوراً ذکر کرتے ہیں تو اسی وقت وہ بصیرت والے ہو جاتے ہیں۔ پس بندے کو چاہئے کہ عبادت سے پہلے ذکر معبود کرے تاکہ عبادت کا چور شیطان کاہلی اور غفلت کی وجہ سے نقصان نہ کرے۔ اور عبادت محفوظ رہے۔

صیغہ جمع نعبد میں لانے میں نکتہ

نیز جاننا چاہئے کہ عبادت گزار ایک ہے۔ اور نعبد کا صیغہ جمع کیلئے ہے یعنی ہم سب عبادت کرتے ہیں۔ اس صیغہ کے اختیار کرنے میں کیا نکتہ ہے؟ نکتہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ناقص عبادت کو تمام عابدوں کی عبادت کاملہ میں ملا کر بارگاہ اقدس میں پیش کرتا ہے۔ تاکہ کرم کی وجہ سے عبادات میں فرق نہ کریں۔ اور بعض کے ناقص ہونے کی وجہ سے تمام کو رد نہ فرمائیں اور انبیاء علیہم السلام اولیاء بلکہ ملائکہ مقربین کی عبادات کے ہمراہ اس ناقص عبادت کو بھی مقبول قرار دیں۔ جس طرح کہ فقہ میں لکھا ہے کہ اگر ایک شخص دس چیزوں کو ایک قیمت کے عوض فروخت کرتا ہے۔ اور ان چیزوں میں سے بعض ناقص ہوں۔ اور بعض کھری تو خریدار کو یہ حق نہیں کہ کھری چیزیں لے لے اور ناقص کو واپس کردے۔ بلکہ یا سب کو قبول کرے یا سب کو رد کرے۔ اور یہاں جب معاملہ سب سے بڑے کریم کی بارگاہ

میں ہے رد کا تو تصور نہیں ہو سکتا۔ البتہ سب مقبول ہوں گی۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا۔ نیکوں کے طفیل بروں کو قبول فرماتے ہیں۔ کیونکہ جو موتی لیتا ہے وہ دھاگہ واپس نہیں دیتا۔

نیز جمع کا صیغہ لانے میں اشارہ ہے نماز با جماعت کی طرف' گویا مقام عبادت مقام اجتماع ہے۔ اور اجتماع کے بغیر عبادت ناقص ہو جاتی ہے۔ نیز صیغہ جمع کی تلقین میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی عزت افزائی ہے گویا اس طرح فرمایا گیا کہ جب تو نے اپنی بندگی کو میری ذات سے درست کر لیا اور میری بندگی سے تو نے عار نہیں کی۔ تو میں نے تجھے ایک جماعت کے حکم میں رکھا اور جمع کے لفظ کی تلقین فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اِبْرَاهِيمَ كَانَ اُمَّةً بے شک ابراہیم ایک امت تھے۔ نیز اگر اِیَّاكَ اَعْبُدُ کہتا تو اس کا معنی یہ بنتا کہ میں تیرا بندہ ہوں۔ اور جب اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہا تو اس کا معنی اس طرح ہوا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں۔ اور یہ مضمون ادب اور عاجزی کے مقام کے ساتھ زیادہ موزوں ہے۔

متعلقات اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ

اور جو کچھ کہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے متعلق ہے یہ ہے کہ استعانت کی حقیقت' امداد طلب کرنا ہے۔ کسی کام پر مدد کرنے کی چار قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کام پر قدرت بخشے۔ دوسرے یہ اس کام کو آسان فرمائے۔ تیسرے یہ کہ اس کام کے نزدیک کر دے۔ چوتھے وہ کام کرنے پر ابھارے اور رغبت دلائے۔ مثلاً عبادت کیلئے عقل و شعور اور ہاتھ پاؤں بخشنا پہلی قسم میں سے ہے۔ اور رکاوٹوں اور مصروفیتوں کو دور کرنا۔ اور دلجمعی عطا کرنا دوسری قسم ہے۔ اور اس کی ضرورت کا احساس دل میں ڈالنا اور اس کے حسن کو عقل کی نظر میں جلوہ گر کرنا اور لذت عبادت اور قلبی فرحت کو زیادہ کرنا تیسری قسم میں سے ہے۔ اور انبیاء و اولیاء سے کسی مرشد کو پیدا کرنا تا کہ ہر وقت نصیحت اور عبادت کی ترغیب و تاکید کرے چوتھی قسم میں سے ہے۔

اور یہاں اِیَّاكَ کو نَسْتَعِیْنُ پر پہلے لانا بھی حصر و تخصیص کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی ہم تیرے غیر سے مدد طلب نہیں کرتے۔ اور یہ استعانت یا خاص ہے عبادت کیلئے یا عام ہے

دنیا و دین کے تمام امور کیلئے۔ اگر اس سے خاص استعانت مراد ہے۔ تو اس استعانت کا راز یہ ہے کہ عبادت اگرچہ بندے کا کسب اور عمل ہے۔ لیکن بندے کا عمل دل میں پیدا ہونے والے ارادہ سے ہے کہ اس کے واقع ہونے سے پہلے بندے کو اس کا شعور نہیں ہوتا۔ پس وہ نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے۔ نیز عبادت کے نفع و نقصان کا علم۔ پھر اس علم کو دل میں جگہ دینا اور پکا کرنا یہ بھی خدا تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ہے۔ بندے کو اس میں دخل نہیں ہے۔ اور نیز عقل کا کام یہ ہے کہ عاقبت بمعنی انجام پر نظر رکھے جس کا انجام زیادہ بہتر ہو اسے اختیار کرے اگرچہ ابھی اس میں کسی قسم کی مشقت اور تکلیف لازم آئے۔ اور نفس کی خواہش ہمیشہ اسی چیز کو پسند کرتی ہے جو اسے فی الحال نفع دے اور کاموں کے انجام اس پر پوشیدہ رہتے ہیں۔ پس عقل اور خواہش نفس ہمیشہ کھینچا تانی میں رہتے ہیں۔ اور جھگڑتے ہیں غالب طور پر حرص کا لشکر غلبہ کرتا ہے۔ اور دل کی ہلاکت تک کھینچ لے جاتا ہے۔ اور اس لشکر کو اللہ تعالیٰ کی امداد کے بغیر دور کرنا ممکن نہیں ہے۔

عبادت میں رکاوٹیں اور دو شبہات

نیز رکاوٹوں کو دور کئے بغیر عبادت آسان نہیں ہوتی۔ اور وہ چار چیزیں ہیں دنیا' گمان' شیطان اور نفس اور نیز عبادت ممکن نہیں ہوتی جب تک کہ حائل ہونے والی چیزوں کو دور نہ کیا جائے۔ اور وہ چند چیزیں ہیں مصیبتیں اور مصیبتوں کے خطرات اور مختلف قسم کے وہم اور غم۔ نیز عبادت درست نہیں ہوتی مگر ان چیزوں کو ختم کر کے جو کہ عبادت میں عیب پیدا کرتی ہیں۔ جیسے ریا' دکھاوا' اور خود بینی وغیر ذلک اور نیز عبادت پوری نہیں ہوتی مگر اس کے اسباب کے وجود کے ساتھ جو کہ خوف' امید اور مشاہدہ حق کا اشتیاق ہے۔ اور یہ تمام چیزیں مشکل گھاٹیاں ہیں کہ ان کو طے کرنا اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن یہاں دو شبہ وارد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اگر عبادت تقدیر میں ہے۔ تو مدد بھی ہوگی مدد مانگنے کا فائدہ کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی امداد اکثر اوقات میں انہیں کو حاصل ہوتی ہے جو کہ اس کے دربار سے مدد مانگتے ہیں۔ پس یہ مدد حاصل کرنے کیلئے سبب عادی ہے۔ اور اسباب عادیہ میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا فائدہ رکھتے ہیں ان کا فائدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی

عادت جاری کر کے ان چیزوں کو مقصد پانے کا وسیلہ بنایا ہے۔ جیسے کھانا استعمال کرنا پیٹ بھرنے کو اور پانی پینا پیاس دور کرنے کو۔ پس جبری اور قدری کا اعتراض غلط ہے۔

دوسرا شبہ یہ ہے کسی عمل پر مدد مانگنا شروع کرنے سے پہلے مناسب ہے نہ کہ اس کے بعد۔ پس چاہئے تھا کہ مدد مانگنا ذکر میں بھی عبادت سے پہلے رکھا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت وسیلہ ہے۔ اور مدد مانگنا حاجت ہے۔ اور وسیلے کو حاجت پر پیشگی ہے۔ اور چونکہ مدد مانگنا عبادت کے پورا ہونے کیلئے ہے۔ اور ہر چیز کو پورا کرنا اس شئی کو شروع کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ تو استعانت کو بھی عبادت کے بعد لائے۔ گویا بندہ اس طرح عرض کرتا ہے کہ میں نے تیرے حکم سے تیری عبادت کو شروع کر دیا ہے۔ رہ گیا اس کا پورا کرنا وہ میرے اختیار میں نہیں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی روکنے والا روک دے اور کوئی عارضہ پیش آئے۔ پس اس کو پورا کرنے میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں۔ پس بے شک مومن کا دل رحمان کی قدرت کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

اور اگر عام ہے دنیا اور دین کے کاموں میں تو اس اختصاص کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے غیر کی مدد کرتا ہے اس کے کام کی انتہا یہ ہے کہ اس کے دل میں اس غیر کی مدد کرنے کا جذبہ ڈال دیتے ہیں۔ اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ پس گویا بندہ کہتا ہے کہ تیرے غیر سے میری امداد ممکن ہی نہیں مگر اس وقت جبکہ تو اس کی امداد فرمائے تا کہ وہ مدد کرنے کے اسباب مہیا کرے۔ پھر اس کے دل میں میری مدد کرنے کا جذبہ تو ڈالے۔ پس میں وسیلوں سے قطع نظر کرتا ہوں۔ اور تیری امداد کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔

مقام استعانت کی وضاحت

اس مقام کی وضاحت یہ ہے کہ بندے کو بظاہر ایک قسم کی قدرت دی گئی ہے اس کی وجہ سے وہ گمان کرتا ہے کہ کرنا اور نہ کرنا میرے اختیار میں ہے۔ لیکن کوئی کام کرنے کو نہ کرنے پر ترجیح دینا ہرگز اس کو اپنی طرف سے میسر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر ترجیح دینے والی طاقت بندے کی طرف سے ہو تو اس پر بھی اعتراض ہوگا یہاں تک کہ تسلسل لازم آئے گا۔ پس وہ ترجیح دینے والی طاقت نہ ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ پس استعانت بھی

اللہ تعالیٰ ہی سے شایاں ہے۔ اور نیز ہم نے دیکھا ہے کہ تمام مخلوقات اپنی مطلوبہ چیزوں کو طلب کرتی ہیں۔ حالانکہ قدرت، عقل، شعور، کوشش اور محنت میں کوئی بھی کمی نہیں کرتا لیکن بعض کے سوا کوئی مطلب تک نہیں پہنچتا۔ پس غیبی امداد کے بغیر مطلب کا حصول نہیں ہوتا۔ نیز بارہا دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان نے دوسرے سے حاجت طلب کی اور اس شخص نے طویل مدت تک اسے روکے رکھا اور لیت ولعل میں وقت گذار دیا۔ پھر اچانک اس کی حاجت کو پورا کر دیا۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ اس شخص کے دل میں حاجت پوری کرنے کا جذبہ پیدا کرنا، یہ غیب کی طرف سے ہے۔ پس مرد مومن کو جو کہ شرک سے بھاگتا ہے شروع ہی سے چاہئے کہ غیر کی مدد کو جو کہ ظاہر میں مدد ہے۔ اور معنی میں اصلاً قدرت نہیں رکھتا۔ نظر سے گرادے اور قادر حقیقی کی امداد پر اکتفا کرے۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت خلیل علیہ السلام کو نمرود لعین نے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر آگ میں ڈال دیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ اگر آپ کو مجھ تک کوئی حاجت ہو تو فرمایئے تو حضرت خلیل علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ تیری طرف مجھے کوئی حاجت نہیں ہے حضرت جبرائیل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کیجئے تو حضرت خلیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ چھپے اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ میرے عرض کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اور جب بندۂ مومن نماز میں کھڑا ہوا اور اس کے دونوں پاؤں چلنے اور حرکت کرنے سے رک گئے اور دونوں ہاتھ پکڑنے سے بند ہو گئے۔ اور اس کی زبان سوائے قرأت و ذکر کے کچھ نہیں کہہ سکتی گویا طلب اور بھاگنے کے اسباب جس طرح کہ حقیقت میں بیکار تھے ظاہر میں بھی بیکار ہو گئے اس وقت ان اسباب کو بیکار دیکھ کر حقیقت حال کی طرف چلا اور کہا اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

نیز مفسرین نے کہا ہے کہ جب بندۂ مومن نے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہا تو ڈرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عبادت کی نسبت اپنی طرف کر کے خود بینی میں گر گیا ہو اس ڈر کو دور کرنے کیلئے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تلقین فرمائی گئی۔ اور یہیں سے نعبد کو نستعین سے پہلے لانے کا راز واضح ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس صورت میں دو مقام ہیں۔ مقام معرفت ربوبیت اور مقام معرفت

عبودیت اور جب یہ دونوں مقام جمع ہو جائیں تو بندے کا اللہ تعالیٰ سے معاملہ پورا ہو جاتا ہے اور معنی أُوْفُوا بِعَهْدِيْ أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ جلوہ نما ہوتا ہے۔ سورۃ کی ابتداء سے لے کر مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک مقام ربوبیت مبدء سے معاد تک کا بیان ہے اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ ابتدائے مقام عبودیت کا بیان ہے۔ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اس کے کمال کا بیان ہے۔ اور جب دونوں وعدوں کی وفا دونوں طرف سے محقق ہوگئی تو اس پر اس کا نتیجہ مرتب ہوا جو کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے۔

صیغۂ غیب کی صیغۂ خطاب لانے کی وجہ

اکثر علماء نے صیغہ غیب سے صیغہ خطاب کی طرف جو کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں ہے، متوجہ ہونے کی وجہ میں یوں فرمایا کہ نمازی نے نماز شروع ہونے کے وقت اجنبیوں کی طرح کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی ثنا لفظ غیب سے شروع کی۔ اور جب ثنا کو کمال تک پہنچایا تو درمیان میں جو پردہ تھا اٹھ گیا۔ اور دوری، قرب میں بدل گئی اور اجنبیت انجام کار یگانگت میں ڈھل گئی۔ پس وہ اس قابل ہوگیا کہ صیغہ خطاب سے بات کرے۔ نیز علماء نے فرمایا ہے کہ دعا و سوال کیلئے حاضری بہتر ہے۔ غائبانہ سوال اتنا کارگر نہیں ہوتا اور ثنا و تعریف غائبانہ اور پس پشت کرنا بہتر ہے۔ تاکہ خوشامد پر محمول نہ ہو۔

تخصیص عبادت و استعانت میں مشرکین کا مسلمان سے اختلاف

یہاں جاننا چاہیے کہ عبادت و استعانت کی تخصیص میں مشرکین کو مسلمانوں سے اختلاف ہے ان میں سے بعض معدنی اجسام کی پوجا کرتے ہیں۔ جیسے بلند پہاڑ سونا اور چاندی اور بعض درختوں کو پوجتے ہیں۔ جیسے پیپل و تلسی وغیرہ اور بعض روحانیات کو پوجتے ہیں کہ انہیں اپنا مربی قرار دے رکھا ہے۔ بلکہ ان سے ایک جماعت والے ہر قسم کیلئے ارواح فلکیہ میں سے کسی روح کو مدبر اور مربی مانتے ہیں۔ اور انواع عالم میں سے ہر نوع کیلئے ایک روح کو مدبر اور مربی اعتقاد کرتے ہیں۔ اور ہر مرض کو دور کرنے اور بدن میں حرارت، ٹھنڈک، رطوبت اور خشکی میں سے ہر کیفیت حاصل کرنے کیلئے ایک روح کو مقرر کر رکھا ہے کہ اس سے

استعانت کرتے ہیں۔ اور جبکہ وہ روحیں نظر سے غائب ہیں تو ان کی شکلیں صورتیں بنا کر انتہائی تعظیم اور عاجزی سے پیش آتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض انسانوں کے کامل افراد کی پوجا کرتے ہیں۔ اور بعض اجسام بسیطہ کو پوجتے ہیں اگرچہ وہ سفلی ہوں۔ جیسے آگ جو کہ مجوسیوں کا معبود ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ جسم بہت لطیف اور نورانی ہے۔ اور اس کے باوجود آدمی کی ہر صنعت میں اس کا دخل ہے۔ پس ربوبیت الٰہی کا اس میں زیادہ ظہور ہے۔ اور انواع حیوانات میں سے کسی کو اپنے معاش میں اس عنصر کی ضرورت نہیں ہے۔ سوائے آدمی کے۔ پس یہ ایسا عنصر ہے جو نوع انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور انسان کی خاص پرورش نے اسی عنصر میں ظہور فرمایا تو یہ اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ انتہائی عاجزی سے پیش آیا جائے۔ اور ایک جماعت اجسام علویہ کو جیسے سورج اور چاند اور دیگر ستاروں کو پوجتی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ عالم کی تدبیر نور اور ظلمت کے بدلنے پر ہے کہ دن اور رات اسی سے انتظام پاتے ہیں۔ نیز تدبیر عالم فصلوں کے بدلنے ہوا کے اختلاف اور بعض اوقات میں رطوبت کی زیادتی اور بعض دوسرے اوقات میں خشکی کی قوت پر بھی موقوف ہے۔ اور یہ چیزیں انہیں جسموں کے اثر سے ہیں۔ پس ان جسموں کیلئے انتہائی تعظیم کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اور اس کے باوجود ان جسموں کی ایسی روحیں ہیں کہ انہوں نے اسمائے الٰہی کے ساتھ پوری مناسبت حاصل کر رکھی ہے۔ پس یہ عبادت کے زیادہ لائق ہیں ان تمام مذاہب کو مرد مسلمان ان دو کلموں سے رد کر دیتا ہے۔ اور ملت حنفی کی حقیقت جو کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام لائے ان ہی دو کلمات کی تفصیل ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

باقی رہ گئی تفصیل عبادت کی۔ اور غیر سے استعانت کی۔ اور وہ یہ ہے کہ عبادت یعنی انتہائی عاجزی انتہائی تعظیم کیلئے ہو دین میں مطلقاً حضرت حق سے مخصوص ہے حقوق والوں میں سے کسی کیلئے جیسے باپ ماں استاد پیر آقا اور مالک اور حق کے انعام کے مظاہر میں سے کسی کیلئے جیسے عناصر فلکیات اور ارواح غیبیہ جائز نہیں۔ کیونکہ انتہائی تعظیم کے اسباب ان میں ثابت نہیں ہیں۔ اور جب انتہائی تعظیم کے اسباب ثابت نہیں۔ اور انتہائی عاجزی بے موقع اور ناجائز ہے۔ اور مالک الملک علی الاطلاق کے حق کو ضائع کرنا ہے۔ اور ایک عظیم ظلم

ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔

اور استعانت یا تو ایسی چیز کے ساتھ ہے کہ مشرکین' موحدین میں سے کسی کے وہم اور فہم میں اس چیز کے مستقل ہونے کا وہم نہیں گزرتا جیسے دانوں اور غلہ کے ساتھ بھوک دور کرنے میں استعانت اور پانی اور شربتوں سے پیاس دور کرنے میں استعانت اور راحت کیلئے درخت کے سائے سے استعانت اور اسی کی مانند اور مرض کو دور کرنے میں دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے استعانت اور معاش کا سبب مقرر کرنے میں امیر اور بادشاہ سے استعانت جو کہ حقیقت میں خدمت کا معاوضہ مال کی شکل میں لینا ہے۔ اور عاجزی کا موجب نہیں ہے۔ اور طبیبوں اور علاج کرنے والوں سے استعانت کے تجربہ اور زیادہ اطلاع ہونے کی وجہ سے ان سے مشورہ طلب کرنا ہے۔ اور اس میں کسی استقلال کا وہم نہیں ہوتا۔ پس اس قسم کی استعانت بلا کراہت جائز ہے۔ کیونکہ حقیقت میں استعانت نہیں ہے۔ اور اگر استعانت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے استعانت ہے۔

یا ایسی چیز سے استعانت ہے کہ اس چیز کے مستقل ہونے کا وہم مشرکین کی عقلوں میں جگہ پکڑے ہوئے ہے۔ جیسے ارواح روحانیت فلکیہ یا عنصریہ یا سیر کرنے والی ارواح مثل بھوانی' شیخ سدو وزین خان اور ان کی مثل اور استعانت کی یہ قسم عین شرک ہے۔ اور ملت حنفی کے خلاف ہے۔ اور اگر کوئی عبادت و استعانت کے حصر پر دلیل طلب کرے ہم کہیں گے کہ پہلی تین آیتیں اس حصر کی دلیل ہیں۔ کیونکہ عبادت و استعانت یا تو اس لئے ہے کہ اس کی سابقہ نعمتیں ابد تک شکر اور طلب مزید کا سبب ہیں۔ اور اس کی امداد ہمیشہ کیلئے جاری ہے یا اس سبب سے کہ اس کی ربوبیت تمام مخلوقات کو شامل اور محیط ہے۔ اور امداد بھی ربوبیت کے حق کا بقایا ہے یا کسی کمال یا نعمت کے ضائع ہونے کی ڈر کی وجہ سے یا کسی آفت اور نقصان پہنچنے کے خطرہ کی وجہ سے ہے۔ اور یہ چیزیں معمولی اور کلی اعتبار سے اور خلق و ایجاد اور قدرت دینے اور ان پر قابض ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہیں تو جب عبادت اور استعانت انہیں چیزوں سے ثابت ہوتی ہیں تو مخصوص بھی اسی ذات کے ساتھ ہوں گی۔

ایاک نعبد و ایاک کو اختیار کرنے میں نکتہ

یہاں جاننا چاہئے کہ اس مطلب کیلئے چند عبارتیں دل میں آتی ہیں۔ ان میں سے ایک عبارت کو اختیار فرمایا گیا اس میں کیا نکتہ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَنَسْتَعِيْنُ نہیں کہا بلکہ ایاک کو دوبارہ لایا گیا۔ تا کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ عبادت سے استعانت کی گئی بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہو۔ اور لَكَ نَعْبُدُ بھی نہیں کہا گیا۔ تا کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ بندے کے عبادت کرنے میں حق تعالیٰ کو کوئی نفع ہے۔ اس لئے کہ لغت عرب میں لام نفع کیلئے آتا ہے۔ جس طرح کہ مالہ وما علیہ میں مشہور ہے۔ اور اسی طرح بک نستعین نہیں کہا گیا۔ تا کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ حق تعالیٰ کو اپنے اور اپنے مطلوب کے درمیان واسطہ اور آلہ بنایا ہے۔ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِيَّاكَ بھی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس میں نفی کی صراحت تھی اس لئے کہ جتلایا گیا ہے کہ منفی چیزوں کی طرف توجہ کم کی جائے یعنی مقام مناجات میں نمازی کی توجہ نفی کی طرف نہیں ہے جو کچھ ہے اپنے مقصد کا اثبات ہے۔ اور عبادتی لک بھی نہیں کہا تا کہ پتہ چلے کہ جو عبادت کہ ہمیشہ بار بار کی جائے اس میں کوتاہی ہوتی ہے اور ایاک عبدت و عبدنا بھی نہیں کہا گیا کہ کوئی یہ وہم نہ کرے کہ عبادت سے فارغ ہو چکا اور اسے چھوڑ دیا۔ و ایاک اعبدانا بھی نہیں کہا تا کہ اس عبادت کی کمزوری کا پتہ چلے گویا کمال ضعف کی وجہ سے قابل تاکید نہیں ہے و اِيَّاكَ نَعْبُدُ نَحْنُ بھی نہیں کہا تا کہ پتہ چلے کہ تمام مخلوق عبادت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس ناقص عبادت کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ عبادت گذار ہیں۔ بہر حال یہ ترکیب جو اختیار کی گئی تمام تصور و خیال میں آنے والی ترکیبوں سے بہتر ہے۔ نیز اَعِنَّا بھی نہیں کہا گیا۔ جیسا کہ اِهْدِنَا کہا گیا۔ تا کہ پتہ چلے کہ حقیقت میں بندے کی ضرورت عبادت کی طلب ہے۔ اور استعانت کا ذکر تو صرف حاجت طلب کرنے کی اجازت کی درخواست کیلئے ہے۔

متعلقات اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اور مراتب ہدایت کی ترتیب

اور جو کچھ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے ساتھ متعلق ہے یہ ہے کہ ہدایت کا معنی

مطلب کا نشان دینا ہے۔ یا الہام کے ساتھ جیسے پستان کو چوسنا کہ کسی غور وفکر اور سکھلائی کے بغیر ہی بچے کو اس کا القا ہوتا ہے۔ اور رو کر شکایت کا اظہار کرنا کہ شکم مادر سے باہر آنے کی ابتداء ہی میں بچے کو اس کی تعلیم حاصل ہو جاتی ہے یا حواس ظاہرہ اور باطنہ کے ساتھ یا صرف عقل کے ساتھ یا نظری دلائل کے ساتھ یا رسل علیہم السلام کو بھیج کر۔ پس مراتب ہدایت اس ترتیب سے ہیں پہلے ہدایت الہامی جو کہ حالت طفلی میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہدایت احساسی ہے کہ جب آدمی کے احساسات ظاہر و باطن میں قوت پکڑتے ہیں۔ اور وہ اچھی اور بری چیز کو پہچانتا ہے۔ اور جس چیز تک حواس نہیں پہنچ سکتے اس کی دریافت کیلئے اسے عقل عطا کی گئی تا کہ حواس ظاہری اور باطنی کی عقلوں سے ان کے کلیات نکال کر کام میں لائے۔ اور جو عقل سے دریافت نہ ہو سکے اس کیلئے نظری دلائل عطا کیے گئے تا کہ ان دلائل سے نتیجہ نکالے اور جو کچھ عقل کی نظر سے باہر ہے۔ اور اس کا حسن اور عیب قوت عقلیہ سے نہیں پایا جا سکتا یا اس کے ادراک میں وہم وخیال الجھتے ہیں تو ایسی چیزوں کی دریافت کیلئے رسل علیہم السلام کو بھیجا گیا۔

رسل اور کتب سماویہ کے ذریعے ہدایت کی دوقسمیں

اور جو ہدایت رسل علیہم السلام کو بھیجنے اور کتابیں اتارنے سے ملتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک عام اور دوسری خاص۔ عام یہ کہ خیر اور شر کی راہ کو واضح کرے۔ اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں تبیانی' توفیقی' تبیانی یہ کہ رسول علیہ السلام جو کچھ لائے اس کی شرح کرنا اس حد تک کہ اس کے سمجھنے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور اسے فقہاء کے عرف میں ابتلاء کہتے ہیں۔ اور توفیقی یہ کہ ہدایت انبیاء علیہم السلام کو تھامنے کے اسباب کسی شخص کے حق میں فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اس پر ہدایت حاصل کرنے کو آسان کر دیتے ہیں۔ تا کہ وہ ابدی سعادت تک پہنچ جائے۔ اور مقام اصطفاء سے مشرف ہو۔ اور اس توفیق کا انجام یا تو آخرت میں بہشت ہے یا دنیا میں حق کو پالینا اور ہدایت خاص یہ ہے کہ عالم نبوت یا عالم ولایت سے ایک نور اس شخص کی عقل پر جلوہ گر ہو۔ اور اسے حقائق کا ایسا انکشاف ہو جائے جیسے کہ وہ ہیں۔ اور اس کے بھی تین درجے ہیں یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ

فرمایا گیا قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۔

یا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے لولا اللہ ما اھتدینا اور اسی ہدایت خاص میں وہ بھی داخل ہے جو کہ ایک حال سے دوسرے حال اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں سیر و سلوک کے دوران بندہ کی امداد واقع ہوتی ہے۔

الی-لام کے بغیر اھدنا کی حکمت

یہاں جاننا چاہئے کہ اگر ہدایت سے مراد راستے کا نشان دینا ہو تو اسے الی سے متعدی کرتے ہیں۔ اور اگر راستے تک پہنچنا منظور ہو تو لام کے ساتھ متعدی کرتے ہیں۔ اور اگر راستہ گزار کر مقصد تک پہنچانا مقصود ہو تو پھر بنفسہا متعدی کرتے ہیں۔ پس لفظ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں بندہ کے کامل عجز و ناتوانی کا اظہار ہے کہ وہ راستے کا نشان دینے اور مطلب کے راستے تک پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کر سکتا جب تک کہ ہر دم اللہ تعالیٰ کی ہدایت رہنمائے راہ، رفیق سفر اور دستگیر نہ ہو۔ اور اِهْدِنَا میں جمع کا صیغہ لانے میں وہی نکتہ ہے جو کہ نعبد میں مذکور ہوا خصوصاً یہاں تو مقام دعا ہے۔ اور تمام مسلمانوں کیلئے دعا کرنا قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔ نیز حمد کو بھی تمام حمد کرنے والوں کی حمد کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ بھی سب کی عبادت کو شامل ہے۔ اور استعانت بھی سب کی طرف سے بیان ہوئی۔ اس لئے لازماً طلب ہدایت بھی سبھی کیلئے چاہئے۔ نیز اگر تمام گھر یا محلہ یا ایک شہر یا ایک ملک میں سے ایک شخص کو ایک قسم کی ہدایت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے گمراہی میں گرفتار رہتے ہیں تو اس شخص کو کہ جس نے مطلب تک راہ پالی ہے سخت دشواری پیش آتی ہے اگر ان کی موافقت کرتا ہے۔ تو جان بوجھ کر ہلاکت میں گرتا ہے۔ اور اگر مخالفت کرے تو ان تمام لوگوں کیلئے ہنسی مذاق بن جاتا ہے۔ اور اس کی مجلسی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے اوقات قیل و قال اور لڑائی جھگڑے کی وجہ سے تلخی سے گزرتے ہیں۔ اور رشتہ داری، دوستی کے تعلقات اور باہمی تعاون و امداد سب کچھ دگرگوں ہو جاتا ہے۔ تو ناچار اپنے آپ کو بنی نوع انسان سمیت ہدایت کی دعا میں شامل کرنا چاہئے تاکہ ان

قباحتوں کی کھینچا تانی سے بچا جا سکے۔

طریق وسبیل کی بجائے طراط کی حکمت

اور لفظ صراط طریق وسبیل کا ہم معنی ہے۔ جس کے معنی راستہ کے ہیں۔ اور یہاں اس لفظ کو اس لئے اختیار کیا گیا کہ مسلمانوں کو اس لفظ کے ذکر سے پل صراط یاد آئے۔ اور وہ جان لیں کہ ہمیں اس راہ سے گزرنا ہے۔ اور اس سے گزرنا سیدھی راہ چلے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور مشہور یہ ہے کہ صراط مستقیم' افراط تفریط یعنی کمی بیشی جو کہ دونوں مذموم ہیں کی درمیانی راہ چلنا ہے۔ مثلاً عبادت میں افراط یہ ہے کہ جہاں بھی صفات الوہیت میں سے کسی صفت کا ظہور دیکھا جائے بے اختیار اس کی پوجا شروع کردی جائے۔ جیسا کہ ہندوؤں کا مذہب ہے۔ اور تفریط یہ ہے کہ دنیوی مصروفیتوں اور طلب معاش سے اپنے آپ کو کبھی فارغ نہ کیا جائے۔ اور ایک لحہ کیلئے بھی عالم غیب کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ جیسا کہ انگریزوں اور دوسرے بے دینوں کا معمول ہے۔ اور استعانت میں افراط یہ ہے کہ سببیت کے وہم سے ہر چیز درخواست کریں۔ اور مطلوبہ کاموں میں اس کی طرف رجوع کریں۔ اور ستاروں کی تاثیرات' دنوں کی سعادت ونحوست اور معدنیات' نباتات اور حیوانات کے مخفی خواص کی رعایت کریں۔ اور نحوست وبرکت کو بیوی' بچوں' غلاموں' کنیزوں' حویلی' تلوار اور دوسری چیزوں میں خیال کریں۔ اور زندگی کے اوقات کو اپنے اوپر تنگ کرلیں اور سودائیوں کی طرح ہر چیز سے ڈریں۔ اور ہر چیز سے عظیم نفع پہنچنے کی امید کریں۔ اور تفریط یہ ہے کہ معتبر اسباب کو جیسے دوا' غذا اور پرہیز اور جیسے اچھوں کی صحبت اور بروں کی مجلس اور دعا اور جناب الٰہی میں التجا کو ساقط الاعتبار گردانیں' علی ہذا القیاس تمام امور میں میانہ روی قابل تعریف ہے۔ اور کمی بیشی مذموم۔ جیسا کہ علم اخلاق کی مبسوط کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ (اقول وباللہ التوفیق چنانچہ الطریقۃ المحمدیہ کی تلخیص مفتاح الفلاح کا اُردو ترجمہ جو کہ کلید مراد کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ یہ ترجمہ توفیق الٰہی سے اس فیقر نے کیا ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

آدمی کی تین قوتیں

اور اگر نمونہ کے طور پر یہاں ذکر کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کی تین قوتیں ہیں۔قوت نطقیہ کہ اسے عقلیہ بھی کہتے ہیں اس کا کام چیزوں کو جاننا اور حقائق کی دریافت ہے۔اور حقائق یا تو باری تعالیٰ کی ذات وصفات ہیں یا دنیا و آخرت میں اس کے افعال و آثار اور اس قسم کو جاننا علم الٰہی کہلاتا ہے۔اور اس قسم میں افراط و تفریط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور وفکر کرے۔اور اس کے راز کو پانے کی کوشش کرے یا تنزیہ کیلئے صفات الٰہی کی بالکل نفی کر دے یا ان صفات کا اثبات تشبیہ کے طریقے پر کرے کہ خالق کو مخلوق سے ہم رنگ کر دے یا جن صفات کو شریعت نے ثابت کیا ہے غلط تاویل کر کے ان کا انکار کرے۔ جیسے کلام، سمع، بصر، رویت، رضا اور غضب یا اپنے افعال کی طرح اللہ تعالیٰ کے افعال کو کسی غرض کے ساتھ مخلوط مانے یا اپنی عقل کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ پر زیادہ بہتر اور بہت پاکیزہ کام کو واجب جانے۔ بندے کے افعال کو بندے کی طرف ہی منسوب کرے۔اور ان افعال میں اللہ تعالیٰ کے فعل اور تاثیر کا انکار کرے یا بندے کو پتھر کی طرح بے دخل سمجھے اور جبری ہو جائے۔اسی طرح کے دوسرے باطل عقائد جو کہ افراط و تفریط کی طرف مائل ہیں۔

علم نبوت

یا ارواح، ملائکہ، انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام، اولیاء اور ائمہ دین اور اس قسم کو علم نبوت کہتے ہیں۔اور اس قسم میں افراط و تفریط یہ ہے کہ ان مراتب اور مناصب کا سرے سے انکار کر دے یا خطا و گناہ سے ان کی عصمت اور محفوظیت کا اعتقاد نہ رکھے۔اور انہیں اپنی طرح اغراض دینوی اور گھٹیا مقاصد کی طلب کے ساتھ ملوث اور نفس کی ضروریات سے مغلوب مانے۔یا ائمہ و اولیاء کو انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے مرتبہ کے برابر مانے (اقول وباللہ التوفیق، اس میں روافض خزہم اللہ تعالیٰ کا رد ہے جو کہ اسی قسم کا اعتقاد رکھتے ہیں۔محمد محفوظ الحق غفرلہ) اور انبیاء مرسلین کیلئے لوازم الوہیت ثابت کرے۔جیسے علم غیب، ہر کسی کی

ہر جگہ فریاد سننا' تمام مقدورات پر قادر ہونا اور فرشتوں' انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی ارواح کو تصور' مجسمہ' قبور اور تعزیوں کے پردے میں معبود بنا لے اور رزق' فرزند' خدمت اور مرتبہ کی مستقل طور پر انہیں سے درخواست کرے۔ اور ان کی سفارش اور عرضی کی قبولیت کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں واجب جانے اگرچہ اس دربار عالی میں یہ پسند نہ بھی ہو (اقول و باللہ التوفیق' صفات باری تعالیٰ اس کی اپنی ہیں۔ کسی سے حاصل کی گئی نہیں یعنی عطائی نہیں۔ وہ ان صفات میں مستقل ہے۔ اگر اس جہت سے کسی کے متعلق بھی ان چیزوں کا عقیدہ رکھے تو قطعاً حرام بلکہ شرک۔ جبکہ کوئی بھی مسلمان مقربین میں یہ صفات مستقل نہیں مانتا بلکہ عطائی چنانچہ اس سلسلہ میں شاہ صاحب قدس سرہ العزیز کے اپنے ہی گزشتہ الفاظ اس کتاب کے صفحہ ۱۱ پر دیکھ لیں' فرماتے ہیں: ''یہاں سمجھ لینا چاہئے کہ غیر سے اس طرح مدد مانگنا کہ اسی پر اعتماد کرے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر نہ سمجھے حرام ہے۔ اور اگر توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ اور اسے مدد کے مظاہر میں سے ایک مظہر سمجھتے ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اسباب اور حکمت پر نظر کرتے ہوئے اس سے غیر سے ظاہری طور پر مدد مانگے تو یہ عرفان سے دور نہیں۔ اور شرع شریف میں بھی جائز ہے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء نے اس قسم کی امداد دوسروں سے مانگی ہے۔ اور حقیقت میں یہ غیر سے نہیں۔ بلکہ حضرت حق تعالیٰ سے استمداد ہے''۔ نیز یہ بات لوازم الوہیت کے لفظ سے ہی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ تمام صفات باری تعالیٰ مستقل' قدیم' لامتناہی ہیں۔ جبکہ باقی کسی کی صفات ایسی نہیں لہٰذا انبیاء علیہم السلام و اولیاء کی صفات مقدسہ کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

علم معاد یا سمعیات

یا معاملات قبر' دوزخ' بہشت' حساب' میزان اور دوسرے امور آخرت اور اس علم کو علم معاد یا علم سمعیات بھی کہتے ہیں۔ اور اس قسم میں افراط و تفریط یہ ہے کہ مثلاً ایمان کو نجات کیلئے اس قدر مؤثر مانے کہ اس کے دل میں کسی قسم کے گناہ کا کھٹکا باقی نہ رہے۔ اور سمجھے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں دے گا۔ یا ایمان کو اس قدر ساقط الاعتبار قرار دے کہ ہر گناہ سے ایمان کا اثر زائل ہو جائے گا۔ اور ایمان والے گناہگار بے ایمان

کافروں کی طرح دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ یا آخرت میں اچھے برے اعمال کی ذاتی تاثیر ثابت کرے۔ اور جانے کہ اللہ تعالیٰ جزا دینے کے مقام میں بے اختیار بندہ کے اعمال کے تابع ہے۔ گناہ سے معافی اور اطاعت کو قبول نہ کرنا اس سے ممکن نہیں یا بہشت اور دوزخ اور اس جگہ لذت پانے اور درد اٹھانے کو دنیا کے انقلابات کی طرح زائل اور فانی سمجھے علیٰ ہذا القیاس۔

علم الجواہر والاعراض

یا اجسام اور دوسرے اعراض ہیں کہ اسے علم الجواہر والاعراض کہتے ہیں۔ اور علم طبعی اور ریاضی بھی کہتے ہیں۔ اور افراط و تفریط اس قسم میں یہ ہے کہ مثلاً ان چیزوں کی شرح و بسط میں پوری گہرائی میں جائے۔ اور ان چیزوں کے احوال' اطوار' خواص اور تاثیرات کے بے مقصد حصول میں اپنی عقل کو مصروف کرے۔ جیسے علم ہیئت' ہندسہ' حساب' فنون ریاضی' موسیقی' کشش ثقل' مناظرہ' شعبدہ' طلسمات' نیرنجات' علم زراعت' علم حیوان' خواص نباتات و احجار اور طب وغیرہ میں غور کرنا یا ان چیزوں کا بالکل انکار کرے۔ اور ان سے خالی رہے۔ اور ان میں سے دین و دنیا میں جس قدر مفید ہے اس پر بھی توجہ نہ کرے۔

قوت شہویہ

جو کہ منفعتیں لینے کا مبدء اور مرغوبات کی خواہش کا وسیلہ ہے۔ اور اس کا افراط فجور ہے۔ نیز اسے خلاعت بھی کہتے ہیں۔ یعنی لذتوں اور مرغوبات میں حد موزوں سے زیادہ مصروف ہونا۔ اور اس کی تفریط کو جمود کہتے ہیں یعنی جس چیز کی عقل اور شرع نے ترغیب دی ہے اس سے بے توجہی کرنا۔ جیسے نکاح حلال اور غیر مشتبہ لذیذ کھانا اور ان کا درمیانی درجہ عفت ہے۔ یعنی شہوت کو عقل اور شرع کے حکم کے تابع کر دینا تاکہ حرص کی پوجا سے سلامتی حاصل ہو اور اس درمیانی مرتبہ سے بے شمار اچھی عادات پیدا ہوتی ہے۔ جیسے حیا' صبر' قناعت' تورع' جوانمردی اور سخاوت اور سخاوت کے توابع میں ایثار' کرم' معاف کرنا' مروت اور معاملات میں نرم خوئی ہے۔

قوت غضبیہ

جو کہ پر خطر چیزوں کو اپنانے کا مبدء ہے۔ اور اس کا مقتضیٰ قبضہ جمانا' اونچا ہونا اور اپنے اور اپنے متعلقین سے غیر کی طرف سے آنے والی تکلیف کو دور کرنا ہے۔ اور اس قوت کا افراط تہور ہے۔ یعنی ایسی جگہ اور ایسی چیز پر جرأت کرنا چاہئے جہاں یہ جرأت نہیں چاہئے۔ اور اس کی تفریط جبن ہے۔ یعنی اس سے ڈرنا جس سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ اور کا وسطی درجہ شجاعت ہے۔ اور شجاعت سے بے شمار اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے بلندی ہمت' استقلال' حلم' حوصلہ اور غیرت وغیرہ اور قوت نطقیہ کے استعمال میں میانہ روی کو حکمت کہتے ہیں۔ اور اس سے ذہانت' زود فہمی' ذہن کی صفائی' آسانی سے علم حاصل کرنا اور اچھی طرح حفظ کرنے' یاد کرنے اور سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے افراط کی طرف کو جربزہ کہتے ہیں۔ (اور یہ ادراک کا ایسا ملکہ ہے جو کہ اسے ایسی چیزوں کی اطلاع حاصل کرنے کی دعوت دے جن کی معرفت ممکن نہیں) اور اس کی تفریط کو بلادت (کند ذہنی) اور غباوت (کم فہمی) کہتے ہیں۔ اور جب تینوں قوتوں میں میانہ روی حاصل ہو جائے تو اسے عدالت کہتے ہیں۔ اور عدالت کے نتائج میں سے دوستی' الفت' وفاداری' شفقت' احسان کا بدلہ دینا' تعلقات کا لحاظ کرنا' اچھی صحبت' اچھی شراکت' توکل' معبود مطلق کے حق کو پورا کرنا' فرشتوں' پیغمبروں علیہم السلام اور حکام کے حق کو پورا کرنا اور شرع شریف کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرنا ہے۔ اور یہی کمال تقویٰ ہے۔

ایک نکتہ

لیکن یہاں ایک نکتہ جان لینا چاہئے۔ اور وہ یہ ہے کہ قوت نطقیہ انسان کی ذاتی ہے جو کہ بدن کے ساتھ متعلق ہونے سے پہلے ہی روح کو حاصل تھی۔ البتہ قوت شہویہ اور غضبیہ بدن کے ساتھ متعلق ہونے کے وسیلہ سے حاصل ہوئی۔ پس قوت نطقیہ میں کمال میانہ روی یہ ہے کہ اسے استعمال میں اس حد تک پہنچا دے کہ اس سے زیادہ کا امکان نہ رہے۔ اور قوت شہویہ اور غضبیہ میں کمال اعتدال یہ ہے کہ اسے بقدر ضرورت استعمال کریں۔ اس حد

تک کہ اس سے کم تر ممکن نہ ہو۔ ناچار طریق اعتدال کو انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی اور صدیقوں' شہیدوں اور صالحین کی رفاقت کے بغیر پانا دشوار ہے۔

اور اسی لئے کہتے ہیں کہ صراط مستقیم' انبیاء علیہم السلام کی اقتداء ہے۔ اور قدر مشترک یہ ہے کہ انسان دلی طور پر ماسوی سے منہ پھیرنے والا ہو۔ اور اس کا قلب' فکر اور ذکر کلی طور پر حضرت خالق جل جلالہ کی طرف متوجہ ہو جائے یہاں تک کہ اگر اس دربار سے فرمان پہنچے کہ اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں ذبح کر دے۔ جیسے حضرت خلیل علیہ السلام کی طرح اطاعت کرے۔ اور اگر ارشاد ہو کہ اپنی جان کو ہماری راہ میں قربان کر تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح بکمال مسرت وخوشی قبول کرے۔ اور اگر فرمائیں کہ اپنے آپ کو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں ڈال دے تو حضرت یونس علیہ السلام کی طرح فرمانبرداری کرے۔ اور اگر منصب اعلیٰ اور مرتبہ بلند عطا کرنے کے بعد اشارہ ہو کہ اپنے آپ کو ایک غیر معروف آدمی کے سامنے شاگردوں کی طرح پیش کر اور اس سے ایک دو کام کی باتیں سیکھ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح عار محسوس نہ کرے۔ اور شرم نہ کرے کہ آپ حضرت خضر علیہ السلام کی طرف گئے اور ان کی شاگردی اختیار کی۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ جب مکہ معظمہ میں صحابہ کرام کو کافروں کے ہاتھوں بہت تکلیف پہنچی تو انہوں نے رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ شریف کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے ایمان والوں کو کافروں کے ہاتھوں اس حد تک سخت مصیبتیں پہنچی تھیں کہ ان میں سے کسی کو زمین کھود کر کھڑا کر دیتے اور تیز آرا اس کے سر پر چلاتے یہاں تک کہ وہ ٹکڑے ہو کر گر پڑتا لیکن وہ اپنے دین سے ہرگز نہیں پھرتا تھا۔ اور کسی کی لوہے کی کنگھیوں سے ہڈیوں سے کھال ادھیڑ دیتے لیکن وہ اپنے مذہب کے خلاف حرف تک اپنی زبان پر نہ لاتا۔

کہتے ہیں کہ خط مستقیم' تمام خطوط سے چھوٹا ہوتا ہے جو کہ نقطہ کے درمیان فرض کیا جا سکتا ہے گویا جو بندہ صراط مستقیم چاہتا ہے وہ اپنی عاجزی اور کمزوری بیان کرتا ہے۔ یعنی میری ناتوانی کے لائق صرف اور صرف طریق مستقیم ہی ہے اور اسی لئے اگر کسی بوڑھے اور

کمزور کو کسی ضرورت کیلئے کہیں جانا پڑے تو نزدیک والے راستہ کو تلاش کرتا ہے۔ اور دور کی راہ سے بچتا ہے۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک بندہ دنیا میں ہے وہ مشیروں اور رہنماؤں کی کھینچا تانی میں رہتا ہے۔ اہل وعیال کسی راہ سے بلاتے ہیں' ماں باپ کسی راہ سے بلاتے ہیں' دوست اور مشفق کسی اور راہ سے۔ دشمن اور حاسد دوسرے راستے سے' اس کا اپنا نفس کسی راہ سے۔ شیطان کسی راہ سے' ہر خواہش' ہر غضب اور ہر اعتقاد کسی راہ سے۔ جبکہ اس کی عقل کمزور' اس کی عمر تھوڑی اور اس کی کوشش کا میدان تنگ تو حیران ہو کر اپنے مالک کے دروازہ پر اپنے آپ کو پیش کر کے فریاد کرتا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

شبہ اور اس کا جواب

یہاں بعض جاہل شبہ کرتے ہیں کہ جب مسلمان کو اس دعا کی تعلیم دی گئی کہ نماز میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں زبان پر لائے۔ تو ہدایت کا یہ سوال بے موقع ہے کہ نماز پڑھنے والے مسلمان کو یہاں تک ہدایت حاصل ہو گئی ہے کہ دربار عالی میں پہنچ گیا تو حاصل شدہ شے کو حاصل کرنے کا کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہدایت کے مرتبے بے شمار ہیں۔ پس ایک آدمی کسی وقت بھی سوال ہدایت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

کہتے ہیں کہ کسی چیز کے متعلق آدمی کا علم دو طریقوں سے ہمیشہ ترقی میں ہے۔ ایک اس علم کی ہمیشگی یعنی توجہ کے اوقات کا مسلسل رہنا۔ اور غفلتوں کا دور ہونا دوسرے دلائل کی زیادتی کے ساتھ۔ کیونکہ وہ علم جو ایک دلیل سے حاصل ہوا ہے اس علم کے برابر نہیں ہو سکتا جو کئی دلائل سے حاصل ہوا۔ اور ممکنات کی قسموں میں سے جہان میں جو کچھ موجود ہے اس میں وجود ذات الٰہی' اور اس کے علم' قدرت' جود رحمت اور حکمت پر ایک دلالت سونپی اور پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ہر شے میں اس کی علامت ہے جو کہ اس کے ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ہر گھاس جو کہ زمین سے اگتی ہے وحدہ لا شریك له کہتی ہے۔ پس آدمی کا علم ہر وقت بڑھ رہا ہے۔ اور ترقی پذیر ہے۔ اسی پابندی میں نہ رہ کہ مضمون باقی نہیں رہا۔ زلف یار سے متعلق سو سال تک گفتگو کی جا سکتی ہے اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر ونواہی کی تعمیل اور فضائل اور اونچے مرتبوں کو حاصل کرنا ایک

بہت وسیع میدان ہے۔اوران سب سے زیادہ ضروری اس مرتبہ پرثابت قدم رہنا ہے جوکہ اسے ہدایت کے مرتبوں میں سے حاصل ہے۔اوراسی لئے حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے منقول ہے کہ آپ نے اہدنا کی تفسیران لفظوں میں فرمائی کہ ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ اور قرآن مجید میں گویا اسی کلمہ کی شرح کیلئے دوسری جگہ ارشاد فرمایا اے ہمارے رب! اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہمارے دلوں کوٹیڑھا نہ فرما۔

دوسرا شبہ اوراس کا جواب

یہاں ایک اور شبہ بھی وارد ہوتا ہے کہ زبان کے ساتھ دوسرے سے مطلب مانگنا دو وجہ سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یا تو اسے یاد دلانا ہے کہ وہ اس مطلب کو بھول چکا ہے یا بخیل کو سخاوت پر ابھارنا ہے۔اور یہ دونوں صورتیں حکیم مطلق اور جواد برحق کے متعلق تصور میں نہیں آسکتیں تو اس درخواست کا فائدہ کیا ہوا خصوصاً جبکہ دعا' قضا سے راضی ہونے کے خلاف ہے۔تو ہم کہتے ہیں کہ کبھی حکیم کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے کہ طالب کو اس کا مطلب بغیر عاجزی اور زاری کئے نہ دیا جائے۔تاکہ اس کا نفس شکستہ ہو جائے۔اوراس کا تکبر نیچا ہو جائے۔پس ہوسکتا ہے کہ ہماری عاجزی کارگر ہو جائے۔اوراللہ تعالیٰ کی حکمت میں جوشرط ملحوظ رکھی گئی ہے وہ حاصل ہو جائے۔ جب تک بچہ نہ روئے دودھ کو کب جوش آتا ہے۔اور جب تک بادل نہ روئے باغ میں کب پھول کھلتے ہیں۔

اوردعا قضا سے راضی ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہو کہ بندہ عاجزی اور زاری کرے۔اوراس کی طلب کے بعد عطا واقع ہو۔اب یہ سمجھنا چاہئے کہ ہدایت کے سوال کو استعانت پر بطور فرع لایا گیا ہےاس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت' استعانت ہی کی ایک قسم ہے۔اور خاص کو عام پر بطور فرع لایا جانا بالکل ظاہر ہے۔اور استعانت کے واسطہ سے یہ عبادت کی بھی فرع ہے۔ کیونکہ جب عبادت' مجاہدہ کی وجہ سے کمال کو پہنچتی ہے۔تو اعلیٰ درجہ کی ہدایت کا فائدہ دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا اور جنہوں نے ہم میں مجاہدہ کیا ہم انہیں اپنی راہوں کی ہدایت عطا فرماتے ہیں۔اور مجاہدہ استعانت کا محتاج ہے۔اور جب عبادت اور استعانت کا

لحاظ کریں تو ہدایت کا مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی فرع ہونا بھی ظاہر ہو گیا کیونکہ ہدایت کے نفع کا کمال تو اسی روز عبادت کاملہ کے واسطہ سے ظاہر ہوگا۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی اور ان تینوں چیزوں کا رحمت عام و رحمت خاص بلکہ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ پر متفرع ہونا بھی بالکل ظاہر ہے کہ اس کی بہترین تربیت ہدایت ہے۔

متعلقات صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

اور جو کچھ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ نعمت کی حقیقت وہ نفع ہے جو کہ بطور احسان دوسرے کو پہنچائیں اور اس میں اپنا کسی قسم کا نفع پیش نظر نہ ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کے سوا منعم حقیقی کوئی نہیں۔ کیونکہ انعام دینے میں مخلوق کو اپنے منافع بھی ملحوظ اور پیش نظر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پیچھے گزرا اور یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ کافر و فاسق کے حق میں اللہ تعالیٰ کی نعمت حقیقت میں نعمت نہیں۔ کیونکہ اس پر احسان کرنا رب تعالیٰ کو منظور نہیں کافروں اور فاسقوں کو نفع کی قسم سے جو کچھ عطا ہوا ہے یہ صورت میں نعمت مگر معنوی اعتبار سے بلا اور آفت ہے۔ پس یہ اس طرح ہے کہ کسی کو حلوہ میں زہر ہلاہل لپیٹ کر دی جائے یا لذیذ حلوا جس میں کہ زہر وغیرہ نہیں ایسے شخص کو دیں جسے خرابی صحت لاحق ہو کہ اس کے معدے میں زہریلے اخلاط سے مل کر یہی حلوہ زہر ہلاہل کا حکم پیدا کرے یا کسی ایسے شخص کو لذیذ حلوہ دیں جو کہ اسے بے وقت یا سیر ہونے کے اندازے سے زیادہ کھالے اور یوں ہیضہ کا سبب ہو۔ اور اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا۔ اور ''ہرگز گمان نہ کریں کافر کہ ہم نے جو انہیں مہلت دی ہے ان کیلئے بہتر ہے۔ ہم نے تو انہیں۔ اس لئے مہلت دی کہ وہ زیادہ گناہ کرے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو چار گروہوں انبیاء' صدیقین' شہداء اور صلحاء کے ساتھ خاص فرمایا گیا ہے۔ پس انعمت کا لفظ اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے کچھ عموم رکھتا ہے۔ لیکن درحقیقت انہیں چار گروہوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

تفسیری نکات

اور یہاں مفسرین نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

فرمایا: صِرَاطَ مَنْ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ نہیں فرمایا اس لئے کہ لفظ من کبھی نعت عرب میں نکرہ موصوف ہوتا ہے۔ پس معروف اشخاص کا علم جو کہ انعام الٰہی کے ساتھ مشہور ہیں حاصل نہیں ہوتا اور جب ان اشخاص کا علم ان کی ذوات کے ساتھ حاصل نہ ہوا تو مجہول کی پیروی طلب کرنا لازم آتا ہے۔ اور وہ محال ہے۔ اور انعمت فرمایا۔ اور انعام کی نسبت ذات الٰہی کے ساتھ فرمائی تاکہ انعام کے کامل ہونے کا پتہ چلے کیونکہ ذات الٰہی ہر جہت سے کامل ہے۔ اور جو کچھ کامل کی طرف سے آئے کامل ہوتا ہے۔ اور لفظ خطاب لائے تاکہ بندہ کو حاضری کے بعد غیب کی طرف رجوع نہ ہو کہ کور کے بعد حور ہے۔ یعنی کمال کے بعد نقصان ہے۔ اور علیہم اور کو انعمت سے پہلے نہیں لائے کہ اس سے تخصیص کا فائدہ حاصل ہوتا اور تخصیص مثل کو طلب کرنے سے روکتی ہے جبکہ بندہ اس انعام کی مثل طلب کرنے کے درپے ہے۔ پس تخصیص اس کی غرض کے منافی ہے۔ اور انعمت کو بصیغہ ماضی لایا گیا۔ تاکہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ وہ انعام مشکوک ہے۔ کیونکہ مستقبل شک کا مقام ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور مفعول انعام حذف کر دیا گیا۔ تاکہ دنیوی اور اخروی انعام کو شامل ہو۔ اور یہاں شبہ وارد ہوتا ہے کہ صراط مستقیم تو ایک راہ ہے۔ اور یہ چاروں گروہ مختلف راہوں والے تو ایک راہ ان چار گروہوں کی راہ کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور یہ بھی ہے کہ ہر نبی علیہ السلام کا طریقہ اور شریعت جدا اور طریقت میں ہر ولی کی معروفیات اور اذکار جدا جدا ہیں۔ پس راہوں کی کثرت کے باوجود کہ مشہور قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف راستے مخلوق کے سانسوں کی تعداد کے برابر ہیں' راستے کا ایک ہونا کیسے درست ہوگا؟

جواب: اس شبہ کا جواب ایک مثال کے ساتھ دل میں اتر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مثلاً طب یونانی علاج کی راہ مستقیم ہے۔ اور بقراط اور جالینوس کے وقت سے لے کر علوی خان کے زمانہ تک محفوظ اور جاری۔ اس کے باوجود کہ بقراط اور جالینوس کے علاج اپنے زمانے میں دوسرے طریقے سے تھے۔ اور علوی خان اور حکیم علی گیلانی کے علاج اپنے وقت میں بطور دیگر تھے۔ وہ لوگ مفردات کو استعمال کرتے تھے۔ اور فصد اور اسہال کے ساتھ

تنقیہ سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ جبکہ ان حضرات نے معجونوں اور شربتوں کے مرکبات سے کام لیا۔ اور ہر مرض میں فصد واسہال کے تنقیہ سے کام لیا۔ پس معلوم ہوا کہ اس قسم کے اختلافات اور کثرتیں وحدت طریق کے منافی نہیں۔ نیز یونانی طبیبوں میں سے بعض قواعد بنانے والے ہوگزرے اور بعض ان قواعد کی تقلید کرنے والے۔ پس یہ اختلاف بھی راہ کے مختلف ہونے کا سبب نہیں بنتا جس طرح کہ ایک قافلہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو ایک ہی راستہ پر روانہ ہوتا ہے۔ اور اس قافلہ میں سے بعض تاجر' بعض بوجھ اٹھانے والے مزدور اور کرایہ کش اور بعض محافظ اور نگہبان۔ حالانکہ سب کے سب ایک ہی راہ پر چل رہے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے منصب اور مرتبے کے مطابق مختلف کام کرتے ہیں اسی طرح انبیاء علیہ السلام اسی راہ میں رہبر اور محافظ ہیں۔ اور صدیق' شہید اور صالحین اپنے اپنے مرتبے کے مطابق ہم سفر' ہاتھ پکڑ کر چلنے والے' بوجھ اٹھانے والے اور نگہبان ہیں۔ یہ تمام مرتبے راستے کے ایک ہونے کے منافی اور مخالف نہیں ہیں۔

اختلاف شرائع کی حقیقت

اور وہ اختلاف جو کہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں واقعہ ہے بنیادی طور پر دین میں اختلاف نہیں۔ بلکہ امتوں کی استعداد اور ہر وقت کی مصلحتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے احکام کے جدا جدا ہونے کی بنا پر عوام کی نظر میں اختلاف کا گمان پیدا ہو گیا ہے۔ اور حقیقت میں تمام انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر ایک ہی قدر مشترک ہے جس میں اختلاف نہیں مثلاً اگر ایک طبیب موسم گرما میں ایک گرم مزاج بیمار کو پانی کے برتن میں بیٹھنے کا حکم دے اور اس کیلئے ٹھنڈی دوائیں اور تر غذائیں تجویز کرے۔ اور دوسرا طبیب ٹھنڈے مزاج کے مریض کیلئے موسم سرما میں حمام میں بیٹھنا' گرم دوا کھانا اور ہلکی خوراک کا استعمال کرنے کا حکم دے تو یہ ایک دوسرے کے مخالف ہرگز نہیں ہیں کہ اگر پہلا طبیب دوسرے طبیب کی جگہ یا دوسرا پہلے کی جگہ ہوتا اور ایک کا مریض دوسرے کے پاس جاتا تو وہ بعینہٖ وہی حکم کرتا اسی لئے حدیث پاک میں وارد ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام حیات ظاہری میں ہوتے تو انہیں میری پیروی کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔

متعلقات غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

اور جو کچھ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے ساتھ متعلق ہے یہ ہے کہ جب دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا انعام بندے کے نصیب ہوا تو غضب اور گمراہی کا گمان اس بندے سے کئی مرحلے دور ہو گیا تو پھر غضب اور گمراہی کے بچنے کی کیا حاجت باقی رہی؟ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ ایک جماعت اپنے آپ کی نعمت والوں یعنی انبیاء و اولیاء کے ساتھ منسوب کرتی ہے۔ حالانکہ وہ غضب و گمراہی کے بھنور میں گرفتار ہے۔ اور اپنی راہ کو انبیاء و اولیاء کی راہ شمار کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ عوام کے ذہنوں میں صراط مستقیم کے ساتھ مشتبہ ہو جائے۔ اور اس جماعت کی اتباع کو انبیاء و اولیاء کی اتباع گمان کریں۔ اور غضب و گمراہی میں گر پڑیں اس اشتباہ کو دور کرنے کیلئے یہ لفظ لائے ہیں۔

مغضوب علیہ اور ضال کون ہیں؟

اور اکثر مفسرین نے مغضوب علیہ اور ضال کے تعین میں مختلف کلمات بیان کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ بیان کئے جاتے ہیں۔ بیضاوی کہتے ہیں کہ مغضوب علیہ سے مراد نافرمانی کرنے والے اور ضال سے جاہل مراد ہیں۔ اس لئے کہ بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ کی پوری نعمت یہ ہے کہ اسے حق کی پہچان اور نیک عمل دونوں عنایت فرمائے جائیں۔ اور جسے ان ہر دو نعمتوں سے حصہ نہیں ملا اس پر نعمت تمام نہیں ہوئی۔ پس اگر حق کی معرفت رکھتا ہے مگر عمل خیر نصیب نہیں تو فاسق ہے۔ اور محل غضب اور جو کوئی حق کی معرفت نہیں رکھتا اگرچہ نیک عمل کرتا ہے جاہل اور گمراہ ہے۔ اور پہلے گزر چکا کے مغضوب علیہ دو گروہ ہیں۔ عناد رکھنے والا کافر کہ دیدہ دانستہ انکار کرتا ہے۔ اور جان بوجھ کر نافرمانی کرنے والے کہ دیدہ دانستہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور ضال کے بھی دو گروہ ہیں وہ کافر جو کہ کسی کے پیچھے لگ کر کفر میں گرا ہے یا غور و فکر کم کرنے کی وجہ سے دین کی سچائی اس پر واضح نہیں ہوئی۔ اور نافرمانی کرنے والا جو کہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور عفو پر اعتماد کر کے ارتکاب گناہ کرتا ہے یا غور و فکر۔ علم کی طلب اور اہل ذکر سے پوچھنے میں کوتاہی کی وجہ سے نادانستہ ناجائز کام کرتا ہے

بعض نے کہا ہے کہ مغضوب علیہ کافر اور ضال بدعتی ہے۔ بعض نے کہا کہ مغضوب علیہ وہ ہے کہ اس سے قیامت کے دن یقینی طور پر بدلہ لیا جائے گا۔ اور ضال عام ہے معافی کا گمان بھی رکھتا ہے۔ اور حدیث صحیح میں حاتم طائی کے بیٹے عدی سے جو کہ حضور علیہ السلام کے صحابی ہیں مروی ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے ان دو لفظوں کے معنی پوچھے تو آپ نے فرمایا کہ مغضوب علیہم یہودی اور ضالین نصاریٰ ہیں۔ اور اس کی تصدیق قرآن مجید میں واقع ہے۔ یہود کے حق میں فرمایا: وباؤا بغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں لوٹے اور نصاریٰ کے حق میں فرمایا: وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ کہ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے اور بعض نے کہا ہے کہ جس نے صحیح اعتقاد' نیک عادت اور عمل صالح میں کمی کی۔ اور جو چاہئے اس میں کوتاہی کی وہ مغضوب علیہ ہے۔ اور جو زیادتی کی راہ چلا وہ گمراہ ہے۔

غیر المغضوب علیهم ولا الضالین لانے کی حکمت

اور یہاں جاننا چاہئے کہ بظاہر اس لفظ کی حاجت نہ تھی۔ اگر اس طرح فرمایا جاتا کہ اِهْدِنَا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ تو کافی شافی تھا اور ضلال اور غضب کا ذکر اتنا ضروری نہ تھا لیکن ایمان کے دو پر ہیں کہ ان دو پروں کی قوت سے مومن کو اس راہ کی سیر داس پر چلنا میسر آتا ہے۔ اور وہ دو پر خوف اور امید ہیں۔ اور دونوں کو اعتدال پر ہونا چاہئے۔ اسی لئے قرآن مجید میں جگہ جگہ بخشش کے وعدے کے ساتھ عذاب کی وعید رکھی گئی ہے۔ اور صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی هو العذاب الالیم یعنی میرے بندوں کو خبر دیجیے کہ بے شک میں ہی بخشنے والا رحم فرمانے والا ہوں۔ اور بے شک میرا عذاب وہی دردناک عذاب ہے۔ اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر مومن کے خوف اور امید کو تولا جائے تو دونوں برابر ہیں۔ پس جب انعام کے ذکر نے امید پر دلالت کی تو لازم ہوا کہ غضب و ضلال کا ذکر بھی فرمایا جائے۔ تاکہ خوف پر دلالت کرے۔ اور ایمان کے دونوں رکن برابر ہو جائیں۔ نیز جاننا چاہئے کہ غضب کی نسبت ذات حق کی طرف نہ فرمائی گئی اور اسی طرح گمراہی کی۔ بخلاف انعام کے۔ اس لئے کہ انعام صرف

فضل ہے کہ اس سے پہلے کوئی استحقاق نہیں۔ جبکہ غضب بندوں کے اعمال کی نحوست اور گمراہی ان کے ادراک کی کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ پس گویا اللہ تعالیٰ صرف انعام کا فاعل حقیقی ہے۔ اور غضب و ضلال بندوں کی شرکت اور ان کے استحقاق کی وجہ سے اس سے صادر ہوتے ہیں۔

یہاں غَيْرِ الَّذِيْنَ غَضَبَ عَلَيْهِمْ نہیں فرمایا تاکہ صرف غضب و ضلال کے ساتھ مشہور چند معلوم اشخاص سے ہی پرہیز خاص نہ رہے۔ نیز منعم علیہ کے مقابلہ میں ایک گروہ لائے جو کہ مغضوب علیہ ہے۔ اور ضالین جو کہ مہتدین کے مقابل ہے منعم علیہم کے مقابل مقام کے مناسب نہیں۔ لیکن جب منعم علیہم یقینی طور پر ہدایت یافتہ بلکہ ہدایت دینے والے ہیں۔ کیونکہ ان کی راہ کو طلب کرتا ہے۔ اور اس راہ کی ہدایت چاہتا ہے۔ تو لازماً ضالین بھی منعم علیہم کے مقابلہ میں آئے۔ نیز جاننا چاہئے کہ مغضوب علیہم کو ضالین سے پہلے لانا اس حقیقت کی علامت ہے کہ ضالین کے مقابلہ میں مغضوب علیہم کی حالت زیادہ خراب اور آخرت میں ان کی نسبت زیادہ رسوا ہوں گے۔ پس تفسیروں میں مغضوب علیہم کی بدبختی کی ترجیح کی رعایت رکھنی چاہئے تاکہ قرآن پاک کی عبارت کی مخالفت لازم نہ آئے۔

تمام سورت کی تفسیر کے متعلقات — سات آیات اور سات ارکان کی معنوی مناسبت

اور دوسری قسم سے یعنی جو کہ ہیئت مجموعی کے اعتبار سے تمام سورۃ کے ساتھ متعلق ہے یہ ہے کہ نماز میں اس سورت کی قرأت واجب قرار دی گئی ہے۔ اور محسوس ہونے والے اعمال نماز میں سات رکن ہیں۔ اور اس سورت کی آیتیں بھی سات ہیں۔ نماز کے سات ارکان قیام، رکوع، قومہ، پہلا سجدہ، دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا، دوسرا سجدہ اور قعدہ۔ اور یہ سات اعمال انسان کے بے روح جسم کے سات اعضاء کی مثل ہیں۔ اور یہ سورت بمنزلہ روح ہے۔ اور جب روح جسم کے ساتھ ملتی ہے۔ تو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ پس بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو قیام کے مقابل تصور کرنا چاہئے اس لئے کہ ہر چیز کے وجود کا قیام اس چیز میں اسم الٰہی کے ظہور کی بدولت ہے۔ نیز بِسْمِ اللّٰهِ ہر کام کی ابتداء کیلئے مقرر ہے۔ اور قیام اعمال نماز کی ابتداء ہے۔ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رکوع کے مقابل ہے

اس لئے کہ اس صیغہ کے ساتھ حمد کرنے میں حق کی طرف بھی نظر ہے۔ اور مخلوق کی طرف بھی۔ نیز ملاحظہ منعم بھی ہے۔ اور ملاحظہ نعمت بھی۔ پس یہ ایک حالت ہے جو کہ غفلت و استغراق کے درمیان ہے۔ جس طرح رکوع ایک حالت ہے قیام وسجدہ کے درمیان۔ یا یہ کہ جب اس نے حمد میں رب تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کو ملاحظہ کیا تو اس کی پشت ان نعمتوں کے وزن سے دوہری ہوگئی۔ اور ٹیڑھی ہوگئی اور رکوع کی شکل بن گئی۔ اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قومہ کے مناسب ہے۔ اس لئے کہ ہر وہ بندہ جو کہ اپنی بلندی کی حالت کو اللہ تعالیٰ کیلئے پستی کی حالت میں بدل دے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اسے اس کی اصل بلندی کی حالت کی طرف لوٹا دیتی ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کیلئے عاجزی اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتا ہے۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پہلے سجدہ کے مناسب ہے۔ اس لئے کہ سجدہ تجلی قہری جلالی پر دلالت کرتا ہے۔ جو کہ خوف شدید اور انتہائی عاجزی اور انکساری کو واجب کرتی ہے۔ اور خاک ہونا اور چہرے کو خاک پر ملنا اسی کے اثر سے ہے۔ نیز يَوْمِ الدِّيْنِ کی ابتداء موت کے بعد سے ہے۔ اور موت جسد انسانی کا اپنی اصل یعنی خاک کی طرف رجوع ہے۔ اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ دوسجدوں کے درمیان بیٹھنے کے مناسب ہے۔ اس لئے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ پہلے سجدہ سے فارغ ہونے کا بیان ہے جس میں انتہائی عاجزی واقع ہوئی۔ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ دوسرے سجدہ کیلئے مدد مانگنے کیلئے ہے۔ اور لفظ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ایک بہت ضروری مطلب کا سوال ہے۔ پس یہ دوسرے سجدہ کے مناسب ہے جو کہ قبولیت کا مقام ہے۔ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ گویا حصول مطلب اور انعام الٰہی وصول کرنے کی نیک فال ہے۔ پس یہ قعدہ کے مناسب ہے۔ کیونکہ بادشاہوں کی یہ ہمیشہ کی عادت ہے کہ جب ان کے غلام انتہائی عاجزی کے ساتھ مجرا دسلام سے فارغ ہوتے ہیں تو وہ انہیں بیٹھنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور ان پر انعام واکرام ہوتا ہے۔ اور اپنے مالک کے سامنے بیٹھنا انعام کا کامل مرتبہ ہے۔ اسی لئے اس مرتبہ کے حاصل ہونے کے بعد التحیات جو کہ شکر وثناء منعم حقیقی اور اس راہ کے وکیلوں اور رفیقوں پر درود وسلام کو شامل ہے مقرر کیا گیا۔

ایک اور مناسبت

اور بعض نے یوں کہا ہے کہ لفظ بِسْمِ اللّٰہِ طہارت کے مناسب ہے۔ اس لئے اسم الٰہی کا نور ناپاکی کی ظلمت کو دور کرتا ہے۔ اور لفظ رحمٰن جو کہ بِسْمِ اللّٰہِ کے اندر ہے استقبال قبلہ کے مناسب ہے۔ اس لئے کہ ایجادی رحمت کا حاصل حق کا اشیاء کی طرف متوجہ ہونا اور چیزوں کو حق کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اور استقبال قبلہ میں بھی بدن کا مبدء ترابی کی طرف متوجہ ہونا ہے جو کہ کعبہ سے ہے۔ اور مٹی کا جوہر بدن میں سب عناصر سے زیادہ غالب ہے۔ اور سب کی مٹی نقطہ کعبہ سے پھیلائی گئی ہے۔ جیسا کہ اخبار میں مذکور ہے۔ اور یہ حالت روح کے اپنے مبدء کی طرف متوجہ ہونے کا موجب ہوتی ہے جو کہ بنائے کعبہ کے بعد اس مبارک مکان میں جلوہ گر ہے۔ پس دو الفاظ یعنی رحمٰن اور رحیم کو لانے میں استقبال بدنی اور توجہ روحانی کی طرف اشارہ ہے۔ اور حمد قیام کے مناسب ہے۔ کیونکہ خلق کے حق کے ساتھ قائم ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ حتیٰ کہ خلق کی تمام خوبیاں حضرت حق کی طرف لوٹ گئیں اور رَبِّ الْعَالَمِیْنَ رکوع کے مناسب ہے۔ کیونکہ ربّ اور مربوب دونوں کو شامل ہے۔ جس طرح کہ رکوع قیام اور قعود دونوں کے معنوں کو شامل ہے۔ اور رحمٰن و رحیم کا ذکر اعتدال کے مناسب ہے۔ کیونکہ فنا کے بعد بقا لازم ہے۔ اور بقا اعتدال کو لازم کرتی ہے۔ اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ مناسب سجدہ ہے۔ ساری مخلوقات اس دن انتہائی عاجزی میں ہو گی۔ اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کے مناسب ہے۔ کیونکہ سجدہ کی وجہ سے کمال قرب حاصل ہوا اور بارگاہ کے مقرب کا حق ہے کہ بیٹھے اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ دوسرے سجدہ کے مناسب ہے۔ کیونکہ استعانت مزید عاجزی کا ذریعہ ہے جو کہ سجدہ کی تکرار سے لازم آتی ہے۔ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تشہد والے قعدہ کے مقابل ہے۔ کیونکہ صاحب استقامت کے اعزاز کا پتہ دیتا ہے۔ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تشہد پڑھنے اور درود شریف اور دعا کے مناسب ہے۔ جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔

حکمت تکرار سجدہ

اور یہاں عوام کے دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ارکان نماز میں سے سجدہ میں تکرار

کیوں فرمائی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے پہلا سجدہ ازل سے مناسب ہے۔ اور دوسرا ابد سے اور انکے درمیان کا بیٹھنا دنیا کی صورت ہے۔ پس اس کی ازلیت سے اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ اس سے اول کوئی نہیں۔ پس اس سلبی صفت (کہ اس سے پہلے کوئی نہیں) پر نظر کرتے ہوئے ایک سجدہ کرنا چاہئے۔ اور اس کی ابدیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کوئی نہیں۔ پس اس صفت پر نظر کرتے ہوئے دوسرا سجدہ کرنا چاہئے۔ نیز پہلا سجدہ آخرت میں دنیا کی فنا کا اشارہ ہے۔ اور دوسرا سجدہ آخرت کے جلال الٰہی میں فنا کا اشارہ ہے۔ نیز پہلا سجدہ کل مخلوقات کے اپنی ذات میں فنا ہونے کا اشارہ ہے۔ اور دوسرا سجدہ ذات حق کی بقا کے ساتھ ساری کائنات کی بقا ارشارہ ہے۔ نیز پہلا سجدہ حکم قدرت کے تحت عالم شہادت کا جھکنا ہے۔ اور دوسرا سجدہ ملاحظہ جلال عزت کے حضور عالم ارواح کا جھکنا ہے۔ نیز پہلا سجدہ معرفت ذات وصفات کی نعمت پر سجدہ شکر ہے۔ اور دوسرا سجدہ حقوق کبریائی کی ادائیگی میں کوتاہی کی وجہ سے سجدۂ خوف ہے۔ نیز مشہور ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے سے بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز آدھا اجر رکھتی ہے۔ پس جب بیٹھ کر پڑھنے کے وقت سجدہ کیا جائے گا تو دو سجدوں کی تواضع ایک رکوع کی تواضع کے برابر ہوئی۔ نیز ہر باب میں دو معتبر گواہ درکار ہیں۔ اور قیامت کے دن یہ دو سجدے بندے کی بندگی کیلئے دو عادل گواہ ہیں۔ نیز وجود کی ابتداء وحدت سے کثرت کی طرف ہے۔ اور فردیت سے زوجیت تک۔ پس وجود کی مسرت کے مناسب یہی ہے کہ دو سجدے مقرر ہوں۔

نیز جسم کا سیدھا ہونا انسانی صفت اور کمر کا جھکا رہنا چارپایوں کی صفت اور زمین پر سر رکھے رہنا حشرات الارض یعنی سانپ' نیولا وغیرہ' کیڑوں مکوڑوں کی صفت ہے۔ پس رکوع میں نفس کی سرکوبی ایک مرتبہ ہے۔ اور سجدہ میں دو مرتبہ۔ اسی لئے سجدہ میں تکرار رکھی گئی تاکہ نفس کی سرکوبی زیادہ حاصل ہو۔

فائدہ دیگر

سورت فاتحہ میں دس چیزیں ہیں پانچ چیزیں صفات ربوبیت سے اللہ' رب' رحمٰن' رحیم' مالک اور پانچ چیزیں صفات عبودیت سے عبادت' استعانت' طلب ہدایت' طلب

استقامت' طلب نعمت و پناہ از غضب۔ عبادت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے استعانت رب سے' طلب ہدایت رحمٰن سے' طلب استقامت رحیم سے اور طلب نعمت اور غضب سے پناہ مالک سے تعلق رکھتی ہے۔ نیز آدمی پانچ چیزوں سے مرکب ہے بدن' نفس شیطانی' نفس سبعی' نفس بہیمی جوہر ملکی جو کہ عقل ہے۔ پس جوہر ملکی کا اطمینان تجلی اسم کے ساتھ ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔ اور نفس شیطانی نرم اور مطیع ہوتا ہے اسم رب کی تجلی سے رَبِّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوں سے اور نفس سبعی یعنی درندہ صفت نفس کی اصلاح اسم رحمٰن کی تجلی سے ہوتی ہے اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذِ ن الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ اس دن سچی بادشاہی حضرت رحمٰن کیلئے ہے۔ اور نفس بہیمی یعنی چار پایہ صفت نفس کی اصلاح اسم رحیم کی تجلی سے ہے وَمِنْ رَّحْمَتِه جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ اور اس کی رحمت سے ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن مقرر فرمائے کہ تم اس (رات) میں آرام کرو اور (دن) میں اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو اور بدن کی غلاظت اور میل کچیل کا ازالہ صفت مالکیت کی تجلی سے ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ آج کے دن کس کی بادشاہی ہے اللہ واحد قہار کیلئے اور جب ان تجلیات کی برکت سے آدمی اپنے تمام اجزاء سمیت درست اور مہذب ہو گیا تو اپنے مطلب کی طرف پچھلے پاؤں لوٹا' بدن کی اطاعت کیلئے اِیَّاكَ نَعْبُدُ اور نفس بہیمی کو مطیع کرنے کیلئے تاکہ اپنی لذتوں اور بری چیزوں کے ارتکاب کو چھوڑنا آسان ہو جائے وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ لایا۔ اور نفس سبعی کے غلبہ سے خلاصی پانے کیلئے اِهْدِنَا کہا اور اور نفس شیطانی کے فریبوں کو دور کرنے کیلئے استقامت مانگی۔ اور جوہر ملکی کی اصلاح کیلئے ارواح مقدسہ کے ساتھ کی درخواست کی۔ اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے ساتھ ناپاک ارواح سے دوری کی درخواست کی۔

مزید حکمت

نیز جب بندہ مناجات کے مقام میں کھڑا اور اس نے ذات باری تعالیٰ کی صفات

کاملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے لے کر مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک ملاحظہ کیں تو بے اختیار اسے سیر الی اللہ کا شوق دامنگیر ہوا اس شوق سے مجبور ہو کر اس نے اس سفر کا پکا ارادہ کر لیا اور ہر سفر میں اخراجات ضروری ہیں اس سفر کا خرچ عبادت ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہا اور جب جانا کہ سفر بہت طویل جبکہ سفر خرچ بہت قلیل ہے۔ نیز اس فاصلے کو طے کرنے میں قوت وفا نہیں کرتی تو کوئی سواری چاہئے تو اس نے وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہا تا کہ زاد راہ میں برکت اور اس طویل فاصلے کو طے کرنے کیلئے بارگاہ خداوندی سے سواری کی امداد ہو جائے۔

حضرت ابراہیم ادہم سے منقول ہے کہ آپ راہ حج میں سواری کے بغیر جا رہے تھے ایک اعرابی نے آپ سے کہا کہ اے شیخ آپ کا کیا حال ہے کہ اس اتنے طویل سفر کا بغیر کسی سواری کے قصد فرمایا؟ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس کئی سواریاں ہیں۔ اگر تکلیف آئے تو میں صبر کی سواری رکھتا ہوں۔ اگر کوئی نعمت آئے تو مرکب شکر اور مقرر شدہ قضا آئے تو رضا کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ اور اگر نفس خلل ڈالے تو قناعت اور زہد کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ اور اگر شیطان وسوسہ ڈالے تو نگہبان ذکر کی وجہ سے پناہ میں رہتا ہوں۔ اعرابی نے کہا آپ کا یہ سفر مبارک ہے۔ اور در حقیقت آپ سوار ہیں۔ اور میں پیادہ اور جب بندے نے توشہ اور سواری حاصل کر کے اطمینان کر لیا تو اس کے سامنے مختلف راہیں نمودار ہوئیں تو ناچار اس نے صراط مستقیم طلب کی۔ اور جب راہ مستقیم ظاہر ہوئی تو اس راہ میں اس کیلئے کوئی رہنما اور ساتھی چاہئے تو نبی علیہ السلام کو رہنما اور اولیاء کو اپنے ساتھی مقرر کیا۔ اور اس راہ میں جو پڑوسی کانٹے اور چٹانیں آتی ہیں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے الفاظ سے ان سے بچاؤ حاصل کیا۔

اسمائے سورہ فاتحہ

جاننا چاہئے کہ اس سورت کے بہت سے نام ہیں۔ ان میں بعض ناموں کی وجہ تسمیہ کی تشریح کے ساتھ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ تا کہ اس تمام سورت میں جو فوائد رکھے گئے ہیں ظاہر ہو جائیں۔

فاتحۃ الکتاب

ان ناموں میں سے ایک نام فاتحۃ الکتاب ہے۔ اور یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی اس سورت سے شروع کرتے ہیں لکھنے میں اور نماز پڑھنے میں بلکہ اس سورت کا نام اور حمد ہر کتاب کی ابتداء ہے۔ اور ہر چیز کا وجود اس چیز میں اسم الٰہی کے ظہور کی وجہ سے ہے۔ اور اس چیز کی بقا اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ ہے۔ اور اسی وجہ سے اس سورۃ کا نام فاتحہ بھی ہے۔ کیونکہ علوم کے فضائل کو کھولتی ہے۔ پس بِسْمِ اللّٰهِ ذات الٰہی اور اس کی صفات کا اشارہ ہے جو کہ ہزاروں سے بھی زیادہ ہیں۔ اور تمام دین اور شریعت اس کی معرفت اور اس کی عبادت کیلئے ہیں۔ اور لفظ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ذات حق کے اپنے وجود اور صفات کاملہ کے ساتھ عالم میں ظہور فرمانے کی طرف اشارہ ہے۔ اور تمام علوم کی انتہا اسی راز کو جاننا ہے۔ اور حرف یا جو کہ لگانے' چپکانے کیلئے ہے اشارہ ہے اسماء وصفات الٰہی کے ساتھ فیض یاب ہونے کی طرف جو کہ نوع انسانی کے کمال کی انتہا ہے۔ اور حمد ان نعمتوں کے شکر کی طرف اشارہ ہے جو کہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان میں سے خاص بدن انسانی میں متبحر طبیبوں کے بیان کے مطابق پانچ ہزار منفعتیں ہیں۔ اور اس مقدار کو اگر اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کے ساتھ قیاس کریں تو اس قطرے کی نسبت سے بھی کم تر ہے جو اسے متلاطم دریا کے ساتھ ہے۔ اور اس کے ضمن میں معرفت نفس حاصل ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے تمام خلائق کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ موجودات کی اقسام کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے ارواح' عالم شہادت کے اجسام' عالم مثال کے اجسام اور اعراض اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اشارہ ہے تمام اچھائیوں کی طرف اور تمام آفتوں سے خلاصی پانے کے اسباب کی طرف اور یہ بحث علوم کے عظیم مقاصد سے ہے۔

اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اشارہ ہے معاد' جسموں سے جدائی کے بعد نفوس کے باقی رہنے' بعض کی سعادت اور بعض کی شقاوت' آسمان و زمین کی تخریب' صور پھونکنے' مرنے کے بعد زندہ کرنے کی کیفیت' میدان قیامت میں کھڑے ہونے' حسنات' میزان عمل' درجات جنت' طبقات نار اور انبیاء علیہ السلام' علماء اور شہداء کی شفاعت کے مرتبوں کی طرف

اور یہ مقصد علم اعتقاد کے بہت بڑے مقاصد میں سے ہے۔اور ایاک نعبد عبادت قلبی اور جسمانی کی قسموں کی طرف اشارہ ہے جو کہ کتب فقہ وسلوک میں ہر طریقہ کے اوراد واشغال میں سے کچھ بیان ہوئے۔اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پیشوں اور صنعتوں کی قسموں کی طرف اشارہ ہے جو کہ دنیا میں رائج اور جاری ہیں۔کیونکہ بنی آدمی کے تمام پیشے اور ان کی صفتیں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات سے مدد مانگنا ہے۔مثلاً کاشتکاری اور زراعت کا پیشہ کہ یہ بیج کی صورت نوعی اور کیفیت زمین کے مقتضیٰ' آب وہوا' سورج' چاند' لوہا' بیل' چڑا وغیرہ سے استعانت ہے جو کہ سب مخلوق ہیں۔اور اسی پر تمام پیشوں اور کاموں کو قیاس کرنا چاہیئے اسی لئے کہا گیا ہے بنی آدم کی صفتیں تین چیزوں کی طرف لوٹتی ہیں۔

استنتاج واستخدام ونقل وحکایت

استنتاج یہ ہے کہ کسی چیز کو ایک دوسری چیز کے ساتھ جمع کریں کہ ایک تیسری چیز حاصل ہو مثلاً زراعت اور درخت کہ بیج اور زمین کو اکٹھے کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔اور مثل نسل' دودھ' دہی اور گھی کے کہ نر کو اس کی مادہ کے ساتھ جمع کرنے سے حاصل ہوتی ہے یا دو مختلف النوع جانوروں کو ملانے سے حیوانات میں۔اور پیوندکاری اور نر کھجور کا شگوفہ مادہ کھجور میں لگانے سے درختوں اور نباتات میں اور صغریٰ اور کبریٰ اور قضیہ شرطیہ اور استثنائیہ کو ملانے سے قیاسات میں اور

استخدام

یہ ہے کہ کسی چیز کی قوت اور نفع کو اپنے کام میں صرف کیا جائے جیسے جانوروں کی سواری' اور غلاموں' کنیزوں' سائیسوں' درزیوں' ملاحوں اور دوسرے خاص اور مشترک مزدوروں سے خدمت لینا اور

نقل وحکایت

یہ ہے کہ بعض مخلوقات میں بعض دوسری مخلوقات کے ذریعے ایک خاص صورت' شکل اور کیفیت پیدا کریں جو کہ پسندیدہ چیز کی حکایت کرے۔مثلاً جب چاہیں کہ سونے اور

چاندی کو پہننے کے طور پر استعمال کریں تو پہلے انہیں مصالحے اور آگ مسلط کرنے کے ذریعے پانی بنا کر روئی یا ریشم کے دھاگے پر چلائیں تاکہ روئی میں سونے اور چاندی کی چمک دمک اور صفائی پیدا ہو۔ اور روئی سونے اور چاندی کی حکایت کرے۔ جیسے کناری' طاش اور بادلہ وغیرہ اور اسی قیاس پر پرندوں کی آوازوں اور سازوں کے نغمات میں اور پھولوں اور ریحان کی مہک اور گلاب اور کلیوں کے طبعی رنگوں میں غور کرنا چاہئے کہ علم موسیقی عطاری' صباغی انہیں سے پیدا ہوا۔

اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ علوم ومعارف حاصل کرنے کے دو طریقوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ استدلال اور تصفیہ ہے۔ پہلے کو مشائین کا طریقہ اور دوسرے کو اشراقیوں کا طریقہ کہتے ہیں۔ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں نبوت و ولایت کے مباحث' اعتقادات صحیحہ' فضیلت والے اخلاق' نیک اعمال' انبیاء کی تواریخ اور اولیاء اور ان کے مقامات و ملفوظات کی طرف اشارہ ہے۔ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں کفار اور بدعتیوں کے گروہوں۔ اور دنیا والوں کے مقالات کا اشارہ ہے اور برے اعمال' ردی عادات اور باطل عقائد سے کنایہ ہے جو کہ مختلف علاقوں اور طویل مدتوں کے دوران پھیلے۔

سورة الحمد

اور ان میں سے ایک نام سورة الحمد ہے۔ کیونکہ اس سورت کی ابتداء لفظ حمد کے ساتھ ہے۔ اور اس سورت کی حمد قرآن پاک اور غیر قرآن کے تمام محامد کو شامل ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

سورة الشکر

اور ان میں سے ایک نام سورة الشکر ہے۔ کیونکہ حمد شکر کی بنیاد ہے۔ اور اس سورت میں شکر کی وجوہ کو جمع فرمایا گیا ہے۔ اور وہ تین وجہیں ہیں دل سے محبت' زبان سے تعریف اور اعضاء کے ساتھ خدمت۔ جیسا کہ ان سب کی تفصیل گزر چکی۔

سورۃ الکنز

اور ان میں سے ایک نام سورۃ الکنز ہے۔ کیونکہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا ہے کہ سورۃ فاتحہ عرش کے نیچے ایک خزانے سے اتری۔ اس سے مراد معرفت کے اسرار ہیں جو کہ ذات' اسماء' افعال' معاد' صراط مستقیم' جزا' علم مخاصمہ اور علم احکام کی معرفت کو شامل ہیں۔ پس اللہ ایک نام ہے جو کہ ذات و اسماء کو جامع ہے۔ اور حرف یا جو کہ الصاق کیلئے ہوتی ہے کا اشارہ اس طرف فرمایا گیا کہ اشیاء کے وجود اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء کے ساتھ قائم ہیں۔ جس طرح کہ جسم کا قیام روح کے ساتھ ہے۔ اور وجود اشیاء کا یہی راز ہے۔ لیکن یہ اس طریقہ سے نہیں کہ اس پر واجب ہے۔ بلکہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ کمالات ذاتیہ کا فیض عطا فرماتا ہے۔ پس لفظ رحمٰن اور رحیم میں معرفت افعال بیان ہوئی۔ اور افعال کا راز بھی ظاہر ہو گیا کہ اس کے افعال کمال ذاتی کی بنا پر ہیں جو کہ حمد کا مقتضی ہے۔ کیونکہ کامل کی شان یہ ہے کہ غیر کی تکمیل کرے نہ کہ اپنی تکمیل چاہے۔ اس لئے کہ وہ سب کا ربّ ہے۔ پس کل مخلوقات کو کمالات کا فیض عطا فرمانا اسی سے ہے۔ اور اگر کسی کمال کے حاصل کرنے کا فیض پہنچاتا تو طالب عوض ہوتا اور لام استغراق اور لام اختصاص کے ساتھ بیان فرمایا کیونکہ اس کی حمد محیط ہے۔ اس لئے کہ جو چیز بھی دنیا میں کسی وجہ سے بھی تعریف کی مستحق ہے سب اسی کے فیض سے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ بہتر طور پر اس حمد سے محمود ہو گا۔ اور اسی لئے کہا گیا ہے حمد کو تیری ذات سے ایسی صحیح نسبت ہے کہ جس کے دروازہ بھی کوئی جائے وہ تیرا ہی دروازہ ہے۔

پھر حمد کے راز کا اشارہ فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی تربیت رحمت فرماتا ہے کہ پہلے تو ہر چیز کو۔ جیسا کہ چاہئے تھا پیدا فرمایا پھر وہ اپنی بقا کیلئے جس چیز کی محتاج ہے اسے بخشی اور تمام نہ ختم ہونے والے کمالات کی گنجائش دی اور معاد کا اشارہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے ساتھ فرمایا۔ اور مالکیت کے محیط ہونے کا اشارہ بھی فرمایا۔ اور مالکیت کی اضافت اس زمانے کی طرف کر کے جو کہ بندوں کو محیط ہے۔ یعنی يَوْمِ الدِّيْنِ مالکیت کے محیط ہونے کا اشارہ بھی فرمایا۔ اور معاد کے راز کا بھی یہی اشارہ فرمایا جو کہ

رحمت کا تقاضا ہے۔ اس لئے کہ ظالم سے مظلوم کیلئے بدلہ لئے بغیر مظلوم پر رحمت پوری نہیں ہوتی۔ اور عابدوں کی عبادت ہر نعمت تمام نہیں ہوتی مگر ایک کلمہ اور ایک عمل پر ملک ابد بخشنے کے ساتھ پھر صراط مستقیم کا اشارہ فرمایا ہے۔ اور اس کے دو رکن ہیں عبادت کے ساتھ جلا بخشنا' اور استعانت کے ساتھ تزکیہ اور صراط مستقیم کا راز بھی بیان فرمایا کہ اس کا نتیجہ شکر ہے جو کہ حمد کے لفظ سے سمجھا جاتا ہے۔ اور صبر ہے جو کہ عبادت کے لفظ سے ظاہر ہوا پھر عبادت کے خلاصہ کا پتہ دیا جو کہ دعا ہے۔ اس لئے کہ وہ عاجزی اور زاری کو ضمن میں لئے ہوئے ہے جو کہ ممکن و محتاج ہونے کی نسبت کا اظہار ہے۔ اور یہ روح عبودیت ہے۔ اور انعام و غضب کا ذکر کر کے جزا کا اشارہ فرمایا۔ اور جزا کا راز بھی بیان فرمایا جو کہ عبادت اور استعانت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ربوبیت کا حق عبادت اور عبودیت کا حق اعانت ہے۔ اور جب دونوں حق جمع ہو گئے تو ہدایت یا گمراہی کی راہ کے ہر سالک کیلئے جزا کا حصول لازم ہوا استدلال کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ افراد عالم میں سے ہر فرد کی نسبت بلا واسطہ الوہیت' ربوبیت' رحمت اور مالکیت رکھتا ہے۔ پس واسطوں کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ان امور میں شرک کا عقیدہ رکھنا کس لئے؟ (اقول و باللہ التوفیق' اس واسطہ سے مراد وہ ہے۔ جسے کفار اختیار کئے ہوئے تھے جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى قرب خداوندی کیلئے وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے اس سے اس وسیلہ کی نفی نہیں ہوتی جو کہ خود ارشاد خداوندی ہے یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ الخ اور اس کی وضاحت حضرت مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے صفحات گزشتہ میں اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفسیر میں فرمائی ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ) کیونکہ جب سب کے سب اسی کی ربوبیت اور رحمت کے محتاج اور اسی کے مملوک ہیں تو پھر شریک ٹھہرانے سے تو عابد اور معبود کی برابری لازم آئی۔ نیز ایک طرف انتہائی عاجزی اور دوسری انتہائے عظمت نہ رہی اور عبادت و استعانت کے ساتھ علم احکام شرعیہ کی طرف اشارہ فرمایا جو کہ تمام عبادت اور معاملات کو جمع کئے ہوئے ہے۔

سورۃ المناجات

اوران میں سے ایک نام سورۃ مناجات ہے۔ کیونکہ نمازی اس سورۃ کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں مناجات کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت کی سختیوں سے نجات عطا فرماتا ہے۔

سورۃ التفویض

اور اس کا ایک نام سورۃ التفویض ہے۔ اس لئے اس میں حقیقی استعانت کو حضرت حق جل جلالہ کے ساتھ خاص فرمایا گیا۔

سورۃ وافیہ

ایک نام سورۃ وافیہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا مضمون معراج نماز کے ساتھ پورا اترتا ہے۔ کیونکہ بِسۡمِ اللّٰہِ کی با تمام موجودات کے اسی سے ظاہر ہونے کا اشارہ ہے۔ پس وہ تمام اشیاء سے زیادہ ظاہر ہے۔ لیکن انتہائی طور پر ظاہر ہونے کی وجہ سے مخفی ہے۔ یہاں تک کہ وجود اور تمام کمالات کا فیض عطا کر کے اس کی رحمت عام ہوئی۔ یہاں تک کہ تمام خوبیوں کا مستحق ہوا اور ہر چیز کی پرورش فرمائی پہلے تو وجود عطا کر کے۔ دوسرے ماہیات کے تابع خصوصیتیں عطا فرما کر اور یہ کمالات اشیاء کی ذوات کا تقاضا نہ تھا اس لئے کہ قیامت کے دن اس کی شان قہاری کے سبب سے تمام کمالات ذوات سے جدا ہو جائیں گے ہاں ان کمالات کے عوض اہل عبادت و استعانت کو دوسرے کمالات عطا فرمائے جائیں گے۔ پس ان کمالات کو طلب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہدایت استقامت اور انعام اسی سے طلب کئے جائیں۔ اور کمال کے بعد نقصان اور نقصان کی طرف لوٹنے کو مضر سمجھ کر اس سے پرہیز کی جائے۔

سورۃ الشفا والشافیہ

اس کا نام سورۃ الشفا والشافیہ بھی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ فاتحہ الکتاب ہر بیماری سے شفا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پاک کا نور اس

ظلمت کو دور کر دیتا ہے جس سے بیماریوں کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس آفت کے منافی ہے جس کی بیماری سے توقع ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد نعمت کو کھینچتی ہے اس آیت کے مطابق لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ نعمتیں عطا کروں گا اور حالت مرض میں جو نعمت درکار ہے وہ شفا اور صحت ہے۔ اور اقرار ربوبیت' آثار تربیت کے فیضان کا تقاضا کرتا ہے۔ کہ اس کی وجہ سے شفائے کامل ہوتی ہے۔ اور رحمت کے ذکر سے اپنے افعال کے کمال کو چاہتا ہے جو کہ کمال صحت پر مرتب ہوتا ہے۔ اور قیامت کے دن کی مالکیت حمد کی جزا کے طریقہ سے مرض کے اسباب کو توڑنا اور اسباب شفا کی تقویت دینا طلب کرنا ہے۔ اور ہدایت طلب کرنے میں دوا کی تجویز اور مرض کی تشخیص میں غلطی سے بچنے کا اشارہ ہے۔ اور استعانت کے ساتھ بدن کے احوال کی استقامت چاہتا ہے۔ جو کہ روح کی سواری ہے۔ اور انعام کے ساتھ اشارہ کرتا ہے کہ شفا کے بعد کی پرہیز شکنی سے جو لذیذ اور پاکیزہ چیزوں کے استعمال سے مجھے نفع حاصل ہو۔ اور غضب وضلال کو دور کر کے بری تدبیر اور اسباب مرضی کے لوٹنے سے پرہیر کرتا ہے۔

سورۃ رقیہ

اور ان میں سے ایک نام رقیہ ہے۔ اس لئے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا گزر ایک مرگی والے مریض پر ہوا اس نے یہ سورت پڑھ کر اس پر دم کیا اس دورے والے مریض کو شفا ہو گئی۔ اور اس کی وجہ مناسبت گزر چکی۔

اساس

اور ایک نام اساس یعنی بنیاد ہے۔ اس لئے کہ امام شعبی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ سب آسمانی کتابوں کی بنیاد قرآن پاک اور قرآن پاک کی بنیاد فاتحۃ الکتاب ہے۔ پس جب بھی تجھے بیماری آئے تو تجھے چاہئے کہ تو اساس قرآن سے التجا کرے۔ اور شفا حاصل کرے۔ نیز یہ سورۃ نماز کا رکن ہے۔ اور نماز تمام طاعتوں کی بنیاد ہے۔ کیونکہ وہ بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ نیز نماز مناجات اور مشاہدہ کے مقام تک

پہنچاتی ہے جو کہ تمام کمالات کی بنیاد ہے۔ نیز اس سورت میں معاد کو مبدء یعنی آخرت کو دنیا کے ساتھ مراتب کی ترتیب کے مطابق مربوط فرمایا گیا ہے۔ اور ہر مرتبہ دوسرے مرتبہ کی بنیاد ہے۔ مثلاً انعام ہدایت اور استقامت پر مرتب ہوتا ہے۔ جبکہ غضب ان کی ضد پر اور ہدایت عبادت میں استقامت پر موقوف ہے۔ اور عبادت دنیا و آخرت میں افعال الٰہی کو جاننے پر موقوف ہے کہ رحمٰن، رحیم اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ان افعال کا پتہ دیتے ہیں۔ اور افعال الٰہی اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے آثار ہیں کہ ان پر حمد مرتب ہوتی ہے۔

سورۃ الصلوٰۃ

اس کا ایک نام سورۃ الصلوٰۃ ہے کہ نماز میں اس سورت کا پڑھنا ضروری ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دربار خداوندی سے حکایت فرمائی ہے کہ (رب تعالیٰ نے فرمایا ہے) میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم فرمایا ہے جب بندہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے۔ تو حق تعالیٰ ملائکہ کی حاضری میں فرماتا ہے کہ دیکھو میرے بندے نے مجھے یاد کیا۔ یعنی وہ ذکر جو کہ ذات اسماء، صفات اور میرے افعال کو جامع ہے اس سے ظاہر ہوا اور جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی یعنی ایسی تعریف جو کہ تمام تعریفوں کو جامع ہے۔ اور جب بندہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے۔ تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے مجھے بزرگی اور تعظیم کے ساتھ یاد کیا کیونکہ اس نے ہر چیز کو میری طرف منسوب کیا۔ اور اس نے جان لیا کہ میری طرف سے ہر چیز کی ایجاد حکمت اور منفعت کے عین مطابق ہے۔ اور جب بندہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے۔ تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے میرے بندے نے بزرگی کے ساتھ خاص کیا۔ کیونکہ اس نے اس دن کو یاد کیا کہ اس دن کسی دوسرے کو اصلاً نہ ملک ہوگا نہ ملک اور جب بندہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہتا ہے۔ تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس آیت کا مضمون میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے۔ کیونکہ عبادت میرا حق ہے کہ ربوبیت کا تقاضا ہے۔ اور امداد بندے کا حق ہے۔ کیونکہ عبودیت

کے لوازمات سے ہے میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے اس نے میرا حق ادا کیا۔ اور ایاك نستعین لك سے ساتھ اس نے اپنے حق کی درخواست کی۔ اور جب بندہ اھدنا الصراط المستقیم سے سورت کے آخر تک پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا ہوئے کہ یہ تمام میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے بندے کو اس کی طلب عطا فرمائی یعنی ہدایت' استقامت اور انعام کی طلب اور غضب و ضلال سے پناہ۔ یہ سب بندے کے منافع ہیں۔ اور بندہ عاجزی کے طریقے سے جو کہ روح عبودیت ہے ان کا تقاضا کرتا ہے۔ پس ربوبیت کا حق تقاضا کرتا ہے کہ اسے ان مقاصد تک پہنچا دیا جائے۔

سبع المثانی

ان میں سے ایک نام سبع مثانی ہے۔ یعنی وہ سات آیتیں جن کی ہر نماز میں تکرار کی جاتی ہے۔ اور وہ سات آیتیں یہ ہیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ جو کہ باب ذکر کی کنجی ہے۔ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ جو کہ باب شکر کی کنجی ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ جو کہ رجاء وامید کے دروازے کی کنجی ہے۔ مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ جو کہ خوف اور ڈر کے دروازے کی چابی ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ جو کہ باب اخلاص کی کنجی ہے۔ اور اخلاص معرفت عبودیت اور معرفت ربوبیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ دعا اور عاجزی کی کنجی ہے۔ اور صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ آخر سورہ تک اویسیت کے دروازہ کی چابی ہے۔ اور پاکیزہ ارواح کی اقتداء اور برکات اور ان کے انوار کے نزول کی طلب ہے کہ اس کی وجہ سے سالک کو کجی میں لوٹنے سے بے خوفی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور قرآن پاک کے حکم کے مطابق کہ جب قرآن پڑھو تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو جب آٹھواں کلمہ کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ہے کہ ان سات آیتوں کے ساتھ ملایا جائے تو جنت کے آٹھ دروازوں کیلئے آٹھ روحانی کنجیاں ہاتھ آجاتی ہیں۔ (اقول و باللہ التوفیق حضرت مفسر رحمتہ اللہ علیہ نے یہاں قراءِ مکہ کوفہ اور اکثر فقہاء حجاز کے مطابق بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو سورۃ فاتحہ کا جزو بنانا ہے۔ لیکن قراء مدینہ عالیہ بصرہ اور امام اعظم ابو حنیفہ اور علاوہ ازیں دوسرے فقہاء کوفہ اس طرف گئے ہیں کہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرآن کی آیت ہے مگر جزو فاتحۃ الکتاب نہیں۔ چنانچہ مسلم اور بخاری دونوں میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے **قال صلیت خلف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وخلف ابی بکر و خلف عمر فلم یجھر احد منھم** بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پیچھے نمازیں ادا کیں ان میں سے کسی نے بھی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ جہر کے ساتھ نہیں پڑھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دی۔ بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الخ دیکھیے یہاں حضور علیہ السلام نے بِسْمِ اللّٰهِ سے بات شروع نہیں فرمائی یہ بھی اس امر پر دلالت ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ جزو فاتحہ نہیں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

قرآن عظیم

اور ان میں سے ایک نام قرآن عظیم ہے۔ اس لئے کہ یہ سورۃ ثواب میں تمام سورتوں سے اعظم اور افضل ہے۔

سورۃ تعلیم المسئلۃ

ایک نام تعلیم المسئلۃ یعنی دعا کی تعلیم ہے۔ اس لئے کہ اس سورت میں بندوں کو اپنے پروردگار سے سوال کرنے کے آداب تعلیم کئے گئے کہ پہلے ثنا اس کے بعد اخلاص اور اس کے بعد دعا مانگیں۔

کافیہ

ان میں سے ایک نام کافیہ یعنی کفایت کرنے والی ہے۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے کہ یہ سورت دوسری سورتوں سے کفایت کرتی ہے۔ اور کوئی دوسری سورت اس سے کفایت نہیں کرتی۔

ام الکتاب وام القرآن

ان میں سے ام الکتاب اورام القرآن نام ہے۔ کیونکہ یہ سورت ان تینوں علموں کو شامل ہے جو کہ بندہ کے علمی اور عملی کمال کا سبب ہوتے ہیں۔ اور وہ تین علوم یہ ہیں علم شریعت یعنی شرعی ذمہ داریاں (۲) علم طریقت یعنی معاملات قلبی کو پہچانا (۳) علم حقیقت مکاشفات ارواح کو پالینا' علم شریعت کی دو قسمیں ہیں۔ اول بنیادی عقائد' دوسرے علم اصول سے فرعی احکام۔ اس سورت میں پہلے معرفت ذات ہے کہ وہ ایسی چیز ہے کہ تمام موجودات اسی کے ساتھ قائم ہیں۔ جس طرح کہ اجسام' ارواح کے ساتھ قائم ہیں۔ پھر اس ذات مقدس کے وجود کی معرفت ہے اس دلیل سے کہ اپنی رحمت سے ممکن کی (وجود وعدم) دونوں طرفوں میں سے ایک طرف کو ترجیح دی۔ پس لازماً وہ خود بھی موجود ہے۔ پھر اس کی صفات کی معرفت ہے۔ اس طرح کہ اس کی تمام صفات' کمالات ہیں جو کہ کامل حمد کا سبب ہیں۔ اور اس کی دلیل تربیت ہے۔ کیونکہ حیات' علم' ارادہ اور قدرت کے بغیر پرورش کا تصور نہیں ہوسکتا۔ اور رحمت بھی اس کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ حقیقت رحمت یہ ہے کہ جو چیز درکار ہو بخشی جائے۔ اور بخشا مرحومین کے حالات کو تفصیلی طور پر جانے بغیر جو چیز ہر کسی کے پورے طرح لائق ہے جانے بغیر۔ ہر چیز ہر کسی کو پہنچانے مختلف جہانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنے اور ایک ہی تدبیر کو تمام کثرتوں میں جاری کرنے کی قدرت کے بغیر ممکن نہیں۔ نیز اس کی دلیل جزا دینا ہے۔ اس لئے کہ جزا مکلفین کے اقوال کو سنے' ان کے افعال کو دیکھے بغیر اور بغیر اس کلام کے کہ اس سے تکلیف دیں ممکن نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کے اسماء کی معرفت ہے۔ اس طرح کہ حقائق اسماء قریبی وسائل ہیں' اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان اور ان حقائق کی وجہ سے وہ دیکھتا' سنتا اور مہربان ہوتا ہے۔ اور بعض کو بعض پر فضیلت دیتا ہے۔ پھر معرفت توحید اس دلیل سے ہے کہ وہ ماسوا کا رب ہے۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہے اسی کی ربوبیت سے فیضیاب ہے۔ پس مرتبہ اور مقام میں اس کا شریک نہیں ہوسکتا۔ اور اس کے ہوتے دوسرے کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ پس اگر کوئی دوسرا معبود فرض کریں تو لغو ہوگا اور لغو الوہیت کے قابل نہیں پھر عبادت کیلئے اس کے

استحقاق کی معرفت ہے اس دلیل سے کہ ہر چیز' ہر حالت اور ہر حاجت میں اسی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اور اسی کے دربار کی محتاج ہے ابتدائی حالت میں اس کے دربار کی احتیاج ربوبیت کی وجہ سے درمیانی حالت میں رحمانیت اور رحیمیت کی وجہ سے اور انتہائی حالت میں روز جزا میں اس کی مالکیت کی وجہ سے اور جب وہی ہے جو کہ ان حالات اور ان حاجات کے وقت انعام اور فضل فرماتا ہے۔ تو عبادت کا مستحق بھی وہی ہوگا۔

پھر نبوت' ولایت اور مراتب ایمان کی معرفت صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں مذکور ہے۔ اور کفر' بدعت اور فسق کی معرفت غضب وضلال میں پیش نظر ہے۔ اور نیک بختی اور بد بختی کی معرفت انہیں دو معرفتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اور فضل وعدل کی معرفت ان دو صفات سے ہے کہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کی معرفت یہیں سے دریافت کی جاتی ہے کہ عبادت سے استقامت رونما ہوتی ہے۔ اور استقامت سے انعام اور شقاوت وضلالت پر غضب مرتب ہوتا ہے۔ اور قضا وقدر کی معرفت' عبادت اور استعانت کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر شرعی ذمہ داریوں کے خلاف مقدر نہ فرماتا تو استعانت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ ابتداء کی معرفت بِسْمِ اللّٰهِ سے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک ہے۔ اور آخرت کی معرفت مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے انعام وغضب کے ذکر تک ہے۔

اور علم فروع سے نعبد کے ساتھ معرفت عبادات اور نستعین کے ساتھ معاملات' مناکحات اور فیصلوں کی معرفت ہے۔ کیونکہ معاملات میں حرص' عقل کا مقابلہ کرنے والی ہوتی ہے۔ پس واجب' مستحب' مباح اور صحیح کو ہدایت سے جانا جاسکتا ہے۔ جبکہ حرام' مکروہ اور فاسد کو غضب وضلال سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ معاملات اور عبادات کا ماخذ جو کہ امر اور نہی ہے عبادت وغضب کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے۔ اور امر ونہی کا نتیجہ جو کہ وعدہ اور وعید ہے انعام اور غضب سے منکشف ہوتا ہے۔

اور علم طریقت

جو کہ قوت نظریہ اور عملیہ کے کمال کی معرفت ہے صراط مستقیم سے ادا کیا گیا۔ اور ان

ہر دو قوتوں کے نقصان کو غضب وضلال کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ اور ابتدائے سلوک میں علم طریقت میں جس کی رعایت واجب ہے اس کا نام عبادت ہے۔ سلوک کے وسط میں اس کا لقب استعانت ہے۔ اور انتہائے سلوک میں استقامت نام ہے۔ اور اوصاف نفس کی معرفت' غضب وضلال کے ذکر سے معلوم کی جاسکتی ہے کہ اس کی حقیقت راہ استقامت سے پھر جانا ہے۔ اور اوصاف قلب کی معرفت' استقامت وہدایت سے پہچانی جاسکتی ہے۔

اور تخلیہ کی معرفت عبادت سے اور تجلیہ کی معرفت ہدایت واستقامت کے ساتھ ہے۔ اور تخلیہ میں دونوں شہوتوں سے پاک ہونا لازم ہے۔ اور اسی کو عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے جو کہ شہوت کی ضد ہے۔ نیز غضب سے پاک ہونا ضروری ہے۔ اور رحمت الٰہی کے ذکر سے اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس لئے کہ جو رحمت الٰہی کا امیدوار ہوگا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت پانے والے پر غضب کرنا کیونکر جائز ہوگا۔ اور حدیث پاک میں وارد ہے

الراحمون یرحمهم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحکم من فی السماء

رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والے رحم فرمائیں گے۔ اور حرص سے پرہیز' استقامت کے ساتھ بیان فرمائی گئی۔ کیونکہ حرص اکثر راہ استقامت سے پھسلا دیتی ہے۔ اور شہوت' غضب اور حرص کی فروع سے چند چیزیں ہیں۔

اول حسد اور اس سے خلاصی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ اس امر پر دلالت ہے کہ بندہ تمام مخلوقات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی عطاؤں پر راضی اور خوش ہے۔ اور حسد اس خوشنودی کی ضد ہے۔ دوسری چیز بخل اور اس سے خلاصی رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کے معنی کو ملاحظہ کرنے سے ہے۔ اس لئے کہ جب ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ تو جو چیز اس کی ملک ہی نہیں اس میں بخل کا کیا معنی؟ تیسری چیز عجب یعنی تکبر ہے۔ اور اس سے خلاصی کا راستہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے مضمون سے ہے۔ اور چوتھی چیز کبر ہے۔ اور اس سے خلاصی کا راستہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے مضمون سے ہے۔ اور پانچویں کفر وبدعت ہے۔ اور ان دونوں سے بچنے کی راہ غضب وضلال سے پرہیز کرنے میں ہے۔

نیز تجلیہ میں اخلاق کا اعتدال ضروری ہے۔ جیسے پارسائی' شجاعت اور سخاوت اور

اعتقادات میں اعتدال ضروری کہ کمی بیشی کی طرف مائل نہ ہو۔ اور اعمال میں بھی تاکہ حد رہبانیت سے محفوظ اور مہمل اور قاصر ہونے سے گزر جائے۔ اور اس اعتدال کی طرف اشارہ صراط مستقیم کے ساتھ واقع ہوا ہے۔ نیز تجلیہ میں زہد محبت اور شوق بھی ضروری ہے۔ اور ان سب کو حمد کے ساتھ ادا فرمایا اس لئے کہ جب تمام نعمتیں اسی کی طرف سے دیکھیں تو اسباب اس کی نظر سے گر گئے اور اسباب سے بے رغبتی حاصل ہوگئی۔ اور منعم سے محبت اور شوق ہر انسان بلکہ ہر حیوان کی جبلت ہے۔ نیز تجلیہ میں محتاج ہونے کا اظہار بھی ضروری ہے۔ اور وہ استعانت کے ساتھ بیان ہوا اور عاجزی کا اظہار بھی اور وہ عبادت سے سمجھا گیا۔ اور معرفت عزت ربوبیت اور ذلت بشریت بھی ضروری اور یہ مضمون رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو جمع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

نیز تجلیہ میں معرفت کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ اور معرفت کا بائے الصاق سے پتہ دیا گیا ہے۔ یعنی روحانی تعلق جو کہ بندے کو اپنے خالق کے ساتھ حاصل ہے۔ لوگوں کے ربّ کو بے کیف اور قیاس سے بالاتر تعلق لوگوں کی جان کے ساتھ ہے۔ اور پانچ اسماء کو یہاں اس سورۃ میں یاد کرکے مقام ذکر کا نشان دیا گیا۔ اور مقام شکر کا حمد سے۔ مقام رضا کا رحمت سے مقام خوف کا یوم جزا کی مالکیت اور ذکر غضب سے۔ مقام اخلاص کا اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے۔ مقام دعا کا اھدنا سے۔ ارواح طیبہ کی اویسیت کے مقام کا صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اور بری صحبت اور ناپاک روحوں کے توسل سے بچنے کا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ سے نشان دیا گیا۔ میرے پیر صحبت کی پہلی نصیحت یہ ہے کہ ناپاک مصاحب سے پرہیز کرو۔

اور علم حقیقت

جو کہ علم مکاشفہ ہے اس سورت سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ سر ربوبیت کی معرفت کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہر حمد کا رجوع اس کی طرف نہیں ہے مگر ہر شے کے وجود کے اس کی ذات سے قائم ہونے کی وجہ سے اور تسمیہ کی با اسی پر دلالت کرتی ہے۔ اور تجلی جلال کی معرفت مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ اور ذکر غضب سے۔

معرفت تجلی جمالی ذکر رحمٰن ورحیم اور انعام سے۔ کمالات الٰہی کی معرفت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک مفہوم سے۔ اسماء الٰہی کی معرفت پانچ اسماء کے ذکر سے' معرفت نفس ذکر ضلال سے' معرفت قلب استعانت سے' معرفت روح ہدایت سے' معرفت سر وخفی اور اس سے اوپر کے مقامات کی معرفت' ذکر استقامت وانعام سے' سر نبوت کی معرفت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے تا الرحیم اور ذکر انعام سے اور معرفت وحی لفظ با سے ہے۔ کیونکہ وحی کی حقیقت' بعض روحوں کا بعض کے ساتھ متصل ہونا ہے یہاں تک کہ اتصال کا یہ سلسلہ ذات حق تک پہنچے اور ختم ہو جائے۔ اور نبوت وولایت کے درمیان فرق کی بحث صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں تابع اور متبوع کے ذکر سے جانی جا سکتی ہے۔ اور احوال ومقامات کی بحث اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اور ذکر ہدایت واستقامت وانعام سے سمجھی جا سکتی ہے۔ اور علم الیقین کا مرتبہ غائب کے صیغوں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک کے الفاظ میں سے حاصل ہوتا ہے۔ اور عین الیقین ایاک کے خطاب سے اور حق الیقین کی معرفت' رحمت' ہدایت' انعام اور استقامت کے ذکر سے۔ اور قضا وقدر کا ستر لفظ رحیم سے سمجھا جا سکتا ہے جو کہ ہر کسی کو اس کی استعداد کے مطابق تخصیص کا فائدہ دیتا ہے۔

اور اسرار عبادت کی معرفت' اسے پانچ اسماء کی فرع کی شکل میں لانے سے جانی جا سکتی ہے۔ اور اسرار معاملات کو ہدایت کے استعانت کی فرع کے طور پر لانے سے پہنچانا جا سکتا ہے۔ اور اخروی اسرار' مستقیم پر انعام اور غیر مستقیم پر غضب کے ذکر سے دریافت ہوئے۔ اور عالم غیب کیلئے عالم شہادت کی تسخیر لفظ استعانت سے سمجھی گئی اور ذات حق میں ماسوی کی فنا مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے ظاہر فرمائی اور بقا کی معرفت' استقامت وانعام کے ساتھ ارشاد فرمائی گئی۔

آدمی میں شیطان کی مداخلت کا بیان

یہاں جاننا چاہئے کہ شیطان کے داخل ہونے کی جگہ کہ اکثر آدمی کے دل میں اسی طرف سے آتا ہے تین راستے ہیں۔ شہوت' غضب' حرص' شہوت کو بہیمیت (چارپایوں کی طرح ہونا) غضب کو سبعیت (درندگی) اور حرص کو شیطانیت کہتے ہیں۔ غضب کا مرتبہ

شہوت سے اونچا ہے۔ اور حرص کا مرتبہ غضب سے بالاتر ہے کہ انسان شہوت کی وجہ سے اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ اور غضب کی وجہ سے اپنے غیر پر' جبکہ حرص کی وجہ سے اپنے پروردگار کے حقوق ضائع کرتا ہے۔ اسی لئے حدیث پاک میں وارد ہے کہ ظلم تین ہیں ایک ظلم بخشا نہیں جاتا' ایک ظلم (کا بدلہ) چھوڑا نہیں جاتا۔ اور ایک ظلم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوڑ دے جو ظلم بخشا نہیں جاتا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے۔ اور جو چھوڑا نہیں جاتا وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہے۔ اور جسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوڑ دے وہ انسان کا اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔

اور آدمی میں شہوت کا نتیجہ دو چیزیں ہیں لالچ اور بخل اور غضب کا نتیجہ بھی دو چیزیں ہیں خود بینی اور تکبر۔ حرص کا نتیجہ بھی دو چیزیں ہیں: کفر و بدعت۔ اور ان چھ چیزوں کے جمع ہونے سے آدمی میں ایک ساتویں خصلت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ مذموم اخلاق کا نقطہ انتہا ہے۔ اور اسے حسد کہتے ہیں۔ ایمانی حکمت کے حکماء یوں فرماتے ہیں کہ مذموم اخلاق میں حسد کا مرتبہ لعینوں کے درمیان شیطان کے مرتبے کی مثل ہے۔ جب یہ ابتدائی گفتگو معلوم ہوئی تو جاننا چاہئے کہ وہ تین اسماء جو کہ بِسْمِ اللّٰهِ میں واقع ہیں تین بنیادی مذموم اخلاق کو دفع کرنے کیلئے ہیں۔ اور سورۃ فاتحہ کی سات آیتیں' سات فرعی مذموم اخلاق دور کرنے والی ہیں۔ اس کا بیان یہ ہے کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا ہو۔ اور حرص کا شیطان اس سے بھاگ گیا۔ اور جس نے اس کی رحمانیت کو پا لیا غضب سے بالکل پاک ہو گیا۔ اور جس نے اس کی رحیمیت کو اپنے میں دیکھا وہ کبھی روا نہ رکھے گا کہ اپنے آپ پر ظلم کرے۔ اور اسے افعال بہیمیہ سے ملوث کرے۔ اور جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا مرتبہ شکر حاصل کیا۔ اور موجود پر قناعت کرنا اس کا نصیب ہوا اور شہوت کے بت کو توڑ دیا اور جو رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا معتقد ہوا اس کی حرص کلی طور پر دور ہوئی۔ اور اس کے بخل نے بھی عدم کی راہ لی اس لئے کہ حرص اس چیز میں ہوتی ہے کہ اپنے پاس موجود نہ ہو۔ اور بخل اس چیز میں ہوتا ہے جو کہ اپنے پاس ہے۔ اور وہ موجود اور غیر موجود جو کچھ بھی دیکھتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور جس نے یوم جزا کی مالکیت کو پہچان لیا اور اس کے بعد کہ اس نے رحمٰن و رحیم کو

جان لیا تھا اس کا غضب زائل ہو گیا۔ اور جو اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ زبان پر لایا اس نے پہلے کلمہ سے تکبر کو اور دوسرے کلمہ سے خود بینی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور جب اس نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہا اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو آخر تک اس کے ساتھ ملاحظہ کیا۔ کفر اور بدعت دور ہو گئے۔ اور جب یہ چھ بری عادتیں اس میں نہ رہیں تو حسد خود بخود دور ہو گیا۔

لطیفہ

اور اس سورت کے لطائف میں یہ ہے کہ اس میں سات حروف مذکور نہیں ہیں۔ ث ج خ ز ش ظ اور ف اور یہ سات حرف جہنم کے سات قسم کے عذاب پر دلالت کرتے ہیں۔ اور دوزخ کے سات دروازوں کی گنتی کے برابر ہیں تو لازماً مسلمانوں کے گمان میں بات آتی ہے کہ جب بھی سورت فاتحہ پڑھی جہنم' اس کے طبقات' اس کے مختلف قسم کے عذاب اور اس کے دروازوں سے داخلے سے خلاصی مل گئی۔ رہا حرف ث تو یہ ثبور کی طرف اشارہ ہے جو کہ قیامت کے دن خاص کر دوزخیوں کیلئے ہوگا وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا آج کے دن ایک ثبور کو نہ پکارو بلکہ کئی ثبور کو پکارو۔ ج جہنم اور جحیم کا نام یاد دلاتی ہے۔ اور خ اس ذلت و رسوائی کی طرف اشارہ ہے جو کہ ابد تک دوزخیوں کو لازم رہے گی۔ رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ اے ہمارے رب جسے تو نے آگ میں داخل فرمایا تو اسے رسوا کیا۔ اور ز زفیر کی طرف اشارہ ہے جو کہ دوزخیوں کا نغمہ ہے۔ اور زقوم کی طرف اشارہ ہے جو کہ اس گروہ کا کھانا ہے۔ اور ش شہیق کی طرف اشارہ ہے لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ان کے لئے وہاں چیخنا چلانا ہوگا۔ اور حرف ظا لفظ لظیٰ کا معتبر لفظ ہے جو کہ جہنم کا ایک طبقہ ہے۔ اور فا فراق کا سر یعنی پہلا لفظ ہے جو کہ اہل محبت کے نزدیک عذاب کی بدترین قسموں میں سے ہے۔ نیز فرقت و اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو دخول دوزخ کا سبب ہے۔

فضائل سورۃ الفاتحہ

اور جب اس سورۃ کے لطائف و نکات سے ہم فارغ ہوئے تو لازم ہوا کہ اس سورت

کے بعض فضائل بھی جو کہ حدیث پاک میں مذکور ہیں لکھ دیں۔ بخاری اور دیگر صحاح ستہ اور دوسری معتبر کتابوں میں روایت کی گئی ہے کہ ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ جو کہ صحابی ہیں نقل فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مسجد پاک نماز ادا کر رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی۔ میں نماز میں مصروفیت کی وجہ سے جواب نہ دے سکا یہاں تک کہ میں نماز سے فارغ ہوا اور آپ کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنا عذر بیان کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تمہارا یہ عذر قابل قبول نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول علیہ السلام کے بلانے کا حالت نماز بھی جواب دینا چاہئے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے یَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو جبکہ تمہیں ایسے کام کیلئے بلاتے ہیں جو تمہارے لئے حیات بخش ہے۔

پھر فرمایا میرے ہمراہ آؤ میں تمہیں مسجد سے باہر آنے سے پہلے ایسی سورت کی تعلیم دوں گا جو کہ قرآن پاک میں بزرگ ترین ہے میں آپ کا دست مقدس پکڑ کر رواں ہوا جب میں مسجد کے دروازہ کے قریب پہنچا تو میں نے یاد دہانی کرائی۔ فرمایا کہ وہ سورۃ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ہے۔ اور وہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جس کے نزول کو حق تعالیٰ نے مجھ پر احسان قرار دیا ہے فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ تحقیق ہم نے آپ کو سات آیتیں عطا فرمائیں جو تکرار سے پڑھی جاتی ہیں۔ اور قرآن عظیم۔

اور مسند دارمی مسند امام احمد ترمذی نسائی سنن بیہقی اور صحیح ابن خزیمہ میں اسی واقعہ کی مثل سید القراء ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اور وہاں یہ کلمہ واقع ہے کہ اتحب ان اعلمك سورة لم تنزل في التوراة ولا في الانجيل ولا في الزبور ولا في القرآن مثلها قال ابي نعم یعنی کیا تو پسند کرتا ہے کہ میں تجھے ایسی سورت کی تعلیم دوں جس کی مثل تورات انجیل زبور اور قرآن پاک میں نہیں اتری۔ اُبی نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سورت ام القرآن ہے۔ جسے تو ہر نماز میں پڑھتا ہے۔ اور صحیح مسلم نسائی ابن حبان طبرانی اور حاکم

میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یوں آیا کہ ایک دن حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ آسمان سے ایک بڑے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی غور سے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ ایک فرشتہ ہے کہ ابھی اترا ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے لے کر اب تک یہ کبھی زمین پر نہیں آیا جب وہ فرشتہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب پہنچا تو اس نے کہا کہ آپ خوش ہوں کہ آپ کو جو نور عطا فرمایا گیا آپ سے پہلے کسی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نے دیا گیا۔ سورۃ فاتحہ اور امن الرسول سے لے کر سورۃ البقرہ کے آخر تک۔ آپ اس سے ایک حرف نہیں پڑھیں گے مگر آپ اس پر عظیم ثواب پائیں گے۔

سورت فاتحہ پڑھ کر کرم کرنا

نیز بخاری، مسلم اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سانپ اور بچھو کے ڈسے ہوؤں، مرگی کے دورے والوں اور پاگلوں کو یہ سورت پڑھ کر دم فرمایا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور دار قطنی اور ابن عساکر نے سائب بن یزید سے روایت کی کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سورت کے ساتھ دم فرمایا ہے۔ اور یہ سورۃ پڑھنے کے بعد اپنے منہ مبارک کا لعاب شریف درد کی جگہ پر لگایا ہے۔

اور بیہقی نے شعب الایمان میں اور سعید بن مسعود نے اپنی سنن میں روایت بیان کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا فاتحۃ الکتاب شفاءٌ من کل داء کہ سورت فاتحہ ہر بیماری سے شفا ہے۔ اور بزار اپنی مسند میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے اپنا پہلو بستر پر رکھا اور سورت فاتحہ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھ کر اپنے آپ پر دم کیا وہ ہر بلا سے پناہ میں آ گیا۔ مگر وہ جس کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہو۔ اور عبد بن حمید اپنی مسند میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ فاتحۃ الکتاب ثواب میں قرآن پاک کے دو تہائی حصہ کے برابر ہے۔ اور بے شمار روایات میں جو کہ حاکم کے نزدیک صحیح ہیں۔ اور بیہقی نے بھی شعب

الایمان میں ان کی صحت بیان کی افضل القرآن اور آخر سورۃ فی القرآن یعنی قرآن پاک میں سب سے زیادہ ثواب والی سورۃ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

اور ابوالشیخ' طبرانی' ابن مردویہ' دیلمی اور ضیا مقدسی نے اپنی احادیث مختارہ میں روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عرش کے خزانے سے مجھے چار چیزیں عطا فرمائی گئیں اور اس خزانے سے ان چار چیزوں کے سوا کسی کو کچھ نہیں ملا۔ ام الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ' آیت الکرسی' سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں اور سورۃ کوثر اور ابونعیم اور دیلمی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فاتحہ الکتاب اس سے کفایت کرتی ہے کہ قرآن پاک کی کوئی چیز اس سے کفایت نہیں کرتی اور اگر فاتحہ الکتاب کو ترازو کے ایک پلے میں اور سارے قرآن پاک کو دوسرے پلے میں رکھیں تو فاتحہ الکتاب قرآن پاک سے سات گنا زیادہ آئے۔

اور ابوعبید نے فضائل القرآن میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے فاتحہ الکتاب کی تلاوت کی گویا اس نے تورات' انجیل' زبور اور فرقان کو پڑھ لیا۔ نیز تفسیر دکیع' کتاب المصاحب ابن انباری' کتاب العظمہ ابوالشیخ اور ابونعیم کی کتاب حلیۃ الاولیاء میں وارد ہے کہ ابلیس لعین کو اپنی زندگی میں چار مرتبہ رونے پیٹنے اور اپنے سر پر خاک ڈالنے کا اتفاق ہوا اس وقت جب اس پر لعنت پڑی۔ جب اسے آسمانوں سے نکال کر زمین پر دے مارا گیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ ہوئی۔ اور جب فاتحہ الکتاب اتری (اقول وباللہ التوفیق۔ الامام الکبیر الشہیر الشہاب احمد بن حجر الہیتمی رحمۃ اللہ علیہ اپنی عظیم تالیف مولد النبوی الشریف میں جو کہ اصح الموالید ہے' میں فرماتے ہیں: حجب ابلیس اللعین عن خبر السماء فرق انه عظیمة کہ ابلیس لعین کو جب آسمان کی خبروں سے روک دیا گیا تو بہت بری طرح چیخا چلایا اور یہاں مذکور مواقع میں سے یہی بیان فرمایا۔ وحین ولد النبی صلی اللہ علیه وسلم جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ ناقلاً عن الجزء الثانی من جواہر البحار للشیخ النبہانی) اور ابوالشیخ کتاب الثواب

میں لائے ہیں کہ جسے کوئی حاجت ہو اسے چاہئے کہ فاتحہ الکتاب پڑھے اور ختم کرنے کے بعد اپنی حاجت مانگے انشاء اللہ العزیز وہ حاجت پوری ہو۔ اور ثعلبی نے شعبی سے روایت کی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے درد گردہ کی شکایت کی۔ امام شعبی نے اسے فرمایا کہ تجھے لازم ہے کہ تو اساس القرآن پڑھے اور درد والی جگہ پر دم کرے اس نے کہا اساس القرآن کیا ہے شعبی نے فرمایا سورۃ فاتحہ۔

جادو اور مختلف دردوں اور مرضوں کے لئے

اور مشائخ کے مجرب اعمال میں مذکور ہے کہ سورۃ فاتحہ اسم اعظم ہے ہر (اچھے) مطلب کیلئے پڑھا جا سکتا ہے اس کے دو طریقے ہیں ایک یہ نماز فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان چالیس دن روزانہ ۴۱ بار اس طرح پڑھیں کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی م کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی ل سے ملایا جائے جو مطلب ہوگا حاصل ہوگا۔ اور اگر بیمار کی شفا یا جسے جادو کیا گیا ہے اس کی نجات منظور ہو تو پانی پر دم کر کے اس مریض اور جادو والے کو پلائیں۔ دوسرا طریقہ یہ کہ مہینے کی پہلی اتوار فجر کی سنت اور فرض کے درمیان م کو ل کے ساتھ ملائے بغیر ۷۰ مرتبہ پڑھیں اس کے بعد ہر روز اسی وقت دس دس بار کم کر کے پڑھتے جائیں یہاں تک کہ بروز ہفتہ ختم ہو جائے۔ اور پہلے مہینہ میں مطلب حاصل ہو جائے تو درست ورنہ دوسرے، تیسرے مہینہ میں اسی عمل کو دہرائیں اور اس سورت کو چینی کے پیالہ پر گلاب، مشک اور زعفران کے ساتھ لکھنا اور اسے دھو کر پرانی بیماریوں سے شفا کیلئے ۴۰ دن تک پلانا مجرب ہے۔ اور دانتوں، سر، پیٹ اور دوسری دردوں کیلئے سات بار پڑھ کر دم کرنا بھی مجرب ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورت البقرۃ

یعنی وہ سورت کہ جس میں بقرہ یعنی گائے کا ذکر ہے۔ یہ مدنی ہے۔ ۲۸۶ آیتیں ہیں' ۶۰۲۱ کلمے ہیں' ۲۵۵۰۰ حروف ہیں۔ اور یہ سورت قرآن پاک کی تمام سورتوں سے زیادہ لمبی ہے۔ اور جتنے احکام شرعیہ اس سورت سے حاصل ہوتے ہیں اتنے کسی اور سورت سے حاصل نہیں ہوئے۔ اور اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ پانچ سو حکم شرعی اس سورت میں درج ہیں۔ اور اس کی ایک آیت جو باہمی قرض لینے دینے سے متعلق ہے قرآن پاک کی تمام آیتوں سے زیادہ طویل ہے۔ اور وہ بیس شرعی احکام پر مشتمل ہے۔ اور اگرچہ اس سورت میں قدرت کے عجیب وغریب امور وشیون کے انواع اقسام مذکور ہیں۔ لیکن اس کا نام رکھنے میں بقرۃ کی طرف اضافت کی تخصیص کی گئی ہے۔

وجہ تسمیہ۔ مسائل ضروریہ پر دلالت

اور اس کا نام سورۃ البقرہ دو وجہ سے رکھا گیا ہے ایک تو اس لئے کہ بقر جس کا ذکر اس سورت میں آیا اس کے علاوہ کسی اور سورت میں اس کا ذکر نہیں۔ پس گائے کا واقعہ اسی سورت کا خاصہ ہے۔ اور امتیاز پیدا کرنے کے مقام پر شے کے خاصہ کا ذکر ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ بقرہ کا قصہ دین کے تمام ضروری مسائل پر دلالت کرتا ہے۔ پس وہ واقعہ گویا تمام قرآن پاک کا خلاصہ ہے خصوصاً اس سورت کے مضامین کا خلاصہ ہے۔

اثبات صانع عالم

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دین کا سب سے عظیم مسئلہ صانع کے وجود کو ثابت کرنا

ہے۔ اور اس واقعہ سے یہ اہم مسئلہ اس طرح سمجھا جاتا ہے کہ اس مقتول کا زندہ ہونا از خود نہ تھا ورنہ ہر مارا ہوا زندہ ہو جائے۔ اور نہ ہی انس پر گائے کے اعضاء مارنے سے ورنہ ہر وقت گائے کے اعضاء کو کسی بھی میت پر مارنے سے اسے زندہ ہو جانا چاہئے۔ پس زندہ ہونا نہ تھا مگر صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ نہ کہ اس سبب کے ساتھ بلکہ اس سبب کے نزدیک اور اسی جگہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی ثابت ہوئی۔ بلکہ اس کی حکمت ہی اس لئے کہ اس مردہ کو زندہ کرنے سے جتلا دیا کہ مردہ دل کو نفس امارہ کے ذبح کرنے سے زندہ کیا جا سکتا ہے۔

اثبات نبوت

پھر دوسرا اہم مسئلہ اثبات نبوت ہے۔ اور یہ اہم مسئلہ اس واقعہ سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ واقعہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کا معجزہ تھا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوگئی تو پہلے اور پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت ثابت ہوگئی اس لئے کہ تمام انبیاء علیہم السلام دو حال سے خالی نہیں ہیں یا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تصدیق فرمائی اور سچے کی تصدیق کرنے والے اور اس کے تصدیق یافتہ دونوں سچے ہیں۔

اثبات نبوت کے ضمن میں نہایت مفید اشارہ۔ اور دیگر مسائل

اور اس قصہ سے اثبات نبوت کے ضمن میں ایک بہت مفید اشارہ ہے اس طرف کہ لوگوں پر انبیاء علیہم السلام کی اطاعت، وجہ حکم کی تفتیش کے بغیر واجب ہے۔ تا کہ مشقت کم ہو۔ اور رسوائی بھی نہ ہو جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کو اتتخذنا ھزوا کہنے والوں کو رسوائی ہو پھر تیسرا اہم مسئلہ استقامت ہے۔ اور یہ مقصد اس سورت سے اس طرح حاصل ہوا کہ اس مقتول کے قاتل نے دنیا طلب کی۔ اور ذلیل ہوا۔ پس معلوم ہوا کہ طلب دنیا ذلت ہے۔ اور ماسوی اللہ کی طلب خطا ہے۔ پھر چوتھا اہم مسئلہ مجاہدہ ہے۔ اور یہ واقعہ مجاہدہ اور شرائط مجاہدہ پر بسیر حاصل دلالت کرتا ہے۔ مثلاً چاہئے کہ نفس امارہ کا قتل بڑھاپے کے

زمانے میں نہ ہو۔ کیونکہ ہوائے نفسانی نے جب قویٰ اعضاء اور رگ وریشہ میں استحکام پیدا کر رکھا ہو تو اس کا اکھاڑنا بہت دشوار ہوتا ہے خصوصاً جبکہ کمزوری اور قوتوں کے گر جانے کا وقت ہو تو کمزور سے یہ نہیں ہو سکتا کہ طاقتور درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ نیز جوانی کی مستی اور زور شباب کے وقت بھی نہ ہو۔ کیونکہ اس وقت عقل کم اور ناتجربہ کار ہوتی ہے ہوائے نفسانی سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی اس لئے غالب گمان بھی ہے کہ مغلوب ہو جائے گی۔ نیز مجاہدہ کی شرائط میں سے دوستی کی زردی ہے کہ تسر الناظرین جو کہ دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے۔ اور زراعت وتجارت جیسے دینوی اعمال میں منہمک ہونے سے بچنا ہے استعداد کا درست ہونا اور جو ہر روح کا بے داغ ہونا ہے۔ پھر پانچواں اہم مسئلہ آخرت ہے۔ اور یہ بھی اس واقعہ سے صراحتاً ثابت ہے۔ اس لئے کہ اس مقتول کے جسم سے جدا ہونے والی زندگی پھر اسی جسم کی طرف لوٹی اور یہی پانچ اہم مسائل ہیں جو کہ اس سورت کے مطالب کا خلاصہ ہے۔ اور باقی تمام امور ان پانچ امور کے کامل کرنے والے اور ابتدائیے ہیں۔

سورۃ البقرہ کی اہمیت

جاننا چاہئے کہ مسند امام احمد اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ البقرہ قرآن پاک کی کوہان کی طرح ہے اس کی ہر ہر آیت کے ساتھ ۸۰'۸۰ فرشتے نازل ہوئے۔ اور آیت الکرسی جو کہ قرآن پاک کی بہترین آیت ہے عرش کے نیچے سے لاکر اس سورت میں رکھی گئی ہے۔ اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت الکرسی اس سورت کے بمنزلہ دل ہے۔ اور فی الواقع غور کرنے اور گہری نظر سے دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس سورت کے تمام مطالب اسی آیت کے اردگرد گھومتے ہیں۔

الحی القیوم بمنزلہ جان ہے اور تمام آیات اسی کے شیون ومظاہر

اور جو بمنزلہ جان ہے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کا لفظ ہے جو کہ آیت الکرسی میں واقع ہے۔ اور

سورت کی تمام آیتیں اسی کلمہ کے شیون ومظاہر ہیں۔جس طرح کہ تمام انسانی اعضاء جان پاک کے مظاہر شیون ہیں اس مقام کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ یہ تفسیر اس کی گنجائش کی متحمل نہیں۔لیکن جسے تمام تر پایا نہیں جاسکتا اسے بالکل چھوڑا بھی نہیں جاسکتا کے مطابق نمونہ کے طور پر چند چیزیں لکھنا ضروری ہیں غور سے سننا چاہئے۔اس سورت میں جس چیز کا فیض پہنچانا منظور ہے حق تعالیٰ کی حیات اور قیومیت ہے جو کہ رنگارنگ ظہور کے ساتھ کائنات میں جلوہ گر ہے۔ پہلے تو افرادانسانی میں سے ہر ہر فرد کی حیات ہے کہ كُنتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ (تم مردہ تھے۔پس اس نے تمہیں زندہ فرمایا) اس کا اشارہ فرماتی ہے۔پھر ابوالآباء حضرت آدم علیہ السلام کی ایجاد اور آپ کو منصب خلافت عطا کرنے اور آپ کو زمین میں ٹھہرانے کے ساتھ کہ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً الخ اس کی شرح ہے تمام نوع کی حیات اور قیام ہے۔

خاندان بنی اسرائیل کی حیات وقیام

پھر اس نوع کے خاندانوں میں ایک خاندان کی حیات وقیام ہے کہ اس خاندان کی مانند اللہ تعالیٰ کے حضور عظمت ومرتبہ میں اور اس سورۃ کے وقت نزول تک دیر تک ٹھہرنے والا کوئی خاندان موجود نہ تھا۔اور اس حیات ومقام کی شرح کی ابتداء یابنی اسرائیل کے رکوع کے آغاز سے پارہ کے آخر واقع تیسرے یابنی اسرائیل آخر تک لمبی ہوگئی۔اور اس عالی خاندان میں حیات کی وہ اقسام جو ظاہر ہوئیں ان میں سے پہلے وہ قسم بیان فرمائی ہے جو کہ فرعون کے وقت میں ظاہر ہوئی جس نے لڑکوں کو ذبح کرنے اور لڑکیوں کو باقی رکھنے کے ساتھ اس خاندان کی حیات کو ختم کرنے کا قصد کیا اس کے بعد تورات عطا کرکے اس خاندان کے دلوں کی حیات بیان فرمائی گئی۔باوجودیکہ اس خاندان کے جاہل بچھڑا پوج کر اس حیات کو زائل کرنے کی فکر میں لگ گئے تھے۔اور بچھڑا پوجنے کے نقصان کو دور کرنے کا طریقہ جو کہ قتل کی صورت میں تھا معنی میں اس خاندان کو زندہ کرنا تھا۔جیسا کہ کرم خوردہ عضو کو کاٹ دیا جائے بھی بطور ضمیمہ ارشاد ہوا۔پھر دوسری جماعت نے جس نے ب۔۔نی کے طریقہ سے رؤیت باری تعالیٰ کا سوال کرکے اپنی زندگی کو برباد کردیا۔حضرت ۔۔۔ علیہ

السلام کی دعا سے از سر نو زندگی کی خلعت پہنی۔ پھر تمام بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی وجہ سے میدان تیہ میں گرفتار ہو کر قریب تھا کہ دولت حیات کو ختم کر بیٹھتے کہ غیب کی طرف سے ان کی حیات اور قائمی کے اسباب سے بادل کے سایہ کو ظاہر کیا گیا۔ اور من اور سلویٰ نازل فرمایا گیا۔ اس کے بعد ایک بستی کا نشان دیا گیا پھر پتھر سے رواں پانی کے چشمے جاری کئے گئے تاکہ ان کی حیات کی صورت دگرگوں نہ ہو جائے۔ اور جب اس خاندان میں ایک گروہ ہتک حرمت کی وجہ سے انسانی حیات کے ازالہ کا مستحق ہو کہ اس پاکیزہ انسانی زندگی کے بجائے حیوانی خسیس زندگی کی خلعت پہن کر مسخ ہو گیا تو عنایت الٰہی نے ان کے شر و مسرفوں سے دور رکھا اور اس واقعہ کو دوسروں کیلئے عبرت بنایا۔ تاکہ آئندہ اس خاندان کی حیات وقیام اس قسم کے گناہوں سے خلل میں نہ پڑے۔

پھر گائے کے واقعہ میں عجیب غیبی زندگی پیدا فرما کر ان کیلئے ایک دستور العمل ارشاد فرمایا۔ اور ان کی سنگدلی کی وجہ سے باہمی قتل و اختلاف میں مشغول ہونے۔ اپنے درمیان منافقت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے گئے پختہ وعدوں کو توڑنے۔ اور اس خاندان کے قیام کو زائل کرنے کی فکر میں رہنے کے باوجود پے در پے عنایات الٰہی کے ظہور کو بیان فرمایا۔ یہاں تک کہ کلام زندگی پر ان کی حرص اور موت سے فرار کے بیان تک پہنچا۔ اس کے باوجود کہ اسباب زندگی کو وہ جڑ سے اکھاڑ رہے تھے۔ اور اپنے لئے ہر طرف سے موت کے اسباب کو جمع کر رہے تھے۔ پس ان کا فعل ان کی خواہش کے منافی تھا۔ اور اس سے زیادہ عجیب یہ کہ اپنے خاندان کی حیات وقیام کے شدید حریص ہونے کے باوجود اس فرشتہ کے ساتھ جس کو یہ کام سپرد ہے۔ اور ہر دینی خاندان کی حیات وقیام اسی کی امداد و اعانت سے ہے دشمنی کرتے تھے جس طرح کہ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ الخ کی آیت میں مذکور ہے۔ اور اس کلام کے تتمہ کے طور پر اس گروہ کے جادو اور دوسرے کلمات کفریہ جو کہ حیات غیبیہ الٰہیہ کو زائل کرتے ہیں مشغول ہونے کو بھی بیان فرمایا یہاں تک کہ اس خاندان کا قصہ تمام ہوا۔

خاندان بنی اسماعیل کی حیات وقیام

اس کے بعد بنی اسماعیل سے ایک دوسرے خاندان کی حیات وقیام کو بنی اسماعیل سے

شروع فرمایا ہے۔ اور اس کی ابتداء کی بنیاد وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ سے رکھی۔ پہلے کعبہ معظمہ کی تعمیر اور اس مرکز تجلیات گھر کے اس جگہ باقی رہنے کے ساتھ خاندان اسماعیل کے قیام کا ارشاد ہوا۔ اس کے بعد عبادات میں اس گھر کی طرف منہ کرنے اور اس کی تعظیم واحترام کرنے کا حکم ظاہر فرمایا جو کہ اس خاندان کے قیام کا سبب تھا۔ اور جب ان دو عمدہ خاندانوں کی حیات وقیام کے بیان سے فراغت ہوئی۔

حیات کی چند اقسام

تو حیات کی چند قسمیں جو کہ بظاہر حیات کے منافی معلوم ہوتی ہیں۔ اور حقیقت میں اقسام حیات کا خلاصہ ہیں تنبیہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک شہادت فی سبیل اللہ ہے جو کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ کے مقتضیٰ کے مطابق حیات کی بہترین قسم ہے۔ اور اسی لئے اس قسم کی زندگی کے اسباب کے حصول پر حوصلہ اور دلیری دی گئی اور مصیبتوں پر صبر کرنے کی وجہ سے اجر جزیل کا وعدہ اور بشارت عمدہ عنایت فرمائی اور ان میں قصاص کا مقدمہ ہے جو کہ بظاہر قاتل سے زندگی چھین لینا ہے۔ اور حقیقت میں ایک جہان کی زندگی کا سبب ہے۔ اور ان میں سے ہر میت کی وصیت کو بغیر کسی تغیر وتبدل کے نافذ کرنے کے ساتھ حیات معنوی ہے۔ اور ان میں سے روح کی حیات ہے جو کہ جسم کو روزے میں بھوکا پیاسا رکھنے سے ہے۔ اور ان میں سے دین کی حیات ہے جو کہ دشمنان دین کے ساتھ جہاد وقتال میں مشغول ہونے کی وجہ سے ہے جو کہ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے آخر قصہ تک مذکور ہے۔ اور ان میں سے ملت کی حیات وقائمی ہے نشانات حج کو ایام حج میں اس مکان میں قائم کرکے جو کہ اس عالی خاندان کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔

ہر گھر کی حیات وقیام

پھر ہر ہر گھر کی حیات اور قائمی کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ آداب نکاح بیان کرکے۔ ایام حیض میں مقاربت سے روک کر جو کہ حیات خبیثہ فاسدہ کو باقی رکھنے کا موجب ہے۔

اور قسم کے بہانے جسے عرف شرع میں ایلاء کہتے ہیں حقوق زوجیت کو ضائع کرنے سے روک کر اور یتیموں کی پرورش اور قریبیوں پر مال خرچ کرنے کی کیفیت بھی خانہ داری کے ضمن میں مذکور ہوئی اس کے بعد اگر عقد نکاح کے ٹوٹنے اور خانہ داری کے دگرگوں ہونے تک نوبت پہنچے جسے عرف شرع میں طلاق کہتے ہیں۔ تو عدت کی حفاظت' برتنے کی چیزیں دینے اور اولاد کو دودھ پلانے کے ساتھ اس نکاح کے نشان باقی رکھنے اور حقوق خانہ داری کو قائم رکھنے میں کسی قسم کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ اس عقد کی حیات و قیام بالکل دگرگوں نہ ہو۔ اور یہ مضامین اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ کی آیت تک چلے گئے ہیں۔

حی و قیوم کا معنی ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے غیبی حیات کے واقعات

اور جب ان سب سے فارغ ہوئے تو چند واقعات اسباب ظاہر کے بغیر غیبی زندگی کے وارد ہونے کے بیان فرمائے۔ تا کہ حی و قیوم کے معنی اس کلمہ کے نزول سے پہلے اور اس کے نزول کے بعد سننے والوں کے ذہنوں میں جم جائیں۔ اور وہ جو اس کلمہ کے نزول سے پہلے ہیں دو واقعات ہیں۔ پہلا واقعہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی حیات کا ہے جو کہ وبا سے ڈر کر بھاگ گئے اور مر گئے۔ پھر حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوئے۔ دوسرا واقعہ حضرت شمویل اور طالوت کا کہ بنی اسرائیل کے خاندان کے قیام کے زائل ہونے کے بعد انہوں نے اس قیام کو لوٹایا اور آخر حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ پر اور تابوت سکینہ کے آنے سے قیومیت اتم واوفر نے ظہور فرمایا۔ اور اس کلمہ کے نزول کے بعد چند واقعات ہیں۔ پہلا واقعہ نمرود کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جس نے اللہ تعالیٰ کے زندہ کرنے اور موت دینے کا مسئلہ نہ سمجھا اور اپنے کو محیی اور ممیت قرار دیا۔ دوسرا واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام کا کہ آپ نے ویران شہر کی حیات و قیام کے بعید از امکان جانا یہاں تک کہ اپنے آپ پر اور اپنی سواری پر حیات و قیام کو لوٹانے کے حق الیقین کے ساتھ معلوم کیا۔ تیسرا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کہ آپ نے مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت میں توقف فرمایا یہاں تک کہ اس کی کیفیت کے عین الیقین کو سر کٹے اور اکھڑے ہوئے پروں والے پرندوں پر دیکھا اور یہ مضامین مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ پر ختم ہوئے۔

احوال کی حیات وقیام کا ذکر

اس کے بعد احوال کی حیات وقیام کے ذکر کی باری آئی اور جو چیز لوگوں کے ذہن میں اموال کی حیات وقیام کا موجب ہے۔ یعنی سود کھانا اور جو کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان اموال کو ضائع کرنا ہے اسے تفصیل سے بیان فرمایا۔ اوراس کا عکس اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ اور صدقہ کرنا ہے۔ جو کہ لوگوں کے ذہنوں میں اموال کو ضائع کرنے کا موجب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اموال کی حیات اور مضاعفت کا سبب ہے۔ اوراس کی تفصیل بھی ارشاد فرمائی اور دوسرے جائز معاملات میں جیسے خرید وفروخت' قرض لینا' دینا' اموال کی حیات وقیام کیلئے لکھنے اور گواہ بنانے کے باب میں دستورالعمل عنایت فرمایا گیا۔ اور سورت کو ختم فرمایا۔ پس معلوم ہوا کہ اس سورت کے مطالب سب حی وقیوم کی شرح وتفصیل ہیں۔ اور یہ کلمہ اس سورت کیلئے بمنزلہ جان ہے۔ اور آیت الکرسی اس سورہ کے دل کے مترادف ہے۔ اور باقی تمام سورت اعضاء وجوارح کی طرح ہے۔ واللہ اعلم

شرعی حد بندیوں کے درمیان سورۃ البقرہ کی خصوصیت

نیز یہ سورت شرعی زمان ومکان کی حد بندیوں کے درمیان ایک خصوصیت رکھتی ہے کہ کسی دوسری سورت کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔ اول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چالیس دنوں کا ذکر جو کہ ارباب خلوت وریاضت کے نزدیک اصل معتبر ہے۔ پھر ماہ مبارک رمضان کا ذکر اوراس کے ساتھ فرض روزوں کی مدت کا تعین۔ پھر حج کے مہینوں کا ذکر جن سے مراد شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن ہیں پھر حرمت والے مہینوں کا ذکر جو کہ چار ہیں۔ اوران میں قتل میں پہل کرنا حرام تھا اوران میں نیکیاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ اور برائیاں زیادہ وزن دار۔ پھر مدت حیض کا بیان کہ اس دوران منکوحہ اور لونڈی سے جماع حرام ہے۔ پھر مدت ایلاء کا ذکر جو کہ چار مہینے ہیں پھر ذکر عدت طلاق جو کہ تین حیض یا تین طہر کی مدت ہے۔ (امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین حیض کی مدت ہے) پھر عدت وفات کا ذکر جو کہ چار ماہ دس دن ہے۔ اوراس کی انتہا ایک سال تک بھی ہو جاتی

ہے۔ یہ وہ شرعی حد بندیاں ہیں جو کہ زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جو حد بندیاں مکان سے تعلق رکھتی ہیں۔ پس ان میں ایک متوجہ ہونا ہے جو کہ کعبہ معظمہ اور مسجد حرام سے متعلق ہے۔ اور تمام شہر مکہ اور اس کے ارد گرد کی حرمت جو کہ حرم سے عبارت ہے۔ اور مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانا اسی کے توابع میں سے ہے۔ اور ان میں سے صفا اور مروہ ہے کہ ان کے درمیان چکر لگانا اور دوڑنا واجب ہے۔ اور ان میں سے عرفات، شعر حرام اور منیٰ ہے کہ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلاَ اِثْمَ عَلَیْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلاَ اِثْمَ عَلَیْهِ کی آیت میں اس مقام پر رات گزارنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور احرام میں ممنوع چیز کے ارتکاب کی جزا جب مال کی طاقت نہ رکھتا ہو تین دن کے روزوں کی صورت میں بیان ہوئی۔ اور اسی قیاس سے سکان غیر حرم کے ساتھ متمتع کے جائز ہونے کو خاص کرنا اور قربانی مہیا نہ ہونے کی صورت میں متمتع پر دس روزوں کا واجب کرنا بھی اسی ضمن میں آیا۔

کئی وجوہ سے تمام سورۂ قرآن کے مقابلہ سورۃ البقرہ کی خصوصیت

اور جن زمانوں اور مکانوں کے ساتھ احکام شرعیہ متعلق ہیں ان کی خصوصیات کا علم وحی کے بغیر اصلاً نہیں پایا جاتا اور محض امر تعبدی ہے۔ کہ عقل کو اس سے واقف ہونے کے امکان کا کوئی حیلہ نہیں۔ تو جو سورت اس علم پر مشتمل ہو گی وہ وحی ہونے میں کامل معروف ہو گی۔ اور اسی لئے اس سورت کو اس سبب سے ایک قسم کی خصوصیت حاصل ہو گئی کہ چند چیزوں میں ساری قرآنی سورتوں سے ممتاز ہے ان میں سے ایک وہ ہے جو کہ ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جس نے سورۃ البقرہ کی قسم اٹھائی تو اس پر اس کی ہر آیت کے عوض قسم ہے۔ پس گویا سورۃ البقرہ کی قسم کھانا دو سو چھیاسی قسمیں کھانا ہے۔ اور اسی مضمون کو ابن ابی شیبہ' مجاہد سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے سورۃ البقرہ کی قسم کھائی تو اس پر اس کی ہر آیت کے عوض قسم ہے۔ تو جو چاہے قسم پوری کرے۔ اور جو چاہے۔ توڑ دے اور ان میں سے وہ ہے جو کہ صحیح مسلم میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت لائی گئی کہ جب ہم میں سے کوئی سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تو اسے ہمارے درمیان عظمت اور مرتبہ حاصل ہو جاتا اسی لئے

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک لشکر بھیج رہے تھے۔ اور ان کا امیر مقرر کرنے میں تردد فرمارہے تھے اہل لشکر میں سے ہر کسی کو اپنی بارگاہ میں بلا کر تفتیش فرمائی کہ تم کون کون سی سورت پڑھتے ہو ہر شخص جو کچھ اسے یاد تھا پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک نوجوان کی باری آ گئی جو کہ عمر میں سب سے چھوٹا تھا اس سے بھی آپ نے پوچھا کہ قرآن پاک سے تجھے کون کون سی سورت یاد ہے۔ اس نے عرض کی فلاں سورۃ' فلاں سورۃ اور سورۃ بقرہ بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آیا تجھے سورۃ بقرہ بھی یاد ہے۔ عرض کی جی ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا جاؤ تم اس لشکر کے امیر ہو۔ اس وقت قوم کے ایک عمر رسیدہ شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ میں بھی سورۃ بقرہ کو یاد کر سکتا تھا مگر میں ڈرا کہ اگر سورۃ بقرہ کو یاد کرتا ہوں تو اس کی طوالت کی وجہ سے ہر روز اسے تہجد میں پڑھ نہیں سکوں گا۔ اس لئے میں نے اس سورۃ کو یاد نہیں کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یہ خیال مت کرو اور قرآن پاک سیکھو کیونکہ جس نے قرآن کو سیکھا یعنی یاد کیا۔ اور وہ اسے تہجد میں پڑھتا ہے اس کی مثال کستوری سے ہر مشکیزے کی ہے جس کا منہ کھلا رکھا گیا ہے۔ اور اس کی مہک ہر جگہ پہنچتی ہے۔ اور جس نے قرآن پاک کو یاد کیا۔ اور اسے نہیں پڑھتا تو اس کے سینے میں قرآن اس کستوری سے پُر مشکیزے کی طرح ہے جس کا منہ مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہو۔ اور اس حدیث کو ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور بیہقی نے کتاب الدلائل میں عثمان ابن ابو العاص سے روایت فرمائی کہ میں کم عمر تھا لیکن اس کے باوجود مجھے حضور علیہ السلام نے شہر طائف کی صوبہ داری عطا فرمائی اس نسبت سے کہ میں نے سورۃ بقرہ پڑھی ہوئی تھی۔

اور ان میں سے وہ ہے جو کہ بطریق تواتر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ فرماتے تھے کہ سورۃ بقرہ کو اپنے گھروں میں پڑھتے رہو۔ کیونکہ شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے جہاں سورۃ بقرہ پڑھی جائے۔ اور ابو یعلیٰ' طبرانی اور بیہقی نے شعب الایمان میں سہل بن سعد سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہر چیز کی کوہان ہے۔ اور قرآن کی کوہان سورۃ البقرہ ہے جو شخص اسے اپنے گھر میں روزانہ پڑھے گا تین دن تک

شیطان اس گھر میں نہیں آتا اور جو ہر رات اپنے گھر میں سورۃ بقرہ پڑھے شیطان تین راتیں اس گھر میں نہیں آتا اور ان میں سے وہ ہے جو کہ حدیث متواتر میں اس سورت کے حق میں فرمایا گیا کہ جادوگر اس سورت کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ نیز فرمایا ہے کہ سورۃ بقرہ سیکھو کیونکہ اس کا سیکھنا برکت اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے۔ اور ان میں سے وہ ہے جو کہ حدیث مشہور میں وارد ہے کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران قیامت کے دن دو سیاہ بادلوں یا دو سیاہ سائبانوں کی شکل میں آئیں گے۔ اور ان دو سورتوں کے درمیان ایک چمکتا خط یعنی لکیر ہوگی یا اڑنے والے جانوروں کے دو گروہ کبوتروں اور کلنگوں کی طرح صفیں باندھے آئیں گے اور اپنے پڑھنے والے کی طرف سے سفارش میں جھگڑا اور اصرار کریں گے یہاں تک کہ اسے بہشت میں لے جائیں گی۔ اور اسی لئے ان دو سورتوں کی زہراوین یعنی دو پھول کا لقب دیا گیا۔

اور اصفہانی اپنی کتاب الترغیب میں عبدالواحد بن ایمن سے روایت لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جو سورۃ بقرہ اور آل عمران شب جمعہ میں پڑھے گا اسے اتنا اجر دیتے ہیں کہ لبیدا سے عروبا تک کے درمیانی فاصلہ کو پر کر دیتا ہے۔ لبیدا ساتویں زمین اور عروبا ساتویں آسمان کا نام ہے۔ اور ان میں سے وہ ہے جو کہ ابوعبیدہ نے ام الدرداء سے روایت کی کہ قرآن پاک پڑھنے والوں میں سے ایک شخص نے رات کے وقت اپنے ہمسایہ پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ اور صبح اس شخص کو پکڑ کر قصاص میں قتل کر دیا گیا جب اسے دفن کر دیا گیا تو تمام قرآن پاک ایک ایک سورت کر کے اس کے سینہ سے بھاگتا چلا گیا یہاں کہ سورۃ بقرہ اور آل عمران ایک جمعہ تک اس کے ساتھ رہیں۔ اور عذاب سے اس کی حفاظت کی ایک جمعہ کے بعد سورۃ آل عمران بھی بھاگ گئی اور سورۃ بقرہ نے دوسرے جمعہ تک اس کی حفاظت کی۔ اور عذاب والے فرشتوں کو آنے نہ دیا یہاں تک کہ رب العزت کے دربار سے ندا پہنچی کہ میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر قطعاً ظلم نہیں فرماتا اس ندا کو سن کر سورۃ بقرہ بھی باہر آ کر چلی گئی۔ ام الدرداء فرماتی تھیں کہ جب یہ سورت باہر آئی ایسا لگا کہ بہت بڑا بادل آ گیا۔ اور ان میں سے بخاری نے تعلیقاً اور مسلم اور

دوسرے صحاح والوں نے بسند صحیح روایت کی ہے کہ سید بن حضیر ایک دفعہ رات کے وقت اپنے گھر میں سورۃ بقرہ پڑھ رہے تھے۔ اور ان کا گھوڑا اس جگہ قریب ہی باندھا ہوا تھا اچانک گھوڑے نے کودنا شروع کر دیا۔ اور اسید پڑھنے سے چپ ہو گئے۔ آپ کے خاموش ہوتے ہی گھوڑا بھی آرام سے کھڑا ہو گیا پھر پڑھنا شروع کیا تو گھوڑے نے پھر کودنا شروع کر دیا آپ پھر چپ ہو گئے تو گھوڑا بھی چپ ہو رہا جب چند بار ایسا ہی ہوا آپ اٹھے اور یحییٰ نامی اپنے بیٹے کو جو کہ اسی جگہ کے متصل سو رہا تھا اٹھا لے گئے کہ کہیں گھوڑا شوخی سے اسے تکلیف نہ پہنچائے۔ اس دوران اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا دیکھا کہ ایک سائبان جو کہ چراغوں سے بھرا ہوا تھا زمین کی سمت سے آسمان کی طرف اوپر جا رہا تھا۔ آپ نے جان لیا کہ گھوڑے کے کودنے کی وجہ یہی روشنی تھی۔ آپ اسی سائبان کو دیکھتے رہے یہاں تک کہ غائب ہو گیا۔ صبح کے وقت آ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ماجرا بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ فرشتے تھے جو کہ اس سورۃ کے پڑھنے کی وجہ سے اترے تھے اگر تو صبح تک پڑھتا رہتا تو صبح تک وہ لوگوں کو نظر آتے اور ہرگز نہ چھپتے۔

ابو عبید نے مدینہ عالیہ کے سفید ریشوں سے روایت کی ہے کہ انصار کے محلہ والوں نے ایک صبح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ گزشتہ رات ہمارے محلہ میں ایک عجیب شے ظاہر ہوئی کہ ثابت بن قیس ابن شماس کا سارا گھر روشن چراغوں سے پر تھا۔ اس کا سبب معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی ہو۔ اس سے پوچھو۔ لوگ ثابت بن قیس بن شماس کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ رات آپ نے تہجد میں کیا پڑھا تھا؟ اس نے کہا کہ سورۃ بقرہ بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سورۃ بقرہ اس کے حقائق و دقائق کے ساتھ بارہ سال کی مدت میں پڑھی اور فارغ ہوئے۔ اور ختم کے دن ایک اونٹ ذبح کر کے کافی کھانا پکا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوستوں کو کھلایا۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ اس سے معلوم ہوا کہ حفظ القرآن الکریم اور علومِ دینیہ کے حصول سے فراغت پر خوشی کرنا اور حسب

استطاعت خیرات کرنا۔ محافل ذکر منعقد کرنا اس حدیث پاک سے ثابت ہوتا ہے کیونکہ ذکر بھی خیرات ہے۔ اور ان تمام نیکیوں کی جامع محفل میلاد شریف ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ آٹھ سال تک سورۃ بقرہ پڑھنے میں لگے رہے۔ اور آٹھ سال کے بعد ختم کی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ سورۃ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کے نزدیک ایسی عظمت رکھتی تھی کہ کوئی دوسری سورۃ ایسی نہ تھی۔

خاصہ سورۃ البقرہ برائے دفع چیچک

اور اس سورۃ کے مجرب خواص میں سے ہے کہ جن دنوں میں بچوں کو چیچک نکلتی ہے صبح کے وقت بغیر ناشتہ کئے اس بچے کے پاس جسے چاہیں تجوید و ترتیل کے ساتھ پڑھیں اور دم کریں۔ اور بچے نے بھی ناشتہ نہ کیا ہو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سال اس بچے کو چیچک کا عارضہ نہ ہوگا۔ اور اگر ہوگا تو سہل اور آسان ہوگا۔ اور اسے کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قرأت شروع کرتے وقت آدھ پاؤ چاول بقدر ضرورت شکر اور دہی کے ساتھ کسی مستحق کو اسی مجلس میں کھانے کو دیں اور وہ مستحق قاری اور بچے کی موجودگی میں کھائے۔

سورتوں کی ترتیب توفیقی ہے یا اجتہادی

یہاں جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب شارع علیہ السلام کی فرمائی ہوئی توقیفی ہے یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادی مسائل میں سے ہے کہ اپنی عقل سے سورتوں میں مناسبت معلوم کر کے ایک کو دوسرے کے بعد لکھا ہو۔ اور دونوں صورتوں میں دو سورتوں کے درمیان رابطہ کی وجہ بیان کرنا لازم ہے۔ کیونکہ یہ ترتیب اگر شارع علیہ السلام کی طرف سے توقیفی ہے۔ پس شارع حکیم ہے۔ اور حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد سے ہو تو وجہ مناسبت کی تحقیق کی بنا اس پر ہوگی کہ صحابہ کرام نے رضی اللہ عنہما کسی چیز کے باعث اس سورۃ کو ایک خاص سورۃ کے بعد رکھا ورنہ دین کے معاملہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فعل

کو صرف اٹکل پر محمول کرنا پڑے گا اور وہ باطل ہے۔ کیونکہ ان کی سیرت اس کے خلاف گواہی دیتی ہے۔ نیز یہی فرض کیا گیا ہے کہ یہ ترتیب اجتہادی ہے جزافی یعنی اٹکل سے نہیں۔ اور اجتہاد کو کوئی ماخذ چاہئے۔ اور وجہ ربط کا بیان گویا اس ماخذ کی طرف اشارہ ہے۔

ترتیب آیات توفیقی اور ترتیب سور اجتہادی ہے

نیز جاننا چاہئے کہ ایک ایک سورۃ کی آیات کی ترتیب بالا جماع توقیف سے واقع ہوئی اس ترتیب میں قطعاً اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف آپس میں سورتوں کی اس ترتیب میں ہے جو کہ مصحف عثمانی میں لکھی ہے۔ اور سب کے سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر اجماع کیا۔ اور اس مصحف کے نسخے مختلف علاقوں میں پہنچے اور تمام مجتہدین نے انہیں قبول کیا۔ اور جنہوں نے اس ترتیب کے خلاف لکھا ہے۔ جیسے عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما وہ طوعاً او کرہاً اس مخالفت سے دست بردار ہو گئے۔ اور اکثر مالکی حنفی اور شافعی علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ ترتیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد سے واقع ہوئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارے کچھ نہیں فرمایا بلکہ اپنی امت کو سپرد کر کے اس جہان سے تشریف لے گئے اور اس گروہ کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ ترتیب توقیفی ہوتی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہوتی تو اس کی مخالفت حرام اور بدعت سیئہ ہوتی۔ حالانکہ ابن مسعود اور ابی بن کعب جو کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں نے اس ترتیب کے خلاف ترتیب اختیار فرمائی اور آخری وقت تک اسی ترتیب کی رعایت کرتے تھے۔ اور دوسرے صحابہ کرام نے بھی بوقت ضرورت ان دونوں بزرگوں کے خلاف سوائے اجماع جمہور کے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اور یہ ذکر نہیں کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارے ترتیب کے خلاف فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ ترتیب توقیفی نہ تھی ورنہ ان دونوں کی مخالفت اور دلیل پیش کرنے کے مقام پر توقیف کے ذکر سے ان صحابہ کرام کی خاموشی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

اور علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ ترتیب بھی توقیفی ہے۔ اور حضور علیہ السلام کے اشارہ اور فرمان کے مطابق عمل میں آئی اور اس گروہ کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی

اللہ عنہم تو حقیر کاموں میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ اور اپنی طرف سے کوئی چیز بھی اختیار نہیں کرتے تھے تو اس اعلیٰ مقدمہ میں اپنی عقل کو کس طرح دخل دے دیا جب تک کہ حضور علیہ السلام کا فرمان ان کے نزدیک نہ ہوتا اور ان کے فرمان کے بغیر اجماع کس طرح ثابت ہوتا۔

دونوں فریقوں کے درمیان محاکمہ

اور دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ یہ ہے کہ دونوں فریق صحیح کہتے ہیں۔ جنہوں نے اس ترتیب کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے اجتہاد سے بتایا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ترتیب کے مطابق ہر سورۃ کو اس کی جگہ پر رکھنے والے صحابہ کرام ہیں رضی اللہ عنہم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس خود یہ کام نہیں فرمایا بلکہ مجتہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی روش پر چھوڑ کر تشریف لے گئے اور جو اسے توقیفی کہتے ہیں وہ اس معنی سے کہ صحابہ کرام نے صرف اپنی عقل سے یہ کام نہیں کیا۔ بلکہ اس باب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال اور افعال کی اس حد تک اتباع کی کہ ان کے جمہور نے یقین فرمالیا کہ اگر حضور علیہ السلام بہ نفس نفیس یہ کام فرماتے تو اسی ترتیب سے فرماتے اس کے بغیر نہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماعی مسائل کی یہی حقیقت ہے کہ نصوص کثیرہ جو اگرچہ علیحدہ علیحدہ قطعیت اور یقین کا فائدہ نہ دیں مگر مجموعی طور پر قطعی اور یقینی ہوتی ہیں کے قوی ماخذ کے بغیر کبھی اجماع کا قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ اور اسی فیصلہ سے بعض امور شرعیہ کے توقیفی اور اجتہادی ہونے کے بارے میں کافی اختلافات حل ہو جاتے ہیں۔ جیسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مسند خلافت پر فائز ہونا اجماع کے ساتھ تھا یا نص کے ساتھ اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ نزول کے اسباب کا مشاہدہ کرنے والے تھے۔ اور وحی کے معنوں کو پورے طور پر پہچانتے تھے۔ اور طویل صحبت کی وجہ سے حضور علیہ السلام کے ایک سورۃ کو دوسری سورت کے بعد ترتیب کے ساتھ پڑھنے کو اکثر سنتے تھے اس معنی پر انہیں پوری واقفیت تھی جو کہ دوسروں کو حاصل نہیں ہوتی چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں اہل مدینہ کے کئی لوگوں سے روایت آئی ہے حکم کہتے ہیں کہ مجھے گمان ہے کہ ان میں ابو جعفر بھی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ

شریف میں سورۃ جمعہ اور سورۃ منافقون کی تلاوت فرماتے سورۃ جمعہ کے ساتھ ایمان والوں کو خوشخبری سناتے اور انہیں اعمال خیر پر ابھارتے اور منافقوں کی سورۃ کی سے منافقین کو ناامید کرتے اور انہیں ڈانٹتے۔

اور خطابی نے حکایت کی ہے کہ جب صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین مصحف مجید کو جمع کرنے لگے تو انہوں نے سورہ قدر کو سورہ علق کے بعد لکھا ہے۔ اور سورۃ علق کے سورہ قدر پر مقدم ہونے کا استدلال یہاں سے کیا کہ سورۃ قدر میں انزلناہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے جو کہ لفظ اقرء سے التزاما سمجھا جاتا ہے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۃ انفال اور سورۃ براءۃ کے متعلق فرمایا ہے کہ ہم نے اس (انفال) کا قصہ براءۃ کے مشابہہ دیکھا یہاں سے معلوم ہوا کہ بعض موقعوں پر انہوں نے اپنی عقل سے بھی کام لے کر واضح رابطہ کا اعتبار کیا ہے۔ چنانچہ یہ واضح رابطہ سورۃ طلاق وتحریم' سورۃ تکویر وانفطار' سورۃ والضحیٰ والم نشرح' سورۃ فیل ولا یلاف اور معوذتین کے درمیان اظہر من الشمس ہے۔ اسی لئے قاضی ابومحمد عبدالحق بن عطیہ سورتوں کی ترتیب میں تفصیل کے قائل ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ قرآن پاک کی اکثر سورتوں کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ پاک میں معلوم تھی جیسے سبع طوال' حوامیم اور مفصل اور ان میں سے بعض کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ علیہم نے ظاہر عقل سے دریافت کی۔ اور اسی کے مطابق عمل کیا حق یہ ہے کہ اس بزرگ کی بات بہت مضبوط ہے۔ اس لئے کہ صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں میں وارد ہے کہ قرآن پاک اور اہل قرآن جو کہ اس پر عمل کرتے تھے کو قیامت کے دن لایا جائے گا۔ اور سورۃ بقر اور آل عمران آگے آگے ہوں گی۔ آخر تک۔

اور مصنف ابن ابی شیبہ میں سعید بن خالد سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک رکعت میں سبع طوال کی تلاوت فرمائی اور اسی مصنف میں واقع ہے کہ آپ ایک رکعت میں تمام مفصلات جمع فرماتے تھے۔ اور صحیح بخاری میں عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سورۃ بنی اسرائیل' کہف' مریم' طٰہٰ

اور انبیاء کے متعلق فرماتے ہوئے سنا کہ وہ جید سورتوں میں سے ہیں۔ اور وہ میری پہلے یاد کی ہوئی ہیں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر شب جب اپنے بستر مبارک پر تشریف فرما ہوتے تو دونوں ہتھیلیاں ملا کر سورۃ اخلاص، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر پھونک مارتے آخر تک اور مصنف ابن ابی شیبہ میں امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک رکعت میں اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ اور لِاِيْلَافِ قُرَيْشٍ پڑھیں اور اگر کتب حدیث، کتب فضائل القرآن اور کتب تفسیر ماثورہ میں تلاش کی جائے تو اس قسم کی کثیر چیزیں نکل سکتی ہے۔

ترتیب قرآن میں ترتیب نزول کی رعایت کیوں نہیں فرمائی

اور وہ جو اس فن سے بعض ناواقف لوگ گمان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ترتیب قرآن کے وقت ترتیب نزول کی رعایت کیوں نہیں فرمائی۔ اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ ہے کہ ہر ہر سورت کی آیات کی ترتیب مسلمانوں کے اجماع کے مطابق توقیفی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کے کہنے کے مطابق عمل فرمایا ہے۔ اور اس ترتیب میں کئی مدنی آیتیں مکی آیتوں سے پہلے واقع ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ترتیب نزول کا شارع علیہ السلام کے ہاں اعتبار نہیں۔ اور جو چیز شارع کی نظر میں ایک مقام پر گر گئی ہو اسی قسم کے مقام پر دوسری مرتبہ اس کا اعتبار کرنا شرع و دین سے وابستگی کے منافی ہے۔ ایسا قدم وہی اٹھائے گا جو ناواقف ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ترتیب نزول کو اختیار فرمایا جاتا تو سورتوں کے درمیان ایک نرالی بے نظمی لازم آتی۔ اور چھوٹی سورۃ طویل سورت سے پہلے آجاتی اور لمبی سورتیں چھوٹی سورتوں کے درمیان۔ اور اس کا عکس رونما ہوتا اور قرآن مجید کی ترتیب بہت بے زیب ہو جاتی۔ بلا شبیہ اس شاعر کی مانند جو کہ اپنا دیوان جمع کرنے کے درپے ہو۔ اور جس چیز کو اس نے پہلے نظم کیا تھا اسے ترتیب میں اس چیز سے پہلے رکھے جسے اس نے بعد میں نظم کیا تھا۔ پس پہلے ایک فرد لکھے اس کے بعد ایک غزل، بعد ازاں ایک دوسری فرد اور ایک رباعی بعد ازاں قصیدہ پھر لیلیٰ اور مجنوں، قیس اور لبنیٰ کی مثنوی اور اسی کی

مثل اس کے بعد ایک فرد اور قطعہ علی ہذا القیاس۔ کہ یہ اہل عقل اور طبع موزوں والوں کے ہاں بہت مکروہ لگتا ہے۔ لہٰذا شعراء دواوین کی تالیف کے وقت نظم وفکر کے آگے پیچھے ہونے کا اعتبار نہیں کرتے بلکہ پہلے قصیدے لکھتے ہیں اس کے بعد شنویات ازاں بعد غزلیات اس کے بعد قطعات۔ رباعیات اور افراد اور اگر کوئی ان میں سے نظم وفکر کے تقدم وتاخر کا اعتبار کرے تو اسے ملامت وطعن کی جائے گی۔ علاوہ ازیں نزول کے تقدم وتاخر کی رعایت اس ساری بے انتظامی کے باوجود ممکن نہ ہوتی کیونکہ ایک سورت کی آیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہ تھا۔ پس متاخر کی تقدیم اور مستقدم کی تاخیر لازم تھی کہ اس سے گریز نہیں ہو سکتی تو مفت میں اس بے انتظامی کے ارتکاب سے کیا حاصل ہوتا۔

سورۃ فاتحہ کے سورۃ البقرہ کی وجہ ربط

جب یہ تمہید ذہن نشین ہوگئی تو اس سورۃ (بقرہ) کی سورۃ فاتحہ سے ربط کی وجہ سنی چاہیے۔ سورۃ فاتحہ اجمالی طور پر قرآن پاک کے تمام معنوں کو ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اور سورت بقرہ اس کی تفصیل کی ابتداء ہے۔ نیز سورۃ فاتحہ میں آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے ساتھ بندے کو ہدایت طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور سورت بقرہ میں آیت هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ تک بیان فرمایا گیا ہے کہ ہدایت کی دولت کیسے میسر ہوئی۔ اور یہ نعمت کس نے پائی۔ اور یہ سعادت کسے نصیب ہوئی۔ نیز سورۃ فاتحہ کے آخر میں ایمان والوں کے گروہ اور کافروں کے دو فرقوں کا ذکر تھا اور سورۃ بقرہ کے آغاز میں بھی زمرۂ مومنین اور کافروں کے دو فرقوں' کھلے کافروں اور منافقوں کو بیان کیا گیا۔ نیز سورۃ فاتحہ میں صفات الٰہیہ میں سے پہلے ربوبیت مذکور ہے۔ اور اس سورت میں بھی پہلے نوع انسان کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی شرح ہے كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ اور يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ میں اس معنی کو تمہید تفصیل کے طور پر پہلے بیان فرمایا۔

پھر سورت فاتحہ میں دینی اور دنیوی رحمت کی اقسام دو اسماء اَلرَّحْمٰنِ ' اَلرَّحِيْمِ کے ساتھ بیان ہوئیں اور اس سورت میں دینی اور دنیوی رحمت کی اقسام کی تفصیل ہے جو کہ

بارگاہ خداوندی سے بنی اسرائیل کے دو گروہوں کو عنایت ہوئیں پھر سورہ فاتحہ میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کو لاکر مسئلہ جزا بیان فرمایا۔ اور اس سورت میں بنی اسرائیل کے ذکر میں ہر ناشکری اور نافرمانی کے بدلے انہیں دنیوی سزاؤں کی صورت میں بدلہ دینے کا ذکر ہوا۔ پھر سورۃ فاتحہ میں عبادت اور استعانت کا بیان ہے۔ اور اس سورت میں آیت فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ سے لے کر مسائل جہاد و حج کے آخر تک عبادات کی شرح ہے۔ اور وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى سے لے کر صدقات اور سود کے مسائل کے آخر تک استعانت کی قسموں کی تفصیل ہے۔ اور آیت اٰمَنَ الرَّسُوْلُ میں صراط مستقیم کا بیان ہے کہ حقیقت میں انہیں مطالب کی طلب پر سورت فاتحہ ختم ہوئی۔ پس یہ سورت، سورت فاتحہ کی شرح کا حکم رکھتی ہے۔ اور شرح کا مرتبہ متن کے مرتبہ کے بعد ہوتا ہے۔

یہاں جاننا چاہئے کہ سورت بقرہ ان ۲۹ سورتوں میں ہے جن کی ابتداء حرف مقطعہ سے واقع ہوئی۔ اور وہ حروف تکرار والے حروف کو گرا کر ۱۴ ہیں الف، لام، میم، صاد، را، کاف، ہا، یا، عین، طا، سین، حا، قاف، نون اور صراط علی حق نمسکہ کا جملہ ان حروف کا جامع ہے۔ اور ان ۱۴ حروف کو ان سورتوں میں وارد کرنے میں ۲۹ نکات اور باریکیاں ملحوظ ہیں جو کہ بیضاوی اور اس کے حواشی میں مذکور ہیں۔ اور یہاں جس چیز کا بیان ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حروف کے معنی کیا ہیں ایک مقدمہ کو بیان کئے بغیر اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے اس مقدمہ کو پہلے بیان کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ علمائے محققین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ الفاظ کی اپنے وضعی معنوں پر دلالت صرف وضع کے ساتھ ہے کہ واضع نے جس لفظ کو جس معنی کیلئے چاہا خاص کر دیا بغیر اس کے کہ لفظ کی ذات میں ان معنوں کے ساتھ کوئی مناسبت ثابت ہو اکثر علماء نے اسی مذہب کو اختیار فرمایا ہے۔ اور علماء میں سے بعض نے فرمایا ہے کہ لفظ اور معنے کے درمیان طبعی مناسبت ہے جو کہ اس لفظ کے اس معنی کے ساتھ مختص ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اگر وہ مناسبت نہ ہو تو واضع کو معنوں کے مقابلہ میں لفظ وضع کرنے میں ترجیح بلا مرجح لازم آئے۔

پہلے مذہب کی دلیل یہ ہے کہ لفظ کی دلالت ذات لفظ کے تقاضا کی وجہ سے ہوتی تو گروہوں۔ اور شہروں کے اختلاف کی وجہ سے زبانوں کا اختلاف ثابت نہ ہوتا اور ہر شخص ہر لفظ کے معنی کو سمجھ لیتا۔ اور ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف لفظ کو منتقل کرنا محال ہوتا اس لئے کہ انفکاک بالذات محال ہے۔ اور ایک لفظ کو ایک دوسرے کے منافی دو معنوں میں استعمال کرنا محال ہوتا۔ جیسا کہ جون سیاہ اور سفید کو کہتے ہیں۔ اور قرء کو حیض اور طہر کا نام ہے۔ اور دوسرے مذہب کی دلیل یہ ہے کہ تلاش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ذات میں حروف کے مختلف خواص ہیں۔ جیسے جہر ٔ ہمس' شدت درخاوت' استعلاء و تسفل۔ اور ترکیب کی شکلوں کے مختلف خواص ہیں۔ جیسے فعلان کہ حرکت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے نزدان' حققان۔ اور عین کے ضمہ کے ساتھ فعل طبعی لازمی افعال پر دلالت کرتا ہے۔ اور تشدید کے ساتھ یعنی فعل کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر ان خواص کو جاننے کے باوجود اگر ان خواص کو وضع کرنے والا ان کی رعایت نہ کرے۔ اور مناسبت کو بے مقصد چھوڑ دے تو کلمہ کا حق ادا نہیں کیا۔ اور یہ حکمت کے منافی ہے۔ جبکہ ان کا واضع ذات پاک حضرت حق ہے۔ کہ تمام جہاں کے حکیموں کی حکمت اس کی بے پایاں حکمت کے دریا کا ایک قطرہ ہے۔ اور ان دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ یہ ہے کہ الفاظ اور معنوں کے درمیان ذاتی مناسبت کی رعایت ضرور کی گئی ہے مگر جو لوگ اس مناسبت کا انکار کرتے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ صرف یہی مناسبت معنی کو سمجھنے میں کافی نہیں ورنہ پہلے ذکر کیئے گئے محذورات لازم آئیں گے۔ بلکہ اس مناسبت ذاتی کے ہمراہ معنی کو سمجھنے میں وضع واضع کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ مفرد الفاظ جو کہ حروف ہجا سے عبارت ہے کی مختلف ترکیبیں مختلف مناسبتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور وہ جدا جدا مناسبتیں مختلف طریقوں کو چاہتی ہیں۔ جس طرح کہ عناصر اربعہ اپنی کیفیتوں کے ساتھ تمام جہان کے مرکبات کے اجزاء ہیں۔ مگر ان کی کیفیتوں نے دوسری کیفیتوں سے مل کر اور اس انضمام کی وجوہ کے اختلاف نے کہ بعض غالب اور بعض معتدل ہیں مراتب ترکیب کو گنتی اور احاطہ کی حد سے باہر کر دیا۔ اور اس کیفیت کے نشانات کو ظاہر میں عقل کی نظر سے چھپا دیا کہ علام الغیوب کی ذات کے بغیر انہیں دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ کہ

اس خاص ترکیب میں اس کیفیت کا اثر کیا ہوگا۔ جب تک کہ تجربہ نہ ہو مثلاً ٹھنڈک اور خشکی کی کیفیت جو کہ افیون میں ہے وہ اپنی اور مٹی کی کیفیت سے زیادہ غالب نہ ہوگی۔ حالانکہ تھوڑی سی افیون مار ڈالتی ہے۔ جبکہ اس سے کئی گنا زیادہ پانی اور مٹی سے مزاج بھی نہیں بدلتا مار ڈالنے تک تو کیسے پہنچے۔ اس لئے عقل ظاہر میں اس قسم کو صورت نوعیہ کے ساتھ وابستہ کر کے اپنی تسلی کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ یہ کام اس مرکب سے خاصیت کی وجہ سے صادر ہوا اس مرکب کے اجزاء کی کیفیات کا تقاضا نہ تھا علی ہذا القیاس۔

یہاں سمجھنا چاہئے کہ واضع نے اپنے علم محیط کے کمال سے ہر ترکیب میں مفرد الفاظ کو مان کر ہر ترکیب کو معنی کے مقابلہ میں وضع فرمایا ہے۔ لیکن جب ظاہر بینوں کی عقلیں اس مناسبت کو پانے تک نہیں پہنچیں تو وہ واضع کے ارادہ کے حوالہ کے بغیر کوئی چارہ نہیں جانتے اور صورت نوعیہ کے بجائے واضع کے ارادے کو اپنے اعتماد کا عصا قرار دیتے ہیں ورنہ حقیقت الامر وہی ہے جو مذکور ہوئی اسی لئے صیغوں کے اشتقاق کا علم رکھنے والوں نے مناسب ترکیبوں میں غور وفکر کر کے حقیقت کا کھوج لگایا ہے۔ اور انہوں نے قریبی ترکیبوں کے درمیان فرق کیا۔ جیسا کہ فا کے ساتھ فصم اور ق کے ساتھ قصم کہ فصم کسی شے کے جدا ہوئے بغیر ٹوٹنے کو کہتے ہیں۔ جبکہ قصم کسی شے کا ٹوٹنا یہاں تک کہ جدا جدا ہو جائے۔ اور اسی قیاس پر جبد وجدب اور مدح وحمد ہے۔

نیز مفرد الفاظ کی مناسبتیں ہر فرقہ اور ہر ملک کی نسبت سے اس طرح مختلف ہوتی ہیں کہ ایک فرقہ اور ایک ملک کے رہنے والے معنوں میں سے ایک معنی میں کسی چیز کو پاتے ہیں کہ دوسرے اسے نہیں پاتے اس لئے پہلے فرقہ نے اس چیز کی رعایت کرتے ہوئے ایک لفظ کو ان معنوں کے مقابلہ میں وضع کیا۔ اور دوسرے اس چیز سے غافل ہو کر ان معنوں کے مقابلہ میں لفظ وضع کرنے میں اس کی رعایت نہیں کرتے۔ اس طرح ہر فرقہ کے الفاظ اور لغات میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آسمانی اور زمینی عوارض کی وجہ ہر قوم کے حاصل شدہ مزاج کو بھی آوازوں کی کیفیتوں میں پورا دخل ہے جو کہ معنوں کی حکایت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہاڑی لوگوں کی زبان جنگلی لوگوں کی زبان کی نسبت زیادہ سخت

اور ثقیل ہوتی ہے۔ اور جنگلی لوگوں کی زبان شہریوں کے مقابلہ میں اسی طرح، علی ہذا القیاس ہر فرقہ اور ہر ملک کی عادتوں کو بھی پورا دخل ہے۔ اسی لئے ہر شخص، ہر شخص کی زبان نہیں سمجھ سکتا اور صاحب مسلم نے اپنے بعض شیوخ سے نقل فرمایا کہ انہیں کوہ سوالک جو کہ شمالی ہندوستان میں واقع ہے کے برہمنوں میں سے ایک کے ساتھ ملاقات کا اتفاق ہوا کہ اس برہمن کے پاس قاعدے کلیے محفوظ تھے کہ ان قواعد کی وجہ سے وہ ہر زبان کو پوری طرح سمجھ لیتا تھا اور اس کی ذمہ داری نقل کرنے والے پر ہے ہاں یہ خوف اس وقت لازم ہوگا کہ معنوں پر دلالت کرنے کیلئے الفاظ کی ذاتی مناسبت ہی کافی ہو۔ جیسا کہ عباد بن سلیمان وغیرہ کا مذہب ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ الفاظ سے معنوں کو سمجھنے میں مناسب ذاتی کافی نہیں۔ بلکہ واضع حکیم کی نظر میں سبب ترجیح دینے والا ہے۔ اور اس بحث کی اگر واقعی تحقیق کرنا چاہیں تو افعال کے حسن و قبح کی بحث میں نظر کریں کہ اس حسن و قبح کو اشعریوں نے محض شرعی قرار دیا ہے۔ بغیر اس کے کہ ذات فعل میں کسی حکمت کا تقاضا ہو۔ پس ان کے نزدیک اگر بالفرض شارع بدکاری کو واجب اور نماز کو حرام قرار دے تو ہو سکتا ہے۔ اور اس فرقہ کے ظاہر بین احکام شرعیہ کو صرف انکل اور ایک زبردستی قانون سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ جمہور ظاہر بیں علماء معنوں کے مقابلہ الفاظ کی وضع سے متعلق اسی قسم کی جزاف و تحلم کا عقیدہ رکھتے ہیں اور فرقۂ معتزلہ نے عقل کو حاکم مستقل جانا ہے۔ اور ان افعال کے حسن و قبح کو ان کا ذاتی سمجھتے ہیں۔ اور نسخ اور حسن کے قبح میں بدل جانے کی صورت میں ان پر گفتگو کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ اور اس قیاس نے ان پر و **الله لاکذبن عذا** میں اجتماع نقیضین لازم آتا ہے۔ جیسا کہ اس بحث میں عباد بن سلیمان ضمیری کا مذہب ہے۔

اور ماتریدیہ کے محققین فرماتے ہیں کہ حسن و قبح عقلی ہے۔ لیکن ایسے معنی سے نہیں کہ عبد کے حق میں کسی حکم کو واجب کرنے والا ہو بلکہ اس معنی سے کہ اس فعل میں کوئی ایسی چیز ہے جو کہ اس فعل کو حکیم مطلق کی طرف سے حکم کا مستحق قرار دیتی ہے۔ کیونکہ کسی مرجوح کو ترجیح دینا اس کی شان نہیں ہے۔ اور جب تک کہ حکیم مطلق حکم نہ فرمائے اس وقت تک مکلفین کے حق میں حکم ثابت نہیں ہوتا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مکلف ہونے کیلئے

دعوت کا پہنچنا شرط ہے۔ جیسا کہ اس بحث میں مذہب مختار ہے۔ پس جو مشکلات قول بالتناسب پر ذکر کی گئیں تھوڑا سا غور کرنے پر سب ختم ہو جاتی ہیں۔

جب یہ مقدمہ ذکر ہوا تو جاننا چاہئے کہ حروف ہجا میں سے ہر حرف کی ہیئت اور اس حرف کے نکلنے کی جگہ جسے قرأ کے عرف میں مخرج کہتے ہیں کے اعتبار سے۔ نیز آواز نکلنے اور سامع پر دباؤ اور تیزی کی وجہ سے اثر کرنے۔ جیسا کہ اسے عرف قرأ میں صفت حرف کہتے ہیں کہ اعتبار سے ایک بسیط اجمالی حالت ہے کہ واضع نے مختلف ترکیبات کو جدا جدا معنوں کے مقابلہ میں وضع کرتے وقت اس کا اعتبار فرمایا۔ اور علمائے اشتقاق جیسے امام راغب اصفہانی وغیرہ نے قوت ذہانت سے ان حالات کو دریافت کر لیا ہے۔ اور وہ حالت بسیط' واضع کے استعمال میں ترکیبی خصوصیتوں سے خالی نہیں آئی ہاں عقل کیلئے ممکن ہے کہ ان حالات کو ترکیبی خصوصیتوں سے علیحدہ کر کے گہری نظر سے اسے معین کرے۔ اور اپنی معلوم کیفیتوں میں سے کسی کیفیت کے ساتھ تعبیر کرے۔ جیسے اہل موسیقی کا نغموں کی آوازوں کو صورتوں اور وقتوں سے تعبیر کرنا اور اہل نجوم کا ستاروں کی تطبیق کو کائنات کی اقسام سے حکایت کرنا اور اس معنی کو حضرت سلطان العارفین اسوۃ الحکماء المتالہین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز نے کتاب خیر کثیر جس کا لقب خزائن الحکمت ہے کہ آخر میں شواہد و دلائل کے ساتھ تفصیلاً بیان فرمایا ہے۔ اور کتاب **الفوز الکبیر فی علم التفسیر** کے آخر میں اس قدر بیان پر اکتفا فرمایا جو کہ مقطعات قرآنی کی تفسیر میں کام آئے چنانچہ ان کی بشارت والی عبارت فوز کبیر سے نقل کی جاتی ہے۔

الفوز الکبیر کے حوالے سے ہر حرف ہجا کا معنی بسیط

فرماتے ہیں کہ جاننا چاہئے کہ حروف ہجا جو کہ کلمات عرب کی اصل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا معنی بسیط ہے۔ کہ انتہائی نازک ہونے کی وجہ سے اس کی تعبیر اجمالی رمز کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے قریبی مادے قریبی سے معنوں میں متفق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اہل ادب کے عقل مندوں نے ذکر کیا ہے کہ جہاں نون اور فا جمع ہوئے ہیں وہاں کسی نہ کسی طرح سے نکلنے کے معنوں پر دلالت ہے۔ جیسے نفر' نفث' نفح' نفخ' نفد و نفذ اور

جہاں بھی فا اور لام جمع ہوئے ہیں وہ پھاڑنے کے معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے فلق، فلج، فلح، فلذ اور فلو۔ اور یہیں سے اہل ادب کے عقل مند جانتے ہیں کہ اکثر عرب والے اکثر ایک کلمہ کو حروف متقاربہ میں تبدیل کر کے کئی وجہوں پر بولتے ہیں۔ جیسے دق، دک، لج، نز بہرحال اس کے بے شمار گواہ ہیں۔

اور ہمیں صرف تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اور یہ سب نعت عرب ہے۔ اگرچہ خالص عرب اس کی گہرائی تک نہیں پہنچتے۔ اور نحوی بھی ادراک نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر تو خالص عربی سے تعریف جنس کا مفہوم یا تراکیب کے خواص پوچھے تو وہ اس کی حقیقت بیان کرنے پر قادر نہیں ہوتا اگرچہ انہیں استعمال کرتا ہے۔ پھر کلام عرب کے موشگاف ایک سطح پر نہیں ہیں۔ بعض ذہن کے اعتبار سے بعض سے زیادہ لطیف ہیں۔ کئی مفہوم ایسے ہیں کہ ایک جماعت اس کی گہرائی تک پہنچی اور دوسرے وہاں تک نہیں پہنچے اور یہ علم بھی اگرچہ لغت عرب سے ہے مگر اکثر باریک میں اس مفہوم کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ پس حروف مقطع سورتوں کے نام ہیں اس طرح کہ سورۃ میں جو کچھ تفصیل سے مذکور ہوتا ہے اس پر اجمالی طور پر دلالت کرتے ہیں اس کی تشبیہ اس طرح ہے کہ کسی کتاب کا نام ایسا مقرر کر دیا جائے کہ سننے والے کے ذہن پر اس کتاب کی حقیقت کو واضح کر دے۔ جیسا کہ بخاری نے اپنی کتاب کا نام جامع الصحیح المسند فی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکھا ہے۔ پس الم کا معنی یہ ہے کہ غیر متعین غیب، عالم شہادت کی نسبت سے جو کہ آلودہ ہے متعین ہو گیا۔ کیونکہ ہمزہ اور ہا دونوں غیب کے معنوں میں ہیں البتہ ہا اس عالم کا غیب ہے۔ اور ہمزہ عالم مجرد کا غیب اسی لئے استفہام کے وقت ام کہتے ہیں۔ اور عطف کے وقت او اس لئے کہ جس کے متعلق استفہام ہوتا ہے اس کا امر ایک منتشر امر ہے۔ اور وہ متعین کی بہ نسبت غیب ہے۔ اور اسی طرح جس میں تردد ہے وہ غیب ہے پہلے ہمزہ زیادہ کرتے ہیں۔ تا کہ اس پر دلالت کرے کہ اس کے ذہن میں ایک صورت قائم ہے کہ اس کی تفصیل فلاں مادہ ہو گا۔ اور ضمیروں میں ہا کو اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس عالم کا غیب ہے۔ اور متعین کو کچھ اجمال حاصل ہوا اور لام تعین کے معنوں میں ہے۔ اسی لئے تعریف کے وقت لام زیادہ کرتے

ہیں۔ اور چونکہ میم کی وجہ سے دونوں ہونٹ جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ آلودہ کے جسم پر دلالت کرتی ہے جس میں کہ شے کی حقیقتیں جمع ہوئیں اور مقید ہوئیں اور تجرد کی فضا سے تقید کی گرفت میں آپڑیں۔

حروف مقطعہ کے کنایات

پس الم فیض مجرد سے کنایہ ہے جو کہ عالم تغیر میں آیا اور ان کے عادات وعلوم کے مطابق متعین ہوا۔ اور ان کے دل کی سخت کا نصیحت کرنے کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور فاسد اقوال اور کھوٹے اعمال کو مضبوط دلائل سے گرادیا۔ اور ساری سورت اس کی شرح اور بیان ہے۔ اور الف' الم کی مثل ہے۔ سوائے اس کے کہ راتردد پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی وہ غیب جو کہ آلودگی سے متعین ہوا پھر دوسری بار آلودگی میں آیا اور متعین ہوا۔ تیسری دفعہ اسی طرح اور یہ بنی آدم کی برائیوں کو گرانے والے علوم سے کنایہ ہے۔ جو کہ بار بار انہیں توڑتے ہیں۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور یکے بعد دیگرے ان کے مذاکرات اور بار بار کے سوال وجواب پر صادق آتے ہیں۔ اور طا اور صاد دونوں آلودگی کے عالم سے عالم بالا کی طرف اٹھنے کی حرکت سے عبادت ہیں سوائے اس کے کہ طا اس متحرک کی عظمت وبزرگی یا اس کی آلودگی پر دلالت کرتی ہے۔ اور صادق صفائی اور لطافت پر جبکہ سین تمام آفاق میں جاری ہونے' محو ہو جانے اور پھیل جانے پر دلالت کرتا ہے۔ پس طٰہٰ انبیاء علیہم السلام کے مقامات ہیں کہ ان کے عالم اعلیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے آثار ہیں جس نے اس عالم میں اجمالی بیان اور ان کی کتابوں میں مذکور ہونے کے ساتھ ایک غیب کی صورت پیدا کی۔ اور حٰمٓ انبیاء علیہم السلام کے مقامات ہیں کہ ان کی حرکات فوقانی کے آثار ہیں جو کہ عالم آلودگی میں جاری اور آفاق میں منتشر ہوئے۔ اور حا رہی ہا ہے جس کا معنی بیان کیا جاچکا سوائے اس کے کہ جب روشنی' ظہور اور تمیز رکھے تو اسے حا سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس حم کا معنی ایک نورانی اور روشن اجمالی ہے جو کہ عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ سے آلودہ جہان کے نصائص میں پیوست ہوا اور یہ کنایہ ہے ان کے اقوال کو رد کرنے اور ان کے شبہات' مناظرات اور عادات میں حق کے ظاہر ہونے سے اور ع ظہور اور روشنی اور متعین ہونے پر دلالت کرتا

ہے۔ اور ق' م کی طرح اس عالم پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن قوت اور شدت کی جہت سے اور میم اس میں صورتوں کے اجتماع اور ہجوم کی جہت سے۔ پس عشق حق روشن ہے کہ آلودگی کے عالم میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ اور ن اس نور سے عبارت ہے جو کہ اندھیرے میں سرایت کرتا اور پھیلتا ہے اس حالت کی طرح جو کہ صبح صادق کے وقت یا غروب شمس کے نزدیک ہونے کے وقت ہوتی ہے۔ اور یا اسی طرح ہے مگر یہ کہ ن کی بہ نسبت یا میں نورانیت کچھ کم سمجھی جاتی ہے۔ اور ہا کی نسبت سے تعین کم ہوتا ہے۔ پس یہ اُن معنوں سے کنایہ ہے جو کہ عالم میں پھیلتے ہیں۔ اور ص ایک ہیئت ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کے اپنے پروردگار کی طرف جلتہ یا کسباً متوجہ ہونے سے پیدا ہوئی۔ اور ق ایک قوت اور شدت اور ایک شکستگی ہے جو کہ اس عالم میں متعین ہوئی۔ جیسا کہ کوئی کہے کہ میرے قصد کا نشانہ یہ ہیئت ہے کہ اس عالم میں شکستگی اور تصادم کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اور ک مثل ق کے ہے سوائے اس کے کہ قوت کا معنی ق کی بہ نسبت کم سمجھا جاتا ہے۔ پس کٓھٰیٰعٓصٓ کا معنی ظلمتوں سے آلودہ جہاں جس میں بعض علوم جو کہ روشن نہیں ہیں پروردگار اعلیٰ کی طرف رجوع کے وقت متعین ہوئے۔ خلاصہ کلام یہ کہ ان کلمات کے معنوں کو بطریق ذوق سمجھایا گیا اور ان اجمالی معنوں کو ان کلمات کے سوا تحریر میں لانا اور تقریر کرنا ممکن نہیں اگرچہ یہ کلمات ان کی حقیقت کے بیان کو پورا نہیں کرتے بلکہ ایک وجہ سے بیان کرتے ہیں وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ انتہی۔

شیخ کبیر صدر الدین قونوی کے ان حروف کے اجمالی معنوں کو بیان کرنے کے متعلق دو رسالے ہیں۔ اور ان ہر دو رسالوں میں انہیں مضامین کے قریب قریب بیان فرمایا۔ مثلاً ایک رسالہ میں فرماتے ہیں الف ہر قیم محیط' اسے ثابت رکھنے والا جو اس کے ساتھ قائم کیا گیا ہو جیسے حضرت آدم و عیسیٰ علیہما السلام اور کعبہ۔ لام' ہ پر وسیلہ جو کہ اس چیز کو پہنچانے میں مستقل ہو جس کا اس سے قصد کیا جائے جیسے رسل مستقلہ میم ہر کامل جس نے اپنا مقصد پورا کیا جیسے فلک اور زمین وعلیٰ ہذا القیاس۔ دوسرے رسالہ میں فرماتے ہیں الف غیب ہے۔ اور احاطة لام وسع وصله في لطف جس کا وصل لطف میں وسیع ہے۔ المیم تمام اظہر مثال حس۔ میم۔ کامل کہ اس نے حس کی مثال ظاہر کی۔

اور علمائے جفر کے نزدیک اس عالم کے ارکان کے ساتھ حروف کی مناسبت کے بیان میں ایک علیحدہ راستہ ہے۔ اور وہ راستہ ان حروف کی خطی اشکال پر مبنی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حروف ہجا کے اجمالی معنوں کا ہونا اور ان معنوں پر نظر رکھتے ہوئے حقائق کلیہ کے ساتھ ایک ان کی مناسبت ہونا ایک ایسا امر ہے کہ اہل کشف وتحقیق اور اہل اشتقاق وتصرف دونوں کے نزدیک مسلم ہے اگر ظاہر بین متکلمین اور فقہاء اس کا انکار کریں تو وہ کسی گنتی میں نہیں۔

مقطعات کی تحقیق میں سولہ اقوال

مگر جو کچھ مقطعات کی تحقیق میں قدیم مفسرین سے منقول ہے۔ پس سب کے سب ۱۶ قول ہیں۔ اول یہ ہے کہ یہ حروف اسرار محبت ہیں کہ غیروں سے چھپا کر اپنے رسول حبیب پاک علیہ السلام کو ان کا پتہ دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ حروف مفردہ سے خطاب کرنا احباب کی سنت ہے۔ کیونکہ حبیب کا راز جو حبیب کے پاس ہے واجب ہے کہ اس پر رقیب کو اطلاع نہ ہو۔ اور اس قول کی تائید اس روایت سے کی گئی ہے جو کہ امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہر کتاب کا سرّ یعنی راز ہے۔ اور قرآن پاک کا سر سورتوں کے اوائل ہیں۔ اور وہ جو امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ ہر کتاب کا چنا ہوا مضمون ہوتا ہے۔ اور قرآن کا صفوۃ حروف تہجی ہیں۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ علم بے پایاں دریا کی طرح ہے کہ اس سے نہر جاری کی گئی اور اس نہر سے راجباہ اور اس راجباہ سے کھالے۔ پس اگر نہر کو تکلیف دیں کہ دریا کے سارے پانی کو برداشت کرے تو نہیں کر سکتی اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آسمان کی طرف سے پانی اتارا۔ پس وادیاں اپنے اندازے کے مطابق بہہ نکلیں۔ پس بے پایاں علم کا دریا اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اور اس دریا سے مختلف نہریں رسل علیہم السلام کو عطا فرمائی گئیں۔ اور ان نہروں سے چھوٹے راجباہ ہر فن کے علماء کو پہنچے اور ان راجباہوں سے عوام الناس کو ان کی استعداد کے مطابق نالیاں پہنچتی ہے۔ اور ہر نچلے درجے کا اپنے سے اوپر کے درجہ کا متحمل نہیں ہو سکتا اسی لئے بعض خبروں میں واقع ہے کہ علماء کیلئے سر ہے۔ اور خلفاء کیلئے سر ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام

کیلئے سر ہے۔ اور فرشتوں کیلئے سر ہے۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات سر ہی سر ہے۔ پس علماء کیلئے ممکن نہیں کہ خلفاء کے سر پر اطلاع پائیں اور اسی قیاس پر۔

اور اس کا سبب یہ ہے کہ کمزور عقلیں اسرار قویہ کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں جس طرح چمگادڑ کی آنکھ آفتاب کے نور کو برداشت نہیں کر سکتی اور یہ قول شعبی سے منقول ہے۔ کیونکہ ان سے ان حروف کے معانی کا سوال کیا گیا تھا آپ نے فرمایا اللہ کا راز ہے اسے مت طلب کرو اور جو اس قول کے رد میں کہا گیا کہ اگر مقدمہ یہی ہے۔ تو قرآن کا معنی معلوم نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ نزول قرآن کا فائدہ اس کے معنوں کے فہم پر منحصر نہیں کئی جگہ صرف ایمان مطلوب ہوتا ہے۔ جیسا کہ تمام متشابہات میں یہی معنی مطلوب ہے وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهُ سے لے کر اِلَّا اللّٰهُ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا تک کی نص کے موافق۔ اور جیسا کہ شریعت کے جن افعال کی ذمہ داری بندوں پر رکھی گئی ان کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں بعض وہ ہیں کہ ان میں وجہ حکمت ظاہر ہے۔ جیسا کہ نماز کہ معبود کی بارگاہ میں عاجزی اور منعم کا شکر ہے۔ اور روزہ کہ نفس کو توڑنا اور شہوت کو مغلوب کرنا ہے۔ اور زکوٰۃ کہ مساکین کی حاجت پوری کرنا اور بخل جیسی ذلیل عادت کو دور کرنا ہے۔ اور بعض اعمال ایسے ہیں کہ ان میں وجہ حکمت اصلاً ظاہر نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اکثر افعال حج اور دونوں قسم کے اعمال سے بندے مکلف کئے گئے تا کہ اس تکلیف شرعی پر عمل کرنے کی وجہ سے مکلفین اپنے کمال کے مرتبوں میں ترقی کریں بلکہ دوسری قسم میں کمال اطاعت زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح کلمات قرآنی میں دونوں قسمیں وارد ہوئی ہیں۔ تا کہ دوسری قسم میں ایمانی قوت زیادہ ظاہر ہو۔

دوسرا قول یہ ہے کہ حروف مقطعات سورتوں کے نام ہیں۔ اور یہ اکثر متکلمین کا مذہب ہے۔ اور خلیل اور سیبویہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ حروف اسمائے الٰہیہ ہیں۔ اور یہ قول حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر منتخب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے بھی منقول ہے کہ وہ اپنی دعا میں یوں کہتے یا کہیعص یا حمعسق اور اسی کے قریب یہ

قول ہے کہ یہ حروف اسماء الٰہی کے بعض حصے ہیں۔ بعض جگہوں پر ہمارے لئے ترکیب ممکن ہے۔ مثلاً الر حم ن کو جمع کریں تو ہمیں الرحمٰن حاصل ہوا اور بعض میں ممکن نہیں ہے۔ اور یہ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

قول چہارم یہ ہے کہ یہ حروف قرآن پاک کے نام ہیں۔ اور کلبی' سدی اور قتادہ کا یہی مذہب ہے۔

قول پنجم یہ ہے کہ ان حروف میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کسی نام پر بطریق اشارہ دلالت کرتا ہے۔ مثلاً الف احد' اول' آخر' ازلی اور ابدی کا اشارہ ہے۔ اور لام لطیف کا اشارہ' میم ملک' مجید' منان کا اشارہ ہے۔ ک سے کافی' ہا سے ہادی' حا سے حکیم' عین سے عالم اور صاد سے صادق کا اشارہ ہے۔ اور کبیر و کریم' مخبر' عزیز و عدل کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول منقول ہے۔ لیکن کبھی وہ ان حرفوں سے صفات مرکبہ کا استنباط بھی کرتے تھے مثلاً الف لام میم میں انا اللّٰہ اعلم کہتے تھے۔ اور الف لام میم ص انا اللّٰہ اعلم و افضل ۔ اور الٓر میں انا اللّٰہ اری اور محمد بن کعب قرظی صفات افعال کو انہیں حروف سے نکالتے تھے۔ اور کہتے تھے الف الاء اللہ' لام لطف الٰہی ہے میم اس کی مجد ہے۔

قول ششم یہ ہے الف اللہ سے لیا گیا ہے۔ اور ل جبریل سے اور میم محمد سے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بواسطہ جبریل علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارا ہے۔ اور بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ الف انا لام لی اور میم منی یعنی تمام عالم میں ظاہر میں ہوں۔ اور ہر چیز میری ملک اور خلق ہے۔ اور مجھ سے پیدا ہوئی۔

قول ہفتم: عبدالعزیز بن یحیٰ نے کہا ہے کہ بچوں کی تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے انہیں حروف ابجد مقطعہ کی تعلیم دیتے ہیں اس کے بعد مرکبات سکھاتے ہیں ان حروف مقطعہ کو لانے میں اسی طریقہ کی طرف اشارہ ہے۔

آٹھواں قول: قطرب نحوی کہتا ہے کہ جب کفار اس قرآن کو سنتے تھے تو مذاق اور بیہودہ باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا کہ کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت

سنو اور اس میں شور ڈالو۔ حق تعالیٰ نے یہ حروف مقطعہ اس لئے اتارے تاکہ تعجب سے سننے لگیں۔ اور قرآن پاک کے معنی ان کے دل پر وہاں سے ہجوم کریں کہ انہیں شعور تک نہ ہو۔

نانواں قول: مبرد کہتے ہیں کہ بعض سورتوں کے اوائل میں ان حروف مقطعہ کو لانا تحدی یعنی دعویٰ نبوت کے وقت کافروں کو ہوش دلانے اور تنبیہہ کرنے کو ہے کہ دیکھو کہ یہ قرآن پاک ان ہی حروف سے ہے کہ تم بھی اپنے کلام کو ان ہی سے ترکیب دیتے ہو اگر یہ ہمارا کلام نہ ہوتو تم سب کے سب اس کے مقابلہ سے عاجز کیوں ہو جاؤ۔

دسواں قول: ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ یہ حروف ابجد کے حساب سے اس امت کے عمدہ انقلابات کے اوقات اور مدتوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان میں سے بعض معلوم اور بعض نامعلوم ہیں۔ اور اس کی تائید وہ روایت ہے جو بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں سند ضعیف کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ ایک دن ابو یاسر بن اخطب یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے سنا کہ حضور علیہ السلام سورۃ بقرہ کا ابتدائیہ پڑھ رہے ہیں یہ دیکھ کر اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا کہ آج میں نے محمد سے عجیب چیز سنی ہے۔ کہ کتاب الٰہی میں الم کی تلاوت کر رہے تھے حیی نے کہا تو نے اپنے کانوں سے سنا اس نے کہا ہاں حیی اٹھا اور یہودی عالموں کی جماعت کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ یہ حرف آپ کے پاس جبریل اللہ تعالیٰ کے ہاں سے لائے ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا: ہاں۔ حیی نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ گزشتہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کو (علیہم السلام) اپنی حکومت کی مدت معلوم نہ تھی اس پیغمبر کو اس مدت پر کیوں آگاہی دی گئی پھر اس نے ہمراہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ شمار کرو۔ الف ایک ہے۔ اور لام تیس اور میم چالیس۔ پس اس دین کی مدت ساری کی ساری اکہتر برس ہے یہ دین جو اتنی قلیل مدت رکھتا ہے ہم اسے کیوں قبول کریں پھر حضور علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ ان حروف کے علاوہ آپ پر اور حروف بھی نازل ہوئے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہاں اور المص

پڑھا اس نے کہا کہ اس کی مدت زیادہ ہے ایک سو اکسٹھ سال۔ پھر پوچھا آپ کوئی اور چیز بھی رکھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: الٓر المٓر حیی نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے یہ مسئلہ ہم پر مشتبہ کر دیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آپ کے دین کا رواج کم ہے یا زیادہ اور جب اٹھ کر چلا گیا تو ساتھیوں سے کہنے لگا کہ شاید یہ ساری مدتیں امت (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیلئے جمع کی گئیں لیکن اس کی امت کے ادوار و انقلابات ان مدتوں میں دوسرے رنگ میں ظاہر ہوں گے اس کے ہمراہیوں نے کہا کہ ابھی کام مشتبہ ہے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس قصہ کے بعد یہ آیت بھیجی وہ وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری۔ اس میں سے بعض آیات محکمات ہیں جو کہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری متشابہات۔

گیارہواں قول یہ ہے کہ یہ حروف ایک کلام کے ختم ہونے اور دوسری کلام کے شروع ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

بارہواں قول یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان حروف کی قسم فرمائی ہے۔ اور حرف قسم محذوف ہے۔ جس طرح کہ دوسری سورتوں کے اوائل میں دوسری مخلوقات کی قسمیں بیان فرمائیں اور فی الواقع یہ حروف ایک شرافت رکھتے ہیں۔ اور اسی شرافت کی وجہ سے قسم کے قابل ہیں۔ کیونکہ لغات کی اصل ہیں۔ اور ان کی وجہ سے لوگوں کے مافی الضمیر کا تعارف حاصل ہوتا ہے۔ ذکر الٰہی کا مادہ ہیں اللہ تعالیٰ کی کلام کی اصل اور بندوں کے نام اس کا خطاب ہیں۔

تیرہواں قول: الف امر سلوک کی ابتداء میں شریعت ہر استقامت کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ فرمایا جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر انہوں نے استقامت اختیار کی۔ اور لام اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو کہ مجاہدہ کے وقت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اور جن لوگوں ہم میں مجاہدہ کیا ہم ضرور انہیں اپنی راہوں کی ہدایت دیں گے۔ اور میم اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ محبت کے مقام میں دائرہ کی مانند گھومتا ہے کہ اس کی انتہا عین ابتداء ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک عارف نے فرمایا انتہاء آخر میں ابتداء ہو جاتی ہے۔

چودھواں قول: الف حلق کی جڑ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور لام زبان کی طرف سے جو کہ مخارج کا درمیان ہے۔ اور میم لب سے ظاہر ہوتا ہے جو کہ مخارج کا آخر ہے اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ کے کلام کی ابتداء درمیان اور آخر اللہ تعالیٰ کا ذکر چاہئے۔

پندرہواں قول یہ ہے الف لام تعریف کی علامت ہے۔ اور میم علامت جمع، گویا فرمایا گیا کہ قرآن پاک کا نزول تمام لوگوں کو آگاہی بخشنے کیلئے ہے۔ تاکہ اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو جانیں۔ اور اس کی پسند اور ناپسند کو پہچانیں۔

سولہواں قول: ان حروف مقطعہ کو سورتوں کے اوائل میں لانا اعجاز ثابت کرنے کیلئے ہے۔ کیونکہ لکھنے اور پڑھنے کے بغیر حروف کے ناموں کو پہچانا نہیں جاسکتا۔ بالکل بے پڑھا جو کہ کبھی کسی مکتب میں نہ بیٹھا ہوا سے حروف کے نام اصلاً معلوم نہیں ہوتے۔ ہاں صرف حروف کے ساتھ بولتا ہے۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھے پڑھے بغیر ان اسماء کا ذکر فرمائیں تو یقین حاصل ہوگا کہ آپ نے انہیں وحی کے ذریعے سے معلوم کیا۔ خصوصاً جب گہری نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان حروف کو لانے میں اس قدر باریکیوں اور نکات کی رعایت کی گئی ہے کہ ماہر عربی دان کیلئے ان کی رعایت ممکن نہیں۔

دقائق حروف

ان میں سے یہ ہے کہ مقطعات میں چوداں حروف وارد کئے گئے ہیں جو کہ حروف ہجا کا نصف ہیں اگر الف کو علیحدہ شمار نہ کریں۔ انتیس سورتوں میں جو کہ الف کو ملا کر حروف ہجا کی تعداد ہے۔ پس حروف کے ناموں کا نصف مسمیات کی تعداد میں وارد کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ الف کو ہمزہ کے ساتھ پوری شارکت ہے ان میں فرق صرف سکون اور حرکت کا ہے۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ ان حروف کو وارد کرنے میں حروف کی ساری قسموں کی طرف اشارہ ہے کہ نصف نصف ہر قسم کا لایا گیا مثلاً حروف کی دو قسمیں ہیں مہموسہ مجہورہ مہموسہ حروف "فحثہ شخص سکت" ہیں۔ اور ان دس حروف میں سے حا، ہا، صاد، سین اور کاف مقطعات قرآنی میں وارد ہیں جو کہ ان کا حقیقی نصف ہیں۔ اور حروف مجہورہ میں سے بھی

نصف حقیقی یا نصف اقل مذکور ہے۔ اور وہ لام' نون' یا' قاف' طا' عین' ہمزہ' میم اور را ہے۔

نیز حروف دو قسموں پر ہیں شدیدہ اور رخوۃ۔ شدیدہ آٹھ حروف ہیں ہمزہ' جیم' دال' تا' طا' با' کاف اور قاف اور ان حروف کا نصف جو کہ الف' قاف' طا اور کاف ہے ان مقطعات میں مذکور ہے۔ اور باقی بیس حروف جو کہ رخوہ ہیں میں سے دس حروف مقطعات میں مذکور ہیں حا' میم' سین' عین' لام' یا' نون' صاد' را اور ہا

نیز حروف کی دو قسمیں ہیں مطبقہ' منفتحہ' مطبقہ سے جو کہ چار حروف ہیں صاد' ضاد' طا اور ظا کے نصف کو ذکر فرمایا جو کہ صاد اور طا ہیں۔ اور باقی حروف جو کہ منفتحہ ہیں کے بھی نصف کو ذکر فرمایا ہے جو کہ ۱۲ حروف ہیں۔ اور حروف قلقلہ سے جو کہ پانچ حروف ہیں قاف' دال' طا' با اور جیم نصف اقل کو ذکر فرمایا جو کہ قاف اور طا ہیں۔ تا کہ اس طرف اشارہ ہو کہ کلام عرب میں یہ حروف تھوڑے ہیں۔ اور دو حرف لین کہ واؤ اور یا ہیں میں سے یا کو اختیار فرمایا کیونکہ یا ثقل میں واؤ سے کمتر ہے۔ اور حروف مستعلیہ سے جو کہ سات ہیں قاف' صاد اور طا کو جو کہ نصف اقل ہے اختیار فرمایا۔ اور خا' غین' ضاد اور ظا کو ترک فرمایا۔ اور حروف منخفضہ سے جو کہ اکیس ہیں نصف اکثر کہ جو کہ گیارہ ہیں ذکر فرمایا۔ اور حروف بدل سے جو کہ سیبویہ کے مذہب کے مطابق گیارہ حرف ہیں الف' جیم' دال' طا' واؤ' یا' تا' میم' نون' ہا اور ہمزہ نو حرف ذکر فرمائے ہیں۔ اور ان حروف میں سے جو کہ اپنی مثل میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے قریب المخرج میں مدغم نہیں ہوتے۔ اور وہ پندراں حروف ہیں ہمزہ' ہا' عین' صاد' طا' میم اور یا کو ذکر فرمایا جو کہ اس کا نصف اقل ہوتا ہے۔ اور خا' غین' ضاد' فا' ظا' شین' زا اور واؤ کو ترک فرمایا۔ اور ان حروف میں سے جو کہ دونوں میں مدغم ہوتے ہیں اپنی مثل میں بھی اور قریب المخرج میں بھی اور وہ باقی تیراں حروف ہیں میں سے اس کے نصف اکثر کو ذکر فرمایا جو کہ حا' قاف' کاف' را' سین' لام اور نون ہیں۔ تا کہ اشارہ ہو اس بات کا ادغام' کلام کے ہلکے اور فصیح ہونے کو واجب کرتا ہے جو چیز ادغام زیادہ قبول کرے گی اس کے حال کی رعایت زیادہ کی جائے گی۔ اور وہ چار حروف جو کہ اپنے قریب المخرج میں ادغام قبول نہیں کرتے۔ اور ان کے قریب المخرج ان میں ادغام قبول کرتے ہیں۔ اور وہ حروف میم' را'

شین اور فا ہے اس کے نصف کو ذکر فرمایا کہ میم اور را ہے۔ اور حروف زلقیہ جو کہ رب منقل میں جمع ہیں۔ اور حروف حلقیہ جو کہ حا' خا' عین' غین' ہا اور ہمزہ ہیں عرب کے کلام میں زیادہ واقع ہوتے ہیں دو تہائی ذکر فرمائے گئے تا کہ کلام عرب میں ان کے زیادہ واقع ہونے کا اشارہ ہو۔ اور دس زاید حروف جو کہ سالتمونیہا میں جمع ہیں میں سے سات حروف کو ذکر فرمایا گیا۔ تا کہ اشارہ ہو کہ مزید فیہ کی بنا سات سے تجاوز نہیں کرتی اور وہ بھی اسم میں جیسے استفعال اور افعیلال۔ پھر ان حروف کو کبھی مفرد لائے ہیں۔ جیسے صاد' قاف' نون اور کبھی دو دو مثل حامیم' یاسین' طاسین۔ اور کبھی تین تین جیسے طاسیم' الم اور کبھی چار چار جیسے المص' المر اور کبھی پانچ پانچ جیسے کہیعص اور حمعسق تا کہ اس بات کا اشارہ ہو کہ مفرد حروف تین قسموں اسم' فعل اور حرف میں موجود ہوتے ہیں اسم میں جیسے کاف خطاب اور فعل میں جیسے ق اور ل جو کہ وقی یقی اور ولی یلی سے صیغہ امر ہے۔ اور حرف میں جیسے بائے جر اور کاف تشبیہ۔ اور چار جگہ دو دو لائے ہیں طٰهٰ ' طٰسٓ ' یٰسٓ اور حمٓ تا کہ اشارہ ہو کہ دو دو کی ترکیب کبھی حرف میں ہوتی ہے حذف کے بغیر جیسے بل اور ہل اور کبھی فعل میں حذف کے ساتھ ہوتی ہے۔ جیسے قل اور کبھی اسم میں حذف کے بغیر ہوتی ہے۔ جیسے من اور حذف کے ساتھ بھی جیسے دم نو مقامات میں تا کہ اشارہ ہو اس بات کا کہ یہ ترکیب تینوں قسموں اسم' فعل اور حرف میں تین وجہ پر واقع ہوتی ہے ضم' فتح اور کسر۔ پس اسماء میں من' اذ اور ذو اور افعال میں قل' بع اور خف اور حرف میں ان' من اور مذ اور تین ترکیب تین تین کی وارد کی ہیں کہ الم' الر اور طسم ہیں۔ تا کہ اشارہ ہو اس بات کا کہ یہ ترکیب تینوں قسموں اسم' فعل اور حرف میں واقع ہوئی۔ تیراں سورتوں میں تا کہ اس امر کا اشارہ ہو کہ ابنیہ مستعملہ کے تیرہ اصول ہیں دس اسم کیلئے فلس' فرس' کتف' عضد' حبر ' عنب' ابل' قفل' صرد' عنق اور تین فعل ماضی کیلئے بصر' علم ' شرف اور چار چار کی ترکیب کو دو جگہ وارد فرمایا ہے المر ' المص اور اسی طرح پانچ کی ترکیب کو بھی دو جگہ وارد فرمایا کھیٰعص' حٰمٓعسٓق تا کہ اس طرف اشارہ ہو کہ رباعی اور خماسی ترکیب میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اصل جیسے جعفر اور سفرجل اور ملحق جیسے قردد اور جحنفل۔ اور انہیں اشارات کیلئے ان حروف کو سورتوں میں جدا جدا کر کے ذکر فرمایا گیا۔

اور قرآن مجید کے اول میں ایک مقام پر انہیں جمع نہیں کیا گیا واللہ اعلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ: یعنی قانون جس کی اتباع لازم' محکم جو کہ منکروں کیلئے معجزہ ہے۔ اور دلیل طلب کرنے والوں کیلئے مفید کیونکہ بلند مطالب کو روشن دلائل کے ساتھ ثابت کرنے والا ہے۔ اور کمزور شبہات کو زائل کرنے اور مٹانے والا۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ: یعنی وہ کتاب ہے جو کہ اپنے درجہ کمال کی بلندی اور اپنے اسرار و دقائق کی باریکی کی وجہ سے سننے والوں کے وہم اور فہم سے غائب اور افکار اور نگاہوں کی جولانیوں کے مقام سے بعید ہے۔ اسی لئے اس کے حق میں وہ کتاب کہا جاتا ہے جو کہ دوری پر دلالت کرتا ہے۔ نہ یہ کتاب کہ قرب پر دلالت کرتا ہے۔

احکام دین کے اصول چار چیزیں ہیں

یہاں جاننا چاہئے کہ احکام دین کے اصول چار چیزیں ہیں کتاب' سنت' اجماع اور قیاس۔ اس لئے کہ دین کے بعض احکام کتاب سے ثابت ہوئے جیسے نماز' روزہ' زکوٰۃ' حرمت خنزیر اور گائے کا حلال ہونا۔ اور اسی کی مثل دوسرے احکام۔ اور بعض احکام حضرت پیغمبر علیہ السلام کے قول اور فعل سے ثابت ہوئے جنہیں سنت کہتے ہیں۔ جیسے نماز جنازہ اور گدھے اور خچر کی حرمت وغیرہ اور بعض احکام مجتہدین کے اجماع سے ثابت ہوئے جیسے اس لونڈی کو بیچنے کی حرمت جس نے اپنے مالک سے بیٹا جنا ہو۔ اور دو بہنوں کو حرمت ملک یمین کی وطی میں جمع کرنے کی حرمت اور بعض قیاس ظاہر سے ثابت ہوتے ہیں کہ غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا ہو جیسے پیسوں اور ٹکوں میں سود لینے کی حرمت کہ صریح طور پر اس باب میں سونے اور چاندی سے ملتے ہیں۔ لیکن وہ اصل جو لازم اور محکم ہو کتاب کے سوا کوئی اور نہیں۔ اس لئے کہ قیاس کیلئے ایسی جائے اعتماد چاہئے کہ اصل میں اس کی وجہ سے حکم شرع ثابت ہوا ہو۔ اور وہ اعتماد کا مقام یا کتاب ہے یا سنت یا اجماع اور اجماع بھی اپنی ذات میں اصل نہیں۔ کیونکہ اجماع اس قیاس کا نام ہے کہ تمام مجتہدین کے قیاس اسی پر وارد ہوئے ہوں۔ پس اس قیاس کا بھی کتاب وسنت سے کوئی مقام اعتماد ہوگا۔ اور سنت حضرت

رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول وفعل کا نام ہے جب تک پیغمبر کی نبوت ثابت نہ ہوتو اس کے قول اور فعل معتبر نہیں ہوتے۔اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت قرآن پاک سے ثابت ہے جو کہ دائمی معجزہ ہے۔پس حقیقت میں اصل محکم جو کہ پیغمبر' امت' مجتہد اور عام آدمی سے ہرایک لئے لازم الاتباع ہے یہی قرآن پاک ہے۔اور بس۔

اور کتاب اگرچہ اصل لغت میں مکتوب کے معنوں میں ہے کہ لکھے ہوئے کو کہتے ہیں۔جیسے کہ لباس بمعنی ملبوس لیکن اصطلاح شرع میں یہ لفظ قرآن پاک کے ساتھ خاص ہے۔حتیٰ کہ اگر کہا جائے کہ فلاں چیز کتاب میں ہے۔تو سمجھا جائے گا کہ قرآن پاک میں ہے۔اور قرآن پاک کے قرآن اور کتاب کے سوا بہت نام ہیں کہ عین قرآن پاک میں مذکور ہوں گے۔

ان میں سے فرقان ہے جو کہ آیت تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ میں مذکور ہے۔
اور فرقان کی وجہ تسمیہ دو چیزیں ہیں پہلی یہ کہ قرآن حق و باطل کے درمیان جدائی کرتا ہے
دوسرے یہ کہ نزول میں متفرق آیا ہے تیئس سال میں آغاز سے انجام کو پہنچا۔
اور ان میں سے تذکرہ' ذکریٰ اور ذکر ہے۔چنانچہ آیت وَاِنَّہٗ لَتَذْکِرَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ اور وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ اور وَاِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ میں مذکور ہے۔اور تذکرہ ذکریٰ اور ذکر کا معنی یاد کراتا ہے۔یعنی یہ قرآن پاک بندوں کو احکام الٰہی یاد کراتا ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ شرف وفخر کے معنوں میں ہے۔
اور ان میں سے تنزیل ہے جو کہ آیت وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں ہے۔
اور ان میں سے احسن الحدیث ہے۔یعنی بہترین بات' جو کہ آیت اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ میں ہے۔

اور ان میں سے جو عظ ہے۔یعنی نصیحت آیت یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ میں۔
اور ان میں سے حکم' حکمت' حکیم اور محکم ہے آیت وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ حُکْمًا عَرَبِیًّا اور آیت حِکْمَۃٌ بَالِغَۃٌ اور آیت یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ اور آیت کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ

آیاتہٗ میں۔

اوران میں سے شفااوررحمت ہے آیت وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

اوران میں سے ھدیٰ اورھادی ہے اسی آیت میں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اورآیت اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ میں۔

اوران میں سے صراط مستقیم ہے آیت اِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا

اوران میں سے حبل اللہ ہے آیت وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا یعنی قرآن پاک خداتعالیٰ کی رسی ہے اس کمند کی مانند جوکہ اونچے محل سے لٹکادیتے ہیں۔تاکہ جوچاہے ہاتھ میں پکڑکراوپرآجائے۔اورترقی حاصل کرے۔

اوران میں سے روح ہے آیت وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا کیونکہ قرآن پاک ارواح کی زندگی کا سبب ہے۔جس طرح کہ روح بدنوں کی زندگی کا سبب ہے۔پس قرآن پاک بمنزلہ روح کی روح کے ہے۔

اوران میں سے قصص حق ہے آیت اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ کیونکہ جوکوئی قصہ بیان کرتا ہے غالباً لغواور باطل بھی اس میں ملادیتا ہے سوائے اس کلام کے کہ حق کے سوا اس میں کوئی اورچیزنہیں ہے۔

اوران میں سے بیان،تبیان اورمبین ہے آیت هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اورقُرْآنٌ مُّبِيْنٌ

اوران میں سے بصائریعنی روشن دلائل،آیت هٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ

اوران میں سے قول فصل ہے آیت اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ میں

اوران میں سے نجوم ہے فَلَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ

اوران میں سے مثانی ہے۔کیونکہ اس میں واقعات،اخبار اور وعدووعید کوتکرار سے بیان فرمایا آیت مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

اوران میں سے متشابہ ہے۔کیونکہ اس کی ہرآیت دوسری آیت سے فصاحت و

بلاغت' اعجاز اور لطف اسلوب میں مشابہ ہے۔

اوران میں سے برہان ہے آیت قَدْ جَآءَ كُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ میں

اوران میں سے بشیر ونذیر ہے آیت قرآنا عربیا لقوم یعلمون بشیرا و نذیرا

اوران میں سے قیم ہے سورۃ کہف کے اول میں

اوران میں سے مہیمن ہے سورۃ مائدہ کے درمیان آیت مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ میں

اوران میں سے نور ہے آیت وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ میں

اوران میں سے حق اور حق الیقین ہے آیت يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ كُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ اور اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنُ میں

اوران میں سے عزیز ہے آیت اِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ میں

اوران میں سے کریم ہے آیت اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌ میں

اوران میں سے عظیم ہے آیت وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمِ میں

اوران میں سے مبارک ہے آیت كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ میں

اوران میں سے نعمت ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق کہ آپ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ میں نعمۃ کی تفسیر قرآن سے فرمائی اوران ناموں کی شرح اپنے مقام پر آئے گی (اقول وباللہ التوفیق۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ مفسر علام قدس سرہ کا پورے قرآن کریم کی تفسیر کا ارادہ ہے۔ واللہ اعلم ارادہ کی تکمیل کی لیکن دستبرد زمانہ سے یہ عظیم ذخیرہ جواہر ضائع ہوگیا۔ یا حیات مستعار نے وفا نہ کی اور آپ کو تکمیل ارادہ نہ مل سکا۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ) اور یہ کتاب اس لئے اصل لازم الاتباع محکم ہوئی کہ

لَا رَيْبَ فِيْهِ: یعنی اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اس سبب سے کہ یہ کتاب اپنے مطالب پر خود روشن دلائل قائم کرتی ہے۔ اور شبہات کو شفا بخش تقریر کے ساتھ دفع کرتی ہے۔ پھر اعجاز کے ساتھ اس کی تائید کی گئی ہے کہ منکروں کے شبہات کو دور کرنے میں

تیغ براں ہے۔ پھر اس سے پہلے جو کتب الٰہیہ تھیں۔ اور عام مخلوق کے نزدیک ان کا وحی ہونا مسلم الثبوت ہے نے اس کی تصدیق کی ہے۔ پھر اولیاء اور مجاہدات حقہ کرنے والوں کے کشف اس کتاب کے نزول کے بعد اس کتاب کے مطابق آئے ہیں بلکہ کشوف کا سچا ہونا اس کتاب کے مطابق ہونے سے جانا جاتا ہے۔ اور صرف عقلی دلائل معارضات اور مناقضات سے کم خالی ہوتے ہیں۔ پس وہ اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں اصل محکم لازم الاتباع گردانا جائے۔ اور نقلی دلائل جو کہ خود دوسری کتابوں سے ہیں تحریف کا احتمال رکھتے ہیں۔ اور وہ انبیائے سابقین علیہم السلام سے لئے گئے۔ سند کے منقطع ہونے اور ان کی امتوں میں جھوٹ اور بہتان عام ہونے کی وجہ سے محل اعتماد نہیں ہیں۔ اور اس کے باوجود علوم حقہ اور معارف صادقہ میں سے جو کچھ پہلی کتب الٰہیہ اور نبوت کی اخبار ماضیہ میں جدا جدا اور متفرق تھا اس کتاب میں ایک جگہ جمع ہے۔ پس اس کتاب کی اتباع گویا تمام کتب الٰہیہ اور تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کی اتباع ہے۔ جس طرح کہ ہر فن کی پچھلی کتاب متقدمین کی کتابوں کے خلاصہ پر حاوی ہوتی ہے۔ اور وہ کتاب اپنے دیکھنے والے کو تمام پہلی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

اور جب یہ کتاب اصل لازم الاتباع محکم ہے۔ تو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی متقیوں کیلئے ہدایت ہوگی۔ کیونکہ متقی ایسے شخص کا نام ہے جو اپنے آپ کو اس سے بچائے جو کہ آخرت میں اسے نقصان دے خواہ وہ نقصان دینے والا برا عقیدہ ہو یا بری عادت یا برا عمل۔ اور آخرت کے نقصانات کی معرفت اعتقادات و اخلاق و اعمال سے اس اصل محکم لازم الاتباع کے بغیر متصور نہیں۔

تقویٰ کے تین مراتب

یہاں جاننا چاہئے کہ شرع میں تقویٰ کے تین مرتبے مقرر ہیں پہلا اپنے آپ کو ہمیشہ کے عذاب سے محفوظ رکھنا ہے۔ اور یہ تقویٰ کے مرتبوں میں سے ادنیٰ مرتبہ ہے جو کہ اپنے نفس کو انواع شرک سے دور رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور آیت وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى میں تقویٰ اسی معنی میں ہے۔

دوسرا مرتبہ اپنے آپ کو گناہوں سے دور رکھنا ہے۔ اور آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ آمَنُوْا وَاتَّقَوْا میں تقویٰ اسی معنی میں ہے۔ اور اہل شرع کی اصطلاح میں اسی مرتبے کو تقویٰ کہتے ہیں تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو شبہات سے بھی بچائے اور ان بعض مباح چیزوں سے بھی پرہیز کرے جو کہ گناہ کے ارتکاب تک کھینچ لے جائیں۔ اور اپنے باطن کو غیر حق کی طرف مائل ہونے سے باز رکھے۔ اور کلی طور پر اپنے تمام اعضاء و جوارح سمیت اپنے خالق کے حضور متوجہ رکھے۔ اور اس مرتبہ کو تقویٰ حقیقی اور مرتبہ ولایت کا نام دیتے ہیں۔ اور آیت اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ میں اسی مرتبہ کی طرف اشارہ ہے۔

احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ و تابعین کے حوالے سے متقین کی کچھ علامات اور شرائط

اب ہم متقیوں کی کچھ علامات و شرائط بیان کرتے ہیں جو کہ احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ و تابعین میں وارد ہوئیں تاکہ متقی اور تقویٰ کا معنی ذہن میں جگہ پکڑے ابن ابی حاتم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں کو قیامت کے دن ایک کھلے میدان میں روکیں گے پھر ایک ندا دینے والا آواز دے گا کہ متقی کہاں ہیں؟ یہ آواز سنتے ہی متقی پروردگار کے سایہ میں کھڑے ہوں گے۔ اور تجلی الٰہی کے مقام سے اس طرح متصل ہوں گے کہ اس تجلی کی شان ایک لحہ کیلئے بھی ان سے نہیں چھپے گی۔ لوگوں نے پوچھا کہ متقی کون سی جماعت ہے؟ تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ ایسے لوگ ہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو شرک کی انواع اور بت پرستی سے بچایا اور خالص اللہ تعالیٰ کیلئے عبادتیں کیں۔

امام احمد، ترمذی اور دوسرے معتبر محدثین نے عطیہ سعدی سے جو کہ صحابی ہیں روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ بندہ اس درجہ تک نہیں پہنچتا کہ متقیوں میں سے شمار ہو یہاں تک کہ ان چیزوں کو چھوڑ دے جن میں کوئی خطرہ شرعی نہیں صرف اس ڈر سے کہ کہیں حرام میں پڑ جائے۔ اور ایک دن ایک شخص نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے تقویٰ کا معنی پوچھا آپ نے فرمایا کبھی کانٹوں کی راہ چلے ہو؟ اس نے عرض کی ہاں فرمایا پھر تم نے کیا کام کیا؟ عرض کی کہ جہاں کانٹا دیکھتا تھا وہاں سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا

تھا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہی تقویٰ کی حقیقت ہے جب مقدمات دین میں اس قسم کی احتیاط سے کام لے گا تو تو متقی ہو جائے گا اس حکایت کو ابن ابی الدنیا نے کتاب التقویٰ میں روایت فرمایا۔ نیز اسی کتاب میں حضرت حسن بصری سے لائے ہیں کہ تقویٰ ہمیشہ متقین کے ساتھ رہتا ہے یہاں تک کہ انہوں نے حرام کے ڈر سے بہت سا حلال بھی چھوڑ دیا۔

نیز عبداللہ بن مبارک سے روایت کی گئی کہ اگر ایک شخص سو گناہ سے پرہیز کرے۔ اور ایک گناہ سے پرہیز نہ کرے تو وہ متقیوں میں سے نہ ہوگا۔ اور عون بن عبداللہ سے لائے ہیں کہ پورا تقویٰ یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ تقویٰ کی شرطیں جاننے کا متلاشی رہے۔ اور اپنی دانست پر اکتفا نہ کرے جس طرح صحت کی حفاظت کرنے والا۔ اور بیماری سے خوف کرنے والا ہمیشہ بیماری کے اسباب کی معرفت کا متلاشی رہتا ہے۔ اور اپنی دانست پر اکتفا نہیں کرتا۔

نیز امام مالک سے روایت کی کہ وہب بن کیسان کہتے تھے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو بطور نصیحت یہ عبارت لکھی ہے اما بعد کہ اہل تقویٰ کی کچھ علامات ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے آپ سے انہیں پہچانتے ہیں۔ بلا پر صبر، قضا پر راضی رہنا، نعمتوں کا شکر ادا کرنا اور قرآن پاک کے حکم کے سامنے عاجزی کرنا۔ نیز ابن المبارک سے روایت ہے کہ حضرت داؤد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے فرمایا کہ آدمی کے تقویٰ پر تین علامات سے استدلال کیا جا سکتا ہے اول اس کا خدا تعالیٰ پر ہر حالت میں حسن توکل میں جو اسے پیش آئے۔ دوسرے اسے جو کچھ عطا فرمایا اس پر اچھی طرح راضی ہونا، تیسرے جو اسے نہیں ملا اس میں اچھا زہد۔ نیز حضرت ابو سعید مقبری سے روایت کی گئی کہ ایک شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا اے لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والے! مجھے اس بات کا نشان دیں کہ متقی کس طرح ہو سکتے ہیں؟ فرمایا: یہ کام بہت آسان ہے۔ اپنے پورے دل سے خدا تعالیٰ کی محبت بجالا اور اپنی طاقت و استطاعت کے مطابق اس کیلئے عمل کر اور اس اپنی جنس پر اس طرح رحمت کر۔ جیسا کہ خود اپنی جان پر رحمت کرتا ہے اس نے کہا کہ میری جنس کیا ہے؟ فرمایا تمام اولاد آدم اور جو سلوک تو نہ چاہے کہ

تیرے ساتھ کریں تو کسی کے ساتھ وہ سلوک نہ کر۔ اگر تو یہ کام کرے گا تو تقویٰ کا حق ادا کرے گا۔

اور سہم بن منجاب سے لائے کہ کمال تقویٰ یہ ہے کہ تیری زبان ہمیشہ ذکر خدا سے تر ہو۔ اور عون بن عبداللہ سے لائے کہ تقویٰ کی ابتداء حسن نیت ہے۔ اور تقویٰ کی انتہا توفیق' اور آدمی کو اس ابتداء وانتہاء کے درمیان کئی مہلک چیزیں اور شبہات پیش آتے ہیں۔ اور ایک طرف سے نفس اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور شیطان جو کہ مکار دشمن ہے ایک آن بھی غافل نہیں ہوتا ہے۔

اور محمد بن یوسف فریابی سے لائے کہ میں نے ایک دن سفیان ثوری سے کہا: کہ آپ کے نام لوگوں میں اس قدر مشہور ہے کہ ہر مقدمہ میں سفیان ثوری' سفیان ثوری کہتے ہیں۔ میں نے آپ کو دیکھا ہے کہ آپ رات نیند میں گزارتے ہیں۔ فرمایا: خاموش رہ' اس امر کا مدار تقویٰ پر ہے۔ نیز روایت کی گئی کہ حکمائے زمانہ میں سے ایک شخص عبدالملک بن مروان کے پاس آیا۔ عبدالملک نے اس سے پوچھا کہ متقی کی تعریف کیا ہے؟ حکیم نے کہا کہ متقی وہ آدمی ہے جس نے خدا کو خلق پر اور آخرت کو دنیا پر اختیار کر کے اپنے مطلب وطمع سے ہاتھ دھو لئے ہوں۔ اور چشم دل سے روح کے بلند مراتب پر نظر کر کے ان مرتبوں کی طرف متوجہ ہوا اور لوگ سوئے ہوتے ہیں۔ اور وہ ترقی کے غم میں بیدار ہوتا ہے اس کی شفا قرآن' اس کی دوا حکمت کی بات اور دنیا کی نصیحت کو اس کے عوض میں پسند نہیں کرتا اور اس کے سوا کسی لذت کو نہیں جانتا حاضرین مجلس نے جو کہ زیادہ تر اکابر تابعین تھے ان کلمات کو بہت پسند کیا۔

نیز قتادہ سے لائے کہ جب حق تعالیٰ نے بہشت کو پیدا فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ کچھ کہہ بہشت نے کہا طُوبٰی لِلْمُتَّقِیْنَ یعنی متقین کیلئے خوشخبری ہے۔

اور مالک بن دینار سے لائے کہ ساری قیامت متقیوں کی شادی ہے۔ نیز محمد ابن یزید رحبی سے لائے کہ میں نے ایک دن ابودرداء رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ انصار میں سے کوئی ایسا نہیں جو شعر نہ کہے آپ کو کیا ہے کہ آپ شعر نہیں کہتے؟ ابودرداء نے فرمایا کہ میں

بھی شعر کہتا ہوں۔ لیکن وہ اس قابل نہیں کہ شاعروں کی مجلس میں پڑھے جائیں میں نے عرض کی کچھ مجھے سنائیں آپ نے یہ دو بیت پڑھے:

یرید المرء ان یعطی مناہ
ویابی اللّٰہ الا ما ارادا
یقول المرء فائدتی وذخری
وتقوی اللّٰہ افضل ما استفادا

آدمی چاہتا ہے کہ اسے اس کی خواہش عطا کی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ انکار فرماتا ہے مگر جو ارادہ فرمائے آدمی کہتا ہے میرا فائدہ اور ذخیرہ ہو اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ بہترین سے ہے جو اس نے حاصل کی۔

اور ابن ابی حاتم نے معاذ بن جبل سے روایت کی کہ بہشت کے کاروبار کا مدار چار گروہوں پر ہے۔ پہلے متقی اس کے بعد شکر گزار۔ اس کے بعد ڈرنے والے اس کے بعد اصحاب یمین اور ابن ابی شیبہ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں میمون بن مہران سے روایت کی ہے کہ کوئی شخص متقیوں کے درجہ کو نہیں پہنچتا یہاں تک کہ وہ ہر روز اپنے نفس کے ساتھ شدید محاسبہ کرے جس طرح کہ اپنے شریک کے ساتھ کرتا ہے۔ تا کہ اسے پتہ چلے کہ میرا کھانا کہاں سے ہے میری پوشاک کہاں سے ہے۔ اور میرا پینا کہاں سے ہے حلال سے یا حرام سے۔

مفسرین کا اشکال اور اس کا جواب

یہاں مفسرین کو ایک اشکال ہے جو یہاں ذکر کرتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں کہ ہدایت تو گمراہوں کے مناسب ہے۔ پس ظاہر تو یوں تھا کہ ہدی اللضالین فرمایا جاتا کہ متقین کو تو علامات اسلام اور شرائط ایمان کا اچھی طرح سے علم ہے اور سالہا سال بلکہ ساری عمریں اسی راہ میں چلے ہیں۔ اور اس راہ کے نشیب و فراز طے کر چکے تو انہیں ہدایت کا کیا معنی کہ تحصیل حاصل ہے۔ اور وہ عقلمندوں کے نزدیک بالاتفاق سے باطل ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کا معنی یہ نہیں کہ یہ کتاب انہیں مرتبہ تقویٰ پر پہنچنے کے بعد ہدایت

دیتی ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی متقی ہدایت قرآنی کے بغیر متقی نہ ہوا اور اس کتاب کی دلالت کے بغیر اس نے اس راہ کو نہیں پایا۔ جس طرح کہ کہتے ہیں کہ یہ دایہ اس جوان کو دودھ دینے والی ہے۔ حالانکہ جوانی کے وقت دودھ دینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ دودھ دینا تو حالت طفلی میں ہے نہ کہ جوانی کی حالت میں لیکن چونکہ جوانی اسے دودھ دینے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ جوان کو دودھ دینے والی ہے۔ اور صاحب کشاف نے اس معنی کی دوسری طریقے سے تقریر کی ہے۔ اور کہا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ من قتل قتيلا فله سلبه کے قبیلے سے ہے اس طرح کہ یہ کتاب ان گمراہوں کیلئے ہدایت ہے کہ آخرکار وہ درجہ تقویٰ تک پہنچ جائیں گے۔

اور بیضاوی نے کہا کہ اگرچہ قرآن پاک کی ہدایت ہر مسلم و کافر کیلئے عام ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے هُدًى لِّلنَّاسِ مگر قرآن پاک کی ہدایت سے نفع پانا صرف متقی لوگوں کا حصہ ہے۔ اور بس اور امام رازی نے فرمایا ہے کہ متقیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں حق کو پہچاننے کی نیت نے بغیر تعصب اور قیل وقال کے گھر کرلیا۔ اور ان کے عقل وفہم اپنے آباؤ اسلاف کی تقلید کے زنگ سے صاف ہوئے۔ پس یہی وہ جماعت ہے جو کہ قرآن پاک کی ہدایت سے راہ پاتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جن کی عقلیں آفت رسیدہ ہوئیں اور ان کی دانش کا آئینہ زنگ آلود ہوا۔ اور اس معنے کو انہوں نے اچھی غذا سے تشبیہ دی ہے جو کہ صحت کی حفاظت کا سبب ہوتی ہے مگر اصل صحت کے حاصل ہونے کی شرط کے ساتھ ورنہ جو بدن فاسد اخلاط سے پر ہو اس میں اچھی غذا مرض کو بڑھانے کا سبب ہوتی ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی اس تحقیق کا اشارہ ہے اس آیت میں وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا اور اس آیت میں يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَّمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

آدمیوں کے سات گروہوں کا بیان

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لوگ اپنے کام کے انجام کے اعتبار سے سات گروہ ہیں۔ کیونکہ نص قرآنی کے مطابق آدمی یا بدبخت ہے یا نیک بخت۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ اور اصطلاح قرآن میں اشقیاء کو اصحاب الشمال اور اصحاب مشئمة کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہ دو گروہ ہیں۔ پہلا گروہ مردود ہے کہ ان کے حق میں فرمایا وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ (ہم نے جہنم کیلئے بہت سے جن اور انسان پیدا کئے ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے سنتے نہیں۔ وہ لوگ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ ہیں۔ وہ لوگ وہی غافل ہیں) اور یہ لوگ درحقیقت انسانیت سے خارج ہیں گو انسانی صورت میں ہوں بیت۔

این کہ می بینی خلاف آدم اند

نیستند آدم غلاف آدم اند

یہ جو تو دیکھتا ہے آدم کے خلاف ہیں آدم نہیں ہیں آدم کا غلاف ہیں۔ کیونکہ اصل فطرت اور پیدائشی ظلمت کی وجہ سے نور الٰہی کے قابل نہیں ہیں ان کی پیدائش صرف دوزخ کی آگ کو پر کرنے کیلئے ہے کہ ولاء خلقتهم للنار ولا ابالی انہیں میں نے آگ کیلئے پیدا فرمایا۔ اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

منافقین

دوسرا گروہ منافقوں کا کہ اصل میں نور الٰہی قبول کرنے کی استعداد رکھتے تھے لیکن نالائقیاں کرنے، گناہ اپنانے، چار پایوں، درندوں جیسے اعمال کرنے اور شیطانی مکروفریب کے اثر کرنے سے تاریک تصورات اور ظلمانی طاقتوں نے ان کے نفسوں میں رسوخ پیدا کیا۔ اور رفتہ رفتہ ان کے دلوں پر زنگ جم گیا اس گروہ کی حالت فریق اول سے بدتر ہے۔ اس لئے کہ ان کی استعداد کا سکہ ان کے حال کے منافی واقع ہوا اسی لئے ان کے حق میں وارد ہے کہ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ بے شک منافق آگ کے سب سے نچلے درجہ میں ہیں۔

سعید

اور سعید یعنی نیک بخت کی شرع میں دو قسمیں فرمائی ہیں۔ایک قسم سابقین اور مقربین کی۔اور ایک قسم اصحاب الیمین مقتصدین اور اصحاب المیمنہ کی۔اور اس گروہ کی تین قسمیں رکھی ہیں ایک گروہ فضل وثواب والے ہیں کہ ان کا ایمان اور عمل صالح فضل وثواب الٰہی کی امید کے ساتھ واقع ہوا فَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا اور لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا انہیں کے حال کا بیان ہے۔

اور ایک گروہ عفو والوں کا ہے کہ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ جنہوں نے عمل صالح اور برے عمل کو ملایا۔قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت سے توجہ فرمائے۔اور معافی کے دو طریقے ہیں اول یہ کہ اعتقاد صحیح کی قوت کی بنا پر اور برائیوں کے جوہر قلب میں اثر انداز نہ ہونے کی وجہ سے بغیر توبہ بغیر شفاعت اور بغیر عذاب دیئے اسے معاف فرمادیں۔دوسرا یہ کہ ہر عمل کے مقابلہ میں ان سے توبہ ثابت ہو۔اور اس عمل کی بجائے صحیفہ اعمال میں توبہ درج ہو فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ ان لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔اور ایک گروہ عذاب پانے والوں کا ہے کہ گناہوں کے رسوخ کے مطابق عذاب پائیں گے۔یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام علماء شہداء اور ملائکہ کی شفاعت سے نجات پائیں اور انہیں اہل عدل و اہل عتاب کہتے ہیں۔وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا انہیں لوگوں کے حال کا بیان ہے۔اور مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ بھی ان ہی کا عنوان ہے۔

سابقین مقربین

اور سابقین مقربین کے بھی دو گروہ ہیں کہ شرع کی زبان میں پہلے گروہ کو مجتبیٰ اور دوسرے کو منیب کہتے ہیں چنانچہ آیت اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ میں اسی نام کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔اور اہل سلوک کی اصطلاح میں ان دونوں گروہوں کو محبوبین اور محبین کا نام دیتے ہیں۔اور مجذوبین اور سالکین جانتے ہیں۔پس محبین

وہ ہوتے ہیں کہ پہلے انہوں نے مجاہدہ اور رجوع الی الحق کو سامنے رکھا اس کے بعد معرفت کی راہ ان پر کھول دی گئی اور محبوبین وہ ہیں کہ پہلے انہیں چن کر معرفت کا شناسا بنایا۔ اس کے بعد انہیں مجاہدہ اور انابت کا شوق دل میں پیدا ہوا اور ان دونوں گروہوں کو اہل اللہ کہتے ہیں۔ جس طرح کہ اصحاب الیمین کے تینوں گروہوں کو اہل آخرت کا نام دیتے ہیں۔ اور اشقیا کے دونوں فرقوں کو اہل دنیا۔

جب یہ تفصیل ذہن نشین ہو گئی۔ تو جاننا چاہئے کہ اشقیاء کے فریق اول کیلئے قرآن مجید ہدایت نہیں ہو سکتا کیونکہ ان سے قبولیت ہدایت محال ہے اس سبب سے کہ قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتے بمنزلہ شیاطین اور اسی طرح فریق ثانی بھی کیونکہ ان کی استعداد وجود میں آنے کے بعد زائل ہو گئی۔ اور ان کی معنوی صورت مسخ ہو گئی جس طرح کہ بدبودار کھانے کو درست نہیں کیا جا سکتا۔ پس قرآن مجید کی ہدایت آخری پانچ گروہوں کے ساتھ خاص ہو گی جنہیں متقین کا لفظ شامل ہے۔

اور وہ جو بعض ناواقف گمان کرتے ہیں کہ سابقین اور مقربین میں سے ایک گروہ جو کہ محبوبین ہیں۔ اور کشش الٰہی نے پہلے ہی انہیں شناسائے معرفت کر دیا ہے وہ قرآن پاک کی ہدایت کے محتاج کیونکر ہوں گے۔ یہ باطل ہے۔ کیونکہ محبوب جذب وصول کے بعد بھی کتاب کی ہدایت کا محتاج ہے۔ تا کہ سلوک فی اللہ کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اسی معنی کا اشارہ فرمایا گیا کَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ اور وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ہاں محبوب اور محب کے درمیان فرق یہ ہے کہ محب وصول سے پہلے جذب سے پہلے اور اس کے بعد بھی کتاب کی ہدایت کا محتاج ہوتا ہے۔ تا کہ سلوک الی اللہ اور فی اللہ کرے۔ اور اس تقریر میں اس مقام پر متقی اپنے لغوی معنی کے قریب ہے اس معنی میں کہ متقی وہ ہے جو صحیح استعداد پر باقی ہو۔ اور شرک اور شک کے زنگ استغراق کی ظلمت اور گناہوں کی محبت نے اس کی فطرت کے آئینہ کو خراب نہ کر دیا ہو۔ پس یہ تقویٰ ایمان پر مقدم ہے۔ جس طرح کہ تقویٰ کے دوسرے مرتبے ایمان کے بعد ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ عرف شرع میں تقویٰ جدا جدا معنوں پر واقع ہوتا ہے کبھی بمعنی ایمان آتا

ہے۔ جس طرح اس آیت میں وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ۔ کبھی بمعنی توبہ جیسے اس آیت میں وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا اور کبھی بمعنی اطاعت جیسے کہ اس آیت میں اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ اور کبھی بمعنی ترک گناہ جس طرح اس آیت میں وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور کبھی بمعنی اخلاص جس طرح اس آیت میں فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ

اور تقویٰ کے فضائل میں قرآن پاک میں جو وارد ہے یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اور احادیث میں تقویٰ کے فضائل بے شمار ہیں۔

یکے از لطائف

اور اس مقام کے لطائف میں سے یہ ہے کہ جب ہم اس آیت کو ملاحظہ کرتے ہیں کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور اس کے ساتھ دوسری آیت کو دیکھیں کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ تو صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ناس صرف متقی ہی ہیں۔ اور باقی لوگ الانعام۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال جواب طلب باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام قرآن پاک کو ہدایت کے ساتھ موصوف کرنا کس طرح درست ہوگا۔ حالانکہ قرآن پاک میں مجملات اور متشابہات بھی واقع ہیں کہ ان سے مراد کا تعین عقل کے بغیر ممکن نہیں۔ اور جب عقل دخیل ہوئی تو ہدایت عقل کی شان ہوئی نہ کہ قرآن کی شان اور اسی لئے اسلام کے تمام گروہ خواہ وہ حق پرست ہوں یا باطل پرست قرآن مجید سے ہی دلیل لیتے ہیں۔ نیز حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے صحیح روایت میں وارد ہے کہ آپ جب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو خارجیوں کے ساتھ مناظرہ کرنے کیلئے بھیجتے تو فرماتے سنت کو لازم کرنا کیونکہ قرآن کی کئی وجہیں ہیں۔ نیز بعض اعتقادی مسائل ایسے ہیں کہ ان کے مطابق قرآن کا ہدایت ہونا

دلیل عقل پر موقوف ہے۔ جیسے مباحث ذات وصفات اور اثبات نبوۃ علی الاطلاق۔ پس اس قسم میں قرآن کس طرح ہدایت ہوسکتا ہے؟ ورنہ دور لازم آئے گا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے ہدایت ہونے کا معنی یہ نہیں کہ صرف قرآن سے مخالف کو الزام دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کا معنی دیکھنے والے پر نفس الامری حقیقتوں کا انکشاف ہے۔ اور مجملات اور متشابہات قرآن یا تو محکمات کی طرف رجوع کرنے کے بعد مزید انکشاف کا موجب ہوتے ہیں یا ان مجملات اور متشابہات کے مدلول پر صرف ایمان لانے کی وجہ سے درجہ ایمان کی ترقی کا سبب ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہدایت کی ایک قسم ہے۔ اور ان مسائل میں کہ جن پر قرآن کی قرآنیت موقوف ہے قرآن کی ہدایت تاکید' تقویت اور ان مسائل کے دلائل میں وہم کی مداخلت سے امن کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بھی ہدایت کی ایک عمدہ قسم ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کا ہر جزو ہر متقی کیلئے ہدایت ہوگا تاکہ کوئی محذور لازم آئے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ پورا قرآن پاک جمیع متقی افراد کیلئے ان کے فہم واستنباط کے درجوں میں فرق کے مطابق ہدایت ہے۔

ہدایت کے معنوں میں علماء کا اختلاف

اور علماء کرام کو ہدایت کے معنی میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ہدایت کی حقیقت صرف مطالب کی راہ دکھانا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ مطلب تک پہچانا بھی ضروری ہے۔ اور اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ ہدایت' تعلیم' ارشاد' انذار اور ان کی مثل الفاظ کبھی فاعل کے فعل کے معنی ہیں استعمال ہوتے ہیں اگرچہ اس کا اثر منفعل میں ظاہر نہ ہو۔ اور اسی قبیل سے یہ آیت ہے اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى اور کبھی تاثیر فاعل کے معنی میں جو کہ منفعل کو متاثر کرنے کو شامل ہو استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ هداه الله فاهتدى مثل احيىٰ و امات اور یہ دونوں اس کے حقیقی معنی ہیں بلکہ تفتیش کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں معنوں کا انجام ایک چیز ہے فاعل کی تاثیر کا جب فاعل کی نسبت سے تاثیر منفعل کے بغیر اعتبار کریں گے تو پہلا معنی ہے۔ اور اگر اسی تاثیر کو منفعل میں اعتبار کریں تو دوسرا معنی ہے۔ اور دونوں معنوں میں

صفت خدا بھی ہے۔ اور قرآن پاک' انبیاء علیہم السلام اور دوسرے مرشدوں کی صفت بھی ہے۔ ہاں ہدایت کو پیدا کرنا حضرت حق کے ساتھ خاص ہے۔ لیکن ہدایت پیدا کرنا' ہدایت کا حقیقی معنی نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن سے ہدایت پانے کی علامت یہ ہے۔ اور یہی تقویٰ کی علامت ہے کہ ایک شخص پہلے اپنے اعتقادات کو صحیح کرے۔ پھر اپنے اعضاء کے اعمال کو قرآن پاک کے امر ونہی کے مطابق کرے۔ پھر ردی اخلاق جو کہ روح کو ہلاک کرنے والی بیماریاں ہیں' کو ترک کرے۔ اور اعتقادات کی تصحیح' کمزور شبہات اور وہم کی مداخلتوں سے بچے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لئے متقی وہ ہیں کہ

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ یعنی وہ جماعت جو کہ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ غیب اس چیز کا نام ہے جو کہ حواس ظاہری اور باطنی کے ادراک سے باہر ہو۔ جیسے ذات وصفات پروردگار' فرشتے' قیامت کا دن اور اس دن جس جس چیز کا وعدہ ہے۔ تقدیرات الٰہی اور کتب الٰہیہ پر ایمان لاتے ہیں اس حیثیت سے کہ ان کی نسبت خدا کی طرف ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر اسی حیثیت سے ایمان لاتے ہیں۔

ایمان بالغیب کو متقیوں کی علامات میں اس جہت سے اعتبار کیا گیا ہے کہ حواس ظاہری اور باطنی کے مدرکات میں مکلف کا کوئی اختیار نہیں رہتا وہ ان مدرکات کی تصدیق ضرور کرتا ہے۔ پس وہ تقویٰ کی علامت نہیں ہوسکتی اور اس باب میں قرآن کی ہدایت ان امور کی حقیقتوں اور تفصیلات پر مزید اطلاع کے ساتھ ہے۔ اور عقائد کے اہم مسائل یہی اموز ہیں۔ اور جب قرآن پاک میں وارد تمام حقائق اور تفصیلات کے ساتھ ان امور کی تصدیق کریں تو تقویٰ کا جزو اعظم حاصل ہوگا جو کہ عقیدہ کو صحیح کرنا ہے۔

اگرچہ جو ایمان یہاں مذکور ہے وہ ایمان لغوی ہے۔ بمعنی تصدیق۔ لیکن مفسرین یہاں حقیقت ایمان شرعی کے بیان کا معمول رکھتے ہیں۔ اور معتزلہ' خوارج' زیدیہ اور کرامیہ کے رطب ویابس اقوال نقل کرکے سننے والے کا دماغ پریشان کرتے ہیں۔ صاف بات اس قدر ہے کہ عرف شرع میں ایمان' تصدیق کو کہتے ہیں۔ بمعنی دل میں جگہ دینا اور اس بات کا

یقین کر لینا جس کے متعلق یقین سے معلوم ہو کہ دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں جگہ جگہ ایمان دل کے کام کو کہا گیا۔ کہیں فرمایا ہے وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ اور کہیں فرمایا اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ اور کہیں وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ۔ اور ظاہر ہے کہ دل کا کام بھی تصدیق ہے۔ اور بس۔ نیز ایمان کو عمل صالح کے ساتھ ملایا گیا جیسا کہ اس آیت میں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور گناہوں کے ساتھ بھی ملا کر بیان ہوا۔ جیسا کہ اس آیت میں وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا اور اس آیت میں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا ۔ پس معلوم ہوا کہ نہ تو نیک اعمال کو ایمان میں دخل ہے۔ اور نہ ہی برے اعمال ایمان کو برباد کرتے ہیں۔ اور تصدیق کے بغیر صرف اقرار کی اسی سورت میں مذمت کی گئی ہے اس آیت میں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۔ پس معلوم ہوا کہ صرف اقرار ایمان کی حکایت ہے اگر حکایت محکی عنہ یعنی جس کی حکایت ہے۔ اور وہ یہاں ایمان ہے کے مطابق واقع ہوئی تو درست ورنہ ایک دھوکے اور جھوٹ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور محکی عنہ نہیں ہے مگر تصدیق۔

تحقیق مقام

اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح ہر چیز کے تین قسم کے وجود ہیں۔ وجود عینی، جو ذہنی اور وجود لفظی۔ اسی طرح ایمان کے بھی تین قسم کے وجود ثابت ہیں۔ اور مقرر قاعدہ ہے کہ ہر چیز کا وجود عینی اصل ہے۔ اور باقی وجود اس کے فرع اور تابع ہیں۔ پس ایمان کا وجود عینی ایک نور ہے جو کہ دل میں حاصل ہوتا ہے اس سبب سے کہ اس کے اور حق کے درمیان سے پردہ اٹھا دیا جاتا ہے۔ اور یہ وہی نور ہے جس کی مثال کو اس آیت میں پورے طور پر بیان فرمایا گیا مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ اور اس آیت اللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ میں اس کا سبب بیان فرمایا۔ اور یہ نور دوسرے تمام محسوس انوار کی طرح قوت وضعف، پختہ اور غیر پختہ ہونے کو قبول کرتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا اور دوسری آیتوں میں اس

کے متعلق بہت کچھ ارشاد فرمایا گیا۔ اور اس کے زیادہ ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ جب پردہ اٹھ جاتا ہے۔ تو یہ نور زیادتی قبول کرتا ہے۔ اور ایمان قوت پکڑتا ہے یہاں تک کہ اپنے کمال کی بلندی تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ نور وسیع ہو کر اور پھیل کر تمام قویٰ اور اعضاء کو گھیر لیتا ہے۔ پس پہلے شرح صدر حاصل ہوتی ہے۔ اور حقائق اشیاء پر مطلع ہوتا ہے۔ اور غیوب الغیوب اس کی قوت ادراک پر روشن ہو جاتے ہیں۔ اور ہر چیز کو اس کے مقام پر پہچانتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی صداقت کو ان خبروں میں جو انہوں عطا نے فرمائی ہیں اس نور کے اندازے کے مطابق اجمالا اور تفصیلاً پالیتا ہے۔

پھر شرح صدر کے مطابق اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر امر الٰہی کے مطابق تعمیل کرے۔ اور شرع شریف میں روکے گئے ہر کام سے پرہیز کرے۔ اور اس حالت میں اخلاق فاضلہ کے انوار، اچھی صلاحیتیں اور برکت والے اعمال صالحہ معرفت کے انوار کے ساتھ مل کر ایک جگہ اکٹھے ہو کر بہیمیہ شہویہ طبیعت کی تاریک رات میں عمدہ قسم کا چراغاں روشن کر دیتے ہیں چنانچہ ان ہی معنوں کی طرف قرآن پاک کی آیات میں اشارہ واقع ہوا ایک جگہ فرمایا نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ایک جگہ فرمایا نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

اور ایمان کے وجود ذہنی کے دو مرتبے ہیں اول روشن معرفتوں اور منکشف ہونے والے غیبوں کا پورے طور پر اجمالی ملاحظہ جو کہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا مفاد ہے۔ اور اس ملاحظہ کو تصدیق اجمالی، دل سے تسلیم کرنا اور یقین کرنا کہتے ہیں۔ دوسرا روشن غیبوں اور منکشف حقائق کے افراد میں سے ہر ہر فرد کا تفصیلی ملاحظہ اس رابطہ کی وجہ سے جو درمیان میں قائم ہوتا ہے۔ اور اسے تصدیق تفصیلی کہتے ہیں۔

اور ایمان کا وجود لفظی اصطلاح شرع میں شہادتین کا نام ہے۔ اور بس اور ظاہر ہے کہ ہر چیز کا وجود لفظی اس چیز کی حقیقت کی تحقیق کیے بغیر بالکل فائدہ نہیں دیتا۔ ورنہ پیاسے کو پانی کا نام لینے سے سیرابی ہوتی اور بھوکے کو روٹی کا نام تسلی بخشتا۔ مگر جبکہ عالم بشریت میں مافی الضمیر کی تعبیر نطق اور تلفظ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے کلمہ شہادت کو کسی شخص کے مومن

ہونے کے حکم میں بہت بڑا دخل ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے لڑوں حتیٰ کہ وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہیں تو جب انہوں نے یہ پڑھ لیا تو مجھ سے اپنے خون اور مال بچا لئے مگر اس کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ اور اس تحقیق سے ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کی کیفیت اور اس کے قوی اور ضعیف ہونے کی حقیقت کا پتہ چلا۔ نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ جو حدیث پاک میں وارد ہے کہ بدکاری کے وقت بدکار مومن نہیں ہوتا' حیا ایمان سے ہے تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا پڑوسی اس کی طرف سے تکالیف سے محفوظ نہ ہو۔ یہ سب اپنے وجود عینی میں کمال ایمان پر محمول ہے۔ اور جنہوں نے ایمان کے کم اور زیادہ ہونے کی نفی کی ہے ان کی مراد ایمان کے وجود ذہنی کا پہلا مرتبہ ہے۔ پس کوئی جھگڑا اور اختلاف نہیں ہے۔

بیان اقسام ایمان

ایمان کی دو قسمیں ہیں' اول ایمان تقلیدی' دوسرا ایمان تحقیقی اور تحقیقی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ استدلالی اور کشفی اور ان دو قسموں میں سے ہر ایک یا تو انجام رکھتا ہے کہ اس حد سے آگے نہیں گزرتا یا انجام نہیں رکھتا جو انجام رکھتا ہے اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ اور جس کا انجام نہیں وہ بھی دو قسموں پر ہے یا مشاہدہ ہے جس کا نام عین الیقین ہے یا شہود ذاتی ہے جس کا نام حق الیقین ہے۔ اور یہ دو آخری قسمیں یعنی عین الیقین اور حق الیقین ایمان بالغیب میں داخل نہیں۔

اور قدیم صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس آیت میں ایمان بالغیب کو ایک اور معنی پر محمول فرمایا ہے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں حاکم اور دیگر معتبر محدثین کی روایت کے ساتھ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ حارث بن قیس نے ایک دن آپ سے کہا کہ اے اصحاب رسول علیہ السلام ہم اس پر بہت حسرت و افسوس کرتے ہیں جس سے ہم محروم رہے۔ اور آپ کو یہ نعمت حاصل ہوئی کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم بھی اس چیز پر بہت حسرت و

افسوس کرتے ہیں جو ہم سے فوت ہوئی۔ اور تمہیں حاصل ہوئی کہ تم دیکھے بغیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے خدا کی قسم جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی اس کے نزدیک آپ کی نبوت سورج سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ ایمان تو تمہارا ایمان ہے۔ پھر آپ نے سورۃ بقرہ کی تلاوت شروع کی یہاں تک کہ مفلحون تک پہنچے۔ اور اسی مضمون کو بزار ابویعلی اور حاکم حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک دن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیٹھا تھا کہ آپ نے فرمایا میرے سامنے ذکر کرو کہ ایمان کی قسموں میں سے افضل کن لوگوں کا ایمان ہے۔ عرض کی گئی یارسول اللہ فرشتوں کا ایمان' فرمایا انہیں ایمان سے کون سی چیز مانع ہے؟ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فرشتوں کے مرتبہ کو تم جانتے ہو لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ! پیغمبروں علیہم السلام کا ایمان۔ فرمایا: پیغمبروں کے ایمان سے کیا تعجب کہ حق تعالیٰ نے انہیں اپنی رسالت و نبوت کے ساتھ ممتاز فرمایا ہے لوگوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ ان لوگوں کا ایمان جو کہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حاضر رہے۔ اور دین پر اپنی جانیں قربان کر کے شہادت پائی۔ فرمایا کہ ان کا ایمان کیا تعجب رکھتا ہے؟ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی صحبت پائی اور ان کے عادات خصائل دیکھ کر یقین کامل حاصل کیا ہے۔ لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ! آپ بیان فرمائیں کہ کس گروہ کا ایمان افضل ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا ایمان جو ابھی باپوں کی پشتوں میں ہیں۔ اور میرے بعد آئیں گے۔ اور مجھ پر ایمان لائیں گے۔ انہوں نے مجھے نہ دیکھا' چند سیاہ اوراق ان کی نظر میں آئے۔ اور قوت ایمانی کی بدولت اس تحریر کے مطابق انہوں نے عمل کئے۔ یہ گروہ ایمان میں دوسروں سے افضل ہے۔

اور اسی واقعہ کو طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس طریقہ سے روایت کیا کہ دوران سفر ایک دن حضور علیہ السلام صبح اٹھے اور فرمایا کہ پانی ہے؟ کہ ہم وضو کریں لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ یہاں پانی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کسی کے پاس پینے کا پانی ہے؟ لوگوں نے ایک آبخورہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رکھ دیا۔ حضور علیہ السلام

نے اس آبخورہ میں انگشتان مبارک ڈال دیں اور حضرت بلال سے فرمایا کہ لشکر میں اعلان کردو تاکہ لوگ آئیں اور وضو کریں۔ لوگ آ رہے تھے۔ اور حضور علیہ السلام کی انگشتان مبارک کے درمیان سے جاری پانی سے وضو کر رہے تھے۔ اور پانی مبارک انگلیوں کے درمیان سے فوارے کی طرح جوش مار رہا تھا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ وہ پانی پینے میں مصروف تھے۔ اسے بار بار پی رہے تھے۔ جب تمام لشکر وضو سے فارغ ہو گیا۔ سرکار علیہ السلام اٹھے اور نماز صبح ادا فرمائی۔ نماز کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا اے لوگو! بتاؤ کہ کس گروہ کا ایمان زیادہ تعجب کا باعث ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ فرشتوں کا ایمان۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو تو فرشتے پہنچاتے ہیں خود اس پر ایمان کیوں نہ لائیں گے۔ ان کا ایمان لانا کیا تعجب کی بات ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ پیغمبروں علیہم السلام کا ایمان۔ فرمایا پیغمبروں پر آسمان سے وحی اترتی ہے۔ پیغمبر ایمان کیوں نہیں لائیں گے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ آپ کے یاروں کا ایمان۔ فرمایا میرے دوستوں کو کیا ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ حالانکہ میں ان کے درمیان موجود ہوں۔ ہر لحہ اور لحظہ دیکھتے ہیں جو کچھ کہ دیکھتے ہیں۔ ایمان ان لوگوں کا عجیب ہوگا جو کہ میرے بعد آئیں گے۔ اور بے دیکھے مجھ پر ایمان لائیں گے۔ اور میری تصدیق کریں گے۔ وہی لوگ میرے (دینی) بھائی اور تم میرے دوست ہو۔

(اقول و باللہ التوفیق۔ یہ برنائے شفقت اور کہتر نوازی کے طور پر فرمایا۔ یہاں سے خوارج زمانہ کے مطابق حضور علیہ السلام کو اپنا بھائی کہنا ثابت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بادنی تامل معلوم ہوتا ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

ابوداؤد اور طیالسی نے نافع سے روایت کی کہ ایک شخص عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا اے ابوعبدالرحمٰن! آپ نے اپنی آنکھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا؟ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہاں اس شخص نے کہا کہ آپ اپنی ان زبانوں سے حضور علیہ السلام کے ساتھ ہمکلام بھی ہوئے؟ فرمایا ہاں پھر کہا کہ آپ نے اپنے ان ہاتھوں کے ساتھ بیعت بھی کی؟ فرمایا: ہاں۔ وہ شخص وجد میں آ گیا۔ اور کہنے لگا آپ کتنی

عجیب خوشی کی حالت رکھتے ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا تیرے سامنے ایک بات کہتا ہوں۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا کہ فرمارہے تھے کہ وہ شخص خوش حال ہے جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا اور خوش حال وہ ہے۔ پھر خوشحال وہ ہے کہ جو بغیر دیکھے مجھ پر ایمان لایا اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک جماعت میرے بعد پیدا ہوگی جو کہ میری محبت میں اس قدر فریفتہ ہوگی کہ اگر ہو سکے تو میرے دیدار کو اپنے اہل وعیال' ساز وسامان اور احوال کے بدلے خرید لیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ایمان بالغیب جس قسم کا بھی ہو اعمال قلبیہ اور بدنیہ اور مال' مرتبہ اور ساز وسامان کو خرچ کرنے کو لازم ہے جو کہ جسمانی لذتیں اور طبعی خواہشات ہیں۔ اسی لئے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ میں متقیوں کے اعمال قلبیہ اور صحت اعتقادات کا نشان دینے کے بعد اب ان کے بدنی اعمال کا پتہ دیا جارہا ہے۔ اور فرمایا

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

اور نماز کو برپا کرتے ہیں یہاں جاننا چاہئے کہ نماز ادا کرنا اور چیز ہے۔ اور نماز برپا کرنا دوسری چیز ہے۔ اور قرآن مجید میں جگہ جگہ مدح وتاکید کے مقام میں نماز گزارنے کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اقامت نماز کو ذکر کیا۔ اور اقامت لغت میں قیام سے لیا گیا یعنی سیدھا کھڑا کرنا اور قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کو سیدھا کھڑا کریں تو اس کے اجزاء میں سے ہر ہر جزو اس کی طبعی وضع کے مطابق مناسب مقام پر بیٹھتا ہے۔ پس اقامت صلوٰۃ کا معنی یہ ہے کہ نماز کو ہر خلل اور کجی سے بچائیں۔ خواہ وہ خلل اور کجی دل کے کام میں ہو یا زبان کے کام میں یا جسم کے اعضاء کے کام میں اور یہ حفاظت خواہ فرائض میں ہو یا شروط میں یا سنتوں میں یا مستحباب میں۔ اسی لئے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اقامت صلوٰۃ رکوع' سجود' تلاوت اور خشوع کو پورا کرنا ہے۔ اور نماز میں ان پر متوجہ رہنا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے فرمایا ہے کہ اقامة صلوة سے مراد نماز' اس کے اوقات' اس کے وضو' اس کے رکوع وسجود کی حفاظت کرنا ہے۔

نماز کے ارکان کے اسرار

اور صوفیا کے نزدیک اقامت صلوٰۃ میں یہ بھی داخل ہے کہ نماز کے ارکان و آداب کی ادائیگی کے وقت ہر ایک کے سرّ کو پائے اور قصد کرے کہ اپنے آپ کو اس سرّ کے ساتھ وابستہ کرے۔ اور نماز کے اسرار سے وابستہ ہونے کے قصد کے ساتھ ان اسرار کو پانا' نماز گزارنے والوں کے مرتبوں اور استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہے۔ جو کچھ ابتدائی آدمی کے حال کے مناسب ہے لکھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نجاست حکمی جو کہ حدث اصغر و اکبر ہے سے پاک ہونا اور نجاست حقیقی جو کہ بول' براز' خون اور پیپ وغیرہ ہے سے پاک ہونا نماز میں اس لئے مقرر کیا گیا ہے۔ تاکہ دنیوی آلائشوں سے پاکیزگی حاصل کرنے پر دلالت کرے۔ جو کہ تمام حارث اور نو پید ہیں۔ اور نجاست سے خالی نہیں ہیں۔ تاکہ حق کی طرف متوجہ ہونے کے وقت اس درگاہ پاک سے کچھ مناسبت حاصل ہو جائے۔ اور اس بارگاہ میں حاضر ہونے کی قابلیت اور جو خدمت سپرد کی گئی ہے اسے بجالانے کی صلاحیت نصیب ہو۔ جیسا کہ پہلے حمام' غسل' عطریات کے استعمال اور کپڑوں کو صاف کئے بغیر بادشاہوں کے دربار میں نہیں جایا جا سکتا اور نہ ہی ان کی خدمت میں کھڑا ہونا ممکن ہے۔ اور ظاہر کا قبلہ کی طرف متوجہ ہونا کہ اس پاک قطعہ کی زمین آدمی کی جسمیت کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ کیونکہ تمام زمین اسی قطعہ سے پھیلائی گئی۔ دلالت کرتا ہے کہ باطن کو بھی بارگاہ خداوندی کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جو کہ آدمی کی روحانیت کے پیدا ہونے کا مقام ہے۔

تکبیر تحریمہ

یعنی اس وقت دونوں ہاتھ اٹھانا اشارہ کرتا ہے کہ میں نے دونوں عالم سے ہاتھ اٹھا لئے اور دربار حق کو ساری کائنات سے بڑا سمجھتا ہوں۔ اور اس اعتقاد کی تائید دعائے استفتاح یعنی ثنا کو زبان پر جاری کرنے سے ہوتی ہے۔ اور کھڑا ہونا اس راہ میں استقامت پر دلالت کرتا ہے۔ اور سورت فاتحہ پڑھنا جس میں ثنائے ربانی ہے جبکہ زبان دل کی ترجمان ہے اس امر پر دلالت ہے کہ میرا دل مکمل طور پر اس کی طرف مائل ہوا اور اس سورۃ

میں خطاب کے الفاظ مثل اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے ساتھ عبادت و استعانت کو خاص کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ پوری توجہ اور میلان کی وجہ سے مجھے مشاہدہ اور خطاب کا مرتبہ حاصل ہوا اور عبادت و استعانت میں کہ یہ دونوں کام بنی آدم کے اوقات کو لازم ہیں غیروں سے میں نے پورے طور پر منہ موڑ لیا۔ اور ہدایت کا سوال اور اہل غضب و ضلالت کی راہ سے فرار اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ میری محبت اور بغض' میلان اور نفرت اس جناب کے تابع ہے۔ پھر رکوع دلالت کرتا ہے کہ مشاہدۂ عظمت کی وجہ سے میری پشت جھک گئی پھر قومہ دلالت کرتا ہے کہ اس انکساری میں میں نے استقامت اختیار کی پھر سجدہ جو کہ انکساری کے بعد کمال عاجزی ہے کمال قرب پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ جو قرب بشر کی ہمت میں ہے اسی قدر ہے کہ اپنے اعضاء میں سب سے بزرگ عضو کو اس قدر پست کر دے کہ اپنی اصل خاک تک پہنچ جائے۔ اور دوسرا سجدہ حصول قرب کی وجہ سے تکبر کو دور کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور بیٹھنا اس بارگاہ عالی سے اعزاز اکرام حاصل ہونے کا اشارہ کرتا ہے کہ سلام قبول ہونے کے بعد بارگاہ میں بیٹھنے کا پروانہ مل گیا۔ اور سلام اس باطنی سفر سے واپسی پر دلالت کرتا ہے۔

نماز تمام بدنی عبادات کی اصل ہے

نیز کہتے ہیں کہ نماز تمام بدنی عبادتوں کی اصل ہے۔ کیونکہ یہ طہارت اور استقبال قبلہ پر۔ نیز ذکر' تسبیح' تہلیل' شہادتین' درود شریف اور دعا پر مشتمل ہے جو کہ زبان کی عبادتوں کی اصل ہیں۔ نیز روزے کے معنی کو شامل ہے کہ نفس کو اس کی خواہشات سے روکنے کا نام ہے۔ بلکہ نماز میں روزے کی نسبت زیادہ پابندیاں ہیں۔ کیونکہ آنکھ کو دوست کی جہت کے سواد یکھنے سے بچانا ہے۔ اور زبان کو اس کے نام یا اس کے کلام پاک کی تلاوت کے غیر سے اور پاؤں کو کسی اور مقصد کیلئے حرکت دینے سے اور ہاتھ کو لینے دینے سے روکنا ہے۔ اور اسی طرح قوت خیالیہ وفکریہ کو اپنے خزائن میں سیر اور دورہ کرنے سے بچانا ہے۔ اور یہ معنی روزہ میں ثابت نہیں۔ نیز نماز حج کے معنوں کو بھی مشتمل ہے اس کی تکبیر تحریمہ احرام کی جگہ' استقبال قبلہ طواف کی جگہ' قیام' وقوف عرفات اور رکوع و سجود اور رکعات کی حرکات دور یہ صفاو

مروہ کے درمیان سعی کی مثل ہیں۔ نیز نماز زکوٰۃ کے معنوں کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ اس میں ستر پوشی اور آلات طہارت کو حاصل کرنے کیلئے مال خرچ کرنا واجب ہے۔ نیز اوقات میں سے ایک وقت کو اپنی منفعتوں سے خالی کر کے حکم خداوندی میں مصروف رکھنا مال میں سے ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی رضا میں خرچ کرنے کو جدا کرنے کی طرح ہے۔

نماز خلائق کی عبادات کی جامع ہے۔

نیز جمادات کی عبادت بیٹھنا ہے۔ اور چرنے والے جانوروں کی عبادت رکوع ہے۔ اور اڑنے والے جانوروں کی عبادت اچھی آواز کے ساتھ ذکر الٰہی ہے۔

مرغانِ چمن بہر صباحے خوانند ترا با صطلاحے

چمن کے جانور ہر صبح ایک اصطلاح کے ساتھ تجھے پکارتے ہیں۔ اور زمین پر رینگنے والے جانوروں کی عبادت سجدہ ہے۔ اور درختوں اور نباتات کی عبادت قیام ہے۔ اور فرشتوں میں سے ہر گروہ کی عبادت انہیں قسموں کی ہے۔ اور کروبیین کی عبادت جنہیں مہیمن بھی کہتے ہیں مشاہدہ میں استغراق ہے۔ اور نماز ان تمام عبادتوں کو شامل ہے اس اعتبار سے کہ یہ عبادت تمام عبادات بدنی اور نفسی کی ہیئت جامعہ ہے۔ اسی لئے تمام عبادتوں سے بالاتر ہے۔ اس لئے حدیث پاک میں وارد ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اعمال میں کون سا عمل افضل ہے۔ تو فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا۔ اسی بنا پر علامات تقویٰ کے بیان میں صرف نماز قائم کرنے پر اکتفا کیا گیا گویا اشارہ فرمایا ہے کہ ان کے تمام اعمال شرع شریف کے موافق ہیں۔ کیونکہ انہوں نے یہ عبادت جو کہ اعمال بدنی کی اصل الاصول ہے اس خوبی کے ساتھ ادا کی۔ اور جب متقین کے اعمال کی خوبی کے بیان سے فارغ ہوئے تو اب ان کے حسن اخلاق کا نشان دیا کہ

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ یعنی ہم نے انہیں جو روزی دی ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔ تاکہ خود کو شہوت وحرص سے پاک کریں۔

مال خرچ کرنے کی سات قسم کی عبادت

شریعت میں مال خرچ کرنا سات قسموں کی عبادت ہے۔ اول فرض زکوٰۃ ادا کرنا کہ

سونے اور چاندی سے نصاب کی حد کو پہنچنے کی شرط کے ساتھ اور ایک سال گزرنے پر اس کا چالیسواں حصہ واجب ہے۔ اور مویشی اور تجارتی اموال اور عشری زمین کی پیداوار سے ابھی اسی طرح واجب ہے۔ جس طرح کہ کتب فقہ میں لکھا ہے دوسری صدقہ فطر کہ عید کا چاند دیکھنے سے دو سیر گندم ہر آدمی پر واجب ہوتی ہے۔ تیسری خیرات جو کہ سائلوں کو دینے' مہمانوں کی ضیافت' کمزوروں' یتیموں اور مقروضوں کی امداد کرنے سے عبارت ہے۔

چوتھی وقف: جیسے مسجد' مدرسے' پل' کنواں اور سرائے بنانا۔ پانچویں مصارف حج خواہ اپنے لئے یا دوسرے کیلئے سامان حج درست کر کے دیا جائے جیسے سواری' سفر خرچ وغیر ذالک' چھٹی مصرف جہاد کہ اس جگہ ایک درم خرچ کرنا ۷۰۰ درم کے برابر ہے۔ جیسا کہ اس سورت کے آخر میں آئے گا انشاء اللہ العزیز۔ ساتویں ادائے نفقات واجبہ وہ اخراجات جو کہ اس کے ذمہ واجب ہیں۔ اور وہ زوجہ' چھوٹی اولاد اور دوسرے محارم اس شرط پر کہ اس میں استطاعت ہو۔ اور وہ رشتے دار محتاج ہوں۔

اور مما کے لفظ میں من تبعیضیہ لانے میں اشارہ فرمایا کہ اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے میں حد سے گزرنا ممنوع ہے۔ اور اسراف کی حد یہ ہے کہ مال کو ایک جہت میں خرچ کرنا دوسری جہت کے حق کو فوت کرنے کا باعث ہو۔ اور رزق کو اپنی طرف نسبت کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہر چیز ہماری ملک اور مال ہے۔ پس اس چیز میں بخل کرنا جو کہ اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور ہمیں عاریت کے طور پر دی گئی ہے بیجا ہے۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اہل سنت و جماعت کے مذہب میں جس طرح حلال' رزق ہے' حرام بھی رزق ہے۔ پس لفظ من کو لانا جو کہ بعضیت پر دلالت کرتا ہے نہایت مناسب ہے۔ کیونکہ رزق کی جو قسم حرام ہے خرچ کرنے کیلئے لائق نہیں۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ خیانت والے مال غنیمت سے صدقہ قبول نہیں کیا جاتا۔ اور فرقہ معتزلہ رزق کو ملک سے عبارت جانتے ہیں۔ اور مال حرام اس جہت سے کہ غاصب کی ملک میں داخل نہیں رزق نہیں کہتے اور یہ صریح غلطی ہے۔ کیونکہ رزق' فائدہ لینے سے عبارت ہے۔ اور فائدہ لینے میں حلال اور حرام برابر ہے۔ اور اگر رزق' ملک سے عبارت ہو تو چاہئے کہ جانوروں کا رزق

نہ ہو۔ کیونکہ ان میں ملک کی اہلیت نہیں۔ حالانکہ قرآن پاک کی آیت وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ جانوروں کیلئے بھی جناب الٰہی سے رزق مقدر ثابت ہے۔

اور جب متقیوں کے وصف میں ایمان بالغیب کا اعتبار فرمایا گیا تو اس بات کا گمان پیدا ہوا کہ لفظ متقی عربیوں اور ان کی مثل ان پڑھوں کے ساتھ خاص ہو جائے۔ اس لئے کہ ذات' صفات' مباحث نبوت اور قیامت صرف ان ہی لوگوں کی نسبت سے غیب تھے جبکہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ان امور کو کمال شہرت' انبیاء علیہم السلام کی خبروں کے تواتر اور کتب الٰہیہ کی وجہ سے اس طرح جانتے تھے گویا کہ انہیں آنکھوں سے دیکھا ہو حتیٰ کہ ان کے چھوٹی عمر کے بچے بھی اس حقیقت کو بیان کرتے تھے تو جو اہل کتاب مشرف باسلام ہوتے تھے انہیں متقین کے زمرہ میں داخل کرنے کیلئے ضروری ہوا کہ ایمان بالغیب پر ایک اور صفت کا عطف کیا جائے۔ تاکہ پتہ چلے کہ متقیوں کی دو قسمیں ہیں اول وہ لوگ جو ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ اور اس کے تقاضا کے مطابق اپنے اعمال اور اخلاق کو درست کرتے ہیں دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو کہ پہلے سے ہی ان امور غیبیہ کی معلومات رکھتے ہیں۔ اور اپنی ان معلومات کی تاکید اور تقویت کیلئے اس کتاب کی پناہ لیتے ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کی طرح دوسرے اور یہی جماعت مراد ہے ان لوگوں سے کہ فرمایا وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ یعنی متقیوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو کہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو کچھ آپ کی طرف وحی متلو کی شکل میں اتارا گیا جس سے مراد کتاب ہے۔ اور وحی غیر متلو کی شکل میں جو کہ سنت ہے کہ انہیں اس ایمان کے سبب سے ان امور غیبیہ کی تفصیل و تحقیق پر مزید اطلاع حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ قرآن کی ہدایت سے مستفید ہوتے ہیں۔

وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی وہ اس پر بھی ایمان لاتے ہیں جو کہ آپ سے پہلے سابقہ انبیاء علیہم السلام پر اتارا۔ اس سے مراد پہلی کتب الٰہیہ ہیں۔ جیسے تورات'' انجیل' زبور اور پہلے انبیاء علیہم السلام کے صحیفے۔ نیز مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے مراد انبیاء سابقین کی سنتیں اور ان کے مواعظ اور ارشادات ہیں۔ پس اس جماعت کو تمام افراد وحی کا احاطہ کرنے کی

بدولت تقویٰ اور ہدایت کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ جس طرح کہ پہلی جماعت کو ابتداء میں حاصل ہوا تھا اور قرآن پاک کی ہدایت ان لوگوں کی نسبت سے یہ ہے کہ ان ہی امور آخرت اور دیگر امور غیبیہ کی تفصیل و تحقیق قرآن پاک سے حاصل ہوئی۔ اسی لئے ان کے دیگر ساتھی اگرچہ آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر پورا یقین نہیں رکھتے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ یعنی وہی آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کا یقین کامل اس کی تفصیلات پر اطلاع اور شبہات کے رفع کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور یہ معنی ان کے علاوہ اہل کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ یہاں جاننا چاہئے کہ جس طرح ہر مکلف پر قرآن پاک پر ایمان لانا فرض ہے۔ اسی طرح پہلی کتابوں پر ایمان لانا بھی فرض ہے ہاں ان کتابوں کے بعض احکام جو کہ منسوخ ہو چکے ہیں ہر عمل درست نہیں۔ جس طرح بیت المقدس کے قبلہ ہونے پر ایمان فرض ہے۔ لیکن نماز میں اس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں کہ منسوخ ہو گیا ہے خلاصہ الکلام یہ کہ دونوں گروہ جو اس کتاب سے ہدایت پا گئے اگرچہ پہلی کتب الہیہ میں سے ہر کتاب کی ہدایت پر انہیں اطلاع نہ ہو لیکن

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى یعنی وہ لوگ عظیم ہدایت پر ہیں مِنْ رَّبِّهِمْ اپنے پروردگار سے۔ اس لئے کہ پہلا گروہ اگر درجہ دار پہلی کتابوں کی ہدایات پر غالب نہ ہوئے لیکن جب یہ کتاب ان تمام کتابوں کے تمام مضامین کو شامل ہے۔ تو ایک دم ان تمام کتابوں کا نور ان پر جلوہ افروز ہوا اور دوسرے گروہ والوں نے اگرچہ درجہ دار ہدایات سابقہ کے انوار حاصل کئے تھے لیکن یہ امر غیبی جو کہ قرآن مجید کا نزول ہے اپنے انوار و برکات سمیت ان کی نگاہوں سے غائب تھا۔ پس حقیقت میں انہیں بھی ایمان بالغیب وجہ کمال کے ساتھ حاصل نہیں ہوا تھا لہٰذا دونوں گروہ اس قرآن پاک کی بدولت اپنے مطلب کو پہنچے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یہی وہ لوگ ہیں جو مطلب پانے والے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلے گروہ نے ایک دم اس عظیم خزانہ کی طرف راہ پائی اور دوسرے گروہ نے تدریجاً اسے پایا یہاں جاننا چاہئے کہ سورت فاتحہ اپنی ساتوں آیتوں کے ساتھ اور سورت بقرہ کی یہ چار آیات ان تمام ۳۳ آیات میں سے ہیں کہ ان کی برکات مشہور و

معروف ہیں۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے زوائد مسند اور حاکم و بیہقی نے کتاب الدعوات میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا اچانک ایک اعرابی آیا اور اس نے عرض کی کہ میرا ایک بھائی ہے جو کہ شدید درد میں مبتلا ہے فرمایا اسے کیا تکلیف ہے؟ عرض کی اس پر جن کا اثر معلوم ہوتا ہے فرمایا اسے ہمارے پاس لاؤ اعرابی اپنے بھائی کو لے آیا اور اسے حضور علیہ السلام کے سامنے بٹھا دیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ان آیتوں کے ساتھ دم فرمایا وہ فی الفور ٹھیک ہو گیا۔ اور اس طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا گویا اسے کبھی تکلیف ہوئی ہی نہیں۔

سورۃ فاتحہ' سورت بقرہ کی پہلی چار آیتیں۔ دو آیت الٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ' آیت الکرسی' تین آیات سورۃ بقرہ کے آخر سے' سورہ آل عمران کی ایک آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آیت ۱۸)' سورۂ اعراف سے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ (آیت ۵۴) سورۃ مومنون سے فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (آیت ۱۱۶)' سورۃ جن سے وَاَنَّهٗ تَعَالٰى جَدُّ رَبِّنَا (آیت ۳)' سورۃ صافات کی پہلی دس آیات' سورت حشر کی آخری تین آیات'

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ

سورت بقرہ کی آیات کی تلاوت کے فوائد

دارمی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جس نے رات میں سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیات تلاوت کیں اس گھر میں اس رات صبح تک شیطان کا دخل نہیں ہوتا اور شعب الایمان میں بیہقی کی بعض روایتوں میں اور سعید بن منصور نے اپنی مسند میں اور دارمی نے مغیرہ بن شعبہ سے جو کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دوستوں میں سے ہیں یہ روایت وارد کی ہے کہ جو سورت بقرہ کی دس آیات سوتے وقت پڑھے قرآن مجید نہیں بھولے گا۔ چار پہلی آیات' آیت الکرسی اور اس کے بعد والی دو آیات اور تین آخری آیات جن کی ابتداء لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ سے ہے۔

اور طبرانی اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ فرما رہے تھے کہ جب تم میں سے کوئی فوت

ہو جائے تو اسے گھر میں سنبھالے نہ رکھو بلکہ اسے قبر میں جلد پہنچاؤ اور چاہئے کہ قبر میں میت کے سر کے قریب کھڑے ہو کر سورۃ بقر کی ابتداء کی تلاوت کرو۔ اور پاؤں کی طرف سورہ بقرہ کا اخیر پڑھو اور ابن النجار نے اپنی تاریخ میں محمد بن سیرین سے روایت کی کہ ایک دفعہ ہم نے نہر تستر کے کنارے خیمہ لگایا لوگوں نے آ کر کہا کہ یہ جگہ خطرناک ہے جس قافلہ نے بھی یہاں آ کر ڈیرا لگایا اس کے سامان کو چوروں نے لوٹ لیا ہے میرے ساتھی یہ سنتے ہی کوچ کر کے شہر میں آ گئے اور میں ایک حدیث پاک کی وجہ سے جو میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنی تھی اسی جگہ ٹھہرا رہا اور حرکت نہیں کی۔ اور وہ حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص رات کو ۳۳ آیات پڑھے اسے اس رات درندہ یا چور تکلیف نہیں دے گا۔ لیکن چور گھر کا نہ ہو۔ اور وہ اپنی جان اہل اور مال کے ساتھ صبح تک محفوظ رہے گا۔ جب رات ہوئی میں چوروں کے ڈر سے نہ سو سکا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ ایک کثیر جماعت نے ننگی تلواروں کے ساتھ مجھ پر تیس سے زیادہ مرتبہ حملہ کیا لیکن میرے نزدیک نہیں آ سکے جب صبح ہوئی۔ اور میں نے کوچ کیا تو راستہ میں ایک بوڑھا ملا اور اس نے کہا تو انسانوں کی جنس سے ہے یا جنوں سے۔ میں نے کہا میں انسان ہوں اس نے کہا رات تیرا کیا حال تھا کہ ہم ستر سے زیادہ آدمیوں نے تجھ پر حملہ کیا لیکن تیرے اور ہمارے درمیان ایک آہنی قلعہ پیدا ہو جاتا تھا میں نے اس بوڑھے کے سامنے حدیث پاک کا واقعہ بیان کیا اس نے کہا کہ وہ ۳۳ آیات کونسی ہے میں نے کہا چار آیات سورت بقرہ کے اول سے مفلحون تک اور تین آیات آیت الکرسی سے خالدون تک۔ تین آیات آخر بقر وللّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ سے لے کر آخر تک تین آیات اعراف اِنَّ رَبَّكُمْ (آیت ۵۴) سے مُحْسِنِيْنَ تک۔ اور دو آیتیں بنی اسرائیل قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰن سے سورت کے آخر تک اور دس آیات صافات کی ابتداء سے لازب تک۔ دو آیتیں سورہ رحمٰن سے يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ سے تَنْتَصِرَانِ تک اور حشر کے آخر لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ سے لے کر سورت کے آخر تک اور دو آیتیں سورہ جن سے قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهٗ تَعَالٰى جَدُّ رَبِّنَا سے شَطَطًا تک۔

اور جب آدمیوں کے پانچ گروہوں جن کو لفظ متقی شامل ہے۔اور وہ قرآن کی ہدایت سے نفع پاتے ہیں کے حال کو بیان کرنے سے فراغت ہوئی تو اب دو اور فرقوں کا بیان فرمایا جو کہ بدبخت ہیں گویا اس ارشاد میں جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے تسلی ہے کہ ان دو فرقوں کا قرآن پاک سے نفع نہ پانا اس وجہ سے نہیں کہ قرآن پاک کی ہدایت میں کوئی کمی ہے۔اور نہ ہی اس وجہ سے کہ آپ کے ڈرانے اور تبلیغ میں کوئی نقص ہے۔ بلکہ ان کی استعداد کے باطل ہونے اور ان کی فطرت کے خراب ہونے کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

یعنی تحقیق وہ لوگ جو کہ کافر ہو کر مرے۔اس لئے کہ جو عمر کے آخر میں ایمان لایا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر نہیں ہے۔اسی لئے شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ کسی کافر کو کافر نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ اس کا خاتمہ کفر پر نہ ہو۔اور اشاعرہ کے نزدیک اسے مسئلہ موافات کہتے ہیں۔اور کفر کی حقیقت یہ ہے کہ جو چیزیں بالیقین دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہیں۔ان میں سے کسی چیز کا انکار کرے۔اور انکار کا معنی تسلیم نہ کرنا ہے خواہ اس کی حقیقت کو پہچانے یا نہ پہچانے بلکہ خواہ اس کی حقیقت کا اقرار بھی کرے یا نہ کرے۔پس اگر یہ حالت معاذ اللہ مرتے دم تک باقی رہی تو کفر حقیقی ہوا۔ورنہ کفر کی صورت ہے۔اور درحقیقت کفر نہیں۔کیونکہ اعتبار کسی کے ایمان یا کفر پر خاتمہ کا ہے۔پس جو لوگ اسی مرض میں مر گئے تو انہیں اپنی زندگی کے اوقات میں سے کسی وقت بھی آپ کے دین کو تسلیم کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔اور ان کا کفر اس قدر پکا ہوا کہ آپ کے ڈرانے سے اصلاً باز نہیں آتے یہاں تک کہ

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ یعنی ان پر برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔اس لئے کہ ان کا کفر اس وجہ سے نہیں کہ قرآن کے اعجاز یا آپ کی نبوت میں انہیں کوئی شبہ ہے۔ بلکہ ان کی اس طرف بے التفاتی اور بے توجہی کی وجہ سے ہے یا کمال بغض و عناد کی وجہ سے ہے کہ دیکھی ہوئی شے کو ان دیکھی اور سنی کو ان سنی سمجھتے ہیں۔پس ان کا حال برابر ہے خواہ انہیں دلیل ظاہر ہو یا نہ ہو لَا یُؤْمِنُوْنَ وہ ایمان نہیں

لائیں گے۔ اور سواء علیہم میں علیہم کا لفظ اس لئے زیادہ کیا ہے کہ حضور علیہ السلام کا ڈرانا یا نہ ڈرانا ان کی نسبت سے برابر ہے۔ لیکن حضور علیہ السلام کی نسبت سے برابر نہیں۔ کیونکہ انہیں ڈرانے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراسر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اور ڈرانا چھوڑنے سے وہ اجر و ثواب حاصل نہیں ہوتا۔ پس گویا اس طرح ارشاد ہوا کہ ان پر برابر ہے نہ کہ آپ پر۔ اور اسی وجہ سے اس آیت کے نزول کے بعد بھی حضور علیہ السلام انہیں ڈرانے سے باز نہیں رہے۔ بلکہ زیادہ کوشش فرماتے تھے تا کہ اجر و ثواب زیادہ حاصل کریں۔ اور قرآن پاک کے کمال ہدایت اور پیغمبر علیہ السلام کی پوری کوشش کے باوجود ان کے کفر کے باقی رہنے کا سبب یہ ہے کہ دلائل اگرچہ یقینی اور قطعی ہوں۔ لیکن ان کا فائدہ صرف اسی کو پہنچتا ہے جس کے دل کا دروازہ کھلا ہو۔ اور یہ گروہ

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یعنی ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگائی ہے۔ پس ان سے ممکن نہیں کہ کسی دلیل سے علم حاصل کریں۔ کیونکہ دلیل ان کے دل کے اندر داخل نہیں ہو سکتی اور جب تک کہ دلیل آدمی کے دل میں نہ آئے اس کیلئے ممکن نہیں کہ اس دلیل میں غور کرے۔ اور کوئی نتیجہ نکالے اور قلب لغت میں صنوبری گوشت کا نام ہے۔ جسے سینہ کی بائیں جانب خالی جگہ میں رکھا گیا ہے۔ اور روح حیوانی اسی گوشت میں پیدا ہوتی ہے اور وہی روح حس و حرکت کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ اور اس گوشت سے شرائین کے ذریعے سارے اعضاء میں پہنچتی ہے۔ اور اہل شرع کی اصطلاح میں لطیفہ انسان کا نام ہے کہ انسان کی انسانیت اسی سے ہے۔ اور شریعت کے اوامر و نواہی کی تعمیل اور تکلیفات الٰہیہ کے مطابق عمل کرنا اسی سے ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا ہے: ان فی ذلك لذكرٰی لمن كان له قلب بے شک اس میں البتہ نصیحت ہے اس کیلئے جس کا قلب ہے۔ اور یہ لطیفہ عالم امر سے ہے کہ اس کا وجود مادے پر موقوف نہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے: انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول له كن فیكون اس کا امر یہ ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ فرمائے تو اسے فرماتا ہو۔ پس وہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گوشت صنوبری بلکہ تمام بدن عالم خلق سے ہے کہ اس کا وجود مادے پر موقوف ہے۔ اور کبھی قرآن مجید میں اس لطیفہ کو نفس سے بھی تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ

آیت وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ۔ میں اور کبھی روح سے بھی تعبیر فرمایا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ۔ اور اس مقام پر لفظ قلب سے یہی لطیفہ مراد لیا گیا ہے۔ کیونکہ دلیل سے استدلال کرنا اور مدلول کو نکالنا اسی لطیفہ کا کام ہے کہ اسے مخبر الٰہی اور الہام ربانی کی جگہ بنایا گیا ہے۔

اور جب اس لطیفہ پر مہر لگا دی گئی تو استدلال اور الہام کی راہ اور ذوق وکشف سب کچھ بند ہو گیا۔ اور ان کے حق میں اسی قدر پر اکتفاء نہیں کہ ان کے دلوں پر مہر لگائی بلکہ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ اور ان کے سننے کی قوت پر بھی مہر لگا دی گئی۔ پس وہ دوسروں کا استدلال سن بھی نہیں پاتے تا کہ رفتہ رفتہ اس استدلال کا مضمون پنہاں سوراخوں کے ذریعے ان کے دل تک نہ پہنچے۔ اور اگر یہ ان لوگوں کو کہ جنہوں نے استدلال کی راہ طے کی یا دوسروں کے استدلال سن کر کوئی کمال حاصل کیا دیکھتے ہیں تو اصلاً ان کے کمالات کو نہیں پاتے تا کہ خود بھی ان کمالات کو حاصل کرنے میں مشغول ہوں اور کھلی راہ لے لیں کیونکہ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ یعنی ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے جو بالکل دیکھنے نہیں دیتا۔

چند سوالات اور جوابات

یہاں چند سوال باقی رہ گئے جن کے جواب میں اہل عربیت معروف ہوتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ علی سمعهم کا عطف قلوبهم پر ہے۔ پس مہر کے تحت داخل ہو گا یا جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ تو بصر کے ہمراہ غشاوہ کے حکم میں داخل ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن بعض، بعض کی تفسیر کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن مجید میں سمع کو ختم یعنی مہر کے حکم میں داخل فرمایا ہے۔ نہ کہ حکم غشاوہ میں داخل کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً کہ اس کی سماعت اور قلب پر مہر لگائی اور اس کی بینائی پر پردہ ہے۔ دوسرا سوال اسی جواب کی فرع ہے۔ اور وہ یہ کہ دل اور کان کو مہر کے تحت کیوں داخل فرمایا۔ اور آنکھ کی بینائی کو کس لئے پردہ لٹکا کر چھپایا گیا۔ حالانکہ تینوں پر مہر لگانے سے یکساں غرض حاصل ہوتی تھی۔ اور تینوں پر پردہ ڈالنے سے یہی غرض یکساں پوری ہوتی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دل کا مدرکات کو پانے کا سبب حس سلیم۔ سچی خبر اور

عقل ہے اور کان کا مسموعات کو سننے کا سبب ہوا کی لہر ہے جو کہ آواز کی کیفیت میں ہوتی ہے۔ پس دل اور کان پر مہر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں باہر سے اندر نہ پہنچیں جبکہ آنکھ کے مرئیات کو دیکھنے کا سبب مذہب قوی کے مطابق شعاع کا نکلنا اور اس کا شے مرئی تک پہنچنا۔ پس آنکھ کا پردہ شعاع کے باہر آنے کو مانع ہے جو کہ دیکھنے کا منشا ہے۔ اور عقل والوں کا معمول یہ قاعدہ ہے کہ باہر کی چیزوں کے اندر آنے سے حفاظت کیلئے مہر لگاتے ہیں۔ اور اندر کی چیزوں کے باہر آنے کی حفاظت کیلئے پردہ لٹکاتے ہیں اس قاعدہ معمولہ کے مطابق یہ دونوں تعبیریں مختلف آئیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ سمع کو مفرد اور ابصار کو جمع کیوں لائے؟ حالانکہ اگر دونوں کی جنس کے معنی پر نظر کریں تو کوئی تعدد نہیں ہر جگہ مفرد کافی ہے۔ اور اگر ان دونوں کے افراد پر نظر کریں کہ جمع کے صیغہ کے مضاف ہیں تو دونوں جگہ جمع لانا چاہئے تھی۔ اس اسلوب کو بدلنے میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سننے کی طاقت کی جگہ ایک عصبہ یعنی پٹھا ہے جو کہ کان کے سوراخ کے اندر بچھا ہوا ہے۔ اور قوت بینائی کا محل مختلف طبقات اور متعدد رطوبتیں ہیں۔ جیسا کہ علم تشریح میں وضاحت کی گئی ہے۔ اور ہر طبقہ سے شعاع کا نکلنا اور ہر رطوبت میں صورتوں کا منقش ہونا رونما ہوتا ہے۔ پس ہر طبقہ اور ہر رطوبت اس کام میں دخل کی قوت رکھتی ہے۔ پس اس قوت نے گویا متعدد مقامات پر جگہ پکڑی ہے۔ اس کے مقامات کے متعدد ہونے پر نظر کرتے ہوئے صیغہ جمع لانا مناسب ہے۔ بخلاف قوت شنوائی کے کہ خود بھی ایک ہے۔ اور اس کا محل بھی ایک تو لفظ سے جو تعدد سمجھا جاتا ہے وہ کسی طرح بھی اس کے حال کے مناسب نہیں ہے۔

چوتھا سوال یہ کہ دل اور کان پر مہر کرنے کو جملہ فعلیہ کی صورت میں ذکر فرمایا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ اور ان کی آنکھوں کو ڈھانپنے کا بیان جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا جو کہ ہمیشگی اور ثابت رہنے کا معنی دیتا ہے وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ فرق کی وجہ کیا ہوگی؟ جواب یہ ہے کہ دل اور کان پر مہر کرنا امور خارجہ کے دل اور کان میں داخل ہونے کو مانع ہے۔ اور درحقیقت علت کے پورا ہونے اور اس کی تاثیر کے پورا ہونے

کو منع کرتا ہے۔ جیسا کہ ڈھال جو کہ تیرے کے پہنچنے کو مانع ہے۔ اور علت کے پورا ہونے اور اس کی تاثیر کا مانع علت کے شروع ہونے سے متاخر ہے۔ پس جملہ فعلیہ سے اسے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ جملہ فعلیہ حدث یعنی کسی شے کے پیدا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور آنکھ کا پردہ آنکھ سے جو کہ دیکھنے کا مقام ہے شعاع کو باہر آنے سے مانع ہے۔ اور حقیقت میں علت کے شروع ہونے کو مانع ہے۔ جیسا کہ ہاتھ کا شل ہونا کہ تیر پھینکنے سے روکتا ہے۔ اور جو علت کی ابتداء کو روکنے والا ہو وہ معلول کو اپنے اصلی عدم پر باقی رکھنے کا موجب ہوتا ہے۔ اور اصلی عدم ثابت ہے۔ حادث یعنی نیا پیدا ہونے والا نہیں کہ اس سے جملہ فعلیہ کے ساتھ تعبیر کی جائے بلکہ اس کی تعبیر جملہ اسمیہ کے ساتھ زیادہ بہتر ہے جو کہ ہمیشگی اور ثابت رہنے پر دلالت کرتا ہے۔

پانچواں سوال جو کہ اس جواب پر بطور فرع پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ آیت خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً میں آنکھ کے پردہ کو بھی جملہ فعلیہ کے ساتھ لائے ہیں۔ جیسے کہ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ ۔ پس اگر فرق کی یہ وجہ درست ہے۔ تو اس آیت میں ترک اولیٰ لازم آیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جعل اگرچہ فعل ہے۔ لیکن افعال قلوب کے ساتھ ملحق ہے۔ اور افعال قلوب کی خاصیت ہے کہ جملہ اسمیہ کو دوام وثبات کے معنی پر دلالت کرنے سے بدلتے نہیں۔ اور مبتدا اور خبر کو اپنے دو مفعول بنا لیتے ہیں۔ جیسا کہ علمت زیدا فاضلا میں تصریح کی گئی ہے کہ علمت کی نسبت حادث ہے۔ اور زید کی طرف فضل کی نسبت حادث نہیں۔ پس جعل علی بصرہ غشاوہ میں کہ اس سے آنکھ کے پردے کا بیان متعلق ہے۔ ثبوت و دوام کا معنی ثابت ہے۔ کیونکہ مفعول ثانی کی نسبت مفعول اول کی طرف اسی طریقے سے باقی ہے۔ اگرچہ وہ جعل سے متعلق ہے۔ پس اس آیت میں غشاوہ ابصار کے بیان میں معنی کے اعتبار سے جملہ اسمیہ ہی لائے ہیں۔ اور کان اور دل پر مہر کرنے کے بیان میں جملہ فعلیہ کو اختیار فرمایا۔ اور اسی فرق کو ملحوظ رکھا گیا۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ سمع کو بصر سے پہلے کیوں لایا گیا۔ حالانکہ حکماء کے نزدیک بصر کی حس، سمع کی حس سے افضل ہے۔ اس لئے کہ ابصار سے متعلق نور ہے۔ اور سمع سے متعلق ہوا

اور بصر دور سے دیکھتی ہے۔ اور سمع دور سے نہیں سن سکتی ہے۔ اور صنعت الٰہی کے عجائب بصر کی پیدائش میں پیدائش سمع کی نسبت زیادہ ہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام الٰہی کی سماعت ان کی خواہش اور سوال کے بغیر عطا فرمائی گئی اور جب آنکھ سے دیکھنے کی درخواست کی تو یہ نعمت عطا نہ ہوئی۔ اور آنکھ میں چہرے کا جمال ہے بخلاف کان کے اور جو انکشاف بصر کی وجہ سے ہوتا ہے تمام انکشافات سے قوی اور کامل ہے۔ اسی لئے عرب کی مثالوں میں وارد ہے کہ آنکھ کے بعد کوئی بیان نہیں۔ اور اس کے جواب کا بیان یہ ہے کہ اگرچہ بصر کی فضیلت میں یہ وجوہ ثابت ہیں۔ لیکن یہاں ان وجوہ کی رعایت کرنا مناسب نہیں یہاں تو ان وجوہ کی رعایت کرنا چاہئے جو کہ حق کی پہچان میں ترجیح کا باعث ہوں۔ اسی لئے دل کو دونوں حسوں پر مقدم فرمایا۔ اور سننے کی طاقت کو قرآن پاک کی ہدایت۔ پیغمبر علیہ السلام کے ارشاد اور ان کے ڈرانے سے ڈرنے میں پورا دخل ہے کہ اس قدر قوت بینائی کو دخل نہیں ہے اس مقام پر اسی وجہ کی رعایت بہتر ہے۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ سمع کو نبوت کی شرط کے طور پر لکھا گیا ہے۔ کیونکہ کوئی پیغمبر علیہ السلام بہرہ نہیں ہوا جبکہ بعض پیغمبروں کی بینائی میں فرق تھا۔ جیسے حضرت یعقوب' حضرت شعیب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام۔ نیز قوت سمع دوسروں کی عقلوں کے معارف ونتائج فہم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے برخلاف بصر کے کہ اس کے ساتھ صرف محسوسات کو آشکارا کیا جاسکتا ہے۔ نیز قوت سامعہ کا ادراک چھ طرفوں سے ممکن ہے بخلاف بینائی کی قوت کے ادراک کے کہ صرف سامنے کی جہت سے ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ قرآنی ہدایت اور پیغمبر علیہ السلام کے ڈرانے سے کفر کے فائدہ نہ لینے کے بیان میں کان پر مہر لگانا پردۂ چشم سے پہلے ہے۔ جیسا کہ تفسیر میں اس طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ اور جب یہاں اس شبہ کا گمان تھا کہ کسی کے دل میں یہ گزرے کہ جب کافروں کے دائمی کفر کا خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہو۔ اور ان کے دلوں میں نصیحت کے داخل ہونے کی راہ اس قدر بند کر دی گئی تو یہ کفر میں مجبور ہوں گے۔ اور قیامت کے دن حقیقت کار سے بے خبر رہنے کا معقول عذر ان کے ہاتھ میں ہوگا تو اس گمان کو دور کرنے کیلئے فرمایا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور ان کیلئے بہت بڑا عذاب ہے کیونکہ ان کے دل پر مہر لگانا اور ان کی آنکھوں اور کانوں کو دیکھنے سننے سے باز رکھنا جو کہ نصیحت کا ذریعہ ہیں۔ حضرت حق تعالیٰ کی طرف سے پہلے واقع نہیں ہوا تا کہ عذر کی گنجائش ہو بلکہ ان کی نظر میں تقصیر اور رسل علیہم السلام اور نصیحت کرنے والوں کے ساتھ ان کے عناد اور اس تقصیر و عناد پر ان کے اصرار کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوئی تو ان کی یہ حالت ایک مہلک مرض کی طرح ہے کہ ایک آدمی مہلک زہر کھا کر اپنے آپ کو قتل کرتا ہے۔ کہ یہ صریح علامت اور عتاب کا مقام ہے۔ اور جب بدبختوں کے ایک گروہ کے حال کو بیان کرنے سے فراغت ہوئی تو اب ان میں سے دوسرے فریق کا بیان شروع فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ

لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو کہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ گویا اپنے لئے علم توحید اور علم معاد دونوں کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور یہی دو علم دین کی اصل ہیں۔ پس حقیقت میں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم نہ تو مشرکین میں سے ہیں۔ کیونکہ وہ حق سے حجاب اور پردے میں ہیں۔ اور نہ ہی اہل کتاب میں سے ہیں جو کہ دین اور معاد کے متعلق پردے میں ہیں۔ اور حقیقی کفر حجاب میں ہونا ہے یا تو حق سے۔ جیسا کہ مشرکین کیلئے ہے یا دین سے۔ جیسا کہ اہل کتاب کیلئے۔ اور جو حق سے محجوب ہے وہ دین سے پردے میں ہے۔ کیونکہ دین نہیں ہے مگر حق کی طرف پہنچنا اور جو دین سے محجوب ہے کبھی کبھی حق سے محجوب نہیں ہوتا۔ پس یہ گروہ اپنے لئے دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارے دونوں حجاب اٹھ گئے۔ حالانکہ اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ یعنی یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ حاصل یہ کہ ایمان ان سے سلب کر لیا گیا ہے۔ کسی وقت بھی انہیں نصیب نہیں ہوگا۔ اور شرع میں اس گروہ کو منافق کہتے ہیں۔

نفاق کی چند اقسام

اور نفاق کی چند قسمیں ہیں۔ سب سے اونچی اور بڑی قسم یہ ہے کہ ایمان کا اظہار

کرے۔اور باطن میں صاف منکر ہو۔دوسری قسم یہ کہ ظاہر میں مذبذب اور متردد ہو۔تیسری قسم یہ کہ گناہوں کی کثرت' خطاؤں کے اثر انداز ہونے' حب دنیا کے حد سے زیادہ ہونے اور برے اخلاق کے جمع ہونے کی وجہ سے ان کا ایمان چھپ جائے۔اور بے حد کمزور ہو جائے یہاں تک کہ دنیا کے نقصان کو آخرت کے نقصان پر پسند نہ کر سکیں۔اور آخرت کے نفع کو دنیا کے نفع پر ترجیح نہ دے سکیں۔پس حقیقت میں یہ فرقہ بھی ایمان نہیں رکھتا کیونکہ ایمان سے مقصود دنیا اور نفسانی لذتوں کی پستی سے مرضیات الٰہی اور آخرت کے بلند درجات تک پہنچنے کے لئے بلند ہمت حاصل کرنا ہے۔اور یہ فرقہ اگرچہ ایک قسم کی تصدیق رکھتا ہے مگر بہت کمزور تصدیق جو کہ ہمت کی بلندی میں کوئی اثر نہیں رکھتی اور عقل کا مقرر شدہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز مقصود سے خالی ہے۔تو لغو ہے۔پس ان کی تصدیق محض لغو ہے۔ اس کا ہونا' نہ ہونا برابر ہے۔نفاق کے انہیں تین مرتبوں پر مختلف آیات اور احادیث کو موزوں کیا جاسکتا ہے۔مثلاً اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ تک پہلے اور دوسرے مرتبہ کے حال کا بیان ہے۔اور آیت وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ الخ تیسرے مرتبہ کے حال کا بیان ہے۔اور وہ جو حدیث پاک میں وارد ہے کہ آیة المنافق ثلاث وان صام و صلی وزعم انه مسلم اذا حدث كذب واذا عاهد غدر واذا ائتمن خان ۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ روزہ رکھے' نماز پڑھے اور گمان کرے کہ میں مسلمان ہوں۔جب بات کرے جھوٹ بولے جب معاہدہ کرے تو توڑ دے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔یہ بھی اسی مرتبہ پر محمول ہے۔اور ان کے نفاق کے جو کہ ان کی بے ایمانی کا گواہ ہے کے واضح ترین دلائل میں سے یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر بالفرض خدا و جزا ثابت ہو اور ہم سے ہمارے حال کی تفتیش کریں تو ہمارے لئے یہی ہمارا زبانی ایمان سہارا ہے۔جس طرح دنیا میں ایمان والوں کی نسبت سے اسی سہارے کو پکڑتے ہیں۔اور اپنی جان اور مال کو امان دیتے ہیں اسی طرح آخرت میں اسی قسم کے

ایمان کا سہارا لے کر ہم نجات پائیں گے۔ پس اپنے گمان میں وہ۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی وہ اپنے اس ظاہری ایمان سے اللہ تعالیٰ کو اور صحیح ایمان لانے والوں کو فریب دیتے ہیں وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ یعنی وہ حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے کہ ان کے فریب دینے سے اسے فریب لگ جائے۔ اور ایمان والوں کو بھی حق تعالیٰ پیغمبروں علیہ السلام کی زبان اور قرائن ونشانات کے ذریعے ان کے حال پر مطلع فرمادیتا ہے۔ پس ایمان والے بھی ان سے فریب نہیں کھاتے۔ اگرچہ کلمہ شریف کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے جان اور مال کے درپے نہیں ہوتے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ یعنی وہ شعور نہیں رکھتے کہ اس باطل آرزو اور جھوٹی طمع سے ہم اپنی جان کو فریب دے رہے ہیں۔ اس مریض کی طرح جو کہ مہلک مرض میں مبتلا ہو۔ اور دواؤں کے ناموں کو یاد کر کے زبان سے پڑھتا رہے۔ اور آرزو کرے کہ ان دواؤں کا زبان سے نام لینا اس مرض کو دور کرنے کیلئے کافی وشافی ہوگا کہ یہ صریح اپنی جان کو دھوکا دینا ہے۔ اور یہ فریب کھانا عقل مندوں پر پورے طور پر ظاہر ہونے کے باوجود ان پر ظاہر نہیں ہوتا اس لئے کہ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یعنی ان کے دلوں میں پکی بیماری ہے۔ اور وہ بیماری قوت حکمیہ کا قاصر ہونا ہے جو کہ اپنے آباء واجداد کے دین وآئین کے۔ ساتھ الفت پکڑنے کی وجہ سے ہوا اور شہوت کی خلط کا غلبہ ہے کہ اپنی نفسانی لذتوں اور جسمانی خواہشات کو ضبط نہیں کر سکتے۔ اور یہ کتاب اگرچہ اس قسم کی بیماریوں کی شفا کا باعث ہے۔ لیکن جب وہ رسول علیہ السلام سے۔ ساتھ کمال بغض وعناد اور دلوں میں جہالت کی مرض کے مستحکم ہونے کی وجہ سے اسے نہیں سمجھتے اور غور نہیں کرتے اس سے وہ کیا فائدہ اٹھائیں گے۔ اس دوائی کی طرح کہ جسے استعمال نہ کریں بلکہ اس قسم کی دوا اگر اپنے طریقے کے مطابق استعمال نہ کی جائے تو مرض کی زیادتی کا سبب بنتی ہے۔

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک اور مرض زیادہ کردی کہ

جب اس قرآن مجید کے مضامین کو اپنی وضع اور آئین کے خلاف دیکھا اور اسے نفسانی لذتوں اور جسمانی خواہشوں سے روکنے والا پایا تو ان کی قوت غضبیہ نے جوش کیا۔ اور انکار و مقابلہ کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پیغمبروں علیہم السلام اور واعظوں کو تکلیف دینے کے درپے ہو گئے۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ جب ہم نے اس قرآن میں نظر نہیں کی۔ اور غور و فکر نہیں کیا تو ہم بے ایمانی میں معذور ہیں تو کہنا چاہئے کہ ہدایت کے اس قسم کے سبب میں نظر نہ کرنا عذر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر بالفرض عذر بھی ہو صرف تو اسی قدر عذر ہو گا کہ ایمان نہ لائے لیکن تکذیب انکار اور مقابلہ میں کس طرح عذر ہو سکتا ہے وہ اپنی اس تکذیب اور انکار کی سزا ضرور پائیں گے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ اور انہیں دردناک عذاب ہو گا اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کی بلادلیل تکذیب کی۔ بلکہ اس کی صداقت کے دلائل اور اعجاز کے واضح ہونے کے باوجود انکار سے دست بردار نہیں ہوتے تھے۔ نیز اپنے آپ کو مومن اور متقی ظاہر کرتے تھے۔ حالانکہ ایمان اور تقویٰ کے نام کے سوا جو کہ ان کی زبان پر جاری تھا دل میں اس کا کوئی اثر نہیں رکھتے تھے۔

بقیہ سوالات اور جوابات

یہاں چند سوال باقی رہ گئے جنہیں ہم ان کے جوابوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حق تعالیٰ نے اس سورت کی ابتداء میں خالص ایمان والوں کی شان میں پوری چار آیات نازل فرمائیں اور کھلے کافروں کی شان میں کہ جن کا ظاہر و باطن یکساں کفر کے ساتھ آلودہ تھے پوری دو آیتیں اتاریں۔ اور اس قسم کے چھپے کافروں کے بارے میں جنہیں منافق کہتے ہیں تیرہ آیات اتاریں۔ حالانکہ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کھلے کافر کا کفر جس کا ظاہر و باطن کفر کے ساتھ آلودہ ہے کافر منافق ہے کفر سے زیادہ برا ہے۔ کیونکہ اس کا دل بھی جہالت کی بیماری میں گرفتار ہے۔ اور اس کی زبان بھی عقائد کفر بیان کرنے میں جھوٹ اور انکار سے آلودہ ہے۔ بخلاف کافر منافق کے کہ اس کا دل جہالت کی مرض میں گرفتار ہے مگر اس کی زبان اسلام کے سچے عقائد کے بیان میں سچ کہتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ منافق کی

زبان بھی جھوٹ اور انکار میں پڑی ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ عقائد اسلام میرے دل میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: واللّٰہ یشھد ان المنافقین لکاذبون اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافق البتہ جھوٹے ہیں۔ پس اس کے دل وزبان دونوں گناہگار ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ منافق دھوکہ دینے کا قصد کرتا ہے۔ اور بے پردہ کافر کسی قسم کی تلبیس کا قصد نہیں کرتا۔ نیز کھلا کافر مردوں کی طبیعت پر ہے جو کرتا ہے وہی کہتا ہے۔ اور منافق ناقص عورتوں کی طبیعت پر ہے کہ کرتا کچھ ہے۔ اور کہتا کچھ ہے۔ نیز کافر اگرچہ جھوٹ بولنے والا ہے مگر اپنے گمان میں سچ کہتا ہے۔ اور اپنے نفس کیلئے جھوٹ بالکل پسند نہیں کرتا بلکہ اس سے عار محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے اپنے دل کا عقیدہ کھلے بندوں بیان کرتا ہے۔ اور منافق طبیعت میں اتنا کمینہ ہے کہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے۔ اور اس جھوٹ بولنے کو اپنا کمال سمجھتا ہے۔ نیز منافق اپنے کفر کے ساتھ حضرت حق جل وعلا کا استہزاء اور اسے فریب دینے کا قصد کرتا ہے۔ اور بے پردہ کافر بے پردہ اس قسم کی بے ادبی نہیں رکھتا۔ اس لئے منافق کا کفر زیادہ غلیظ اور اس کا پردہ زیادہ موٹا ہے۔ اور اس کا حال زیادہ مخفی ہے۔ اس لیے اس کی رسوائی کیلئے تیرہ آیات نازل ہوئیں اور اس کا حال بیان کرنے کے بعد اس کیلئے مثال بھی بیان ہوئی۔

تقیہ باز کھلے بندوں انکار کرنے والے سے بدتر ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ جس کے مذہب کی بنیاد تقیہ اور باطن کے ساتھ ظاہر کی مخالفت پر ہو وہ اس کے مذہب سے بدتر ہے جو کہ کھلے بندوں انکار کرتا ہے۔ کیونکہ تقیہ والے کی اندرونی حالت پر اصلاً اعتماد نہیں رہتا۔ اور اس کا اقرار وانکار اگرچہ کبھی سچا بھی ہو جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ زندیق کی توبہ قبول نہیں۔ اور اس کلام کا معنی یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی توبہ پر اعتماد کا تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی توبہ پر اطلاع کا ذریعہ بھی زبانی توبہ ہے۔ اور بس اور چونکہ وہ تقیہ کا قائل ہے۔ اس لئے اس کے زبانی اقرار کا کوئی اعتماد نہیں۔ اور اس کلام کا معنی یہ نہیں کہ اگر تہہ دل اور نیت کی سچائی سے اپنے باطل نظریات سے پھر جائے۔ اور اس کا باطن صاف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردود ومسترد ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ چھپے اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ جبکہ بندے کے دلی احوال کو جانتا ہے۔ اور بندوں کو اظہار زبانی کے وسیلہ کے بغیر مافی الصدور کا علم ممکن نہیں۔

دوسرا سوال اور اس کا جواب

دوسرا سوال یہ ہے کہ لفظ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ سے جو کہ مخادعت سے لیا گیا ہے۔ اور یہ باب مفاعلہ سے ہے جو کہ مشارکت کو چاہتا ہے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ منافق خدا تعالیٰ کو بھی اور ایمان والوں کو بھی فریب دیتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ اور ایمان والے بھی انہیں فریب دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ سے نہ تو فریب دینا متصور ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی اسے فریب دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا علم محیط کہ ہر چھپا اس کے حضور آشکارا ہے فریب دیئے جانے سے مانع ہے۔ اور اس کی حکمت کہ اس کے تمام افعال عیب سے پاک ہیں فریب دینے سے مانع ہے۔ اور مومنین کو اگرچہ فریب کھانا ممکن ہے۔ کیونکہ کمال حلم اور ان کے متعلق اچھا گمان رکھنے کی وجہ سے سختی نہیں کرتے۔ اور ان کے جھوٹ کو سچ سمجھتے ہیں چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ مومن فریب کھانے والا سخی ہے۔ اور منافق دھوکا باز کنجوس ہے۔ لیکن فریب دینا ان سے بھی بعید ہے۔ تو مخادعت کا لفظ استعمال کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ باب مفاعلہ یہاں مشارکت کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ اصل فعل کیلئے ہے۔ جس طرح کہ عاقبت اللص (میں نے چور کو سزا دی) سافرت (میں نے سفر کیا) میں واقع ہے۔ اور بالفرض اگر مشارکت کیلئے بھی ہو تو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے خداع کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے معاملہ نہیں فرماتا مگر اس کے صدق نیت اور بلندی ہمت کے مطابق۔ اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہے کہ اصدقکم رؤیا اصدقکم حدیثا یعنی جو شخص اپنے سخن وکلام میں سچ بولنے کی عادت رکھتا ہے۔ تو خواب میں بھی اسے عالم غیب سے سچی خبر عطا کرتے ہیں۔ اور جو حرف وسخن میں جھوٹ بولنے کی عادت رکھتا ہے۔ تو اس طرف سے بھی اس کے حال کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے۔ تو جس شخص نے اپنے دین میں کسی عقیدہ اور عمل کو پسند کر کے اسے اپنے لئے اختیار کیا۔ اور اس عقیدہ اور عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا قصد کیا پہلے اسے خواہشات میں مصروف کر دیتے ہیں۔

تا کہ اسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ میرا یہی عقیدہ اور عمل میرے اور میرے پروردگار کے درمیان میرا کافی وسیلہ ہے۔ اور جانب غیب سے اس کی دعا کی قبولیت۔ دل میں پے در پے القاء' بدعتوں' گناہوں۔ اور گھٹیا کاموں میں سکون دل کے حصول کے موافق خوابیں دیکھنے' نجاستوں سے ملوث ہونے اور ملعون جانوروں کی صحبت سے ایک قسم کی امداد و اعانت ملتی ہے۔ تا کہ اس عقیدہ وعمل کی خوبی یقین کے ساتھ اس کے دل میں جگہ پکڑے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خداع کا معاملہ یہی ہے۔ پھر ورق الٹنے اور بدن سے روح کے جدا ہونے کے وقت یا کسی پیغمبر علیہ السلام یا مرشد کی قوی ہمت کے تصادم کی وجہ سے وہ سارا لطف وکرم برباد ہو جاتا ہے۔ اور معاملہ دگرگوں ہو جاتا ہے۔

رہی مخادعت مومنین۔ پس منافقین کی طرف سے یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو محبوں اور موافقوں کی صورت میں ظاہر کر کے ایمان والوں کے اقبال کو ضائع کرنے اور ان کے مرتبے کو توڑنے کیلئے کئی حیلے کرتے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں عبداللہ بن ابی آپ کے مقابلہ کیلئے یہودیوں کو ابھارتا اور ورغلا کر دلیر کرتا تھا۔ اور مومنوں کی طرف سے مخادعت یہ ہے کہ ان منافقوں کا حال دیکھنے اور جاننے کے باوجود ان کے درپے نہیں ہوتے تھے تا کہ ظاہر داری سے بھاگ نہ جائے۔ اور اپنی جماعت کی کثرت کا انجام قلت نہ ہو۔ اور ان کے مل جانے سے کافروں کی جماعت زیادہ نہ ہو جائے تو خداع کا معنی دونوں طرف سے ثابت ہو۔

اور بعض محققین نے کہا ہے کہ مخادعت خدا سے مراد اس کے رسول علیہ السلام کی مخادعت ہے۔ کیونکہ اس باب میں کسی شخص کا بھیجا ہوا اس شخص کے حکم میں ہوتا ہے وہ جو معاملہ کرے گا اسی شخص کی طرف لوٹے گا اور کسی شخص کے بھیجے ہوئے کا کہنا ہو بہو اس شخص کے کہنے کی طرح ہے۔ جس طرح آیت مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اور آیت وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى میں اس فعل کو صاف طور پر بیان فرمایا گیا۔ پس ایمان کا اظہار کر کے ان منافقوں کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دینا گویا خدا تعالیٰ کو فریب دینا ہے۔ اور رسول علیہ السلام کا ان منافقوں کے ایسے اسلام کو قبول کرنے'

قتل اور قید سے نجات دینے اور غنیمت و منافع میں انہیں شریک کرنے کا معاملہ کرنا گویا خدا تعالیٰ کا ان کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔ اس طرح کہ تمہارا اسلام مقبول ہوا اور ہماری دست برد سے تم نے نجات پائی۔ خصوصاً اس رسول علیہ السلام کیلئے رسالت کے علاوہ محبوبیت کا مرتبہ بھی ثابت ہے۔ اور محبوبِ خدا کو فریب دینا بمنزلہ اس کے ہے کہ خدا کو فریب دیتے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ بندہ مومن نوافل کی ادائیگی اور طاعتیں کر کے میرے قریب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔ اور جب اسے اپنا محبوب بنالوں تو اس کے کان اور آنکھ بن جاتا ہوں کہ مجھ ہی سے سنتا اور دیکھتا ہے۔ اور میں اس کی زبان ہو جاتا ہوں کہ مجھ سے سخن کرتا ہے۔ اس کا ہاتھ میں بن جاتا ہوں کہ میرے ساتھ ہی وہ کام کرتا ہے۔ اس کے پاؤں بن جاتا ہوں کہ میرے ساتھ چلتا ہے۔

اور جسے قرب خداوندی کی یہ حالت نصیب ہو اسے فریب دینے کا قصد بلاشبہ خدا تعالیٰ کو فریب دینے کا قصد ہوگا۔

تیسرا سوال اور جواب

تیسرا سوال یہ ہے کہ منافقوں کے حال کا بیان کافروں کے حال کے بیان پر عطف کے ساتھ لایا گیا۔ جبکہ کافروں کے حال کا بیان ایمان والوں سے جدا کر کے نئے سرے سے بیان کیا گیا۔ اس انداز کو بدلنے میں نکتہ کیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان دو گروہوں میں سے گروہ کے حال کا بیان دوسرے گروہ کے حال کے بیان پر عطف کے ساتھ لاتے ہیں۔ جیسا کہ آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ اور اہل معانی کے قاعدہ کے مطابق بھی جامع وہمی جو کہ تضاد ہے دونوں کے درمیان ثابت ہے۔ کیونکہ کفر ضد ایمان ہے۔ باوجود جامع اور مناسبت کے عطف نہ کرنا آئین بلاغت کے خلاف ہے اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی کلام اصل میں کتاب کے حال کا بیان تھا اور وہ جو کتاب مذکور فلاں فلاں گروہ کی ہدایت کا سبب ہوتی ہے۔ پس کافروں کا ذکر اور ان کی مذمت جو کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے جملہ کا مضمون ہے اس مقام کے مخالف

ہے نہ کہ مناسب اور جامع وہی جو کہ تضاد ہے مومن و کافر اور ایمان و کفر کے درمیان ثابت ہے نہ کہ کتاب کی مدح اور کفار کی مذمت کے درمیان اور کمال بلاغت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مقام کے تباین کو باوجود جامع کے اعتبار میں پہلے کرتے ہیں۔ اور عطف کو ترک کرتے ہیں۔ جس طرح کہ خبریت اور انشا کے ساتھ کلام میں اختلاف کی صورت میں اس اختلاف کو وجود مناسبت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور عطف ترک کر دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھنا چاہیے۔ اور صاحب مفتاح نے باب فصل و وصل میں قاعدہ تباین کو لزوم فصل کیلئے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

چوتھا سوال اور جواب

چوتھا سوال یہ ہے کہ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ مبتداء ہے اور من الناس اس کی خبر ہے۔ اور چاہئے کہ خبر ایک مفید لفظ ہونا چاہئے۔ اور منافقون کا آدمیوں کے زمرہ میں سے ہونا ایک امر معلوم ہے کہ اس کی خبر دینا کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ من یقول میں من موصوفہ ہے۔ پس کلام کا مفاد یہ ہوا کہ آدمیوں کی جنس میں اس قسم کے گروہ ہیں۔ پس فائدہ کلام کا مدار وصف پر ہے۔ جیسا کہ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا میں کہا گیا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ وَمِنَ النَّاس کا ذکر اس لئے ہے کہ اس فرقہ میں صرف آدمی ہونے کی ماہیئت کے علاوہ صفات فاضلہ مثل عقل، علم اور سمجھ میں سے کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ چنانچہ علماء مصنفین کی اصطلاح میں من الناس کا لفظ اسی اشارہ کیلئے ذکر کیا جاتا ہے۔ صاحب حامی نے کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ عَمِلَ فِي النصوص بوجوه اخرىٰ فاسدہ اور شارحین نے کہا ہے کہ اس کلام کا معنی یہ ہے کہ ومن الناس لامن العلماء۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں مِنَ النَّاسِ کا لفظ لانا سامعین کے تعجب کیلئے ہے۔ یعنی لوگوں میں سے اس قسم کے بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔ پس اپنی صورت انسانی پر مغرور نہ ہونا اور علم کی اصطلاح اور اپنی سمجھ میں کوشش کرو۔

پانچواں سوال اور جواب

پانچواں سوال یہ ہے کہ کافروں کے عذاب میں عظیم کا لفظ لایا گیا۔ جبکہ منافقوں کے

عذاب میں لفظ الیم ہے۔ تو ان دونوں عذابوں کے درمیان بڑائی اور دردناک ہونے میں فرق کس طرح ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن کافروں کی موت کفر پر مقدر ہے وہ ازلی مردود ہیں۔ تقدیر کے وقت انہیں دینی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ پس ان کا عذاب بڑا ہے۔ لیکن اپنی استعداد کے باطل ہونے اور اپنے ادراک کی تختی کے مکمل طور پر غبار آلود ہونے کی وجہ سے اس عذاب کے درد کی شدت کو نہیں پاتے۔ جیسے میت کا عضو یا مفلوج یا بے حس ہونے والا عضو کہ اس میں کاٹنے یا داغ لگانے اور دیگر تکلیف کی قسموں کا پتہ نہیں چلتا رہے منافق۔ پس اپنی اصل استعداد کے باقی رہنے کی جہت سے اور قوت ادراک کی وجہ سے درد کی شدت کو پائیں گے۔ اسی لئے ان پر عذاب نہایت دردناک ہوگا۔ نیز کفار جنہوں نے ایمان کی حلاوت بالکل نہیں چکھی اور ایمان کے گھر کے دروازے پر نہ پہنچے۔ کلی طور پر محروم ہونے کی وجہ سے ایمانی لذتوں کی اتنی خواہش نہیں رکھتے۔ بخلاف منافقوں کے اس گھر کے دروازے پر پہنچ کر اور ایمان کی کچھ چاشنی زبان سے چکھ کر اس کی پوری لذت حاصل کرنے سے محروم کر دیئے گئے تو دیکھی اور چکھی ہوئی لذتوں کے گم ہونے پر لازماً انہیں حسرت زیادہ ہوگی۔ جیسا کہ ولایت کے لوگ کہ میوے کھا کر فیضیاب ہو کر وطن سے دور پڑے ہوں۔ ان میووں کے نہ ملنے کی حسرت ان کی جان کے گریبان کو زیادہ پکڑتی ہے بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے ولایت نہیں دیکھی اور اس کے میووں کی لذت نہیں چکھی کہ انہیں اس قدر حسرت نہیں ہوتی۔

چھٹا سوال اور جواب

چھٹا سوال یہ ہے کہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ "آمنا کے جواب میں کس طرح واقع ہو سکتا ہے۔ حالانکہ آمنا میں فعل کی شان کا ذکر ہے نہ شان فاعل کا اور وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں شان فاعل کا ذکر ہے نہ کہ شان فعل کا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جواب بطریق ترقی ہے۔ یعنی وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان میں داخل ہو گئے۔ حالانکہ اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ ایمان والوں کی ایک جماعت میں گنے جا سکیں اور اگر اس کلام کے جواب میں یہ فرمایا جاتا کہ وَلَمْ يُؤْمِنُوْا کہ وہ ایمان نہیں لائے تو یہ ترقی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اسی طریقے پر

دوسری آیت ہے یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنْهَا اور احتمال کہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ میں دو وجہ سے ترقی سمجھی جائے۔ اول تو عموم اوقات کی جہت سے یعنی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم زمانہ قریب میں ایمان لائے۔ حالانکہ یہ لوگ وقتوں میں سے کسی وقت میں بھی نہ بالفعل اور نہ ہی آئندہ زمانے میں ایمان کی قابلیت رکھتے ہیں۔ دوسرے متعلقات کے عموم کی جہت سے کہ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے نہ خدا تعالیٰ پر، نہ روز آخرت پر، نہ رسول پاک علیہ السلام پر، نہ قرآن پاک پر اور نہ ہی کسی اور چیز پر ان چیزوں میں سے جن پر ایمان لانا فرض ہے۔

ساتواں سوال اور جواب

ساتواں سوال یہ ہے کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فرمایا قُلُوْبُهُمْ مرضیٰ کیوں نہ فرمایا۔ جملہ ظرفیہ لانے میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کی مرض عارضی ہے اصلی نہیں۔ لیکن عارضی ہونے کے باوجود اسے پورا قرار اور رسوخ حاصل ہو گیا ہے۔ اسی لئے مرض کو نکرہ لایا گیا۔ اور یہ معنی قُلُوْبُهُمْ مَرْضٰی سے سمجھا نہیں جاتا تھا۔ کیونکہ قُلُوْبُهُمْ مَرْضٰی یا تو مرض کے دائمی ہونے پر اور اس کے اصلی ہونے پر دلالت کرتا یا قرار اور رسوخ کے بغیر عارضی ہونے پر۔ اور اس مرض کی حقیقت جو کہ ہر وقت منافقوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ روحانی طب کے محققین کے نزدیک یہ ہے کہ جب بھی امور غیبیہ الٰہیہ میں سے کوئی امر جہان دنیا میں ظہور کا لباس پہنتا ہے اسے دو قسم کے لواحق ضروری ہیں۔ اول عالم غیب کی صفائی اور طہارت کیونکہ اس کا خزانہ عالم غیب ہے۔ دوسرے جہان دنیا کے لوازمات کیونکہ وہ جہان دنیا میں وارد ہوا۔ پس مخلص ایمان والے اس امر غیبی کو جہان کے لواحق سے قطع نظر کر کے ملاحظہ کرتے ہیں۔ اور حقیقت کے درپے ہوتے ہیں۔ اور منافقین جب اس کے ساتھ لوازم غیب دیکھتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں۔ اور جب جہان کے لواحق اس کے ساتھ دیکھتے ہیں تو پھر جاتے ہیں۔ اور انکار سے پیش آتے ہیں۔

مثلاً پیغمبر علیہ السلام کو جب نور اور دلائل کے ساتھ ملاحظہ کرتے تو بے اختیار سر خم ہو

جائے۔ اور اطاعت کرتے تھے پھر جب دیکھتے کہ پیغمبر علیہ السلام ازدواجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔ بازار میں تشریف لاتے ہیں۔ کبھی جنگ میں پسپائی بھی واقع ہو جاتی ہے۔ بیمار ہو جاتے ہیں تو کہتے کہ اگر یہ بندہ مقرب خدا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کرتا **ما لهذا الرسول ياكل الطعام ويمشي في الاسواق ـ لولا انزل اليه ملك فيكون معه نذيرا اويلقى اليه كنزا وتكون له جنة ياكل منها** (یعنی اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے' بازاروں میں چلتا ہے' آپ پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا جو کہ آپ کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا یا آپ کی طرف خزانہ اتارا جاتا یا آپ کا باغ ہو جس سے آپ پھل کھائیں) اس قسم کے اور بھی شبہات۔

اور اس مرض کی زیادتی کا طریقہ یہ ہے کہ آیات الٰہیہ میں سے ہر آیت کے ہمراہ اور اس راہ کے ہادیوں میں سے ہر ہادی کی جبلت میں جہان دنیا کے لوازم میں سے کوئی چیز ملائی گئی ہے جس قدر وہ آیات کے ملاحظہ اور ہادیوں کی تلاش میں دور دور تک جاتے ہیں اسی قدر ان کے شکوک وشبہات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور مقصد دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ **مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ** جسے اللہ تعالیٰ گمراہ فرمادے تو اس کا کوئی ہادی نہیں۔ اور ان کی ذات کے جوہر میں اس مرض کے مستحکم ہونے کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنی مرض کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اور اس مہلک بیماری کو عین صحت سمجھتے ہیں اس کا گواہ یہ ہے کہ اپنے برے کاموں کو اچھا سمجھتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو۔

منافقوں کے فساد کی اقسام

ان کا زمین میں فساد چند قسموں کا تھا اول یہ کہ قوت شہوت اور غضب کے تقاضوں کو حاصل کرنے میں حد سے گزر جاتے تھے۔ اور قوت حکمیہ کے تقاضوں حاصل کرنے میں کمی کرتے تھے۔ حالانکہ انسانی روح کے مزاج کی صحت اس سے ہے کہ قوت حکمیہ غالب ہو۔ اور قوت شہویہ اور غضبیہ مغلوب اور تابع تاکہ احکام شرعیہ کی اطاعت ممکن ہو۔ اور اس

اطاعت کی وجہ سے دونوں جہانوں کے امور کا انتظام میسر آتا ہے۔ اور انسانیت کا معنی معرض وجود میں آتا ہے۔ دوسری قسم یہ کہ کافروں اور مومنوں کے درمیان آمدورفت رکھتے تھے۔ اور ہر فریق کی باتیں دوسروں کو پہنچاتے تھے تا کہ ہر فریق کے ہاں مرتبہ اور عزت حاصل کریں۔ اور یکسوئی سے مسلمانوں کے ساتھ دوستی نہیں کرتے تھے۔ تیسری قسم یہ کہ کافروں سے ملنے اور ان کی دلجوئی کرنے میں حد سے گزر جاتے تھے۔ اور دین کے امور میں سستی کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ خود کو ایمان والوں کے گروہ میں سے کہتے تھے تو کفار کے ہاں یہی ثابت ہوتا کہ پیغمبر علیہ السلام کا کام اور ان کے دوستوں کا اعتقاد اسی قدر ہے کہ ہماری چاپلوسی کریں۔ اور ہم سے طمع رکھیں اس وجہ سے کافر دلیر ہوتے تھے۔ اور وہ ایمان والوں کے پاس دین اور حضور علیہ السلام کی نبوت کے بارے میں کافروں کے شبہات بیان کرتے اور اس وجہ سے ضعیف الایمان لوگ شک میں پڑ جاتے ان تمام امور کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جب انہیں اس بڑے فساد سے ایمان والے منع کرتے تو جواب میں کہتے۔

اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں حاصل یہ کہ ہم چاہتے ہیں کہ ملک وملت کا حال اسی اصل حالت پر لوٹ آئے۔ سب لوگ باہم متفق اور شیر وشکر ہو جائیں۔ اور اس نئے دین اور آئین کی وجہ سے لوگوں میں جو جھگڑا اور اختلاف رونما ہوا ہے زائل ہو جائے۔ اور حقیقی صلاح یہی ہے کہ ملک وملت کے امر کو پرانے طریقے پر۔ جیسا کہ زمانہ ماضی میں تھا لوٹا دیا جائے۔ اور نئے آئین کی حمایت جو کہ اختلاف اور جھگڑوں کا موجب ہے درمیان سے اٹھ جائے۔ اور کوئی شخص کسی کو قتل کرنے' تکلیف دینے' قید کرنے' اموال لوٹنے اور ہتک حرمت کے درپے نہ ہو۔ پس درحقیقت وہ اصلاح کو معاش حاصل کرنے' اس کے اسباب مہیا کرنے اور دنیوی امور کے انتظام میں منحصر جانتے ہیں۔ اور یہ ان کی دنیا کی محبت میں غلو' لذات بدنیہ میں انہماک' جزوی منفعتوں اور حسی لذتوں میں پوری توجہ کی وجہ سے کلی اور عام مصلحتوں اور باقی رہنے والی عقلی لذت سے محجوب رہنے کی وجہ سے ہے جو کہ عین فساد ہے۔ چنانچہ ان کی اس سمجھ کے رد میں پوری تاکید سے بیان فرمایا۔

اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ یعنی آ گاہ ہو کہ تحقیق یہی گروہ فساد کرنے والے ہیں۔
کیونکہ ملک وملت کا کام اس رسول علیہ السلام کی بعثت سے پہلے ہمیشہ کیلئے خراب تھا اور حق تعالیٰ نے چاہا کہ اس فساد کو دور فرمادے اور یہ چاہتے ہیں کہ اصلاح کے بعد اس فساد کو پھر اپنی جگہ پر لے آئیں۔ پس وہ اصلاح کے بعد فساد کاری کرتے ہیں۔ اور یہ ہمیشہ جاری رہنے والی فساد کاری سے زیادہ قبیح اور برا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی اصلاح یہ ہے کہ دین حق کو تمام دینوں پر غالب کر دیا جائے۔ اور اس ارادہ الٰہی کی جان و مال کے ساتھ خدمت کی جائے۔ اور اپنی طاقت کے مطابق حق کے ارادہ کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے اگرچہ اس دوران قتل' قید' مال کی لوٹ کھسوٹ اور دوسری سختیاں اپنے آپ پر یا اپنی جنس پر پہنچیں چنانچہ اس سورت کی دوسری آیت میں فرمایا ہے
وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَاتَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ اور دین اللہ ہی کیلئے رہ جائے۔ نیز اسی سورت میں فرمایا ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْہِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْہِ کَبِیْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَکُفْرٌ م بِہٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِخْرَاجُ اَھْلِہٖ مِنْہُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ ۚ وَالْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ آپ سے پوچھتے حرمت والے مہینہ میں لڑائی کے متعلق فرمادیجئے کہ اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے۔ اور اس کے اور مسجد حرام کے ساتھ کفر ہے۔ اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ قتل سے بڑا گناہ ہے۔ پس ان سختیوں کو فساد سمجھنا اور ان سختیوں سے بچنے کو اصلاح جاننا اور ملک وملت کے کام اسی پہلی نہج پر رکھنے کو صحت کاملہ تصور کرنا بعینہ اس مریض کی طرح ہے جس کے اعضاء میں سے کسی عضو میں کیڑے پڑ کر بدبودار ہو چکا ہو۔ اور اس عضو کے زہر کا اعضائے رئیسہ تک پہنچنے کا خوف ہو۔ اور کوئی تجربہ کار طبیب اسے کاٹنے اور داغ دینے کا عمل تجویز کرے۔ اور یہ ناقص العقل مریض اس سے پرہیز کرے۔ اور کہے کہ اس عضو کو کاٹنا اور داغ دینا بدن کی بنیاد کو خراب کرنا ہے مجھے چاہئے کہ میں اپنے بدن کی اصلاح کروں اور جو کچھ پیدائش کے وقت سے لے کر میرے بدن میں موجود ہے اسے اس کی اصلی صورت پر باقی رکھوں۔ یہ صریح غلطی

اور ہلاکت کا موجب ہے۔ لیکن رای العلیل علیل یعنی بیمار کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے کے مطابق یہ بیمار دل والے لوگ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی اصلاح دارین کے امور عامہ میں خلل ڈالنے والی ہے۔ بلکہ حقیقت انسانیت کو تباہ کرنے والی ہے۔

چنانچہ فرمایا وَلٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ لیکن وہ شعور نہیں رکھتے کیونکہ اصلاح کے وقت فساد کاری کرتے ہیں۔ اور ان کی بے شعوری پر قوی گواہ یہ ہے کہ عقل کامل والے لوگوں کو بے وقوف اور احمق کہتے ہیں۔

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ ایمان حقیقی جو کہ فتنہ و فساد ترک کرنے دنیوی ایندھن میں بے رغبتی اور نفس کی فانی لذتوں اور نام اور مرتبہ چاہنے سے منہ موڑنے کو لازم ہے۔

کَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ جس طرح کہ لوگ ایمان لائے ہیں کہ حقیقت میں لوگ نام ہی اس جماعت کا ہے۔ کیونکہ دارین کے انتظام کے درست ہونے کی وجہ سے معنی انسانیت معرض وجود میں آتا ہے۔ اور اصلاح و انتظام ظاہری اور باطنی طور پر شرع شریف کی اطاعت کے بغیر میسر نہیں ہے۔ اور جب ان کے غیر میں یہ اطاعت ثابت نہیں گو معنی انسانیت ہی ثابت نہیں اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ان کا حال ہے۔ اسی لئے ناس کو یہاں تعین کے بغیر ارشاد فرمایا تا کہ اشارہ ہو کہ حقیقی مومنوں کے سوا کسی کو انسان نہیں کہا جا سکتا۔

قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ کَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بے عقلوں کی طرح ایمان لائیں کہ وہ ایک طرف کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اور زمانے کے انقلابات سے نہیں ڈرتے کہ دوسری طرف کا غلبہ ہو جائے اس وقت اس طرف کے لوگ عداوت کے درپے ہوں گے۔ اور دائرہ تنگ کر دیں گے۔ نیز احکام شرع کی اطاعت صرف دور دراز کی توقعات کیلئے بے شمار دنیوی فوائد سے محرومی کا سبب ہے۔ اور بے پناہ مشقتوں کو برداشت کرنے اور بے پایاں تکالیف پہنچنے کا ذریعہ۔ پس عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ظاہر میں شرع کے احکام کی اطاعت کرنا چاہئے تا کہ مسلمانوں کی زدوکوب سے نجات حاصل ہو جو کہ بالفعل

تسلط رکھتے ہیں۔ اور دنیوی منفعتیں بھی ہاتھ سے نہ جائیں۔ اور دوسری طرف کے لوگوں کو چوری چھپے راضی رکھنا چاہئے تا کہ انقلاب کے وقت ان کی رضامندی کام آئے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ دانا اور آگاہ رہو کہ تحقیق بھی لوگ بے عقل ہیں۔ کیونکہ اگر مرکزی نقطہ یہی ہے کہ نفع حاصل کیا جائے۔ اور نقصان کو دور کیا جائے تو فانی گھٹیا چیز کو باقی اعلیٰ چیز کے مقابلہ میں اختیار کرنا کمال بے وقوفی ہے۔ اور آخرت کو دنیا کے عوض فروخت کرنا نہایت بے عقلی ہے۔ اور مدار دو طرفوں کو راضی رکھنے پر ہے۔ تو ایک طرف علام الغیوب ہے کہ اس کے نزدیک چھپا اور ظاہر برابر ہے۔ خصوصاً اس وقت کہ نزول وحی اور غیبی خبروں کے آنے کا وقت ہے۔ اس کی وجہ سے ہر کسی کو لوگوں کے عقیدہ پر اطلاع ممکن ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دلیل کے تقاضہ سے منہ پھیرنا اور دلیل کو تھامنے والے کو بے وقوف کہنا نری بے وقوفی ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ لیکن وہ نہیں جانتے کہ بے وقوف کون ہے؟ اور بے عقلی کا معنیٰ کیا ہے۔

ایک سوال اور جواب

اور یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ پہلی آیت کو لَا يَشْعُرُوْنَ پر ختم فرمایا۔ اور دوسری آیت کو لا یعلمون پر۔ یہ فرق کس نکتہ کی بنا پر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شعور کا لفظ زیادہ تر علم حسی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی لئے حواس خمسہ کو مشاعر کہتے ہیں۔ اور زمین میں ان کا فساد ایک ایسا امر تھا۔ جیسا کہ محسوس چیز۔ ان کی قباحت کو نہ پانے کو بے شعوری سے تعبیر کیا گیا لیکن نعمت آخرت کی نعمت دنیا پر ترجیح اور ایمان خالص کے طریقہ کی حقیقت اور نفاق کے طریقہ کا بطلان اور تقیہ ایک استدلالی عقلی امر ہے انہیں نہ جاننے کی تعبیر لَا يَعْلَمُوْنَ کے ساتھ مناسب تھی۔

نیز اس آیت میں سفہ یعنی بے وقوفی کا ذکر ہے جو کہ جہالت کی ایک قسم ہے۔ تو اس کا تقاضا ہوا کہ اس کے مقابلہ میں علم لایا جائے تا کہ مقابلہ کی صنعت درست ہو۔ اور یہاں ایک اور شبہ بھی ہے کہ منافق اپنے کفر کو چھپائے رکھتے تھے اور اپنے کفر کو ظاہر کرنے سے

پوری احتیاط کرتے تھے۔ اور اَنُؤْمِنُ کَمَا آمَنَ السُّفَهَآءُ صریح کلمہ کفر ہے جو کہ نفاق کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ ان سے یہ بات اپنے ان رازداروں کے سامنے واقع ہوئی جن سے وہ اپنے نفاق کو نہیں چھپاتے تھے۔ کیونکہ بعض مسلمانوں کی بعض منافقوں کے ساتھ ہم صحبتی اور رازداری ثابت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن ابی کے بیٹے کو اس سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ جو کہ انہوں نے اپنے رازداروں کے سامنے کہا نقل فرما کر انہیں رسوائے عام فرمایا۔ نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات ان سے صرف دل میں صادر ہوئی ہوگی۔ پس قَالُوْا کا معنی قَالُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمْ انہوں نے اپنے دل میں بات کی۔ حق تعالیٰ چونکہ سر اور مخفیات کو جاننے والا ہے ان کی دل بات کو برملا ظاہر فرما دیا۔

الناس سے مراد چہار یار ہیں

ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے آمن الناس کی تفسیر میں فرمایا ہے کما آمن ابوبکر و عمر و عثمان و علی اور ان چار یاروں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ایمان کا خلوص اس وقت کے خواص و عوام میں مشہور ہو چکا تھا۔ ورنہ پہلے گزر چکا کہ جو بھی ظاہری اور باطنی طور پر احکام شرعی کا مطیع ہوا ناس میں داخل ہے۔ اور جس طرح یہ منافق ایمان خالص والوں کو زبان سے احمق اور بے وقوف کہتے ہیں اسی طرح دل میں بھی اس متلاشی حق جماعت کے متعلق حماقت اور سفاہت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ پس یہ کلمہ کو ان سے صادر ہوتا ہے ایسا نہیں کہ مغلوبیت اور غضب کی حالت میں کوئی لفظ زبان سے نکل جائے۔ اور دلی عقیدہ اس کے مطابق نہ ہوتا کہ وہ اس کلمہ کفر بکنے میں معذور ہوں کیونکہ ان کا معاملہ اس بات کی دلیل ہے کہ مخلص مومنوں کی سادہ لوحی اور کافروں کی پختگی اور عقلمندی ان کے دل میں رچی بسی تھی۔

چنانچہ فرمایا

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جب وہ مخلص مومنوں سے ملاقات کرتے ہیں قَالُوْۤا اٰمَنَّا کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ پس ماضی کا جملہ فعلیہ لاتے ہیں۔ اور اس دعویٰ میں مبالغہ اور تاکید نہیں کرتے کیونکہ جانتے ہیں کہ مخلص مومن سادہ لوح ہوتے ہیں۔ اور گمان بھی نہیں

کرتے کہ کسی نے دنیا میں جھوٹ بھی بولا ہوگا۔ پس صرف ہمارے بغیر تاکید و مبالغہ کے کہہ دینے کو وہ قبول کرلیں گے۔ اور جان و مال پر دست اندازی کا ہاتھ چھوٹا کریں گے۔

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ اور جب اپنے گمراہ کرنے والوں کے پاس خلوت میں جاتے ہیں تو پوری تاکید کے ساتھ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ کہتے ہیں کہ بلاشبہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اگرچہ ہم مومنوں کے پاس جان اور مال کی حفاظت کی خاطر ظاہر داری کرتے ہیں۔ اور ایمان اور اطاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جس طرح تم نے کفر کے اعلیٰ مرتبوں میں ترقی کی ہے ہم بھی اسی مرتبے میں ہیں۔ اور اس کلام میں کئی قسم کی تاکید اور مبالغہ کی رعایت کرتے ہیں جملہ اسمیہ لاتے ہیں پھر اسے حرف تاکید کے ساتھ پکا کرتے ہیں۔ اور انا کافرون کی بجائے اِنَّا مَعَکُمْ کہتے ہیں۔ تاکہ مرتبہ کفر میں ایک ہونے پر دلالت کرے اس لئے کہ کافروں کی کمال عقلمندی اور سمجھ کے معتقد ہیں۔ جانتے ہیں کہ ہم نے ایمان والوں کے پاس ایمان کا اظہار کیا ہے اگر اپنے باطنی کفر کے اظہار کے بارے میں کافروں کے نزدیک پوری تاکید اور مبالغہ نہیں کریں گے تو وہ ہم سے قبول نہیں کریں گے۔ اور اس تاکید اور مبالغہ کے باوجود ان کی دلی تسلی نہیں ہوتی۔ اور گمان کرتے ہیں کہ اس دعویٰ میں اس تمام تر تاکید کے باوجود کافر ہماری تکذیب کریں گے۔ اور اعتراض کریں گے کہ اگر تم ہمارے ساتھ مرتبہ کفر میں شریک ہو تو آمنا کا لفظ تمہاری زبان پر کیوں جاری ہوا؟ کیونکہ اس لفظ کا جاری ہونا اگرچہ ظاہرداری اور زمانہ سازی کیلئے ہو کفر میں تمہارے عقیدہ کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے اس بنا پر پیش بندی کے طور پر کہتے ہیں۔

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ کہ ہم تو صرف ایمان والوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ اور ان کی بے عقلی کو برملا ظاہر کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ جان لیں کہ سادہ لوح لوگ صرف ہمارے زبانی کہنے سے ہمارے افعال کے ہمارے اقوال کے خلاف ہونے میں غور کئے بغیر ہم سے ہمارے ایمان کے دعویٰ پر یقین کرلیتے ہیں۔ پس اس مذاق کی وجہ سے ہمارا کفر میں پورے طور پر پکا ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ جو شخص جس چیز سے مذاق کرتا ہے اس چیز کو بہت

ہلکا اور خفیف جانتا ہے۔ اور ہرگز اس کی کوئی قدر و وقعت نہیں رکھتا۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ ایمان والوں کو کسی وقت استہزاء اور استخفاف کا محل گردانتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ہر وقت علام الغیوب کے استہزاء واستخفاف کے مقام پر واقع ہیں۔ اور نئی مثالوں کے ساتھ کسی وقت بھی اس بارگاہ عالی کے استخفاف اور استہزاء سے خالی نہیں رہتے کیونکہ

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ یعنی حق تعالیٰ خود ان کے ساتھ استہزاء فرماتا ہے۔ کیونکہ ایمان والوں کو ان کے جان اور مال سے تعرض نہ کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ تاکہ دم بدم ان کا نفاق زیادہ ہو۔ اور نفاق زیادہ ہونے کی وجہ سے ایسے عذاب کے مستحق ہوں جو کہ مشقت اور تکلیف میں مال اور جان کے جانے سے زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ مال اور جان کا جانا دنیا کی زندگی میں تکلیف دیتا ہے۔ اور پس اور تہ بہ تہ نفاق ابدی زندگی کو نقصان دینے والا ہے۔ پس گویا اس دربار عالی سے دم بدم ان کے ساتھ ایسا معاملہ ہے جو کہ بے عقلوں اور بے وقوفوں کے ساتھ کرنا چاہئے۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ سنگریزہ دیتے ہیں۔ اور ایک یاقوت لیتے ہیں۔ اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں اس نفاق پر جلدی سے دنیا میں نہیں پکڑتا بلکہ فرصت دیتا ہے وَيَمُدُّهُمْ اور انہیں لمبی مہلت دیتا ہے کہ وہ مستغرق رہیں فِىْ طُغْيَانِهِمْ اپنی سرکشی میں يَعْمَهُوْنَ اندھا دل ہو کر اور اپنے حال کی ابتری سے بے خبر ہو کر۔

یہاں جاننا چاہئے کہ ابتداء میں اپنی طرف سے کسی کو مذاق کرنا جہالت ہے۔ چنانچہ اسی سورت میں آئے گا قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ لیکن استہزاء کے جواب میں بطور بدلہ استہزاء کا سا سلوک کرنا عین حکمت اور کمال انصاف ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں واقع ہے۔ خصوصاً وہ شخص جو کہ کسی کے محبوبوں سے مذاق کرے انتقام کے مقام پر ان محبوبوں کی طرف سے استہزاء کا جواب دینا محبت کی دنیا کے واجبات میں سے ہے۔ اور اس آیت میں اس مقصد پر نظر رکھتے ہوئے خالص الایمان مومنوں کی جلالت شان کا کمال ہے کہ حق تعالیٰ ان کی جماعت میں منافقوں کے استہزاء کا جواب ان کی طرف سے خود دیتا ہے۔

نیز اس آیت میں صریح طور پر وجوب اصلح پر رد ہے جس کے معتزلہ قائل ہوئے

ہیں۔ اس لئے کہ منافقوں کو سرکشی اور دل کے اندھے پن میں رکھنا کسی وجہ سے بھی منافقوں کے حق میں صلاح یعنی درستی نہ تھی اور لغت عرب میں جس طرح آنکھ کے اندھے پن کو عمی کہتے ہیں دل کے اندھے پن کو عمہ کہتے ہیں۔ اور یہ نفاق پیشہ استہزاء الٰہی کے مقام پر کیوں نہ ہوں۔ حالانکہ جو معاملہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا اس سے ان کمال بے عقل ہونا ظہور پذیر ہوا اس لئے کہ

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی یہ گروہ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے ہدایت ایمان دے کر نفاق کی گمراہی خریدی ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے اسلام کا کلمہ زبان پر جاری کیا تو کچھ نہ کچھ حقیقت ایمان کے ساتھ ایک ربط پیدا ہوا گویا وہ اس کے مالک ہو گئے۔ پھر اپنے باطنی نفاق کی وجہ سے اس ہاتھ آئے ہوئے ایمان کو ضائع کر کے اس کے عوض اپنے لئے نفاق کی گمراہی حاصل کر لی۔ حالانکہ ایمان میں سراسر دونوں جہانوں کی بھلائی تھی اور نفاق میں آخرت کا خسارہ نقد حاصل ہے۔ اور دنیا کا خسارہ اگرچہ نفاق میں معلوم نہیں ہوتا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے حال کی رسوائی واقع ہوئی۔ اور ایمان والوں کو اس پر اطلاع دے دی گئی اور قرآن پاک میں ان کے نفاق کا ذکر اتارا اور یہاں تک مشہور اور رائج ہوا کہ ہر مکتب میں بچے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ کہ دنیا کا خسارہ بھی بہت قبیح طریقے سے ہوا۔ پس ان کا یہ سودا اس شخص کے سودے کی مانند ہے جس نے تریاق دے کر زہر ہلاہل خریدی ہو۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ۔ پس یہ سوداگری انہیں کچھ سودمند نہ ہوئی۔ کیونکہ دنیا میں کوئی نفع نہیں رکھتے اور آخرت کو خود برباد کر دیا تھا۔ کیونکہ آخرت کا راس المال جو کہ ایمان تھا اس نفاق کے بدلے ہار گئے۔

وَمَا کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ اور راہ پانے والے نہ ہوئے۔ اس لئے کہ صرف زبانی ایمان جو کہ اب رکھتے ہیں ہدایت نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض ہدایت بھی ہو تو اس صورت میں ہے کہ دل کا اعتقاد اس کے خلاف واقع نہ ہو۔ اور یہاں خود تکذیب اور انکار اس کے بدن میں حاصل ہوا۔ پس اس معاملہ میں کسی وجہ سے بھی نفع یاب نہ ہوئے۔ اور ابدی سعادت کہ اگر

اسے سعادت دنیا سے بدلتے تو بھی خسارہ تھا چہ جائیکہ دنیا کی سعادت بھی ہاتھ نہ آسکی مفت میں ضائع ہوگئی۔ اس سے زیادہ کوئی حماقت اور بے عقلی نہیں ہوسکتی لیکن اپنی کمال حماقت کی وجہ سے کلمہ اسلام کو صرف زبان سے ادا کر لینے کو کمال کا ایک مرتبہ جانتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ زبان پر اس کلمہ کو جاری کرنے کا مقصد مال اور جان کی حفاظت ہے۔ اور اسے ہم نے خود حاصل کرلیا۔ اس کے بعد دوسرے مرتبوں کی ہمیں کوئی پرواہ نہ رہی۔ پس مَثَلُهُمْ یعنی اس کوتہ نظری' غلط فہمی اور گمراہی اور تاریکی کو ہدایت اور نور کے عوض خریدنے کی ان کی مثال

كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا اس شخص کی مثل ہے جس نے آگ جلائی تاکہ اس کا شعلہ بلند ہو۔ اور اس کی وجہ سے روشنی' گرمی' کھانا پکانا اور آگ کے دوسرے فائدے ہاتھ آئیں۔ اسی طرح اس گروہ والوں نے بھی چاہا کہ ایمان کے فطری نور کو جو کہ ہر کسی کی استعداد میں امانت کے طور پر رکھا گیا ہے پیغمبر علیہ السلام کی صحبت اور اہل ایمان کی رفاقت کی وجہ سے شعلہ بار اور قوت والا کریں۔ تاکہ اس نور کے منافع حقائق و معارف کی وضاحت طاعات اور اذکار شوق و ذوق کی گرمی اور اخلاق اور استعدادوں کا پختہ ہونا حاصل ہو۔

فَلَمَّا اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ۔ پس جب اس آگ نے آگ جلانے والے کے اردگرد کو روشن کر دیا۔ اور حاصل کلام یہ کہ اس کی روشنی کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھنا شروع کیا۔ اور لما کی جزا محذوف ہے۔ یعنی اطفاءها یعنی اسے بجھادیا حاصل یہ کہ اس آگ کو بجھادیا اس گمان سے کہ اب مجھے کیا حاجت ہے کہ اس سے زیادہ آگ جلاؤں کیونکہ میری آنکھ کھل گئی ہے میں ہر چیز کو خود بخود دیکھ لوں گا اور اس قدر گرمی جو کہ میں نے کسب کرلی ہے میرے لئے کافی ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ تاریکی میں بیٹھوں اور آگ جلانے کی مشقت نہ اٹھاؤں اور ایندھن اور خس و خاشاک کی طلب کا احسان نہ اٹھاؤں اسی طرح یہ لوگ پیغمبر علیہ السلام کی سرسری صحبت اور ایمان والوں کی مشارکت کی وجہ سے کچھ بصیرت تک پہنچ ہوئے۔ اور انہوں نے سمجھا کہ ہمارے جان اور مال جو کہ ہمارے گردوپیش

میں حمایت میں داخل ہوئے اب ایمان کے مرتبوں کو طے کرنے کی محنت کیا کرنا چاہئے۔ اور اقارب وقبائل کے فراق اور وطنوں اور گھروں سے ہجرت کی تلخی کیا چکھنا چاہئے۔ جب وہ اسی حالت میں مر گئے۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نور کو صاف کر دیا جو انہوں نے کسب کیا تھا۔ کیونکہ اس کا فائدہ تو صرف ان کے مال اور جان کی حفاظت میں تھا اور یہ فائدہ مرنے کے بعد منقطع ہو گیا۔

وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ اور انہیں حق تعالیٰ نے ان کی موت کے بعد اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کسی چیز کو ہرگز نہیں دیکھتے اور کسی وجہ سے ان تاریکیوں سے خلاصی پانے کا حیلہ ان کی نظر میں نہیں آتا اور ظلمات کو جمع اس لئے لائے ہیں کہ مرنے کے بعد ان منافقوں کو چند قسم کی تاریکی گھیر لے گی۔

منافقوں کو گھیرنے والی تاریکیاں

پہلی کفر کی تاریکی' دوسری مکر وفریب کی تاریکی جو کہ اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کے ساتھ کرتے تھے۔ تیسری جھوٹ اور بہتان کی تاریکی کہ خود کو مومن کہتے تھے۔ چوتھی مخلص مومنوں کو طعن اور برا کہنے کی تاریکی کہ انہیں احمق اور بے وقوف کہتے تھے۔ پانچویں جہل مرکب کی تاریکی کہ اپنے فساد کو اصلاح سمجھتے تھے۔ چھٹی نافرمانیوں اور خواہشات کی تاریکی کہ ان کی قید میں گرفتار ہو کر انہیں حاصل کرنے کیلئے نفاق کے پیشے کو حیلہ قرار دیا تھا۔ ساتویں قبر کی تاریکی انواع واقسام کے عذابوں اور کئی قسم کے غضب الٰہی کی سختیاں اور ہولناکیاں۔ پس یہ ان کی مثال ہے اگر وہ سنیں لیکن وہ دنیا میں صُمٌّ یعنی بہرے ہیں۔ سچی بات کو ہرگز نہیں سنتے اور اگر سنتے ہیں تو اپنے حال کو درست کرنے میں ایسی چیز کو جو کہ اس کی اصلاح کرے یعنی خالص ایمان کا اظہار اور اپنی تقصیروں سے معذرت جو کہ انہوں نے بارگاہ پیغمبر علیہ السلام اور دوسرے مخلص ایمان والوں کے بارے میں کیں زبان پر نہیں لا سکتے۔ اس لئے کہ وہ بُكْمٌ گونگے ہیں بغیر اس کے جو کہ ان کے دلوں میں کفر کی پختگی ہے کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اور اگر بناوٹ اور تکلف کے ساتھ کہنے کا قصد بھی کریں تو وہ اپنے حال

کے تدارک اور اصلاح میں اس وقت لگیں گے کہ ایمان کا حسن اور نفاق عیب ان کی نظر میں آئے۔ اور ابھی تاریکیوں کے تہہ بہ تہہ ہونے کی وجہ سے ایمان کا حسن اور نفاق کا عیب ان کی نظروں سے غائب ہے۔ کیونکہ وہ عُمْیٌ اندھے ہیں کہ چیزوں کے حسن وقبح کو نہیں دیکھ سکتے۔

فَهُمْ ۔ پس وہ اگرچہ اس معاملہ سے ہٹنے اور واپس آنے کا قصد کریں لیکن لاَ یَرْجِعُوْنَ وہ ہرگز لوٹ نہیں سکتے۔ کیونکہ دنیا میں جو کچھ جوہر روح میں راسخ ہوا موت کے بعد زائل نہیں ہوتا اور اس کا تدارک حد امکان سے خارج ہے۔ اور اس وقت حواس ومشاعر روح کی اسی کیفیت راسخہ کے تابع ہوتے ہیں۔ اور اس کے خلاف دیکھنا' سننا اور کہنا اس حال میں کسی سے نہیں ہوسکتا۔ ہاں دیکھنے اور سننے کا اعتبار کئے بغیر اس کیفیت کو جزا کے آثار لازم آئیں گے۔ اور یہی عذاب کا معنی ہے۔ اور اسی لئے اہل عقل اور اہل شرع کا اس بات پر اجماع ہے کہ موت کے بعد جدید کسب ممکن نہیں ہے۔ اور زندگی کی کسب کی ہوئی چیزوں کو اپنے سے جدا کرنا اور دور پھینکنا بھی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ اور وہ جو دوسری آیات میں فرمایا ہے کہ کافروں اور منافقوں کے حواس موت کے بعد قیامت کے دن تیز ہو جائیں گے۔ اور ان کی قوت شنوائی اور بینائی ترقی کرے گی۔ جیسا کہ سورۃ مریم میں ہے اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا ۔ پس اس آیت کے منافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے حواس کی تیزی کسب کئے ہوتے اعمال کی جزا کے آثار کو پانے میں تیز ہوگی نہ کہ حق کو پانے میں اور اگر اس جہان میں انہیں دریافت حق بھی نصیب ہوگی تو حسرت وافسوس کے طریقے سے ہوگی نہ کہ تہذیب کسب کرنے کے طریقے سے تاکہ انہیں مفید ہو۔ جس طرح دق کی بیماری والہ کہ اسے دق کے آخری درجہ پر پہنچ کر اپنی بری تدبیر' ضروری قانون اور مرض کے دوسرے اسباب حواس پر ظاہر ہو جائیں تو حسرت وندامت اور دست افسوس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا وآخرت میں اس قسم کے حالات سے پناہ دے۔

اور ہوسکتا تھا کہ لما کا جواب ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ہو اس لئے کہ ان کی ساری مدت

عمر ماحول کو روشن کرنے میں گزری اور جب اس جہان سے گئے اس نور کا فائدہ گم کر دیا۔ اور اکثر مفسرین نے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کو تشبیہ و تمثیل میں داخل کیا ہے۔ اور نور کو لے جانا ان کی ذلت اور طاعات میں بے توفیقی پر جو کہ وہ دنیا میں رکھتے ہیں محمول کیا ہے۔ لیکن اس محمول کرنے میں ایک قوی خدشہ ہے۔ کیونکہ ان کے زبانی ایمان کا اثر جو کہ نور سے مراد ہے دنیا میں ان سے کبھی جدا نہ ہوا۔ ہمیشہ ان کے جان اور مال محفوظ رہے۔ اور ایمان والوں کا ان کے درپے ہونا واقع نہیں ہوا۔ پس ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کا معنی کیا ہوگا۔ اور اس سے زیادہ ان کے زبانی ایمان کا اثر نہ تھا کہ اسے زائل ہونے والا کہا جائے۔ اور اس کے بدل میں تاریکیوں کو لایا جا سکے۔ پس یہ حالت نہیں ہے مگر حالت آخرت جو کہ موت کے بعد رونما ہوگی۔

اور اگرچہ یہ مثال منافقین کے معاملہ کے خسارہ کے بیان میں جو کہ گمراہی خریدنے اور ہدایت دینے میں انہوں نے ظاہر کیا کافی اور شافی ہے۔ لیکن اگر اس خرید و فروخت کے بعد ان کے حال پر نظر کی جائے۔ اور وہ پوری نفرت اور بلاشک و شبہ اعراض جو کہ اسباب ہدایت سے انہیں رونما ہوا اگر اسے نظر میں رکھا جائے تو ایک اور مثال ان کے حال کے موافق آتی ہے۔ پس سامع کو اختیار ہے کہ اگر چاہے۔ تو اسی مثال پر قناعت کرے۔ اور اگر چاہے۔ تو وہ دوسری مثال بھی ملاحظہ کرے۔ چنانچہ فرمایا او یا گمراہی خریدنے اور ہدایت دینے یا اسباب ہدایت سے پوری نفرت کے باوجود ہدایت دے کر گمراہی خریدنے میں ان کی مثال كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ اس شخص کی ہے جو کہ اس جگہ سے بھاگ کر جہاں آسمان سے کثرت سے بارش برستی ہے ایسے مکان کو اختیار کرے جہاں قحط ہو۔ اسی طرح منافقوں کے اس گروہ نے اسلام سے بھاگ کر جو کہ آسمان سے علوم نافع کی بارش کا مکان ہے۔ اور تجلیات کے وارد ہونے اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال کی برکات کی جگہ ہے۔ کفر کو جو کہ قحط زدہ مقام کی مثل ہے کہ نہ وہاں آسمان سے علم نافع کی بارش ہوتی ہے نہ انوار و برکات اعمال صالحہ وہاں وارد ہوتے ہیں جائے قرار اور پناہ گاہ بنا لیا ہے۔ اور اپنے خیال میں اس بدلنے اور معاوضے کو انہوں نے عین حکمت و عقلمندی سمجھا ہے۔ کیونکہ بارش کے

مقام پر کئی تکالیف متوقع ہوتی ہے کہ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ اس بارش میں تاریکیاں ہیں اول تو تہہ بہ تہہ بادل کی تاریکی کہ گویا اس کا ہر طبقہ علیحدہ تاریکی ہے۔ دوسری قطروں کے ہجوم کی تاریکی' تیسری رات کی تاریکی اگرچہ اس مثال میں رات کا ذکر صراحت سے نہیں آیا لیکن برق کے ذکر سے اور وہ جو كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا فرمایا صراحت کے قریب ہی پہنچ گیا کہ یہاں رات کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہ حالت صرف رات کو واقع ہوتی ہے۔ وَرَعْدٌ اور اس بارش میں تیز آواز ہے جو کہ بادل سے سنی جاتی ہے خواہ وہ بادل کے جسموں کے ٹکرانے کی وجہ سے ہو یا اجزائے دخانیہ کے پھٹنے سے وَ بَرْقٌ یعنی اس بارش میں بجلی بھی چمکتی ہے جو کہ آنکھ کو چندھیا دیتی ہے۔ اسی طرح یہ منافق اسلام سے کئی تکالیف کی توقع کرتے ہیں۔ اور جاہلوں کے طعنے' جہاد کی مشقتیں' گھر بار کو چھوڑنا اور قبیلہ اور خاندان سے جدا ہونا ان کی نظر میں تاریکیاں ہیں۔ اور خواہشات کو پورا کرنے اور غضب کو بروئے کار لانے سے شریعت کی جھڑکیاں جو کہ اسلام میں سنتے ہیں رعد شدید کی طرح ان کے جگروں کو پھاڑتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے انوار جلالیہ جو کہ دلائل اور معجزات سے چمکتے ہیں ان کی بصیرت کی نگاہ کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ اور اسے بجلی خیال کرتے ہیں بلکہ جس طرح بارش کے مکان سے بھاگنے والے۔ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ اپنی انگلیاں ڈال لیتے ہیں فِيْٓ اٰذَانِهِمْ اپنے کانوں کے سوراخوں میں ڈر کی وجہ سے مِّنَ الصَّوَاعِقِ یعنی رعد کی تیز آواز کی تاثیر سے اور بجلی کی آگ گرنے سے حذر الموت موت کے خوف سے کہ کہیں تیز آواز دل کو صدمہ پہنچائے اور موت تک پہنچا دے۔ اسی طرح منافقوں کا یہ گروہ تہدیدات شرعیہ سننے سے اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان ہولناک جھڑکیوں کو سن کر شہوت وغضب جو کہ دنیوی زندگی سے لذت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں مر جائے۔ اور یہ بھاگنا انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے رہائی نہیں رکھتے۔

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہر طرف سے پکڑنے والا ہے۔ اور وہ بچ نہیں سکتے کیونکہ قہر تشریعی سے بھاگیں تو اس کے قہر تکوینی سے کیسے بھاگ سکیں

گے۔ اور اگر انہوں نے تہدیدات قرآنی سننے سے اپنے کانوں کو بند کر لیا تو غازیوں کے گھوڑوں کے ہنہنانے' مجاہدین کی تلواروں اور نیزوں کی جھنکار اور ان کے تند و تیز نعروں کے سننے سے اپنے کانوں کو کس طرح بند کر سکیں گے۔ چنانچہ بارش سے بھاگنے والوں کو بجلی کی چمک خوف کا موجب بنتی ہے یہاں تک کہ:

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ قریب ہے کہ بجلی کی تیز چمک ان کی بینائی لے جائے۔ اور انہیں اندھا کر دے۔ اور اسی طرح دلائل باہرہ اور معجزات قاہرہ کے انوار ان چمگادڑ سیرت لوگوں کی بصیرت کی نظر اندھا کرتے ہیں۔ جس طرح کہ بارش سے بھاگنے والوں کو بارش کی تاریکیوں کی وجہ سے حیرت اور بے کلی رونما ہوتی ہے یہاں تک کہ

كُلَّمَا اَضَآءَ لَهُمْ جب بھی بجلی چمکنے سے ان کیلئے جہان روشن ہو جائے مَّشَوْا فِيْهِ اس کی روشنی میں راہ چلتے ہیں اسی طرح منافقوں کا یہ گروہ جب نور اسلام کا غلبہ اور معجزات قاہرہ کا ظہور پاتا ہے۔ تو ظاہری طور پر سیدھی راہ پر قائم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بارش سے بھاگنے والے وَاِذَآ اَظْلَمَ اور جب ان پر جہان تاریک ہو جاتا ہے عَلَيْهِمْ ان پر بجلی کی روشنی چلے جانے کی وجہ سے قَامُوْا یعنی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور راستہ نہیں چل سکتے۔ اسی طرح جب ان منافقوں کو اسلام میں کوئی تکلیف اور مشقت نمودار ہوتی ہے۔ تو اپنے کفر میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ارتداد اور نفاق کے کلمات ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ بارش میں اگرچہ اس قسم کی مشقتیں اور تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اور وہ سمع و بصر کی حس پر صدمہ پہنچاتی ہے۔ لیکن اس سے جو منافع متوقع ہیں ہزاروں مرتبہ ان مشقتوں کے برداشت کرنے اور ان صدموں کو قبول کرنے سے بہتر ہیں۔ اور اس کے باوجود اسی سے بھاگنا فائدہ نہیں دیتا کیونکہ خدا کے کارخانہ میں مشقت کے اسباب صرف اسی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اس قدر احتیاط کے باوجود کہ وہ اپنی انگلیاں رعد کی آواز کے خوف سے اپنے کانوں میں کر لیتے ہیں۔ اور بجلی کی چمک سے بھاگتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسا کر سکتا ہے کہ ان کے کانوں کو بہرا اور ان کو اندھا کر دے۔ بلکہ

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اگر اللہ تعالیٰ چاہے۔ تو ان کی

شنوائی اور ان کی بینائی کو رعد اور برق کے بغیر ہی لے جائے اس لئے کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تحقیق اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اس کی قدرت کسی سبب کی محتاج نہیں ہے۔ اور کوئی مانع اسے اپنی قدرت جاری کرنے سے روک نہیں سکتا۔ پس عمدہ منفعت کے مکان کو قلیل نقصان کے توہم کی وجہ سے کیوں چھوڑا جائے خصوصاً جبکہ وہ چھوڑنا یقین کے ساتھ اس نقصان سے خلاصی پانے کا موجب نہ ہو۔

چند سوالات اور جوابات

یہاں چند سوال باقی رہ گئے ہیں کہ یہاں مفسرین ان کے جواب کے درپے ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ فَلَمَّآ اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ کے لفظ پر نظر کرتے ہوئے مناسب اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ ذَهَبَ اللّٰهُ بِضَوْءِهِمْ فرمایا جاتا۔ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کیوں لایا گیا۔

ضوء اور نور کے معنوں میں فرق:

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ضوء زیادہ تر مضیئ بالذات کے اثر میں استعمال ہوتا ہے۔ اور نور عام ہے خواہ مضیئ بالذات کا اثر ہو یا مضیئ بالعرض کا۔ جس طرح کہ آیت هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا میں اس کا اشارہ ہے۔ پس اس آگ کے بے اثر ہونے کے بیان کے مقام پر ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ زیادہ مناسب ہوا تاکہ اس پر دلالت کرے کہ اس کا آگ اثر واسطہ کے ساتھ اور بے واسطہ سب ختم ہو گیا۔ اور اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔ یہ توجیہ جواب اس صورت میں ہے کہ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ تمثیل میں داخل اور لما کا جواب ہو۔ اور اگر لکھی گئی تقسیم کے موافق ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ موت کے بعد منافقوں کے حال کا بیان ہو نہ کہ تمثیل میں داخل تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ضوء حسی شعاع میں مستعمل ہوتا ہے۔ اور یہاں ایمان کی روشنی برباد کرنا منظور ہے جو کہ معنوی ہے۔ پس لفظ نور کا استعمال ضروری ہوا تاکہ سننے والے کا خیال ضوء حسی کی طرف نہ جائے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دنیا میں کافروں کے حال کے بیان میں پہلے بہرہ ہونا' اس کے

بعد گونگا ہونا اور اس کے بعد اندھا ہونا بیان فرمایا۔ جیسا کہ آیت صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ میں جبکہ آخرت میں کافروں کے حال کے بیان میں اندھا ہونے کو گونگا ہونے سے اور گونگا ہونے کو بہرہ ہونے سے پہلے ذکر فرمایا۔ جیسا کہ سورت بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کے قول وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا میں ہے اس طرز کے بدلنے میں کیا نکتہ ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں حقائق الٰہیہ اور اخرویہ پردے اور حجاب میں ہیں۔ اور اکثر افراد بنی آدم کے افراد ان حقائق سے نابینائی رکھتے ہیں۔ حقائق کی دریافت کا طریقہ یہی ہے کہ واعظوں' مرشدوں اور پیغمبروں علیہم السلام کے کہے ہوئے کو جو کہ ان حقائق کو دیکھتے ہیں۔ اور ہم تک پہنچاتے ہیں سنا جائے۔ اور سننے کے بعد کوئی شبہ اور خلش باقی رہ جائے تو تفتیش' سوال اور تحقیق کی جائے۔ اور تحقیق و تفتیش کے بعد صداقت وحقانیت کی علامات ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ اور نابینائی اٹھ جاتی ہے۔ پس ان تینوں مرتبوں کے فقدان کو دنیا میں اسی ترتیب سے یاد فرمایا۔ جبکہ آخرت میں حجاب برخاست اور درمیان سے پردہ اٹھا ہوا آئے گا۔ کچھ ہی ہے دیکھنا ہے کسی واعظ و مرشد کی وہاں ضرورت نہیں۔ کہ عیان کسی بیان کا محتاج نہیں۔ پس اس مقام میں حقائق کی دریافت کے طریقے کا فقدان یہی ہے کہ حقیقت میں آنکھ اندھی ہو جائے اس کے بعد سوال وتفتیش کا آلہ جو کہ حرف اور آواز ہے گم ہو جائے اس کے بعد اگر سوال و تفتیش کے بغیر بھی کوئی آواز اپنے کان میں محسوس نہ ہوگی تو آخرت کی نسبت سے یہی ترتیب زیادہ مناسب ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کلام عرب میں او شک کیلئے آتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خبروں میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ تو اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ میں کلمہ اَوْ کے استعمال کیا کیا وجہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اصل کلمہ 'او' خبری کلام میں شک کیلئے ہے۔ لیکن جب کلام خبری اختیار دینے اور برابر بتانے کے معنوں کو ضمن میں لئے ہو تو لفظ او کو شک سے خالی لاتے ہیں۔ اور تسویہ اور تخییر میں استعمال کرتے ہیں۔ اور یہاں اس اظہار کیلئے اس کلمہ کو لائے ہیں کہ دونوں تشبیہیں جواز میں برابر ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ منافقوں کو اگر معاملہ

کے خسارہ اور دنیا کو آخرت کے بدلے اور گمراہی کو ہدایت کے بدلے لینے میں آگ جلانے والے کے حال سے تشبیہ دیں جس نے اپنی جلائی ہوئی آگ کو برباد کر دیا۔ اور نقصان اٹھایا تو بھی جائز ہے۔ اور اگر ان لوگوں کے حال کو تھوڑے سے نقصان کے وہم کی وجہ سے نفع کے مقام سے منہ موڑنے میں اور تھوڑی سی مشقت کے ڈر کی وجہ سے فوائد کثیرہ سے بھاگنے میں بارش سے بھاگنے والوں اور اس کی رعد' تاریکی اور برق سے ڈرنے والوں کے حال سے تشبیہ دیں تو بھی روا ہے۔ سننے والا با اختیار ہے خواہ اس تشبیہ کو سنے یا اس تشبیہ کو کیونکہ دونوں تشبیہیں ان کے حال کی صورت بیان کرنے میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ بارش تو آسمان کی طرف سے ہی آتی ہے۔ تو لفظ مِنَ السَّمَآءِ کا فائدہ کیا ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی بارش کو ہر کثیر منفعتوں والی چیز کیلئے بطور مجاز استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح کہ کہتے ہیں کہ فلاں مقام میں نعمت برتی رہے' فلاں شہر میں سونا برستا ہے۔ اس مجاز کے توہم کو دور کرنے کیلئے اس لفظ کو بڑھانا ضروری ہوا تا کہ کوئی لفظ صیب کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرے۔ جس طرح کہا گیا ہے و اذا استیقظ من منامه جب وہ اپنی نیند سے بیدار ہوا تو مِنْ مَّنَامِه کا لفظ بڑھانے سے غرض اس وہم کو دور کرنا ہے کہ کوئی استیقاظ کو خواب غفلت سے تنبیہ پر محمول نہ کرلے اور اسی قیاس پر لفظ طائر یطیر بجناحیہ میں کہا گیا ہے کہ کوئی طیران سے مراد ہمت کی پرواز نہ لے۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ کانوں میں انگلیوں کے سرے ڈالتے ہیں نہ کہ پوری انگلیاں تو مناسب اس طرح تھا کہ یَجْعَلُوْنَ انا ملهم فرمایا جاتا نہ کہ اَصَابِعَهُمْ کیونکہ اصابع پوری انگلی کو کہتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ انگلی کو کان کے سوراخ میں لانا اس کو لازم نہیں کہ ساری انگلی اس میں جائے بلکہ جب انگلی کا سرا کان کے سوراخ میں گیا تو کہا جا سکتا ہے کہ کان میں انگلی آئی۔ اور لفظ اصابع جو کہ پوری انگلی کا نام ہے کے استعمال میں مبالغہ بھی سمجھا جا سکتا ہے گویا ارشاد ہوتا ہے کہ کمال خوف کی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ اپنی ساری انگلیاں اپنے کانوں کے سوراخوں میں ڈال لیں تا کہ کسی طرح بھی رعد کی تیز آواز ان کے کانوں میں نہ

آئے۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ بارش بادل سے برستی ہے آسمان سے نہیں۔ پس اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ کا معنی کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ بارش بادل سے ہی برستی ہے مگر بادل کا ہونا آسمانی جہتوں پر موقوف ہے۔ جس طرح کہ آنے والی آیت میں مذکور ہے۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ بارش آسمان سے آتی ہے۔ اس کے باوجود آسمان سے مراد جہت آسمان ہے نہ کہ جسم آسمان اور بادل آسمان کی جہت میں ہے۔ اگرچہ آسمان میں نہیں ہوتا۔

بادلوں اور رعد وغیرہ کی پیدائش کا بیان:

یہاں اہل حکمت نے کہا ہے کہ جب فلکی قوتیں عناصر میں اثر کرتی ہیں تو گرمی اور بخارات کی وجہ سے عناصر حرکت میں آتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور عناصر کے باہم ملنے سے کئی کئی مخلوقات معرض وجود میں آتی ہیں مثلاً جب موسم گرما کی گرمی عناصر میں قوی اثر کرتی ہے۔ تو دریا سے بخار اور زمین سے دھواں اٹھتا ہے۔ اور آسمان کی طرف جاتا ہے۔ پس کبھی دھواں ہوا کے مقام سے اوپر چلا جاتا ہے۔ اور کرۂ آگ کی حد میں پہنچ جاتا ہے۔ اور شعلہ بار ہوتا ہے۔ اور کبھی چند دنوں وہ شعلہ باقی رہتا ہے۔ اور دم دار ستارے اور نیزے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اور اگر شعلہ کی صورت میں چمکنے کے بعد عنقریب زائل ہو جائے تو شہاب ہوتا ہے۔ اور گاہے مشتعل نہیں ہوتا بلکہ جلنے لگتا ہے۔ اور سرخ وسیاہ علامات آسمان اور زمین کے درمیان ظاہر ہوتی ہیں۔ اور بخار اٹھنے کے وقت چند قسموں کا ہوتا ہے کبھی لطیف ہوتا ہے۔ اور بہت اونچا جاتا ہے۔ اور ایسے مکان تک پہنچ جاتا ہے کہ آفتاب کی شعاع زمین سے اس مکان تک منقطع ہو جاتی ہے۔ اور سردی اور موٹاپا قبول کرتا ہے۔ اور قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گرتا ہے اس موٹے بخار کو بادل کہتے ہیں۔ اور قطروں کو بارش کا نام دیتے ہیں۔

کبھی اتنا لطیف نہیں ہوتا بلکہ کچھ بوجھ بھی اس میں موجود ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے زیادہ بلندی پر نہیں جاتا اور یہ بخار پچھلی رات کی سردی سے جلد جم کر گرتا ہے۔ اور اسے شبنم کہتے ہیں۔ اور کبھی ہوا کی شدید ٹھنڈک کی وجہ سے موٹا بخار جو کہ نازل ہونے لگتا ہے راہ

میں جم کر گرتا ہے اسے ژالہ کہتے ہیں۔ نیز کہتے ہیں کہ بخار دھواں اور غبار جب مل کر زمین سے اٹھتے ہیں۔ اور اٹھنے کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اور غبار واپس ہو جاتا ہے جس سے تیز ہوائیں اور آندھیاں آتی ہیں۔ اور بخار اور دھواں جب ٹھنڈک کی حد کو پہنچتے ہیں تو بخار سرد ہو جاتا ہے۔ اور دھواں اس کے درمیان دباؤ ڈالتا ہے۔ تاکہ اوپر کو نکلنے کا راستہ پیدا کرے۔ اور اس دباؤ سے تیز آواز پیدا ہوتی ہے۔ جسے رعد کہتے ہیں۔ اور کبھی اس دباؤ کی شدید حرکت کی وجہ سے دھواں شعلہ بار ہو جاتا ہے۔ اور بجلی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی تہہ بہ تہہ موٹا اور ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے بخار جم جاتا ہے۔ اور زمین پر گرتا ہے اسے صاعقہ یعنی گرنے والی بجلی کہتے ہیں یہ ہے ان چیزوں کا بننا اہل حکمت کے طریقہ پر۔

لیکن ان کی نظر قاصر ہونے کی وجہ سے سوائے مواد کی استعداد اور صور نوعیہ کی تاثیر کے کچھ دریافت نہیں کر سکتی اس لئے انہوں نے اسی قدر پر اکتفا کیا۔ اور حقیقت میں ان اسباب کے ساتھ اور اسباب بھی اس کارخانہ کیلئے بلکہ کائنات کے تمام کارخانوں کیلئے درکار ہیں۔ اور وہ ان مادوں اور صورتوں پر مدبرہ موکلہ روحوں کے ارادے اور اختیار ہیں کہ شرع کی زبان میں انہیں ملائکہ اور فرشتے کہتے ہیں۔ اور زمان و مکان کی خصوصیتیں اور اسباب مادیہ اور صوریہ کے اجتماع کے باوجود اثر کا پیچھے رہ جانا اسی اختیار اور ارادوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اس لئے شارع علیہ السلام نے علت نامہ کے جز و اخیر یعنی ارواح مدبرہ کے ارادہ و اختیار کے تعلق کا اعتبار فرمایا کہ اس کارخانہ کو بلکہ جہان کے تمام کارخانوں کو پورا کرنے کو ملائکہ کے فعل کی نسبت سے فرمایا۔ اور ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کے امر تکوینی کے تابع قرار دیا کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کیلئے ان کی خوبی ہے کتنی باریک بین ہے ان کی نظر اور کتنا میٹھا ہے ان کا پھل۔

اگر انسان کی قوت فکریہ ہر چیز کے اسباب مادیہ اور صوریہ کی گہرائی میں اترے تو اسے اسباب کے منتہی سے کمال غفلت معلوم ہو۔ اور مسبب کی معرفت ہرگز میسر نہ ہو اگر کلی طور پر اسباب کی نفی کرے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کارخانہ کا منکر ہو جائے گا۔ اور ان تمام اسباب کی تخلیق کو باطل سمجھے گا سُبْحَانَكَ مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا تو پاک ہے۔ تو نے اسے بے

مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ پس جو اعتقاد کہ دنیا و آخرت میں نافع ہو وہ یہی اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بننے والی چیز کا بلاواسطہ فاعل ہے۔ لیکن اسباب کو درمیان میں لانا اس کی عادت کریمہ کا دستور ہے۔ تاکہ حکمت اور قدرت میں سے کسی کا بے مقصد ہونا لازم نہ آئے۔ از سبب سازیش من سوداہم۔ از سبب سوزیش سوفسطاہم۔ اس کے بنانے کے سبب سے میں سودائی ہوں اور اس کے سوز کے سبب سے سوفسطائی ہوں۔

اور جب یہ معنی معلوم ہوا تو جاننا چاہئے کہ حکماء نے جو کچھ بادل' بارش' رعد اور برق کے بننے میں کہا ہے وہ صرف قدرت الٰہی کے ساتھ واقع ہونے والی صورتوں میں سے ایک صورت کی تصویر کیلئے کہا ہے۔ تاکہ دوری دفع ہو۔ اور اسباب کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے جاری ہونے کے ادراک سے الفت رکھنے والا ذہن قبول کرلے۔ ورنہ ان امور کیلئے اور طرق و اسباب بھی متصور بلکہ واقع ہیں چنانچہ آنے والی آیت کی تفسیر اور پہلی اقوام کے عذابوں کے واقعات میں اس کا اشارہ آئے گا انشاء اللہ اور جب نیک بختوں اور بدبختوں کے گروہوں کے بیان سے فراغت ہوئی۔ اور ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب متقیوں کیلئے ہدایت ہے جن کے پانچ گروہ ہیں اب اس سورت کے نازل کرنے سے جو مقصود ہے اسے شروع فرمایا۔ اور تقویٰ کو حاصل کرنے کے طریقے پر دلالت فرمائی جو کہ قرآنی ہدایت سے نفع پانے کا سبب ہے گویا اس طرح فرمایا کہ جب لوگوں نے جان لیا کہ یہ کتاب متقیوں کی ہدایت کیلئے نازل ہوئی تو انہیں اپنے لئے تقویٰ حاصل کرنے کی فکر کرنا چاہئے۔ اور اسے حاصل کرنے کا طریقہ ہم سے سنیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ اس مثال سے جو ہم نے منافقوں کے بارے میں بیان فرمائی کہ یہ لوگ دین اسلام سے جو کہ سراسر ہے۔ بختیوں کی تاریکیوں اور وعید کی رعد و برق کی وجہ سے بھاگتے ہیں۔ جس طرح کہ لوگ بارش سے جو کہ عین رحمت ہے ان چیزوں کے ڈر سے بھاگتے ہیں جگہ سے مت ہلو اور مت کہو کہ عقل مندوں کا کام یہی ہے کہ وہ دنیوی نقصان سے بھاگتے ہیں۔ اور متوقع نفع پر دا نہیں دیتے۔ پس ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ مثال تو کوتہ نظر منافقوں کے حال

صرف تصویر ہے کسی علم کا فائدہ نہیں دیتی۔ پس یہ ان یقینی دلائل جو کہ دین اسلام کو قبول کر کے اور اس دین کے احکام کی اطاعت کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے وجوب پر دلالت کرنے والے ہیں کے مقابل نہیں ہو سکتی تو جو اس قسم کے مواقع پر مضبوطی سے پکڑنے کی اصل کو چھوڑ دے اور اس ضعیف مثال سے دلیل لے گو یا وہ انسانیت سے باہر آ گیا۔ اور لفظ ناس کے مفہوم سے خارج ہو گیا۔ اور اس محکم اصل کا حاصل یہ ہے کہ ربوبیت کی حقیقت' معبود ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور حقیقت عبدیت' عابدیت کو چاہتی ہے خصوصاً جب ربّ تعالیٰ نے بندے کو ایسی نعمت عطا کی جو کہ بزرگزین نعمت ہے۔ اور ہر نعمت اس نعمت کے حصول کے بعد ملتی ہے۔ اور وہ ایجاد کرنے کی نعمت ہے کہ ذات عبد کو بھی عدم کے پردے سے وجود میں لایا گیا ہے۔ اور اس کے مبادی و اصول کو بھی وجود کی خلعت بخشی کیونکہ منعم وہی ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ یعنی اس کی وہ جس نے تمہیں۔ اور انہیں پیدا فرمایا جو تم سے پہلے ہوئے ہیں تمہارے آباؤ اجداد سے یہ پیدا کرنا ایک نہایت عمدہ نعمت ہے اس کے عوض ایسا شکر کرنا چاہئے جو کہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اور وہ عبادت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ میں بندے سے عبادت اپنے نفع کیلئے نہیں چاہتا بلکہ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اس لئے کہ شاید تم متقی ہو جاؤ اور قرآن پاک کی ہدایت سے جو کہ متقیوں کے نصیب میں ہے تم بہرہ ور ہو جاؤ اور اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ عبادت کی حقیقت نسبت عبودیت کو صحیح کرنا ہے۔ اس لئے کہ جب بندے نے اپنے آپ کو ممکن جانا تو اپنے ربّ کو وجوب کے ساتھ پہچانے گا اور جب اپنے آپ کو مملوک جانا تو اپنے ربّ کو مالک جانے گا اور جب اپنے آپ کو مغلوب دیکھا تو اپنے ربّ کو غالب دیکھے گا۔ اور جب اپنے آپ کو تحت قدرت دیکھا تو اپنے ربّ کو قادر دیکھے گا اور جب اپنے آپ کو مامور اور عاجز جانا تو اپنے آپ کو آمر اور غالب جانے گا علیٰ ہذا القیاس۔ پس اپنی حد سے آگے نہیں گزرے گا اور اس عقلی قضیہ کو منعکس نہیں کرے گا۔ اور اپنے میں کوئی قدرت اور تصرف کسی طرح بھی نہیں پائے گا اور اپنے آپکو ایک عاجز غلام کی طرح جانے گا جو کہ اپنے مالک کے حضور پاؤں پر کھڑا اور کمربستہ ہو کر اس کے ہر امر

اور نہی کا منتظر ہے۔

اصمعی نے روایت کی ہے کہ ایک غلام کو ایک شخص کے سامنے لایا گیا۔ تا کہ وہ اسے خریدے۔ اس شخص نے غلام سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے اس نے کہا جو تو میرا نام رکھے گا۔ اس شخص نے پوچھا کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو تو کھلائے گا' پھر پوچھا کہ کیا پہنے گا اس نے کہا جو تو پہنائے گا۔ اس شخص نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ میں تجھے خرید لوں۔ غلام نے کہا کہ بندہ کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ خواہش اس کے مولیٰ کی خواہش ہے۔

اور جب عبادت کا معنی نسبت عبودیت کو صحیح کرنا ہے۔ تو عبادت کا حکم فرمانا کافر اور مومن کو شامل ہے۔ عبادت کے مبادیات اور اس کی نہایات کو بھی شامل ہے۔ اور اس کے اصول وفروع کو کہ اللہ تعالیٰ کی شریعتیں اس کی شرح وتفصیل ہیں۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اگر چہ عبادت کی حقیقت صرف اپنے نفس کے حال پر توجہ اور اپنے آپ پر داغ عبودیت دیکھنے سے ظاہر ہے۔ لیکن یہاں بشری قصور اور قوت فکری کی کمزوری کی وجہ سے معرفت معبود کی طرف ایک راہ کا نشان دیا گیا ہے جو کہ بہت آسان اور واضح ہے۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ عقل والوں میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ میں ایک وقت معدوم تھا اس کے بعد میں موجود ہوا اور جو عدم کے بعد موجود ہو اس کا کوئی خالق چاہئے۔ اور میرا خالق میرا نفس نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرے ماں باپ اور نہ ہی میری جنس کے دوسرے لوگ کیونکہ یہ سب کے سب میری طرح عاجز ہیں اگر کسی صدمہ کی وجہ سے میرے بدن کی کھال کو خراش لگے یہ اسے لوٹا نہیں سکتے۔ اور نہ ہی فضول طبائع' افلاک' عناصر اور کواکب خالق ہیں۔ کیونکہ یہ بھی تغیر وتبدل کے چکر میں گرفتار ہیں۔ پس خالق کوئی ایسی ذات ہے جو کہ عاجزی' حادث ہونے تغیر وتبدل اور نقصان سے پاک ہے۔ اور وہی ذات معبود ہے۔

چند بحثیں۔ یا ایھا الناس والی آیت مکی اور یا ایھا الذین امنوا والی آیت مدنی ہے

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں کہ مفسرین نے ان میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ پہلی یہ

کہ علقمہ سے روایت آئی کہ جس آیت کی ابتداء میں یَآاَیُّھَا النَّاسُ ہے مکی ہے اور ہر وہ آیت جس کی ابتداء میں یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ہے مدنی ہے۔ اور یہ دونوں قاعدے ٹوٹ گئے ہیں۔ کیونکہ آیت بالا جماع مدنی ہے۔ حالانکہ اس کے پہلے یَآاَیُّھَا النَّاسُ ہے۔ اور آیت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا جو کہ سورت تحریم میں واقع ہے مکی ہے۔ حالانکہ اس کے اول میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ کلام علقمہ میں مکی اور مدنی ہونے کا معنی یہ نہیں ہے کہ مکہ اور مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں بھی یَآاَیُّھَا النَّاسُ آیا یہ مشرکین مکہ سے خطاب ہے۔ کیونکہ زیادہ مکہ میں رہتے تھے۔ اور جہاں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وارد ہوا ہے وہ مومنوں سے خطاب ہے جو غالباً مدینہ عالم میں رہتے تھے۔ کیونکہ اس وقت کفر کے غلبہ کا مقام مکہ اور غلبہ ایمان کا مقام مدینہ عالیہ تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ لغت عرب میں لعل امید اور توقع کیلئے ہے۔ اور امید اور توقع اس کے لائق ہے جو کام کی عاقبت سے آگاہ نہ ہو۔ کلام الٰہی میں کیونکر واقع ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ کلام الٰہی میں حرف امید دو جہت سے واقع ہوا۔ اول بندوں کی حالی یا قالی کلام کی نقل جیسا کہ لَعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی اس لئے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام جب فرعون کی طرف مبعوث ہوئے ان کا حال اسی توقع کا تقاضا کرتا تھا گو واقع نہ ہوا دوسری جہت یہ کہ امید کے معنی سے خالی کر کے تعلیل کے معنوں میں استعمال کریں اسی لئے فراء نے کہا ہے کہ کلام الٰہی میں لعلل بمعنی "کے" ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عبادت تقویٰ کے بغیر کوئی اور چیز نہیں۔ پس اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ کے بعد لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ کہنا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَعْبُدُوْنَ یا اِتَّقُوْا رَبَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ کہیں۔ اور یہ بہت نامناسب کلام ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کا معنی عبودیت کی نسبت کو صحیح کرنا ہے۔ اور اس تصحیح کی انتہاء صفت تقویٰ سے متصف ہونا ہے۔ پس عبادت اور تقویٰ باعتبار انتہاء کے باہمی اتحاد رکھتے ہیں۔ اور ابتداء کے اعتبار سے فرق اور غیریت۔ یہاں کلام ابتدائے حال کے اعتبار سے ہے۔ اور یہ احتمال ہے

کہ یہاں اتقاء اپنے لغوی مفہوم بمعنی پرہیز کرنا اور اپنے آپ کی حفاظت کرنے کے موافق ہو یعنی اپنے پروردگار کی عبادت بجالاؤ تاکہ اپنے آپ کو اس کے غضب سے بچالو کیونکہ حقوق کو ضائع کرنا اس کے غضب کا موجب ہے۔اور عبادت ترک کرنے میں تین حق تلف ہوتے ہیں اول اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا حق' دوسرا اپنی عبودیت کا حق' تیسرا اس کی نعمت کا حق کہ اس کے شکر میں دیر کرنا لازم آتا ہے۔اور جو مثال منافقوں کے حق میں گزری ہے اس قابل نہیں کہ عبادت ترک کرنے والے اس سے دلیل پکڑیں بلکہ وہ مثال انہیں پر ابلغ وجوہ سے الٹی پڑتی ہے۔اس لئے کہ جس چیز کو انہوں نے اسلام سے بھاگنے کا منشا قرار دیا ہے۔ درحقیقت اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور اپنے مبدء ومنتہی اور ثمرات کے اعتبار سے بھی اسلام میں داخل ہونے کا سبب ہے۔کیونکہ وہی خالق ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش کی مانند کر دیا ہے کہ اس پر قرار پکڑتے ہو۔اور سکونت اختیار کرتے ہو۔باوجود اس کے کہ دریائے شور نے اس کے اطراف وجوانب میں احاطہ کیا ہے اس سے ایک حصہ کھلا رکھا ہے نہ اس قدر سخت کیا۔

زمین میں صنعت الٰہی کے عجائبات:

کہ سخت چٹانوں کی طرح اس پر سکونت اور رہنا ممکن نہ ہو' نہ اس قدر لطیف اور نرم کیا جیسے پانی اور ہوا اور کیچڑ جس سے کہ قدم پھسلیں۔پس گویا تمام زمین فرش کی طرح بچھی ہے۔اور اپنی جگہ پر قرار پکڑے ہوئے تاکہ اس پر سوئیں اور بیٹھیں۔اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائب میں سے یہ ہے کہ زمین کو اس کے مقام پر ساکن کیا ہے جو کہ جہان کا درمیان ہے۔اس لئے کہ ہر بھاری چیز طبعی طور پر نیچے کی طرف مائل ہے۔جس طرح کہ ہر ہلکی چیز اوپر کی طرف مائل ہے نچلی سمت زمین کے مرکز کا نام ہے جو کہ اس کی حقیقت کے وسط میں ایک نقطہ ہے۔اور اوپر کی جہت اس طرف کا نام ہے جس کا رخ آسمان کی طرف ہے۔پس جس طرح زمین کا آسمان کی طرف اس سمت سے کہ جس پر ہم ہیں بلند ہونا بعید ہے۔اسی طرح زمین کا اس سمت کے مقابل سے نیچے جانا بھی بعید ہے۔اس لئے کہ وہ نیچے

جانا عین آسمان کی طرف بلند ہونا ہے۔ پس اس تدبیر سے زمین کے اپنے اس مقام پر قرار پکڑنے میں کوئی احتیاج نہ رہی کہ اس کے اوپر سے کسی لٹکی ہوئی چیز کے ساتھ باندھیں۔ یا اس کے نیچے سے کسی ستون کے ساتھ اس کی مدد کریں بلکہ اس کی طبیعت میں جو وسط حقیقی کی طرف طبعی میلان رکھا گیا اس بارے میں وہی کافی ہے۔ چنانچہ آیت اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اور زمین کی پیدائش میں بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ ہے کہ اسے پتھر کی طرح سخت نہیں بنایا۔ اور نہ پانی کی طرح نرم۔ تا کہ اس پر چلنا' بیٹھنا اور لیٹنا آسان ہو۔ اور زراعت اور عمارتیں بنانا میسر ہو۔ اور کنویں کھودنا اور نہریں جاری کرنا ممکن ہو۔ اور ان میں سے یہ ہے کہ نہایت لطافت اور صاف ہونے میں ہوا کی طرح نہیں بنایا۔ تا کہ انوار آسمانی کی شعاعیں اس پر قرار پکڑیں اور ان شعاعوں کی وجہ سے اس کے باطن میں حرارت اور گرمی پیدا ہو۔ اور زراعت کے کام آئے۔ اور ان میں سے یہ ہے کہ اسے طبعی طور پر خشک بنایا۔ تا کہ تر عناصر کو اس کے ساتھ خمیر کریں۔ اور مرکبات کے جسم میں ٹھہراؤ پیدا ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں جو زمین میں ودیعت رکھی گئی ہے۔ اور اجمالی طور پر ان نشانیوں آیتوں کی طرف آیت وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ (الذاریات آیت ۲۰) میں اشارہ ہوا چند چیزیں ہیں۔ ان میں سے زمین کے ٹکڑوں کا اختلاف ہے نرمی اور سختی۔ نیز اچھا اگانے اور اس کی ضد میں اور اس کی طرف اس آیت میں تفصیلی اشارہ ہے وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (الرعد آیت ۴)

اور ان میں سے زمین کے رنگ کا اختلاف ہے۔ جیسا کہ آیت وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ (الفاطر آیت ۲۷) میں ہے۔ اور ان میں سے نباتات کا اگنا ہے جو کہ آیت والارض ذَاتِ الصَّدْعِ (الطارق آیت ۱۲) میں مذکور ہے۔

اور ان میں سے یہ کہ اپنی طبعی خشکی کی وجہ سے بارش کے پانی کو جذب کر کے ہضم کرتی ہے۔ اور سنبھال کر رکھتی ہے۔ جیسا کہ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی

الْاَرْضِ (المؤمنون آیت ۱۸) میں مذکور ہے۔

اوران میں سے چشموں کا پھوٹنا اور دریاؤں کا رواں ہونا ہے جو کہ آیت وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا (الحجر آیت ۱۹) میں مذکور ہے۔

اوران میں سے یہ کہ زمین کی طبیعت میں کرم وسخاوت ودیعت رکھی گئی ایک دانہ پکڑتی ہے۔اوراس کے عوض سات سودانہ دیتی ہے۔چنانچہ آیت كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (البقرہ آیت ۲۶۱) میں مذکور ہے۔

اوران میں سے اس کا زندہ ہونا اور مرنا ہے جو کہ حشر وقیامت کا نمونہ ہے۔ ہر سال اس پر دیکھا جاتا ہے۔جیسا کہ اس آیت میں ہے وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا (یٰس آیت ۳۳)

اوران میں سے مختلف جانور ہیں جو کہ اس میں پیدا ہوتے ہیں وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ (البقرہ آیت ۱۶۴)

اوران میں سے قسم قسم کی بوٹیوں کا اگنا ہے آیت وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ (قٓ آیت ۷)

اوراگر اگنے والی چیزوں میں غور کیا جائے تو ان کے رنگوں کا اختلاف ایک بہت بڑی آیت ہے۔اور ذائقوں اور مزوں کا اختلاف علیحدہ آیت ہے۔اور مہکوں کے خلاف ایک اور آیت ہے۔ پھران میں بعض آدمیوں کی خوراک ہے۔اور بعض چرندوں اور پرندوں کی خوراک ہے۔اوران میں سے بعض طعام ہے۔اور بعض سالن، بعض دوا، بعض پھل، بعض آدمیوں کے لباس جیسے روئی اور کتان۔(جو کہ ایک قسم کا کپڑا ہے) ان حیوانی لباسوں کے علاوہ جو کہ بال، اون، ریشم اور کھال سے بنتے ہیں۔

اوران میں سے مختلف پتھر ہیں کہ ان میں سے بعض زینت کیلئے ہیں۔ جیسے یاقوت، الماس، عقیق اور فیروزہ اوران میں سے بعض بنیاد مضبوط کرنے کیلئے ہیں۔جیسے خارا اور علولہ (ایک قسم سخت پتھر کا نام) اور بعض دونوں مقصدوں کیلئے جیسے مرمر اور سرخ۔اوران پتھروں میں عجائب قدرت الٰہی میں سے یہ ہے کہ جس کا فائدہ زیادہ ہے اس کی قیمت اتنی سستی جیسے

سنگ چقماق اور جس کی منفعت تھوڑی ہے وہ زیادہ قیمتی ہے۔ جیسے یاقوت سرخ۔

اور ان میں سے عجیب وغریب کانیں ہیں جو کہ زمین میں رکھی گئی ہیں۔ اور ان میں سے افضل سونا اور چاندی ہے۔ اور اس باب میں عجائب قدرت الٰہی میں سے یہ ہے کہ آدمی کو دقیق پیشے' باریک کاریگریاں اور دور دور کے حیلے سکھائے گئے ہیں یہاں تک کہ مچھلی کو دریا کی تہہ سے اور پرندوں کو ہوا کی بلندی سے شکار کرتا ہے۔ اور اس کے باوجود اسے سونا چاندی بنانے سے عاجز رکھا ہے۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے زیادہ فائدے قیمتی ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اور قیمتی ہونا بغیر عزت کے نہیں۔ اور عزت تقاضا کرتی ہے کہ بشر کو اس کے بنانے کی طاقت نہ ہو ورنہ ذلیل ہو جائے گا اسی لئے کہا گیا ہے من طلب المال بالکیمیاء افلس جس نے کیمیا گری سے مال طلب کیا دیوالیہ ہوا۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ پہاڑوں اور زمین کے دوسرے قطعات میں بڑے جسموں والے درخت اگائے گئے ہیں۔ اور انہیں پھل نہ دیا گیا۔ تا کہ چھت بنانے' جلانے کی لکڑی اور کوئلے کے کام آئیں اور پکانے کے کارخانے میں صرف ہوں۔

مختصر یہ کہ اگر آدمی اپنے حال میں غور کرے۔ اور جہان کو اپنی حاجتوں کے ساتھ وزن کرے تو یقین کے ساتھ جان لے کہ سارا جہان ایک گھر کی طرح ہے کہ اس میں ساری ضروریات مہیا کر کے اسے دیا گیا ہے۔ اور آسمان کو چھت کی مثل بلند کیا گیا زمین کو فرش کی طرح بچھایا گیا۔ اور ستاروں کو چراغوں اور قندیلوں کی طرح لٹکایا گیا۔ اور غذا' دوا' پوشاک' سواری اور زیور' نباتات' حیوانات اور کانوں کی جنس سے اسے عطا کر کے اس خانہ کا مالک بنا دیا ہے۔ اور اپنے انعام واحسان کا گروی بنایا چنانچہ عبادات اور طاعات کی ادائیگی کے ساتھ اس نعمت کے شکر کی طلب کے مقام پر اس معنیٰ کا اشارہ فرمایا ہے۔

وَالسَّمَآءَ بِنَاۗءً اور تمہارے لئے آسمان کو بلند عمارت بنایا ہے چھت کی مانند کہ تم پر سایہ کرے تا کہ عالم بالا کے فرشتوں کے انوار کی شعاعیں تمہارے جہان کو برباد نہ کر دیں۔

اور آسمانوں کو اپنے بندوں کے اوپر بنانے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ ہے کہ آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت دی ہے۔ جیسا کہ آیت وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمٰوٰتِ

السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (الملک آیت ۵) میں مذکور ہے۔ اور چاند سے بھی زینت دی وجعل القمر فیھن نورا اور سورج کے ساتھ بھی وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (نوح آیت ۱۶) پھر کرسی کے ساتھ اس کا احاطہ فرمایا ہے۔ اور کرسی کو عرش سے گھیرا۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (البقرہ آیت ۲۵۵) وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (التوبہ آیت ۱۲۹)

اور ان میں یہ ہے کہ اس چھت کو ٹوٹنے گرنے سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اور چند طبقات بنائے گئے چنانچہ فرمایا وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (النباء آیت ۱۲) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (نوح آیت ۱۵) وَّجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (الانبیاء آیت ۳۲)

اور ان میں سے یہ ہے کہ آسمان کو اعمال کے چڑھنے کا مقام، انوار کی تجلی گاہ، قبلہ دعا اور روشنی اور صفائی کا محل بنایا ہے۔ اور ان میں سے یہ ہے کہ اس کے رنگ کو قوت بصری کیلئے سارے رنگوں سے زیادہ مفید بنایا ہے کہ سبز اور روشن ہے۔ اور اس کی شکل کو بہترین کیا گیا ہے کہ گول ہے۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ آسمان کے ستاروں کو شیطانوں کیلئے سنگسار کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اور انہیں جنگل اور سمندروں کے مسافروں کیلئے راستہ پانے کی علامات بنایا۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ سورج کیلئے ایک طلوع مقرر کیا تا کہ زمین کے اطراف و جوانب میں آدمیوں کیلئے اپنی ضروریات کیلئے آنا جانا آسان ہو۔ اور ایک غروب بھی تا کہ سکون، راحت ہو اور سکون اور نیند کی حالت میں قوت ہاضمہ کو بدن کے باطن میں کامل توجہ ساتھ حاصل ہو۔ اور غذا کو اعضاء کی طرف جاری کرنے کا موقع ملے۔ حکماء کہتے ہیں کہ اگر آفتاب کا طلوع نہ ہوتا تو ٹھنڈک اور کثافت کا اس حد تک غلبہ ہوتا کہ پانی کے جم جانے اور قوت غریزیہ کے جمود کا موجب ہوتا۔ اور اگر آفتاب کا غروب نہ ہوتا تو زمین اس حد تک گرم ہو جاتی کہ جانور اور نباتات سب جل جاتے۔ اللہ تعالیٰ کی عین عنایت ہے کہ نور و ظلمت اور حرارت و برودت کے آگے پیچھے آنے سے آدمیوں کی زندگی میں اعتدال قائم فرمایا ہے۔

آسمان گردش کرتا ہے

نیز کہتے ہیں کہ اگر آسمان گردش نہ کرتا تو سورج آسمان کی ایک سمت میں قرار پکڑتا اور دولت مند سردیوں میں اس طرف کو کھلا رکھتے اور سورج کی شعاع سے نفع لیتے اور موسم گرما میں اس طرف کو بند کر دیتے اور آفتاب کی گرمی سے محفوظ رہتے اور غریب دونوں حالتوں میں محروم و مایوس ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فلک کو گردش دے کر اس نعمت اور اس مشقت کو غنی اور فقیر کے درمیان برابر کر دیا پھر اس سے سورج کے قرب اور دوری کو چار فصلوں کا سبب بنایا۔ تاکہ سردیوں میں حرارت درختوں اور نباتات کے باطن میں چلی جائے۔ اور میوے اور دانے پک جائیں۔ اور حرارت کی قلت کی وجہ سے ہوا پاک اور صاف ہو جائے۔ اور بادل اور برف برسے اور حیوانات کا بدن باطن میں حرارت غریزیہ کے جمع ہونے کے سبب سے قوت پکڑے اور بہار میں سارے طبائع متحرک ہوتے ہیں۔ اور جو مواد سردیوں میں پیدا ہوا تھا وہ ظاہر ہو جائے۔ اور درخت شگوفے لائیں اور جانوروں کو جفتی کا جوش پیدا ہو۔

اور موسم گرما میں ہوا اتنی گرمی پیدا کرے تا کہ میوے پک جائیں۔ اور بدن کی فالتو رطوبتیں تحلیل ہو جائیں۔ اور زمین کی سطح خشک ہو جائے۔ اور زراعت اور عمارت کے قابل ہو جائے او خریف میں سردی اور خشکی غلبہ کرے اور تر میوے ذخیرہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اور حیوانات کے بدن آہستہ آہستہ سردیوں کی مشقت برداشت کرنے کیلئے مستعد ہو جائیں۔

اور چاند کو سورج کا خلیفہ بنایا ہے۔ اور سالوں کی گنتی اور قرضوں اور مدتوں کا حساب اس کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے۔ اور شرعی اوقات کو اس سے مربوط کیا گیا ہے۔ پس اگر آدمی اپنے حال پر توجہ کرے تو یقین کے ساتھ جان لے کہ اسے کسی حالت میں بھی آسمان اور زمین سے گریز نہیں ہے۔ اور اسی لئے ایک کی دوسرے پر ترجیح کی وجوہ متعارض ہو گئی ہیں۔ اگر آسمان اس جہت سے بزرگی رکھتا ہے کہ ملائکہ کی عبادت گاہ ہے۔ اور نافرمانی اور گناہ سے خالی اور محفوظ چھت ہے۔ اور برکت سے موصوف اور اس کے ستاروں کی شعاعیں

زمین کی چیزوں میں قوی تاثیر رکھتی ہیں۔ اور موثر متاثر سے زیادہ شرف والا ہوتا ہے۔ اور اسی لئے قرآن پاک میں جگہ جگہ آسمان کا ذکر زمین سے پہلے ہے۔ اور زمین اس جہت سے بزرگی رکھتی ہے کہ تجلیات کا آشیانہ خانہ کعبہ معظمہ اور مسجد اقصیٰ اس میں واقع ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی خلقت کا مادہ اور ان کے اجسام مقدسہ کا مدفن یہی ہے خصوصاً آدمی کے حق میں کہ شفیق ماں کا حکم رکھتی ہے۔ بلکہ اگر ماں ایک قسم کی غذا جو کہ دودھ ہے اسے دیتی ہے تو زمین رنگا رنگ کی نفیس غذائیں کھلاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے جب آدمی کو حکم ہوتا ہے کہ ماں کے شکم سے باہر آ تو پوری خوشی سے اسے قبول کرتا ہے۔ اور سر کے بل باہر آتا ہے۔ اور جب حکم ہوتا ہے کہ دنیا سے باہر آ ہرگز اپنے پاؤں سے نہیں جاتا یہاں تک کہ مقرر فرشتے روحیں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس آیت میں زمین کا ذکر آسمان پر مقدم فرمایا ہے۔ اور آسمان اور زمین کو اگرچہ بندوں کے حق میں عمدہ نعمت بنایا ہے مگر ان ہر دو کو جدا جدا نہیں چھوڑا بلکہ ہر دو کو ایک دوسرے سے ایک رابطہ دے کر ایک کی قوت کو دوسرے تک پہنچایا تاکہ ترکیب سے دونوں نعمتوں کے آثار جلوہ گریں چنانچہ فرمایا:

وَاَنْزَلَ اس نے اتارا مِنَ السَّمَآءِ آسمان کے بعض اوضاع سے ستاروں کی حرکتوں میں خصوصاً سورج میں مَآءً پانی مختلف قسم کی نباتات اگانے کیلئے جو کہ مختلف قسم کے میووں کے مادوں کو اٹھائے ہوئے ہیں فَاَخْرَجَ بِهٖ ۔ پس نکالا اس پانی سے جو کہ قوت فاعلہ رکھتا ہے۔ اور زمین میں قبول کرنے کی قوت ودیعت رکھی تاکہ ان دونوں قوتوں سے پیدا کرے مِنَ الثَّمَرٰتِ میووں کی جنسوں سے رِزْقًا لَّكُمْ تمہارے لئے رزق۔

اوضاع آسمان سے پانی نازل کرنے کا طریقہ:

اور اوضاع آسمانی سے پانی اتارنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب سورج اپنی خاص حرکت سے ملک اور شہر کی سمت الراس کے قریب پہنچتا ہے۔ تو حرارت اور خشکی اس ملک میں شدت اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس ملک کی زمین کے اجزاء میں ایک دوسرے سے کچھ جدائی پیدا ہو جاتی ہے اور غبار اٹھتے ہیں۔ اور اگر اس ملک کے گرد دریائے شور کا کوئی حصہ احاطہ کئے ہوئے ہو تو اس دریا میں تبخیر کی وجہ سے بخارات پیدا ہوتے ہیں۔ اور آبادیوں اور شہروں

سے بہت سا دھواں جمع ہو کر اوپر کو جاتا ہے۔ اور یہ غبار' بخارات اور دھواں تینوں موسم گرما میں آسمان اور زمین کے درمیان اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ تپش غلبہ رکھتی ہے۔ اور بخارات مرطوب کم ہوتے ہیں' غبار غالب ہو جاتا ہے' آندھیاں اٹھتی ہیں۔ اور ہولناک تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ اور جب سورج گرمی کے نقطہ انقلاب سے پھرتا ہے۔ اور روز بروز اس کی سمت الراس دور ہوتا ہے۔ اور ان تمام غبارات اور دھوؤں میں نمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جو حرارت کہ پہلے سے فضا میں تھی ان کی رقت و لطافت زیادہ کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اور گرم علاقوں میں جو کہ دریائے شور کے ساحلوں کے ساتھ ہوتے ہیں موسم برسات نمودار ہوتا ہے۔ پس فضا کی تدبیر کرنے والی ارواح کو جو کہ بادل کے فرشتے ہیں حکم ہوتا ہے کہ ان تینوں چیزوں کو ہواؤں کی تحریک سے طبقہ زمہریر میں لے جا کر کچھ پکائیں اور پکنے کے بعد اسے برسائیں۔ پس پکنے کی حالت میں خام غبار جن پر زمین کے اثرات غالب ہوتے ہیں سیاہ مواد کی طرح پک کر پانی ہو جاتے ہیں۔ اور برسنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں دیگ کے پکنے کی صورت سامنے آتی ہے اس طرح کہ طبقہ زمہریر کی ٹھنڈک تہہ بہ تہہ بادل کے باہر سے جو کہ تین اجزاء غبار' بخارات اور دھوئیں پر مشتمل ہے اثر کرتی ہے۔ اور حکمت کا مقرر قاعدہ ہے کہ ٹھنڈک اور حرارت جس طرح موضوع اور محل میں تضاد رکھتے ہیں' مکان میں بھی تضاد رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کا باطن سردیوں میں ظاہر کی بہ نسبت زیادہ گرم ہوتا ہے۔ اور گرمیوں میں اس کے برعکس اور کنوؤں کا پانی سردیوں میں گرم ہوتا ہے۔ اور گرمیوں میں سرد۔ پس دھوؤں کی گرمی بادل کے باہر سے بھاگ کر اس کے اندر چھپ جاتی ہے۔ اور بادل کے فرشتے اس گرمی کو معدے کی حرارت غریزیہ اور دیگر آلات غذا کی جگہ قرار دے کر بھڑکاتے اور روشن کرتے ہیں۔ اور یہ روشن کرنا برق کی حقیقت ہے۔ اور اس وقت بادل کو ایک دیگ کی طرح فرض کرنا چاہئے جسے پکانے کیلئے چولہے پر رکھا گیا ہو۔ فرق یہی ہے کہ دیگ کو پکانے والی حرارت دیگ کے باہر سے پکاتی ہے۔ اور بادل کو پکانے والی حرارت اس کے اندر سے ہے۔' معدہ اور جگر کی طرح اور جب پکانے کیلئے ضروری ہے کہ تر جسم کی استعانت کے ساتھ ہو ورنہ خشک اجسام جل کر برباد ہو جائیں گے اسی لئے غذا

کو پکانا پانی اور اس کے مثل کی رطوبت کی مدد کے بغیر میسر نہیں آتا اور پانی اور اس کے مثل کے بغیر غذا جل جاتی ہے۔ اور اسی طرح دیگ پکانا دانوں' غلوں اور دوسرے سخت اور خشک جسموں کے ساتھ جب تک پانی نہ ملائیں ممکن نہیں ہوتا اور اسی لئے بادل کو پکانے میں دانوں اور غلوں کے بجائے غبارات لیتے ہیں۔ اور بخارات کی تری کو پانی کی تری کی جگہ اور دھوؤں کی گرمی' پکانے والی حرارت کی جگہ اور حکمت کا مقرر قاعدہ ہے کہ جب حرارت کو تر جسم پر مسلط کریں تو اس تر جسم کے اجزاء میں ایک شور پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح کہ پکانے کے وقت دیگ کی آواز اور اسی آواز کو رعد سمجھنا چاہئے جو کہ ضرورت کے مطابق پکنے میں باقی رہتی ہے۔ اور منقطع ہو جاتی ہے۔ اور باہر سے بادل کے اجزاء کو جدا کرنے اور جمع کرنے کیلئے ہواؤں کو بھی مسلط کرتے ہیں۔ اور اسی دوران کبھی پکانے والے دھوؤں کے بھڑکنے کی شدت کی وجہ سے ان کا ایک حصہ ہوا کی حرکت دینے کی وجہ سے کود کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ جس طرح کہ مطبخ کے دھوئیں کا شرارا اڑتا ہے اس نازل ہونے والے شرارے کو صاعقہ سمجھنا چاہئے۔ اور جب پکنا کامل ہو جائے۔ اور غباروں کی رقت پورے طور پر رونما ہوتی ہے۔ تو بارش اترتی ہے۔ چنانچہ منضجات اور مسہلات میں تجربہ کیا گیا ہے کہ نضج کامل کے بعد کمزور سی تحریک سے اخلاط گرنے لگتے ہیں۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اس کارخانہ میں کام کا مدار ہر وقت ہواؤں کی تسخیر پر ہے۔ پہلے غبارات' بخارات اور دھوؤں کو اٹھانے اور ان تینوں کو فضا میں جمع کرنے کیلئے' اس کے بعد نمی پیدا کرنے کیلئے پانی کے خزانوں اور دریا سے نمدار بخارات لانے کیلئے۔ پہلی ہواؤں کو مثیرات کہتے ہیں کہ فتثیر سحابا (الروم آیت ۴۸ الفاطر آیت ۹) ان کی شان ہے۔ اور دوسری ہواؤں کو لواقح کہتے ہیں کہ بمنزلہ بیج رطوبت کو منتشر کرتی ہیں۔ جس طرح کہ نر کھجور کا شگوفہ مادہ کھجور میں لگانا۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّیَاحَ لَوَاقِحَ (الحجر:۲۲) ان کی صفت ہے۔

اس کے بعد تہہ بہ تہہ بادل کے اجزاء کو برابر کرنے کیلئے تاکہ پکنے کے اثر کو یکساں قبول کریں' ہوائیں ضروری ہیں۔ اور اس قسم کی ہوائیں بھی لواقح میں داخل ہیں اس کے بعد بادل کے اجزاء میں سوراخ پیدا کرنے اور مسام کھولنے کیلئے بھی کہ پورے طور پر پانی بہہ

سکے ہوائیں ضروری ہیں۔ اور اس قسم کی ہواؤں کو مثیرات کہتے ہیں۔ اور کبھی اس طرح اتفاق ہوتا ہے کہ سردیوں کے موسم میں بارش کے قطرے غلیظ بادل سے جدا ہونے کے بعد راستے میں سرد ہوا لگنے سے جم جاتے ہیں۔ اور اولوں کی صورت میں گرتے ہیں۔ پس یہ ہواؤں کا کام ہے۔ اور موسم بہار میں بادل کا جسم منجمد ہو کر برف کا پہاڑ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ سردیوں میں جہان کی ہوا کی ٹھنڈک کی وجہ سے بادل کے باہر سردی ہوتی ہے۔ اور سردی مسام کے گاڑھے ہونے کا سبب ہوتی ہے اور مسام کے غلیظ ہونے سے بادل کے اندر حرارت جمع ہو جاتی ہے۔ پس جب تک قطرے بادل کے اندر رہتے ہیں نہیں جمتے اور جب بھی اس سے جدا ہوئے۔ اور بادل کے موٹاپے سے باہر آئے ٹھنڈی ہوا انہیں منجمد کر کے نیچے پھینک دیتی ہے۔ اور موسم بہار میں باہر کی ہوا کی گرمی کی وجہ سے بادل کا بیرونی حصہ گرم ہو جاتا ہے مکانی تضاد کی وجہ سے بخارات کے ٹھنڈے اجزاء بادل کے اندر پوشیدہ اور مخفی ہو جاتے ہیں۔ اور بادل کے اندر کا حصہ ان کی ٹھنڈک کی وجہ سے غلیظ ہو جاتا ہے۔ اور منجمد ہو کر کھڑا رہتا ہے جب بھی فرشتوں میں سے بعض کو حکم ہوتا ہے ایک ہوا کو اس پر مسلط کرتے ہیں۔ اور وہ ہوا منجمد اجزاء کو جدا جدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے موسم بہار میں ژالہ باری کے وقت کافی شور سنا جاتا ہے۔ بلکہ دھماکوں کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور سورت نور میں اس حالت ربیعی کا اشارہ فرمایا گیا۔ اس آیت میں **وینزل من السماء من جبال فیها من برد فیصیب به من یشاء ویصرفه عمن یشاء یکاد سنا برقه یذهب بالابصار** اس وقت برق کی چمک میں شدت اس لئے ہے کہ برق کی شعاع کا صاف چمکیلے جسم جو کہ منجمد بادل سے عبارت ہے پر پڑنا اس کی شعاع کو زیادہ کر دیتا ہے۔ اور آنکھ کو خیرہ کر دیتا ہے۔ اور آنکھ کے بالکل خیرہ ہونے کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

اور جس طرح جما ہوا بادل ان اسباب کے ساتھ لٹکا کھڑا رہتا ہے۔ اسی طرح کبھی بہنے والا بادل ہوا کی نمی کی شدت کی وجہ حد سے زیادہ ٹپکنے کی ضرورت کے بغیر رقت اور سیلان پیدا کر کے لٹکائے ہوئے دریا کی طرح فضا میں کھڑا رہتا ہے گویا عالم کی ہوا زمہریری طبقہ میں سب کی سب پانی بن کر ارواح مدبرہ کی تسخیر کی وجہ سے اپنی طبع کے خلاف نزول

نہیں کرتی اور جب بھی تیز ہوا اس معلق دریا پر گزرتی ہے۔ تو اس دریا سے بہت سے قطرے پوہار کی طرح اڑاتی ہے۔ اور اس حالت کو حالت ترشح کہتے ہیں جو کہ بارش کے موسم کے درمیان رونما ہوتی ہے اس ترشح کی مانند جو کہ دریا کے ساحل یا چشمہ وتالاب پر تیز ہوا چلنے کے وقت اور بے درپے پھوہار اڑنے کے وقت حاصل ہوتی ہے یہ ہے گرم علاقوں میں جو کہ دریائے شور سے متصل ہوں بارش کے اترنے کا طریقہ' البتہ سرد علاقوں میں اس کا دوسرا طریقہ ہے۔

سرد علاقوں میں بارش اترنے کا طریقہ

اور وہ یہ ہے کہ جب موسم خریف میں سورج ان شہروں کی سمت الرأس سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ تو ان علاقوں کی فضا کی ہوا غلیظ ہو کر بادل کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اور منجمد ہو کر برف بن جاتی ہے اس پانی کی طرح جو کہ سردیوں میں جم جاتا ہے جب تیز ہوا اس پر مسلط ہوتی ہے۔ تو اس منجمد ہوا کے ٹکڑے نیچے گرتے ہیں۔ اور اسے برف کہتے ہیں۔ اور جب سورج سردیوں کے انقلاب سے واپس مڑتا ہے۔ اور بہار کے اعتدال کے قریب پہنچتا ہے۔ اور گرمی پیدا کرتا ہے وہ منجمد ہوا پانی بن کر زمین پر گرتی ہے۔ اور بہار کی بارش ان علاقوں میں تیزی اور کثرت سے برستی ہے گویا وہ بارش برف کے مادے سے ہوا کا تنقید کرتی ہے۔ اور گرمیوں کے موسم میں ان علاقوں میں ان کی سمت الرا س سے سورج کے دور رہنے کی وجہ سے اس قدر گرمی نہیں ہوتی جو کہ زمین میں خلل کا سبب ہو۔ اور غبارات و بخارات کے اٹھنے کا موجب ہو سکے اسی لئے ان علاقوں میں آندھیاں نہیں اٹھتی اور برسات کا موسم بھی نہیں ہوتا۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اس کارخانہ کا شور وشرینی بارش کا برسنا اور برف کا گرنا زیادہ تر موسم گرما کے انقلاب سے موسم برسات میں اور سردیوں کے انقلاب سے موسم سرما میں سورج کے لوٹنے کے بعد واقع ہوتا ہے۔ اور بہار کے اعتدال سے گرمی کے انقلاب تک' اور خریف کے اعتدال سے سردیوں کے انقلاب تک اس کارخانہ میں اتنا زور نہیں ہوتا۔ یا اگر کبھی بارش یا برف کا نزول ان اوقات میں ہوتا ہے۔ تو بہت کم اور خلاف عادت ہوتا ہے۔

اور اس کا سبب یہ ہے کہ گرمیوں میں حد سے زیادہ حرارت کے بغیر سورج کی شعاع کی تاثیر کی غبارات کو رقیق کرنے اور بخارات کو بنانے میں جو کہ موسم برسات کی بارش کا مادہ ہیں صورت نہیں بنتی اور اسی طرح سردیوں میں ٹھنڈک اور بے حد خشکی کے بغیر بخارات اور ہواؤں کو جمانے میں سورج سے دوری کی تاثیر کی صورت نہیں بنتی۔ اور یہ اس کارخانہ کے وہ اسباب ہیں جو کہ شرع و عقل کے بیان کے مطابق دریافت ہوئے ہیں۔ اور ان اسباب اور طریقوں کے سوا دوسرے اسباب اور طریقے جو کہ نادر ہونے کی صورت میں بارش برسانے اور برف اور ژالہ کے نزول کے سبب ہیں بہت ہیں۔ پس جو اس کارخانہ کے اسباب کا احاطہ کرنے کا قصد کرے بے عقل ہے **وللّٰہ خزائن السموت والارض ولکن المنافقین لایفقھون**

ایک مشہور سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک مشہور سوال رہ گیا کہ ثمرات جمع قلت ہے جو کہ تین سے دس تک پر دلالت کرتی ہے۔ حالانکہ میوے تو بہت ہیں اس قدر کثرت کے باوجود جمع قلت کا استعمال کس طرح جائز ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کریم جو کہ کامل جود و عطا والا ہو بہت کو کم جانتا ہے' اسی جہت سے جمع قلت کا صیغہ لایا گیا کہ یہ سب قسم قسم کے میوے جو تمہاری نظر میں بہت معلوم ہوتے ہیں اس کی جود و عطا کی نسبت سے قلیل و حقیر ہیں۔ اور صاحب کشاف نے اس سوال کے جواب میں جو ذکر کیا ہے کہ ثمرات کو قلت کے وزن پر ذکر کیا ہے۔ اگرچہ آسمان کے پانی سے نکلنے والے پھل بہت ہیں۔ کیونکہ ثمرات سے جماعت ثمرہ کا قصد کیا گیا وہ جو تمہارے اس قول میں ہے کہ میں نے اس کے باغ کا ثمرہ پایا تو اس کے پھلوں کا ارادہ کرتا ہے۔ جیسا کہ قصیدہ کو کلمہ کہتے ہیں۔

اور اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ ثمرات گویا جمع الجمع کا فائدہ دیتا ہے۔ اور جماعات ثمرات کے معنوں میں ہے۔ یہ اس سوال کے رد میں کافی نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ ثمرات اگرچہ اس تقدیر پر پھلوں کے افراد کی قلت پر دلالت نہیں کرتا لیکن پھلوں کی جماعتوں کی تعداد کی قلت پر بلاشبہ دلالت رکھتا ہے۔ اور وہ خلاف واقع بیان کثرت کے مقام کے منافی ہے۔

ان دو آیات میں پانچ نعمتوں کا بیان

یہاں جاننا چاہئے کہ حق تعالیٰ نے ان دو آیتوں میں بندوں پر اپنی نعمتوں میں سے پانچ چیزیں شمار کی ہیں جو کہ اس کی وحدانیت کے دلائل ہیں۔ پہلی نعمت ہر وقت کے لوگوں کی خلقت' دوسری نعمت ان کے آباؤ اجداد کی خلقت' اور ان دونوں نعمتوں کو ایک جگہ ذکر فرمایا۔ اور آیت ختم فرمائی۔ تیسری نعمت زمین کی پیدائش' چوتھی نعمت آسمان کی پیدائش' پانچویں وہ جو کہ زمین و آسمان سے مجموعی طور پر حاصل ہوئی ہے کہ آسمان سے پانی نازل فرمایا۔ اور زمین سے اس کے ذریعے پھل اگائے۔ اور رزق بنایا۔ اور یہ تینوں نعمتیں دوسری آیت میں ایک جگہ لائی گئیں۔ اس تفریق اور اس ترتیب کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی دونوں انفسی نعمتوں کے قبیلے سے ہیں۔ اور دوسری تینوں نعمتیں آفاقی نعمتوں کے قبیلے سے ہیں۔ انفسی نعمتوں کو پہلے ایک جگہ لائے کیونکہ انسان کی طرف سب چیزوں سے زیادہ قریب اس کا نفس ہے۔ پھر اس کے اصول آباء و امہات اور آفاقی نعمتوں کو اس ترتیب سے ایک جگہ لائے کیونکہ زمین بنی آدم کا مکان اور جائے قرار ہے ان کا بیٹھنا' اٹھنا' جاگنا سونا اسی پر ہے اس سے کسی وقت غافل نہیں ہوتے۔ پھر جب نظر کو اوپر اٹھائیں آسمان کو دیکھتے ہیں کہ ایک گنبد کی طرح ان کے سروں پر سایہ ڈالے اور اس سے تم قسم کے انوار اور شعاعیں چمکتی ہیں پھر وہ جو اس صحن اور چھت سے مجموعی طور پر پیدا ہوتا ہے بیان فرمایا کیونکہ مرکب کا مرتبہ مفردات سے بعد ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ بعض کوتہ اندیشوں نے لفظ فراشاً سے اس پر استدلال کیا ہے کہ زمین گیند کی شکل پر نہیں ہے۔ کیونکہ گیند کو فرش نہیں کہا جا سکتا اور یہ استدلال بہت بے معنی ہے۔ اس لئے زمین کے فراش ہونے کو اپنے معروف بستروں توشک' کمبل' قالین اور شطرنجی پر قیاس کرنا کمال بے خبری ہے۔ بستر کیلئے کیا ضروری ہے کہ سطح مستوی ہو۔ کرۂ زمین باوجود گیند کی طرح اور گول ہونے کے جب بہت بڑا جسم رکھتا ہے۔ اور اس کی طرفیں ایک دوسرے سے بہت دوری رکھتی ہیں۔ اور اس کے نشیب و فراز نظر میں نہیں آتے تو وہ بلاشبہ فراشیت کے قابل ہے۔ اور اس کے باوجود قوی قطعی دلائل اس کے گیند نما ہونے پر

قائم ہیں۔

زمین کے گول ہونے پر واضح دلیل

اور اس مدعا پر عقل کے دلائل میں سب سے زیادہ واضح یہ ہے کہ ستارے کا اہل مشرق پر طلوع و غروب' اہل مغرب پر طلوع و غروب سے پہلے ہے۔ اور شمال و جنوب کے درمیان قطب ظاہر کا مبالغہ کے ساتھ جانب شمال میں زیادہ اٹھا ہونا اور قطب خفی کا نیچا ہونا اور جانب جنوب میں اس کے برعکس ہونا اس کے گول ہونے پر صریح دلیل ہے لہٰذا محققین فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر طلوع آفتاب کے ساتھ دو بھائی فوت ہو جائیں ایک چین میں دوسرا اندلس میں بلکہ سمرقند میں۔ دوسرا پہلے کا وارث ہوگا نہ کہ اس کا عکس' کیونکہ چین میں آفتاب کا طلوع سمرقند میں طلوع آفتاب سے پہلے ہے۔ پس چینی بھائی کی موت سمرقندی بھائی کی موت سے مقدم ہے۔

اور دلائل شرعیہ کے اوضاع سے جو اس مکلف پر ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے اوقات کو سورج کے اطوار پر اس طرح قرار دیا گیا ہے کہ تمام مکلفین کو جو کہ زمین کی اطراف و جوانب میں مختلف ملکوں پھیلے ہوئے ہیں کو عام اور شامل ہو۔ اور یہ معنی زمین کے گول ہونے کے بغیر ممکن نہیں۔

نیز جاننا چاہئے کہ اس آیت سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رزق بنی آدم کی غذا کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ ہر وہ چیز جس سے نفع لیں رزق ہے۔ اس لئے کہ نعمت کے عموم کے بیان کے مقام میں ان میووں پر اکتفا کرنا جو کہ آدمیوں کی غذا ہیں۔ اور بس اصلاً مناسب نہیں۔ نیز جاننا چاہئے کہ پرانے مفسرین سے اس طرح منقول ہے کہ بارش کا پانی آسمان سے آتا ہے نہ کہ بادل سے اور بادل ایک واسطہ سے زیادہ نہیں۔ جیسا کہ چھلنی چنانچہ ابوالشیخ کتاب العظمۃ میں حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ بارش آسمان سے آتی ہے یا بادل سے؟ آپ نے فرمایا کہ آسمان سے۔ بادل ایک علامت کے سوا کچھ نہیں۔ اور پانی آسمان سے ہے۔ اور کعب احبار سے روایت کی گئی کہ بادل' بارش کی چھلنی ہے اگر بادل نہ ہوتا تو آسمان کا پانی نزول کے وقت اتنی

شدت کرتا کہ زمین پھٹ جاتی۔

اوراس طرح خالد بن معدان سے روایت کی کہ بارش عرش کے نیچے سے آتی ہے۔ اور ترتیب کے ساتھ سات آسمانوں سے گزرتی ہے یہاں تک کہ نچلے آسمان میں جمع ہو جاتی ہے۔اور وہاں سے اسے بادل جذب کر کے اپنے اندر کھینچتا ہے۔اور عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کیا گیا کہ بارش کا پانی ساتویں آسمان سے ہے۔اور خالد بن یزید سے روایت کی کہ بارش دو قسم کی ہے ایک قسم آسمان سے ہے۔اور ایک قسم وہ ہے جو کہ بادل اسے دریا سے لیتا ہے۔اور رعد اور برق کے سبب سے اسے زمین پر گراتا ہے۔پس وہ قسم جو کہ دریا سے ہے اگانے کی طاقت نہیں رکھتی اور وہ قسم جو کہ آسمان سے ہے اگانے کی طاقت رکھتی ہے۔

اور ان اقوال کی حقیقت یہ ہے کہ بادلوں کا ہونا بلاشبہ زمین و آسمان کے درمیان ہے۔اور غبارات و بخارات کا نئی شکل اختیار کرنا بھی اس جگہ واقع ہوتا ہے۔لیکن جب زیادہ تر بخارات کا اٹھنا دریائے شور سے ہوتا ہے۔اور رعد اور برق غبارات کو کھولنے اور رقیق کرنے کا سبب ہوتے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ بادل نے دریا سے پانی پیا۔رعد و برق کے سبب سے زمین پر ڈال دیتا ہے۔اور اس کارخانہ کی اصل آسمانی اطوار اور ساتوں آسمانوں کے فرشتوں کے افعال سے لی گئی ہے جو کہ عرشی فیصلہ کے حکم سے اس کام کی تدبیر کرتے ہیں۔ پس تمام عبارتیں ایک دوسرے کے مطابق ہو گئیں اور درحقیقت کائنات کے کارخانوں میں سے ہر کارخانہ اگرچہ ظاہر میں نظر میں نچلی زمین کے اسباب کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتا ہے۔لیکن تاثیر عرشی فیصلے کی ہے جو یہ اسباب فراہم کر کے اس کارخانہ میں مصروف کرتا ہے خصوصاً زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے قوائے فاعلہ اور قابلہ کی ترکیب سے نمودار ہوتا ہے کی خلقت بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ تاثیرات میں منفرد ہے۔جس طرح کہ اللہ تعالیٰ ان انعامات کی عطا میں منفرد ہے۔پس بندوں کو چاہئے کہ ان انعامات کے شکر میں اسے عبادت کے ساتھ منفرد کریں۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا ۔پس اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی ہمسر نہ ٹھہراؤ کہ انہیں استحقاق

عبادت میں اس کے ساتھ شریک مقرر کرو اس کا کیا مقام کہ الوہیت یا صفات کمال میں کسی کو اس کے برابر اعتقاد کرو۔ وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمہیں تمہارے آباؤ اجداد اور زمین و آسمان کو اس کے سوا کسی دوسرے نے پیدا نہیں کیا۔ اور اس کی طرف بارش کو کسی دوسرے نے نہیں اتارا اور اس کے سوا کسی دوسرے نے زمین سے میوے نہیں نکالے۔ کس قدر ظاہر ہے کہ نعمت دینے میں اکیلا ہونا شکریہ میں اکیلے ہونے کا موجب ہے۔ پس دین اسلام کو قبول کرنا بارش اور اس کے لواحق کا تقاضا ہے۔ کیونکہ بارش کی ذات بھی اور اس کا مبداء بھی جو کہ آسمان ہے۔ اور اس کی انتہا بھی جو کہ زمین ہے۔ اور اس کا پھل بھی جو کہ رزق کا حصول ہے اس کی قدرت کے قبضے میں ہے۔ اور تمہیں بارش سے گریز نہیں ہے۔ پس جس چیز کو تم نے اسلام سے بھاگنے کیلئے مثال بنایا تھا تم پر منعکس ہوگئی۔ اور دین اسلام کی اطاعت کا موجب ہوئی۔

یہاں جاننا چاہئے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے جو کہ وجوب وجود علم قدرت اور حکمت میں اللہ تعالیٰ کیلئے کسی شریک کا اعتقاد کرے لیکن بہت سے فرقوں نے دوسری چیزوں میں غفلت کی وجہ سے اس کیلئے شریک مقرر کئے ہیں۔ اور جب صحیح غور و فکر کریں تو ان چیزوں میں شریک ٹھہرانا ان چار صفات میں شریک ٹھہرانے کے اعتقاد تک پہنچتا ہے۔ پس حقیقت میں شرک کا اعتقاد ان چار صفات میں ایک ہونے کے عقیدے کے مخالف اور منافی ہے کہ جسے تفتیش اور تحقیق کے وقت ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ پس مشرکین اپنی زبان سے ملزم ہوتے ہیں۔

انواع شرک کی تفصیل:

اور انواع شرک کی تفصیل جو کہ دنیا میں واقع ہے یہ ہے کہ ایک گروہ والے عالم کیلئے دو صانع کا اعتقاد کرتے ہیں ایک حکیم جو کہ خیر اور نیکی کا مصدر ہے۔ اور ایک بیوقوف جو شر اور بدی کا مصدر ہے اس جماعت کو ثنویہ کہتے ہیں۔ اور ان کے مذہب کا بطلان انہی کی زبان سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بیوقوف صانع کس کا پیدا کیا ہوا ہے اگر صانع حکیم کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو شر کا صادر ہونا حکیم سے لازم آیا اور اگر خود بخود پیدا ہوا ہے۔ تو واجب

الوجود ہوا اور واجب الوجود کو کمال علم، کمال قدرت اور کمال حکمت لازم ہے کیسے ہوا کہ یہ واجب الوجود جاہل اور بے وقوف ہو گیا۔

دوسرا فرقہ کہ اپنا نام صابئین رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ اگرچہ وجوب وجود، علم، قدرت اور حکمت اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جہان کے کاموں کو آسمانی ستاروں کے ساتھ وابستہ کیا۔ اور خیر و شر کی تدبیر انہیں سپرد فرمائی۔ پس ہمیں چاہئے کہ ان ستاروں کی ارواح کو بے حد تعظیم کے ساتھ پیش آئیں اور بے حد تعظیم عبادت ہے۔ تاکہ وہ ہمارے کام کریں۔ اور ان کا مذہب بھی ان کی زبان سے باطل ہوتا ہے۔ اس لئے اگر اللہ تعالیٰ ہماری عبادت کو جانتا ہے۔ تو ان ستاروں کی عبادت لغو اور بے مقصد ہوئی۔ کیونکہ وہ قرب جو ہمیں عبادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے ساتھ حاصل ہو گا ہمیں ان ستاروں کی روحوں سے وسیلہ لینے سے بے نیاز کر دے گا اور اگر اللہ تعالیٰ ہماری عبادت کو نہیں جانتا تو اس کے علم میں تصور ہوا اور اس کا علم کا نہ ہوا۔ نیز ستارے جو کہ ہمارے کام کرتے ہیں اگر خود بخود کرتے ہیں تو قدرت میں اللہ تعالیٰ کے برابر ہوئے۔ اور قدرت میں شرک لازم آیا اور اگر اللہ تعالیٰ کے قدرت دینے سے کرتے ہیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ان واسطوں کی طرف رجوع لائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت نے جس طرح انہیں ہمارے کام کرنے کا واسطہ بنایا ہے۔ اسی طرح ہمیں فیض پہنچانے کا جذبہ ان کے دل میں ڈال دے گا۔

تیسرا فرقہ ہندو ہیں جو کہتے ہیں کہ روحانیات غیبیہ جو کہ عالم کے امور کی مدبر ہیں رنگا رنگ صورتیں رکھتی ہیں۔ اور ہم سے پردہ اور حجاب میں واقع ہیں۔ پس ہمیں چاہئے کہ ان روحانیت کی شکلوں کو اچھے جسموں سے جیسے پیتل، سونا اور چاندی بنا کر تعظیم کے ساتھ پیش آئیں تاکہ وہ روحانیت ہم سے راضی ہو جائیں۔

چوتھے پیر پرست ہیں جو کہتے ہیں کہ جب کوئی بزرگ کمال ریاضت اور مجاہدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں مستجاب الدعوات اور مقبول الشفاعۃ ہو کر اس جہان سے گزر جاتا ہے۔ تو اس کی روح کو عظیم قوت اور بڑی وسعت مل جاتی ہے جو شخص اس کی صورت کو برزخ بنائے یا اس کی نشست و برخاست کے مکان میں یا اس کی قبر پر سجدہ اور پوری عاجزی کرے

تو اس کی روح وسعت واطلاق کی وجہ سے اس پر مطلع ہوتی ہے۔اور دنیا وآخرت میں اس کی شفاعت کرتی ہے۔

پانچویں جاہلوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی عبادت کر سکے۔پس عبادت کا راستہ یہ ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو اپنی ذات کا قبلہ بنایا جائے۔تاکہ ہماری توجہ اس قبلہ کی طرف عین توجہ خدا تعالیٰ کی طرف ہو۔اور جو مخلوق اس کام کی قابلیت رکھتی ہے وہ ایک جنس کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز عجیب وغریب خاصیتوں پر مشتمل ہوگی قبلہ ہو سکتی ہے۔جیسے دریاؤں میں گنگا کا پانی اور درختوں میں تلسی کا درخت' اور اسی قیاس پر حیوانات' نباتات' معاون' پہاڑوں اور پریوں سے قبلے گھڑے ہیں۔اور یہی عام ہندوؤں کا مذہب ہے یہ ان لوگوں کی تفصیل ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں دوسروں کو ہمسر کرتے ہیں۔

اور ان میں سے وہ لوگ ہیں جو کہ نام رکھنے میں اپنے آپ کو بندہ فلاں اور عبد فلاں کہتے ہیں۔اور یہ شرک فی التسمیہ ہے۔(**اقول وباللہ التوفیق**۔عبد کے معنی عابد بھی ہیں اور خادم بھی۔جب عبد کی نسبت اللہ کی طرف ہوگی تو اس کے معنی عابد ہوں گے اور جب غیر اللہ کی طرف ہوگی تو معنی ہوں گے خادم غلام۔**قال اللہ سبحانہ وتعالیٰ وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم** (سورۃ النور پ۱۸) یہاں عبادکم بمعنی غلام۔ازالۃ الخفاء میں مفسر علام قدس سرہ کے والد محترم شاہ ولی اللہ بحوالہ الریاض النضرۃ ناقل کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بر سر منبر فرمایا: **قد کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنت عبدہ و خادمہ**۔میں حضور علیہ السلام کے ساتھ تھا بس میں آپ کا بندہ اور خادم تھا۔اس وضاحت کے مطابق عبد النبی۔عبد الرسول نام رکھنا جائز ہے۔ بشکریہ جاء الحق حصہ اوّل از مفتی احمد یار خاں گجراتی رحمۃ اللہ علیہ کو بمعنی غلام نبی اور غلام رسول ہے اور ہر مسلمان غلام نبی ہے۔اور یہ شرک فی التسمیہ ہرگز نہیں۔وہ پہلے معنی کے حوالے سے ہے یعنی بمعنی عابد۔اور یہ معنی عبد النبی میں کسی مسلمان کی مراد نہیں۔محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

اوران میں سے وہ لوگ ہیں جو کہ تکالیف میں دوسروں کو پکارتے ہیں۔ اوراسی طرح منافع حاصل کرنے میں دوسرے سے رجوع کرتے ہیں مستقل سمجھ کر'نہ وہ جو کہ ان دوسروں سے توسل کرتے ہیں۔ (معلوم ہوا کہ مستقل جان کر حل مشکلات کے لیے پکارنا شرک ہے لیکن اہل اللہ سے توسل کرنا جائز ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

ان میں سے وہ لوگ ہیں جو کہ کسی کے نام کو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ عموم علم و قدرت میں برابر کرتے ہیں چنانچہ نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک دن ایک شخص نے حضور علیہ السلام سے کہا **ماشاء الله و شئت** جو اللہ تعالیٰ نے چاہا اور آپ نے چاہا ہو جائے گا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا **جعلتنی لله ندا بل ماشاء الله وحده**

اور امام احمد' ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے حذیفۃ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **لا تقولوا ماشاء الله وشاء فلان قولوا ماشاء الله ثم شاء فلان** ماشاء الله وشاء فلان نہ کہو بلکہ **ماشاء الله ثم شاء فلان** کہو

یہاں جاننا چاہئے کہ جس طرح غیر خدا کی عبادت قطعات شرک وکفر ہے غیر خدا کی اطاعت بھی بالاستقلال کفر ہے۔ اور غیر کی بالاستقلال اطاعت کا معنی یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے احکام کا مبلغ نہ سمجھتے ہوئے اس کی اطاعت کی رسی گردن میں ڈالے اور اس کی تقلید لازم سمجھے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف ظاہر ہونے کے باوجود اس کی اتباع سے منہ نہ پھیرے۔ اور یہ بھی شریک ٹھہرانے کی ایک قسم ہے جس کی آیت **اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابًا من دون الله** میں مذمت کی گئی ہے۔

جن کی اطاعت بحکم خدا فرض ہے چھ گروہ ہیں

تو جن کی اطاعت اللہ تعالیٰ حکم کے ساتھ فرض ہے چھ گروہ ہیں۔ ان میں سے انبیاء علیہم السلام ہیں کہ ان کی اطاعت حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی اطلاع ان کی وساطت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ مخلوق کو دوری

اور حجاب کی وجہ سے ممکن نہیں کہ معارف حق کو اپنے پروردگار کی طرف سے خود حاصل کریں تو ایسے واسطہ کے وجود کے سوا چارہ نہیں جس کی روح نے مشاہدہ حق کی وجہ سے بارگاہ الٰہی کے ساتھ پوری مناسبت پیدا کرلی ہے۔ اور اس کا نفس خلق میں مخلوط ہونے سے بشری مرتبہ رکھتا ہو تا کہ اس کا قلب اس کی روح سے کلمات ربانیہ کو حاصل کرے۔ اور اس کے نفسی قوی میں ان کلمات کو ڈال دے اور خلق جنسی رابطہ کی وجہ سے اس سے ان کلمات کو قبول کرے اس لئے اس کی اطاعت ان اوامر و نواہی کے ساتھ مقید ہے جو کہ رسالت کی حیثیت سے القاء فرمائیں نہ کہ مطلقاً۔ اسی لئے مشورہ اور پیغمبر علیہ السلام کے دوسرے اجتہادی احکام کو قبول کرنے میں وسعت کی گئی ہے۔ بریرہ رضی اللہ عنہ کو پہلے حکم فرمایا کہ اپنے شوہر کو اختیار کرے جب اس نے پوچھا کہ یہ حکم رسالت ہے یا سفارش اور میاں بیوی کے درمیان اصلاح۔ فرمایا حکم رسالت نہیں ہے۔ بلکہ میں سفارش اور مشورہ کے طریقہ سے کہہ رہا ہوں چاہے قبول کر چاہے نہ کر۔ اقول وباللہ التوفیق۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ سعادت دارین اور بہمہ وجوہ بہتری اسی میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشورہ پر ہی عمل کیا جائے۔ اور اگر کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو قبول کر کے آپ اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیں تو اب یہ آپ کا ہی حکم قرار پائے گا جیسا کہ خندق کھودنے میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو قبول فرمایا تو صحابہ نے آپ کے حکم کی تعمیل میں خندق کھودی اور اسی حوالے سے اجر پایا۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ) نیز فرمایا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم اذا امرتکم من امور دینکم فخذوابه

اور ان میں مجتہدین شریعت اور شیوخ طریقت ہیں کہ ان کا حکم اختیاری واجب کے طریقے سے عوام امت پر لازم الاتباع ہے۔ کیونکہ اسرار شریعت اور طریقت کی باریکیاں سمجھنا انہیں کو میسر ہے فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون

اور ان میں سے بادشاہ، امراء اور اہل خدمات ہیں۔ جیسے قاضی، محتسب اور حکام ہیں کہ ان کے اوامر و نواہی جزوی مصلحتوں اور یومیہ واقعات میں رعایا کیلئے واجب الاتباع ہیں۔

اوران میں سے بیوی کے حق میں شوہر ہے ان میں سے اولاد کیلئے والدین ہیں۔ اور ان میں سے مملوک کے حق میں مالک ہے۔ البتہ ان پانچ گروہوں کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ ان کے اوامر ونواہی شرعی اوامر ونواہی کے خلاف نہ ہوں۔ اسی بناپر فرمایا ہے لاطاعة للمخلوق فی معصية الخالق۔ نیز فرمایا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول

اوراطاعت اور عبادت میں فرق کی وجہ کہ شرائع میں غیر کی اطاعت کو ان شرطوں سے جائز بلکہ واجب کیا گیا ہے۔ اور عبادت غیر کو کسی حال سے بھی جائز نہ کیا گیا یہ ہے کہ اطاعت کسی کے حکم کو بجالانا ہے جو کہ حکمرانی کے لائق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے غیر میں حکمرانی کی لیاقت نائب ہونے کی صورت میں بھی متصور ہے۔ جیسے رسول علیہ السلام' حاکم' بخلاف عبادت کے کہ اس کی حقیقت انتہائی عاجزی ہے۔ پس لائق نہیں مگر اس کے سامنے جو انتہائے عظمت رکھے۔ اور وہ ایک ذات میں ہی منحصر ہے۔ اور بس اور اس وجہ سے کہ جاہل لوگ اطاعت اور عبادت کے معنوں میں فرق نہیں کرتے۔ شبہ اور حیرت کے بھنور میں گر پڑے ہیں۔ اور ہر فرقہ کے مشرکین انہیں الزام دیتے ہیں کہ شرک تو ہر مذہب اور ہر دین میں ہے۔ کیونکہ غیر اللہ کی اطاعت تمام دینوں میں مسلم ومعتبر ہے۔ جیسے پیغمبر علیہ السلام' مرشد' مجتہدین اور حاکم اور مطاع ہونا عظمت اور جاہ کے بغیر متصور نہیں۔ پس عظمت میں مشارکت کا اعتقاد لازم آیا اور وہ نہیں سمجھتے کہ مطاع ہونے کیلئے ذاتی عظمت لازم نہیں۔ اور معبود ہونے کیلئے عظمت ذاتی اور وہ بھی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی لازم ہے۔ پس عبادت کو اطاعت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جب عبادت حضرت خالق کی ذات کا مقتضیٰ ہے۔ نیز بندہ کی ذات کا بھی مقتضیٰ۔ نیز بندوں پر اس کے احسان وانعام کا بھی مقتضیٰ ہے حکمت الٰہی میں عبادت سے چارہ نہیں۔ اور جب عبادت تعمیل احکام پر موقوف ہے۔ اور اوامر الٰہی چار طریقوں سے دریافت کئے جاسکتے ہیں کتاب اللہ یا سنت پیغمبراں علیہم السلام یا اجماع مجتہدین یا قیاس جلی اوران تمام امور کی اصل کتاب اللہ ہے۔ پس کتاب کو اتارنا بھی لازم ہوا اور جب کتاب کی

شان اس سے تمام شکوک وشبہات دور کیے بغیر پوری نہیں ہوتی تو اسے دور کرنے کا طریقہ ارشاد فرمایا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا اگر تم شک وشبہ میں ہو اس کے متعلق جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمایا یہاں نزلنا فرمایا نہ کہ انزلنا کیونکہ قرآن کی حقیقت میں کافروں کے شک وشبہ کا منشا تنزیل تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تنزیل لغت عرب میں مرد رو تدریج یعنی درجہ وار آنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور کافر جب دیکھتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سوال کے جواب اور ہر واقعہ کے مقتضیٰ میں قرآن پاک کی کوئی آیت لاتے ہیں انہیں شک وشبہ پیدا ہوتا تھا کہ کہیں شاعروں کے افکار کی طرح جو کہ ہر وقت کے تقاضا کے مطابق کوئی شعر جوڑ لیتے ہیں یہ کلام حضور علیہ السلام کا کلام ہوگا نہ کہ کلام الٰہی۔ پس گویا حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہیں قرآن پاک کے اس طرح آنے سے اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک وشبہ پڑتا ہے۔ تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم بھی اپنی فکری قوتیں جمع کرو اور الفاظ کی ترکیب اور معنوں کو پرونے میں پوری کوشش کو کام میں لا کر اس کلام کی پیروی کرو۔ کیونکہ اس شخص کو تم خود خوب جانتے ہو کہ چالیس سال تک یہ محض بے پڑھے تھے۔ اور انہوں نے اپنی عمر میں ایک بیت بھی موزوں نہ کیا۔ اور نثر میں سے ایک فقرہ بھی نہ لکھا اور تم سب اس کام کے مشاق زمان کے نادر استاذ ہو۔ اور طویل خطبات کی۔ اور روشن قصیدوں کی تالیف کا سلیقہ رکھتے ہو۔ اور اگر تم سے اس سارے کلام کا تتبع نہ ہو سکے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ تو اس کلام کی مثل ایک سورت لاؤ کہ جس کی کم از کم تین آیات ہوں۔ اور اس کلام کی طرح انتہائی فصیح و بلیغ ہو۔ اور اس کی ترکیبوں میں سے ہر ترکیب موقع کے مطابق ہو۔ اور ہر تشبیہ، ہر مجاز اور ہر کنایہ اس میں حسن ولطافت کے ساتھ مستعمل ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تنافر (علم معانی کی اصطلاح کہ چند الفاظ کا ایک مقام پر جمع ہونا کہ تلفظ مشکل ہو۔ اور اس کی ادائیگی سے زبان نفرت کرے) وحشت اور تعقید (ایسی گفتگو کرنا جو سمجھ نہ آئے) سے پاک اور بری ہوتا کہ معلوم ہو کہ یہ کلام بھی تالیف بشری اور سلیقہ شعری ہے۔ اور یہ بھی لجام سست کرنا اور آسانی پیدا کرنا ہے ورنہ اس کلام میں فصاحت و بلاغت کے سوا اور چیزیں بھی

ہیں کہ اگر ان چیزوں کی پیروی تم سے چاہی جائے تو تم پر کام بہت مشکل ہو جائے۔

کلام قرآن کے خصائص ومحاسن

اول یہ کہ یہ کلام بشری کلام کے اسلوبوں سے جدا ہے خصوصاً مطالع اور مقاطع میں۔ دوسری یہ کہ تناقض اور اختلاف سے پاک ہے تیسری یہ کہ غیب کی خبروں پر مشتمل ہے۔ گزشتہ زمانوں کے گزرے ہوئے واقعات کسی کتاب کے مطالعہ اور تواریخ کی طرف رجوع کئے بغیر تفصیل کے ساتھ اس میں مذکور ہیں۔ اور آنے والے واقعات بھی کہیں صراحت کے ساتھ اور کہیں اشارہ کے ساتھ اس سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ واقعات اسی کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ اس میں مذکور ہیں پھر ہم جب اس کلام میں غور کریں تو اس کلام میں نقصان فصاحت کے نقصان کی متقاضی ہیں۔ اور اس کے باوجود فصاحت میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے یہاں سے سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ قادر وتوانا کے سوا کسی کا کام نہیں ہے کہ ان رکاوٹوں کے باوجود اس قسم کا کلام جو کہ فصاحت وبلاغت میں اس کی انتہا پر پہنچ ہوا ہے تالیف کر سکتا ہے۔

ان رکاوٹوں میں سے ایک یہ ہے کہ فصاحت میں عرب اور دنیا کی دوسری جماعتوں کے لوگ زیادہ تر انہیں چیزوں کی تعریف میں کامیاب ہیں جو دیکھی اور سنی ہیں۔ جیسے اونٹ' گھوڑا' غلام' کنیز' عورت' بیٹا' بادشاہت' جنگ' لوٹ مار اور اس قسم کی چیزیں۔ جبکہ اس کلام میں اس قسم کی چیزوں میں سے قدر قلیل کے سوا کچھ مذکور نہیں۔ زیادہ تر اس کلام میں وہ چیزیں مذکور ہیں کہ کسی نے دیکھیں نہ سنیں۔ اور ان چیزوں کے بیان میں تشبیہات دقیقہ اور استعارات بلیغہ کی رعایت کرنا کسی گروہ کی طاقت نہیں۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ اس کلام میں طریق صدق کی رعایت اور جھوٹ سے پرہیز انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس طریقہ کی رعایت کے باوجود فصاحت وبلاغت میں کمی نہیں۔ حالانکہ جھوٹ اور مبالغہ سے پرہیز نظم ونثر میں ضعف اور خست پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے احسن الشعر اکذبہ یعنی شعر میں جس قدر مبالغہ زیادہ ہوگا اسی قدر لطف پیدا کرتا ہے۔

اور ان موانع میں سے یہ ہے کہ جب شعر جوڑنے والا اور اسی طرح نثر لکھنے والا جب واقعہ بیانی اور مضمون باندھنے کیلئے کلام کو دوبارہ لاتا ہے۔ تو اس کا کلام دوسری بار بلندی کے مرتبہ سے گر جاتا ہے اور ناقص ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کلام میں جہاں تکرار فرمایا ہے زیادہ لطف پیدا کیا ہے۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ کلام جب طویل ہو جائے تو اس میں فصاحت و بلاغت کی رعایت بہت مشکل ہوتی ہے۔ اور لازماً بعض مقامات میں مرتبہ بلند سے گر جاتی ہے۔ اور یہ کلام اس طول کے باوجود کسی جگہ پر بھی مرتبہ بلند سے نہیں گرتا۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ اس کلام کے مضامین مشقت طلب عبادتوں کو واجب کرنا' لذیذ چیزوں اور خواہشات نفس کو احرام کرنا لوگوں کو دنیا میں بے رغبتی' مال خرچ کرنے' مصیبتوں پر صبر کرنے' موت کو یاد کرنے اور آخرت کی طرف توجہ کرنے پر ابھارنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان امور کے درمیان بلاغت کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ کوئی شاعر اور نثر نویس نہیں ہے مگر اس کے کلام میں ایک مضمون کو ادا کرنے کا سلیقہ غالب ہوتا ہے۔ بعض معشوقوں کے حسن کو بیان کرنے میں پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور بعض بزم میں' بعض جنگ میں اور بعض ہجو میں۔ اور اسی لئے عرب کے اساتذوں نے کہا ہے امرء القیس عورتوں کے حسن اور گھوڑوں کی تعریف میں بے نظیر ہے۔ اور نابغہ جنگ کو خوب نبھاتا ہے۔ اور اعشیٰ مجلس شراب' خوشی اور رقص و تماشا کو خوب بیان کرتا ہے۔ اور زہیر مطلب پیش کرنے اور طمع کے اظہار پر خوب قدرت رکھتا ہے اس کلام کو جب ہم اچھی طرح دیکھیں ہر فن میں بے نظیر ہے۔ ترغیب میں اس کی ایک آیت کافی ہے **فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین** (السجدہ آیت ۱۷) اور ترہیب یعنی ڈرانے میں یہ آیت **و خاب کل جبار عنید من ورائه جهنم ویسقی من ماء صدید یتجرعه ولا یکاد یسیغه ویاتیه الموت من کل مکان وما هو بمیت** (ابراہیم آیت ۱۵ تا ۱۷) اور زجر و توبیخ میں یہ آیت **فکلا اخذنا بذنبه فمنهم من ارسلنا علیه حاصبا و منهم من اخذته الصیحة ومنهم من خسفنا به الارض ومنهم**

من اغرقنا (العنکبوت آیت ۴۰) اور وعظ و عبرت میں یہ آیت افرء یت ان متعاهم سنین ثم جاء هم ما کانوا یو عدون ما اغنی عنهم ما کانوا یمتعون (الشعراء آیت ۲۰۵ تا ۲۰۷) اور الٰہیات میں یہ آیت اللہ یعلم ماتحمل کل انثی وما تغیض الارحام وما تزداد وکل شیء عنده بمقدار عالم الغیب والشهادة الکبیر المتعال (الرعد آیت ۸، ۹)

اور ان میں سے یہ ہے کہ یہ کلام علوم دقیقہ کی بنیاد ہے۔ جیسے علم عقائد' ادیان باطلہ کے ساتھ مناظرہ' علم اصول فقہ' علم فقہ' علم احوال' علم اخلاق اور دوسرے باریک علوم اور اس قسم کے گہرے مسائل کو بیان کرنے میں بلاغت کی راہ چلنا بشری طاقت نہیں ہے۔ اور اگر کسی بلاغت والے نثر نویس کو فرمائش کریں کہ منطق کے ایک دو مسئلوں کو رنگین عبارت کے ساتھ لکھے یا علم فرائض کے ایک یا دو مسئلے کلام بلیغ کے ساتھ ادا کرے اس سے ہرگز ممکن نہیں ہوگا۔ پس ان چیزوں سے یقین کے ساتھ پالیں گے کہ یہ کلام' بشری کلام نہیں ہے کلام الٰہی ہے۔

اور اگر اس کے باوجود اس کلام کی پیروی سے عاجز رہو۔ اور تمہارا شک و شبہ زائل نہ ہو تو کہہ دو کہ ہمارے سوا کوئی اور اس پر قدرت رکھتا ہوگا گویا ہم عاجز ہو گئے تو اس کا علاج بھی ہم بیان کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مخلوقات میں سے جس کے متعلق قدرت کاملہ اور علم وسیع کا اعتقاد کرتے ہو اس سے مدد مانگو۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور عاجزی اور زاری کے ساتھ اپنے معبودوں کو خدا کے سوا پکارو تاکہ اس کام میں تمہاری امداد کریں۔ اور اس مشکل کو حل کریں۔ اور ان کے معبودوں کو شہداء کا لقب دو وجہ سے دیا گیا ہے اول یہ کہ شہداء شہید کی جمع ہے۔ اور شہید شہود سے لیا گیا ہے بمعنی حضور اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارے معبودوں کو علم محیط اور قدرت کاملہ اس حد تک حاصل ہے کہ جب بھی انہیں کوئی کسی وقت اور کسی مکان میں پکارتا ہے اور فریاد کرتا ہے۔ اور مدد مانگتا ہے وہ فی الفور حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور امداد و اعانت کرتے ہیں۔ اور وہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔ اور اس بنا پر کہ یہ اعتقاد انہیں کے ساتھ

مخصوص تھا شہداء کی اضافت ان کی طرف کی گئی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شہید شہادت سے لیا گیا ہے۔ اور وہ اپنے معبودوں کے حق میں کہتے ہیں کہ "ھولاء یشھدون لنا عند اللّٰہ" اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ یعنی اگر اس اعتقاد میں سچے ہو کہ ہمارے معبودوں کو منصب حضور اور مشکل کشائی یا منصب شفاعت و شہادت اللہ تعالیٰ کے ہاں حاصل ہے۔ پس اگر اس استعانت اور استعداد کے باوجود بھی تمہارا مدعا حاصل نہ ہو تو جان لو کہ تمہارا مذہب دو طریقوں سے باطل ہے۔ ایک یہ کہ تم قرآن پاک کے اعجاز کے منکر تھے۔ اور اسے کلام بشری کہتے تھے۔ اب ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا معجز کلام ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے معبودوں کو حلال مشکل اور جبز وکل کا عقدہ کشا جانتے تھے۔ اور وہ سب جھوٹ نکلا۔

اور بعض مفسرین نے شہداء کو بمعنی گواہاں لیا ہے۔ اور اس کلام کی گزشتہ کلام سے ربط کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اگر اس کلام کی مانند ایک سورت کی قدر تالیف کر کے عقل مندوں کے مجمع اور مقابلہ اور معارضہ کی مجلس میں پڑھو اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ مس[illegible]ن از [illegible] و تعصب انکار کریں۔ اور تمہارے لائے ہوئے کلام کی اس کلام کے ساتھ مماثلت کا یقین نہ کریں۔ اور کہیں کہ یہ تمہارا لایا ہوا کلام اس کلام کے برابر نہیں ہوتا۔ اور اس کی دھول کو نہیں پہنچتا تو ایک اور تدبیر کرو۔ اور اپنے معتبر گواہوں' شاعروں اور نثر نویسوں کو کہ تمہارے نزدیک ان کی گواہی معتبر ہو اس مجلس میں حاضر کرو تاکہ گواہی دیں کہ تمہارا لایا ہوا کلام اس کلام کے برابر ہے۔ اور اس صورت میں لفظ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس لئے بڑھایا ہے کہ خدا سے گواہی لانا ہر عاجز کی شان بلکہ ہر سچے جھوٹے کی عادت ہے۔ پس جھگڑا ختم نہیں ہو سکتا کہ اس کی گواہی پر اطلاع قطع و یقین کے ساتھ ممکن نہیں مگر اعجاز یا وحی کے ساتھ اور پہلی شکل میں تسلسل اور دوسری شکل میں دور لازم آتا ہے۔

چند سوالات کے جوابات

یہاں چند سوال باقی رہ گئے جو کہ ظاہری طور پر وارد ہوتے جنہیں دور کرنا ضروری ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ حضرت پیغمبر علیہ السلام کو یہاں عبدنا کیوں فرمایا لفظ نبینا اور رسولنا

کیوں نہیں فرمایا کہ مقام کے مناسب تھا۔ کیونکہ کتاب کا نزول نہیں ہوتا مگر رسول اور نبی علیہ السلام پر۔ جواب یہ ہے کہ منصب رسالت و نبوت پانا خلوص بندگی اور کمال عبدیت کی وجہ سے ہے۔ اور اصل کا ذکر کرنا فرع کے ذکر سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا: بیت۔ تیری غلامی کے داغ نے خسرو کا مرتبہ بلند کر دیا۔ وہ غلام ملک کا سردار ہوتا ہے۔ جسے بادشاہ نے خرید لیا۔ پس شرف عبودیت کے اظہار کی جہت سے لفظ عبد نازیادہ مناسب ہوا جس طرح کہ انزل علی عبدہ الکتاب' نزل الفرقان علی عبدہ اور دوسری آیات میں اس کی رعایت کی گئی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن پاک میں بعض آیات دوسروں کے کلام سے بطور نقل لائی گئی ہیں۔ پس اگر وہ آیات اسی عبارت کے ساتھ ان سے صادر ہوئی تھیں تو قرآن پاک کا اعجاز متحقق نہیں ہوتا کیونکہ بشر کی کلام بھی اس درجہ بلاغت کو پہنچ گئی۔ اور اگر ان عبارتوں کے ساتھ ان سے صادر نہیں ہوئی تھیں تو خبر واقعہ کے مطابق نہ ہوئی۔ اور خبر الٰہی کا واقعہ کے مطابق واقع نہ ہونا محال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے کے کلام کی حکایت کے دو طریقے ہیں پہلا یہ کہ اس کے کہے ہوئے کو بعینہٖ لے آئیں اور اس میں کسی وجہ سے بھی تبدیلی نہ کی جائے جس طرح کہ احکام طلاق' غلام آزاد کرنے عتاق' اقرار' انکار' قسم اور وصیت کے احکام میں فتویٰ طلب کرنے میں کسی کی عبارت کو لاتے ہیں۔ یا بچوں کے کلام کو بچوں کی لغت میں نقل کرتے ہیں دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نقل بالمعنی کریں۔ اور دوسرے کے معنوں کو اپنی عبارت میں ترتیب دیں جس طرح کہ منشی کسی بادشاہ کے احکام کو اور مکان کی سندیں۔ خطوط اور معاملات لکھنے والے یہی عمل کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی حکایات اور واقعات سب دوسرے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسروں کے کلام کو اپنی عبارت میں نقل فرمایا ہے۔ اور اسی طرح بعض جگہوں میں بندوں کی زبان پر تلقین اور تعلیم کے طور پر ارشاد فرمایا ہے۔ جیسے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ یہاں معنی کا واقع کے ساتھ خبر کی سچائی میں مطابقت رکھنا کافی ہے۔ مطابقت الفاظ درکار نہیں ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ حقیقت قرآن میں کافروں کے شکوک و شبہات یقینی تھے۔ اور

امر یقینی کو حرف شک کے ساتھ جو کہ ''اِن'' ہے کس نکتہ کیلئے لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز کے دلائل کے واضح ہونے کی جہت سے جو کہ شک وشبہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اس امر یقینی کو انہوں نے مشکوک قرار دیا اور حرف شک استعمال کیا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ صاحب شک مدعی نہیں ہے کہ اس سے حجت طلب کی جائے۔ کیونکہ منکر کے مقابلہ میں حجت مدعی پر ہوتی ہے منکر پر نہیں۔ اپنی طرف سے خود حجت لانی چاہئے۔ پس منکروں سے قرآن کا معارضہ طلب کرنا کس وجہ سے واقع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو بھی قرآن پاک کے اعجاز کا منکر ہوا گویا اس نے دعویٰ کیا اس کلام کی مثل کی تالیف بشر کے بس میں ہے۔ اس ضمنی دعویٰ پر مدعی سے حجت طلب کرنا ضروری ہوا۔ بیت اگر اس بیہودہ گوئی کے ساتھ کچھ کہا جا سکتا ہے ہے اگر کچھ طاقت ہے۔ تو کہہ اور اگر کچھ قدرت ہے۔ تو لا۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز میں شک کرتا ہے وہ کسی حکم کے قصد میں نہیں ہوتا۔ جبکہ صدق اور کذب حکم کے لوازمات میں سے ہیں۔ پس اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ اور اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کے درمیان کس وجہ سے رابطہ ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کے دو احتمال ہیں ایک تو یہ کہ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ سے مربوط ہو۔ اور اس تقدیر پر سوال پڑتا ہے۔ اور اس کا رد یہ ہے کہ جو شخص قرآن کے اعجاز میں شک کرتا ہے۔ پس گویا وہ اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ قرآن تالیف بشری ہو سکتا ہے۔ اور وہ اس ضمنی کلام میں کاذب ہے۔ اس کلام پر نظر کرتے ہوئے اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فرمایا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے ساتھ مربوط ہو۔ اور اس تقدیر پر مراد یہ ہے کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ ہمارے معبود ہماری فریاد کو پہنچتے ہیں۔ اور ہماری مشکلات کو حل کرتے ہیں تو اس وقت اپنی شک اور حیرت کو زائل کرنے کیلئے انہیں بلاؤ۔ پس سوال اصل پر نہیں پڑتا۔

یہاں جاننا چاہئے کہ من مثلہ کی ضمیر کو بعض مفسرین نے دور لوٹنے والی قرار دیا ہے۔ اور معنی کی تقریر اس طرح کی کہ ایک سورت کی قدر لاؤ ہمارے اس بندے کی مثل سے جو کہ

اُمی محض ہیں۔ اور آپ نے نظم و نثر کی کبھی مشق نہیں کی۔ اور اس تفسیر کا اگر چہ اس مقام پر احتمال ہے۔ لیکن اس تفسیر کو اختیار کرنا بلا وجہ دائرۂ اعجاز کو تنگ کرنا ہے۔ اور دوسرے مقامات میں دوسری آیات اس تفسیر کے خلاف ہیں۔ ان میں سے سورت یونس میں فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ اور ہود میں فاتوا بعشر سور مثله اور سورۃ اسریٰ میں قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یا توا بمثل هذا القران لایاتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهيرًا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قرآن پاک کے معاوضہ کا مطالبہ ہر بشری اور جنی فرد سے واقع ہوا۔

اور یہاں جب مخاطبین اس ہنر میں برتری کا دم بھرتے تھے تو انہیں سے خطاب مخصوص ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ دوسرے سے مدد طلب کرنے کو بھی جائز فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بلکہ معارضہ سے عاجز ہونے کے ظاہر ہونے اور انکار پر اصرار کے بعد ایک اور ارشاد ہوا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا تو اگر تم یہ کام طلب معارضہ میں ہمارے مبالغے' فصاحت و بلاغت میں تمہاری کثرت و شہرت اور معارضہ و مقابلہ میں تمہاری حرص کے باوجود نہ کر سکو وَلَنْ تَفْعَلُوْا اور تم یہ کام ہرگز نہ کر سکو گے اس لئے کہ اس آسان کام کو مخالف کے الزام میں چھوڑنا' جنگ اور لڑائی کیلئے تیار ہونا' اپنی اور دوسرے عزیزوں کی جان کی بازی لگا دینا' جلا وطنی اور اپنے ملک کی خرابی گوارا کرنا کسی عقلمند سے متصور نہیں ہے۔ پس جب تم نے ان چیزوں کو قبول کر لیا۔ اور اس آسان کام سے کنارہ کشی اختیار کی تو یقین کے ساتھ معلوم ہوا کہ یہ کام آسان نہیں۔ بلکہ تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ پس یہ نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کا کلام۔ پس اس پر ایمان لانا اور یقین کرنا فرض متعین ہے۔ اور تم جو کہ ابھی تک شک و شبہ میں ہو عناد کی راہ چل رہے ہو۔ اور معاندین کیلئے دوزخ کی آگ تیار ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۔ پس اس جلانے والی آگ سے بچو جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ اور وہ آگ غضب الٰہی کی آگ ہے کہ ابتدائی طور پر اس کے بھڑکنے کا سبب کفار کی جنس سے ہے۔ اور دیگر مخلوقات کی جنس سے بت ہیں جو کہ

غالباً پتھروں سے گھڑتے ہیں۔ اور انہیں عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ برابر کرتے ہیں۔ اور سونا کہ دنیا طلبوں کا معبود ہے۔ اور شہوت وغضب جو کہ شہوت پرستوں اور درندہ صفتوں کا مطلب ہے پتھروں اور لوگوں میں شامل ہے۔ جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔

مشکل سوال: اور اسی تقریر سے ایک بہت مشکل سوال دور ہو گیا جو کہ یہاں وارد کرتے ہیں۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ جسے اس آگ کی تمیز کی علامت قرار دیا ہے۔ کس معنی سے ہے اگر مراد یہ ہے کہ اس آگ کے بھڑکنے کی ابتداء ان دو چیزوں پر واقع ہوئی۔ پس خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ ہزار سال آگ جلائی گئی یہاں تک کہ سفید ہو گئی پھر اسے ہزار سال بھڑکایا گیا یہاں تک کہ سیاہ ہو گئی۔ پس وہ سیاہ تاریک ہے۔ اس وقت آدمی اور پتھر کہاں تھے کہ اس آگ کا ایندھن بنتے تھے۔ اور اگر مراد یہ ہے کہ آدمیوں اور پتھروں کو جلائے گی تو ہر آگ یہی خاصیت رکھتی ہے کہ جسے بھی اس میں ڈال دیں استعداد کے مطابق اسے قبول کرنے والے کو جلا کر یا گرم کر کے بدل دیتی ہے۔ دوزخ کی آگ کی خصوصیت کیا ہے۔ اور اس سوال کے جواب کی تحریر یہ ہے کہ دوزخ کی آگ غضب الٰہی کی آگ کا ظہور ہے کہ اس کا بھڑکنا ابتدائی طور پر اور اصل میں کفر اور بت پرستی کی وجہ سے رونما ہوا اور اس برے دھندے کے رکن یہی دو چیزیں ہیں آدمی اور بت۔ کہ ایک عابد ہے۔ اور دوسرا معبود اور اس آگ کا نافرمانیوں کی وجہ سے بھڑکنا بھی انسانی فاسد قوتوں کی طرف لوٹتا ہے۔ پس اس معنی سے بھی اس آگ کا ایندھن آدمی ہوں گے۔ اور بعض مفسرین نے اس طرح کہا ہے کہ اس آگ میں آدمیوں کی کثرت اور ہجوم کی وجہ سے گویا صورتحال یوں ہے کہ ایندھن کی بجائے یہی لوگ اس آگ کا ایندھن ہے۔ پس کلام تشبیہ پر مبنی ہے۔

اور یہاں ایک اور سوال ہے کہ اس صورت میں النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کو موصول اور صلہ کے طریقے سے لایا گیا۔ اور اس طریقے کو پہلے سے مخاطب کا علم والا ہونا درکار ہے۔ اور سورت تحریم میں نَارًا وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ بطریق موصوف وصفت ارشاد ہوا اور اس طریقے میں پہلے سے مخاطب کا جاہل ہونا درکار ہے۔ پس

تطبیق کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ تحریم اس سورت سے پہلے اتری ہوگی۔اس سورت میں مخاطبین کو ایسی آگ کا علم حاصل نہیں تھا جس کی صفت یہ ہو۔پس نار کو نکرہ لایا گیا۔اور اس صفت کے ساتھ موصوف کیا۔جبکہ اس سورت کے نزول کے وقت جو کہ اس کے بعد اتری اس نار معروفہ کو موصول اور صلہ کی ترکیب کے ساتھ یاد کرایا اور بعض گزشتہ مفسرین سے منقول ہے کہ انہوں نے حجارہ کو سرخ گندھک پر محمول کیا نہ کہ بتوں پر۔لیکن قرآنی آیات اکثر جگہوں پر دلالت کرتی ہیں کہ حجارۃ سے مراد بت ہیں چنانچہ آیت انکم وما تعبدون من دون اللہ حصبُ جھنم اور اس کی مثل آیات ہیں۔اور اس سے زیادہ بعید یہ ہے کہ حجارہ کو اہل قسوہ کے سخت دلوں پر محمول کیا ہے۔اور آیت ثم قست قلوبھم من بعد ذالك فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ کو بطور گواہ پیش کیا لیکن اہل قسوہ کے سخت دل لوگوں کے اجزاء اور الناس میں داخل ہیں انہیں حجارۃ کے لفظ کے ساتھ لوٹانے کی ضرورت نہیں مگر عام کے بعد خاص کو بیان کرنے کی جہت سے جو کہ اس مقام پر اتنا موزوں نہیں۔

مفسرین کا شبہ

اور بعض مفسرین اس مقام پر ایک اور شبہ رکھتے ہیں کہ دوزخ کی آگ قہر الٰہی کی آگ کا نمونہ ہے۔جس طرح آدمیوں کے برے افعال کی وجہ سے بھڑکتی ہے اس طرح بلکہ اس سے زیادہ شیطانوں کے افعال قبیحہ کی وجہ سے جوش مارتی ہے۔تو یہاں آدمیوں کی تخصیص کس لئے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مخاطبین چونکہ آدمیوں کی جنس سے تھے اس لئے انہیں اس آگ سے ڈرانا چاہئے جو کہ آدمیوں کے برے اعمال کی وجہ سے مشتعل ہوتی ہے۔اگرچہ وہاں ایک اور آگ بھی ہے جس کا ایندھن شیاطین اور کافر جن ہیں اس آگ کا عجیب وغریب ہونا بھی اس طرح بھی ہے کہ آدمی اور پتھر اس آگ کا ایندھن ہیں۔اور جن اور شیاطین جبکہ ناری ہیں ان کا مادہ آگ ہے۔تو ان کا آگ کو مشتعل کرنا اتنا عجیب وغریب نہیں۔

تحقیق مقام

اور اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ آگ کی حرارت اس کی صورت نوعیہ کے تابع ہے جو

کہ اس کی روحانیت اور ملکوت کا ظل ہے۔ اور اگر صور نوعیہ جو کہ ہر جسم بلکہ ہر جوہر اور عرض کی روحانیات اور ملکوت کے ظلال ہیں درمیان میں نہ ہوں تو تمام اجسام' خصائص میں ایک دوسرے کے برابر ہو جائیں۔ اور درمیان سے امتیاز اٹھ جائے۔ اور آگ کی روحانیت قہر الٰہی کی آگ کی ایک چنگاری ہے جو کہ بے شمار مرتبوں میں تنزل کے بعد مرتبہ نفس میں غضب کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور وہ اخلاط اور ارواح کو جلانے میں اس قدر موثر ہے کہ لکڑی کو جلانے میں جسمانی آگ اس قدر اثر نہیں رکھتی اور جب قیامت کے دن ہر چیز کے احکام روحانیہ غالب ہو جائیں گے تو وہ آگ تکلیف دینے' جلانے اور دائمی تاثیر میں دنیا کی آگ کے مقابلہ میں لامتناہی مرتبوں تک زیادتی پیدا کرے گی اور یہی ہے اس حدیث صحیح کا مضمون ''تمہاری یہ آگ جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جزو ہے سب کے سب اس کے جزو کی طرح ہیں۔ اور وہ آگ کافروں سے دور نہیں ہے کہ قیامت کے دن اسے بھڑکا کر مہیا کریں گے۔ بلکہ اس کے جلانے کے نشان ان کافروں کو مرنے کے بعد بغیر کسی فاصلے کے پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ وہ آگ انہیں سزا دینے کو تیار کی جا چکی ہے ان کی پیدائش اور ان کے کفر اور معاصی سے پہلے کیونکہ آگ نہیں ہے مگر قہر و غضب الٰہی کی چنگاری اور یہ لوگ ازلی غضب رسیدہ ہیں۔

معتزلہ کا رد

اور یہاں جاننا چاہیے کہ کافروں کیلئے وہ آگ تیار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر کافر گناہگاروں اور اہل کبائر کو اس سے عذاب نہیں دیں گے۔ جس طرح چوروں کیلئے قید خانہ بنانے سے لازم نہیں آتا کہ قرض داروں اور دوسرے حقوق والوں کو اس میں قید نہیں کریں گے یا گھر بنانے سے یا اپنی رہائش کیلئے گھر بنانے سے لازم نہیں آتا کہ مہمان کو اس میں جگہ نہ دیں یا کرایہ داروں یا عاریۃً لینے والوں کو اس میں نہیں ٹھہرائیں گے۔ پس معتزلہ اور خوارج کا اس آیت سے دلیل لینا کہ اہل کبائر کافر ہیں۔ اور اہل صغائر کیلئے معافی واجب ہے اعتبار سے گرا ہوا اور بے ہودہ ہے اس دلیل سے کہ بہشت کی صفت میں اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ فرمایا ہے۔ حالانکہ اطفال اور پاگل بھی معتزلہ اور خوارج کے اجماع کے ساتھ

جنت میں داخل ہوں گے۔ اور اطفال اور پاگل متقی نہیں ہیں بلکہ لفظ اُعِدَّتْ جو کہ ماضی کے صیغہ کے ساتھ وارد ہوا اہل سنت کی صریح دلیل ہے اس بات پر کہ بہشت اور دوزخ مخلوق اور تیار ہو چکے ہیں چنانچہ متواتر المعانی احادیث بھی بیان کرتی ہیں۔ اور معتزلہ اس کے خلاف ضد کرتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک جواب طلب سوال ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس آیت میں پہلے آدمیوں اور پتھروں کو دوزخ کا ایندھن قرار دیا گیا ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ وہ آگ کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔ اور جب کافر آگ سے عذاب دیئے جائیں گے تو دوسرے لوگ کون ہیں جو کہ آگ کا ایندھن ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب معرفہ کو معرفہ کے بعد لاتے ہیں تو یہ اتحاد یعنی ایک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے جاء نی زید فاکرمت الجانی جائی اور زید ایک ذات ہے۔ پس مذکور کفار اور وہ لوگ جو کہ آگ کا ایندھن ہیں ان کا مصداق ایک ہو گا۔

اور جب اس کلام سے پہلی غرض لوگوں کو عبادت و توحید کی تاکید اور پابندی تھی۔ بات قرآن پاک کے اعجاز اور منکروں سے معارضہ طلب کرنے تک پہنچی اور اس کے معارضہ سے عاجز ہونے اور انکار پر اصرار کی صورت میں دوزخ کی آگ سے ڈرانا مذکور ہوا تہذیب نفس کی حکمت کے قاعدہ کے مطابق لازم آتا ہے کہ جنہیں اس رشد و ہدایت پر مبنی کلام سے تعلق ہوا اور انہوں نے اس کے اوامر و نواہی کے مطابق عمل کیا ہو انہیں دائمی لذت پانے کی بشارت اور ابدی آرام کی خوش خبری دی جائے۔ تاکہ ڈرانے کے ساتھ رغبت دلانا جمع ہو جائے۔ اور امید اور خوف مل جائیں اور دونوں کیفیتوں کا اعتدال سننے والوں کے نفسوں میں پیدا ہو۔ اور اس قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ کرم کے وعدوں کے ساتھ عذاب کی وعید ملا دیتا ہے۔ اور کسی جگہ دونوں امروں میں سے ایک پر اکتفا نہیں فرمایا تاکہ خوشخبری اور ڈرانا دونوں مل کر خوف اور امید کی دونوں کیفیتوں کو معتدل کر دیں اور ایمان کے دونوں پر جو کہ قرب کے مرتبوں اور جوہر نفس کی اصلاح کے میدانوں میں پرواز

اور بلندی کا سبب ہیں ایک دوسرے کے برابر کر دیئے چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر مومن کے خوف اور امید کو تولیں تو دونوں برابر ہوں گے اس بنا پر یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ پر یاانذرھم بالنار الموصوفة جو کہ اعدت للکافرین کے بعد مقدر ہے پر عطف کے طریقے سے ارشاد فرمایا کہ آپ اس آگ سے اس کتاب کے منکروں کو ڈرائیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور ان لوگوں کو خوشخبری سنائیں جو اس کتاب پر ایمان لائے وَعَمِلُو الصّٰلِحٰتِ اور اچھے عمل کئے۔ اور اچھے اعمال وہی ہیں جن کا کتاب نے حکم فرمایا یا اس کتاب کی تین شاخوں جو کہ سنت پیغمبر علیہ السلام اور اجماع مجتہدین اور قیاس جلی ہے میں سے ایک اس پر دلالت کرے۔ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ کہ ان کیلئے مراتب ایمان اور اچھے اعمال کے مطابق باغات ہیں کہ ان باغات میں سے ایک کا نام جنت الفردوس ہے۔ دوسرا جنت عدن، تیسرا جنت الماویٰ، چوتھا دار الخلد، پانچواں دار السلام، چھٹا دار المقامۃ، ساتواں علیین اور آٹھواں جنت نعیم کے نام سے موسوم ہے اس کے عوض جو کہ ان کے باطن میں ایمان کی وجہ سے معارف حقہ اور پاکیزہ صلاحیتیں باغ کی طرف مرتب تھیں۔ اور وہ باغات ہمیشہ سرسبز اور تروتازہ ہوں گے اس لئے کہ:

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ان باغوں کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جس طرح کہ حکمت ایمانی کی نہریں ان کے باطن سے ان کی زبانوں پر جاری ہوتی تھیں۔ اور ان کا فیض زمانے کو پہنچتا تھا اور جس وقت کہ وہ ان باغات میں داخل ہوں گے۔ اور اس جگہ کی لذیذ چیزوں کو استعمال کریں گے انہیں معلوم ہو کہ یہ تمام قسم قسم کی لذیذ چیزیں اسی ایمان اور عمل صالح کی جزا ہے۔ تاکہ اس جاننے کی وجہ سے ان کی لذت دوبالا ہو جائے۔ اور ایمان اور عمل صالح کی قدر ان کے ذہنوں میں بڑھ جائے۔

اور اگر یہ امر انہیں معلوم نہ ہو تو دنیا کی نعمتوں کی طرح ان نعمتوں کو بھی ابتدائی تصور کریں۔ اور جزا پانے کی لذت نہ پائیں۔ ان کے اس جاننے کی دلیل یہ ہے کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْھَا جب بھی وہ ان باغات سے روزی دیئے جائیں گے مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا میووں کی جنس سے حسی ہو یا عقلی، خیالی قَالُوْا ھٰذَا کہیں گے یہ رزق جزا ہے الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ اس چیز

کی جو ہمیں اس سے پہلے دنیا میں مقامات اور احوال سے عنایت فرمائی گئی جو کہ ہمارے ایمان اور عمل صالح کے ثمرات تھے۔ اور جب ان کے باطن میں ہر عمل کے بے شمار ثمرات پیدا ہو گئے تھے۔ اور یہ تمام ثمرات باہمی مشابہت اور مماثلت جو کہ کیفیتوں میں باہم اتحاد کی وجہ سے رکھتے تھے کہ باوجود لاحق ہونے والی وسعت' رسوخ اور قوت استعداد کی جہت سے ایک دوسرے سے فضیلت رکھتے تھے۔

وَاُتُوا بِہٖ مُتَشَابِھًا اور وہ لذت میں فرق کے باوجود ہم رنگ اور ہم صورت رزق دیئے جائیں گے تاکہ منشاء کی مشابہت اور آثار کا باہمی فضیلت والا ہونا دونوں برقرار رہیں۔ اور اکثر مفسرین نے ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا کو نوعیت اور جنسیت پر محمول کیا ہے نہ کہ جزائیت پر اور ان پر قوی اشکال آتا ہے کہ کلما کا لفظ تمام افراد رزق اور رزق کی باریوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی باران سے یہ قول متصور نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہلے انہیں اخروی رزق کبھی بھی عنایت نہ فرمایا گیا اسی لئے بعض مفسرین نے رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کو رزق دنیوی پر محمول فرمایا ہے۔ اور وہ بھی درست نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ آخرت میں کوئی نعمت دنیوی نعمتوں کے علاوہ نہ ہوگی۔ حالانکہ بے شمار آیات اور لاتعداد احادیث دلالت کرتی ہیں کہ وہاں ان دیکھی اور ان سنی نعمتیں بھی ہوں گی اور ان میں سے آیت فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (السجدہ آیت ۱۷) ہے۔ اور حدیث پاک اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رء ت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

اور ان دونوں مشکلات کی وجہ سے متاخرین میں سے ایک جماعت نے رزقنا من قبل کو عام کیا ہے اس سے کہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ پس پہلی مرتبہ رزق دنیوی کو یاد کریں گے۔ اور دوری باریوں میں رزق اخروی کو لیکن یہ توجیہ تکلف کے باوجود جو کہ اس میں ہے مطلقاً درست نہیں ہوتی کیونکہ بہشتی افراد کی اکثریت مفلس اور مسکین اور بے مایہ تھی انہیں دنیا میں قدر ضرورت سے زیادہ نہیں ملتا تھا بہشت کی نعمتوں کو دیکھ کر وہ کون سی نعمتوں کو یاد کریں گے جو کہ انہیں ملی تھیں اس۔ کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کو بار بار لانے میں لذت

ناقص ہو جاتی ہے۔ اگرچہ منافع اور ذائقے میں فرق ہو اس لئے کہ مثل مشہور ہے کہ جب حلوہ ایک بار کھایا اور بس۔

پس سب سے صحیح یہ ہے کہ هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ جزا کو مجری علیہ (جس عمل پر جزا دی گئی) پر محمول کرنا ہے نہ کہ نوع کو فرد پر محمول کرنا اور جو اتحاد جزا اور مجری علیہ میں فی الواقع موجود ہے وہ اس اتحاد سے زیادہ قوی ہے جو کہ نوع اور فرد میں نظر ظاہر بین میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جزا حقیقت میں مجری علیہ کا دوسرے لباس میں ظاہر ہونا ہے۔ اور اس حقیقت کو پانے میں کہ یہ نعمت اس عمل کا ظہور ہے جو کہ دنیا میں ہم سے صادر ہوا ایسی لذت اور لطف حاصل ہوتا ہے کہ بیان کی حد سے باہر ہے۔

اور وہ جو کہتے ہیں کہ آدمی کو اپنی مالوفات کے ساتھ بہت انس حاصل ہوتا ہے۔ اور اپنی مالوفات کے ساتھ شدید رغبت اور میلان پیدا کرتا ہے۔ پس یہ اس وقت ہے کہ اس کا مزاج عادی اور خواہش کی قوتیں اسی پہلی حالت پر ہوں۔ اور جب مزاج جہان کی وسعت کی جہت سے بدل گیا ہو۔ اور قوت سہویہ نے اپنی بلندی کے کمال کی وجہ سے ترقی کی ہو پھر اسے اپنی مالوفات کا پابند جاننا نادانی ہے ہاں حسن بصری اور دوسرے تابعین سے منقول ہے کہ جنت کے میوے صورت میں ایک رنگ والے ہوں گے۔ اور لذت اور ذائقہ میں مختلف اور جدا جدا لیکن ان بزرگوں نے اس آیت کو اس پر محمول نہیں کیا ہے۔ بلکہ بیان واقع فرمایا ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ بھی بعض اوقات لذت اور خوشی کے طریقوں سے ہے۔

اور لفظ انہار جو کہ یہاں مجمل واقع ہے احتمال ہے کہ اس تفصیل پر ہو جو کہ سورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں واقع ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ بہشت کی نہریں چار قسم کی ہوں گی پانی کی نہریں' شہد کی نہریں' دودھ کی نہریں اور شراب کی نہریں اور احتمال ہے کہ یہاں صرف پانی کی نہریں مراد ہوں کیونکہ درختوں کی سرسبزی اور ان کی تروتازگی میں بھی پانی کی نہریں کام آتی ہیں۔ اور بہشتیوں کے پینے کیلئے وہ چار قسم کی نہریں مہیا ہوں گی کہ مختلف رغبتوں کے مطابق ان سے کھائیں اور پئیں۔

اور بعض اہل زراعت درختوں کو بھی دودھ' شہد اور شراب سے پالتے ہیں۔ اور کہتے

ہیں کہ درخت کے میوے میں نرمی اور چکنائی دودھ دینے سے بڑھتی ہے۔ اور مٹھاس شہد دینے سے اور نشاط و تفریح شراب دینے سے اور اس صورت میں وہاں درختوں کو پالنے میں چاروں نہروں سے کام لیا ہوگا۔ اور جب جنتیوں کے مسکن' کھانے اور پینے کو اس خوبی کے ساتھ بیان فرمایا۔ نیز ارشاد فرمایا کہ یہ لذتیں اور نعمتیں انہیں اعمال کی جزاء اور بدلہ دینے کی صورت میں دی جائیں گی تاکہ ان کی خوشیاں اور سرور بڑھ جائے اور قاعدہ ہے کہ ہم مزاج دوستوں اور دل لبھانے والے محبوبوں کے بغیر ہر نعمت بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ خوشی اور سرور کی تکمیل کیلئے انہیں ہم مزاج مصاحب بھی دیئے جائیں گے۔

وَلَهُمْ فِيهَا اور ان کیلئے ان باغوں' نہروں اور میووں میں اس کے عوض جو انہوں نے اپنے اندر اخلاق الٰہی حاصل کر کے اپنی روح کے جوہر کو لازم کر لئے تھے۔ اور ان اخلاق سے متخلق ہو گئے تھے جو کہ اس کتاب کی عبارتوں اور اشاروں سے سمجھتے تھے۔

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۔ ردی اخلاق' بول' براز' حیض اور نفاس کی نجاستوں اور طبیعت کی گھن والی چیزوں جیسے ناک کا پانی' منہ کا پانی' میل اور بدبو وغیرہ سے پاک اور صاف بیویاں ہوں گی اور ان تمام نعمتوں کے باوجود اگر انہیں زائل ہونے' منقطع ہونے اور موت کا خوف بھی ہوگا تو وہ تمام نعمتیں بے مزہ ہو جائیں گی جس طرح کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ مجھے محبوب کی منزل میں کس قسم کا امن اور عیش ہو جبکہ ہر وقت گھنٹی آواز دیتی ہے کہ کجاوے باندھ لو لہٰذا انہیں اس قسم کے خوف سے پورے طور پر امن نصیب ہوگا۔

وَّهُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ اور وہ ان پر نعمت باغوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے جسموں پر روحانیت غالب آئی اور ایمان اور اعمال کی ہیئتیں ان کی روحوں اور قلوب پر غالب ہوئیں۔ پس ان کے جسم روحانیت کے غلبہ کی وجہ سے فنا کے قابل نہ رہے۔ اور ان کی ارواح اور قلوب ایمان اور اعمال کے آثار کے ساتھ ہمیشہ لذت پائیں گے۔ اور خوش رہیں گے۔

تین چیزوں کی دریافت لازم ہے

یہاں محققین نے کہا ہے کہ آدمی کو تین چیزوں کی دریافت لازم ہے پہلی چیز اپنا مبدء

کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ اور میں کیا تھا۔ دوسری چیز اپنی معاش کہ کہاں سے کھاتا ہوں۔ اور کہاں رہتا ہوں۔ تیسری چیز اپنا معاد کہ میرے کام کی آخر کیا ہے۔ ان آیات میں ان تینوں چیزوں کی یاددہانی کرائی گئی۔ مبدء کے بیان میں اس کے علاوہ کوئی حرف نہ فرمایا اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ کیونکہ اس سے زیادہ اس حقیقت کو کھولنا ممکن نہیں ہے۔ اور معاش کے بیان میں الذی جعل لکم الارض فراشا والسمآء بناء سے رزقالکم تک کچھ تفصیل ارشاد فرمائی کیونکہ اپنے معاش کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اور دونوں فریقوں کے معاد کے بیان میں فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ سے لے کر خَالِدُوْنَ تک سیر حاصل تبصرہ فرمایا اس لئے کہ اس بحث کو اپنے معاش پر قیاس کر کے سمجھ سکتے تھے نہیں سمجھے۔ پس یہ بیان کا بہت محتاج ہے۔

اور جب اس ضمن میں اعجاز قرآن کا اثبات اور اس کے برحق ہونے کی دلیل بیان ہوئی تو کافروں کے معارضہ کا جواب جو کہ وہ مناظرہ کے وقت وارد کرتے ہیں سوال مقدر کے جواب کے طریقے پر ذکر کرنا ضروری ہوا تا کہ دلیل قائم کرنے کے ساتھ شبہ کا دفعیہ بل کر کام پورا کر دے۔

کافروں کی طرف سے معارضہ کی تقریر جو کہ وہ قرآن پاک کے برحق ہونے کے باطل کرنے میں کرتے تھے یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کے مقابلہ اور تتبع سے ہم عاجز ہیں۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کلام بشری کلام نہیں۔ کلام الٰہی ہے۔ لیکن ہمارے پاس ایک اور دلیل اس پر ہے کہ یہ کلام' کلام الٰہی نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ بزرگ اپنی باتوں میں حقیر چیزوں کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور بے وقعت مثالیں اپنے کلام میں نہیں لاتے۔ حق تعالیٰ نے جو سب سے بڑا ہے اپنے کلام میں سورت حج کے آخر میں اور سورۃ عنکبوت کے درمیان میں بتوں اور انہیں پوجنے والوں کی تحقیر کیلئے مکھی اور مکڑی کا ذکر کیوں فرمایا۔ پس ان چیزوں کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کلام' کلام الٰہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے لائق نہیں۔ اور اس معارضہ کے جواب کی تقریر یہ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا تحقیق اللہ تعالیٰ عار نہیں فرماتا اس سے

کہ اپنے کلام میں کوئی مثال بیان فرمائے کیسی بھی ہو خواہ حقیر ہو یا عظیم کیونکہ تمثیل سے غرض نہ ہے کہ کبھی معقول معنی کے ادراک میں وہم کے جھگڑا کرنے سے وہ معنی پورے طور پر ذہن نشین نہیں ہوتا اور جب اس عقلی معنی کو محسوس صورت میں جلوہ گر کریں تو وہم کی کھینچا تانی سے خلاصی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس معقول معنی کا ادراک پوری وضاحت سے ہاتھ آتا ہے اس غرض میں اس چیز کی عظمت اور حقارت جسے مقام تمثیل میں لائیں برابر ہے۔ بلکہ تمثیل میں واجب یہ ہے کہ ممثل (جس کی مثال دی جائے) کے موافق ہو اگر حقیر ہو تو حقیر' اگر عظمت والا ہو تو عظمت والا۔ ہاں بزرگ اور عظمت والے لوگ اپنی کلام میں فحش کے ذکر اور ایسی تمثیلات کے استعمال سے جو فحش پر مشتمل ہوں حیا فرماتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں اس ادب کی کامل طور پر تعلیم فرمائی ہے۔ جہاں بھی جماع یا انسان کے ستر والے اعضاء کا ذکر ہوا کنایہ اور ابہام کے ساتھ ادا ہوا۔ کافروں کو یہ حیا جو کہ محمود ہے اشیائے حقیرہ کی تمثیل سے حیا کے ساتھ مشتبہ ہوا اور قیاس مع الفارق کر کے اعتراض کر دیا۔ حالانکہ اشیاء حقیر کا ذکر ایسے مقام میں جو کہ ان اشیاء کے ذکر کا تقاضا کرے کمال بلاغت اور عین فصاحت ہے برابر ہے کہ وہ حقیر شے۔

بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا مچھر ہو یا اس سے بڑی شے اور مچھر سے اوپر ہونے کے دو احتمال ہیں ایک یہ کہ جسامت میں بالا ہو جیسے مکھی اور ٹڈی۔ دوسرا یہ کہ چھوٹا ہونے میں اور حقارت میں بالا ہونا جیسے مچھر کا پر کہ حدیث پاک میں دنیا کو اس سے تمثیل فرمائی گئی جہاں کہ ارشاد فرمایا ہے **لو کانت الدنیا تعدل عنداللہ جناح بعوضۃ لماسقی کافرا منہاشر بہ ماء** اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی قدر رکھتی تو اس سے کافر کو پانی کا گھونٹ نہ پلاتا اور عرب میں مشہور ہے **ما البق وما شحمہ وما رجل الجراد مالحمہ** یعنی مچھر کیا۔ اور اس کی چربی کیا۔ اور مکڑی کا پاؤں کیا۔ اور اس کا گوشت کیا۔ اور فارسی کی مثالوں میں ہے کہ از بستن پائے پشہ چہ کشاید مچھر کا پاؤں باندھنے سے کیا کھلے گا علی ہذا القیاس۔

حاصل کلام تمثیل کا حسن کمال مطابقت پر مبنی ہے تمثیل کے اور اس کے درمیان جس کی

تمثیل لائے ہیں اگر یہ مطابقت پورے طور پر ثابت ہے۔ تو کلام کے حسن اور بلاغت کو بڑھاتی ہے ورنہ بلاغت میں ایک کمی پیدا ہو جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ امور حقیرہ کے مطابق نہیں ہوں گے مگر امور حقیرہ۔ پس ایسے مقام میں جو کہ تحقیر و اہانت کے مناسب ہے۔ امور حقیرہ کی تمثیل کو چھوڑنا بلاغت کا نقصان ہے۔ کلام الٰہی اس سے مبرا ہے۔ اور اس حقارت کی وجہ سے تمثیل کو چھوڑ دینا اور اس معنی کو بغیر مثال کے لانا سمجھانے اور وضاحت کرنے میں خلل ڈالتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ الامثال مصابیح الاقوال یعنی مثالیں اقوال کے چراغ ہیں۔ اور ظاہر ہے چراغ خواہ سونے کا ہو یا مٹی کا روشنی میں فرق نہیں رکھتا۔ پس اشیائے حقیرہ کی تمثیل سے حیا حق تعالیٰ سے محال ہے۔ اور اگر کافر کہیں کہ تمثیلات حقیرہ سے اللہ تعالیٰ کا حیا نہ فرمایا کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں؟ اگر اسی کلام سے دلیل لیتے ہیں تو عین دعویٰ سے دلیل لانا لازم آتا ہے۔ کیونکہ ابھی تو اس کلام کے کلام الٰہی ہونے میں بحث ہے خود اسی کلام سے اس بات کو ثابت کرنا کہ یہ کلام کلام الٰہی ہے اثبات الشیء بنفسہ ہے ہم کہتے ہیں کہ ہم اس مطلب کو ان کتابوں سے ثابت کرتے ہیں جن کا کلام الٰہی ہونا دوسرے مذاہب والوں سے بھی تسلیم شدہ ہے۔ جیسے کہ انجیل مقدس کہ اس بزرگ کتاب میں حقیر چیزوں کے ساتھ مثال دی گئی جیسے زواں جسے ہندی میں منمنہ کہتے ہیں۔ اور وہ ایک دانہ ہے جو کہ گندم میں مل کر اگتا ہے۔ اور اسے خراب کرتا ہے۔ اور جیسے رائی کا دانہ، چھلنی، کنکر، لکڑی کا کیڑا، پتھر کا کیڑا چنانچہ کھیتی کی اصلاح میں۔

انجیل مقدس میں اشیائے حقیرہ کا بیان ہے

جہاں کہ فرمایا ہے مَلَکُوت آسمانی کی تمثیل وہ شخص ہے جس نے اپنی کھیتی میں گندم کاشت کی جب سو گیا تو ایک دشمن آیا اور اس نے گندم کے درمیان بہت زواں ڈال دیا اور چلا گیا جب کھیتی زمین سے باہر آئی اس شخص کے غلاموں اور خادموں نے دیکھا کہ زواں گندم پر غالب ہے انہوں نے عرض کی اے ہمارے سردار آپ نے اس کھیتی میں صاف اور پاک گندم کاشت کی۔ یہ زواں کہاں سے پیدا ہو گئی اگر آپ فرمائیں تو ہم اسے گندم سے نکال دیں اس شخص نے کہا اگر تم اس وقت زواں کو نکالنے کے درپے ہو گئے تو اس کے ساتھ

اچھی گندم بھی اکھڑ جائے گی۔ ان دونوں کو چھوڑ دو تا کہ کھیتی کاٹنے کے وقت تک اکٹھے پرورش پائیں' جب کھیتی کاٹنے کا وقت پہنچا تو اس نے کاٹنے والوں کو فرمایا کہ زواں کو گندم سے علیحدہ چن لو اور اسے دستہ دستہ باندھ کر آگ لگا دو اور صاف گندم کو کھلیان میں جمع کر دو اور تمہارے لئے میں اس تمثیل کی تفسیر کرتا ہوں۔ وہ آدمی جس نے اچھی گندم کاشت کی تھی ابوالبشر ہے۔ اور اس کی کھیتی جہان ہے۔ اور پاک صاف گندم ملکوت کے بیٹے ہیں جو کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت میں عمل کرتے ہیں۔ اور جس دشمن نے گندم کے درمیان زواں ڈال دی ابلیس ہے۔ اور زواں گناہ اور نافرمانیاں ہیں جنہیں ابلیس کاشت کرتا ہے۔ کاٹنے والے فرشتے ہیں جو کہ اجل آنے تک نیک و بد کو یکساں پرورش کرتے ہیں۔ اور اجل کے پہنچنے کے وقت زواں کو گندم سے جدا کرتے ہیں بروں کو دوزخ کی آگ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور نیکوں کو ملکوت الٰہی میں سپرد کر دیتے ہیں۔ اور جب بروں کو جہنم کی آگ میں لے جاتے ہیں وہاں گریہ وزاری ہوتی ہے۔ اور دانت پیسنا اور نیکوں کیلئے راحت ہوتی ہے۔ جس کے سننے والے کان ہوں وہ سن لے میں تمہارے لئے ایک اور مثال بیان کرتا ہوں جو کہ ملکوت آسمانی کے بہت مناسب ہے ایک اور آدمی نے رائی کا ایک دانہ پکڑا جو کہ سب سے چھوٹا دانہ ہے۔ اور اسے اپنی کھیتی میں بویا جب وہ دانہ اگا ایک بڑا درخت بن گیا یہاں تک کہ بیج سے اگنے والے درختوں میں سب سے بڑا ہو گیا۔ اور آسمان سے پرندے آئے۔ اور انہوں نے اس کی شاخوں میں گھونسلا بنایا یہی ہدایت کی تمثیل ہے جو کوئی ہدایت کی طرف دعوت دے۔ اللہ تعالیٰ اس کے اجر کو بہت بڑا بنا دیتا ہے اس کے ذکر کو بلند کر دیتا ہے۔ اور جس نے اس کی وجہ سے ہدایت پائی نجات پا گیا۔ نیز انجیل مقدس میں فرمایا ہے کہ تم چھلنی کی مانند ہو کہ اس میں سے نفیس نکل جاتا ہے۔ اور کثیف اسی میں رہ جاتا ہے ایسا نہ ہو کہ حکمت تمہارے دل سے باہر چلی جائے۔ اور تمہارے سینوں میں کینے باقی رہ جائیں۔

نیز فرمایا ہے کہ تمہارے دل کنکریوں کی مانند ہیں کہ نہ آگ انہیں پختہ کر سکتی ہے نہ پانی انہیں نرم کرتا ہے۔ اور نہ ہوا انہیں حرکت دیتی ہے۔ نیز فرمایا ہے کہ اے خدا کے بندو! تم کل کے ذخیرہ کی فکر میں نہ رہو۔ اور جانوروں کے حال میں نظر کرو کہ اون اور ریشم کا انہیں

لباس دیا گیا ان کا رزق انہیں پہنچتا ہے۔ نہ وہ سوت کاتتے ہیں نہ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اور بعض جانور پتھر کے اندر اور لکڑی کے پیٹ میں ہوتے ہیں کون ہے جو وہاں انہیں لباس اور رزق پہنچاتا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا۔ آیا تم سمجھتے نہیں۔

نیز فرمایا کہ بھڑوں کو ان کی جگہ سے نہ اٹھاؤ ورنہ وہ تمہارے ساتھ لپٹ جائیں گی۔ اسی طرح بے وقوفوں اور بے عقلوں سے بات نہ کرو تاکہ وہ گالی نہ دیں۔

مچھر میں ہاتھی کے اعضا سے ایک شے زاید ہے اور اس کی سونڈ کے عجائبات

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ بڑے چھوٹے کا خالق ہے۔ اور اس کی حکمت ہر اس چیز میں جلوہ گر ہے۔ جسے اس نے پیدا فرمایا۔ پس جو چیز کسی حکمت اور منفعت پر مشتمل ہے اس کی تمثیل بیان کرنا قابل تحسین اور قابل تعریف ہے۔ بلکہ چھوٹے جسم اور حقیر قدر والی چیزوں میں اگر کوئی کامل حکمت اور عمدہ منفعت ظاہر ہو تو زیادہ عجیب ہوتی ہے۔ چنانچہ مچھر کی عجیب خلقت کے متعلق لکھا ہے کہ اتنے سے چھوٹے جسم کے باوجود جو کچھ ہاتھی کو اس کے اتنے بڑے جسم میں اعضاء جوارح دیئے گئے اسے بھی عنایت فرمائے گئے ایک زائد شے سمیت۔ اور اس کی سونڈ کے عجائبات میں یہ ہے کہ باوجود اس قدر چھوٹا اور کھوکھلا ہونے کے اگر اسے بھینس یا ہاتھی کی کھال میں چبھوئے تو اس طرح نیچے چلا جاتا ہے گویا انگلی حلوہ کے اندر چلی گئی۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ اس کی سونڈ کی نوک میں ایک زہر رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے اثر کرتی ہے۔

پس اشیائے حقیرہ کی تمثیل کو اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم ہے۔ اور اس نے ان چیزوں میں قسم قسم کی حکمتیں رکھی ہیں ہرگز ترک نہیں فرماتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام سننے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم اہل ایمان ہیں جن کا قول معتبر ہے۔ کیونکہ وہ عقل کے مطابق چلتے ہیں۔ اور دوسری قسم کفار ہیں جن کا قول معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عقل کے تقاضا کے برخلاف چلتے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۔ پس جو ایمان لائے۔ پس وہ جانتے ہیں کہ وہ تمثیل حق ہے ان کے پروردگار سے اس لئے کہ کسی سے بے وقعت اور حقیر

ہونے کا بیان بغیر بے وقعت اور حقیر چیز کے ساتھ مثال دیئے ہو نہیں سکتا اگر وہاں بزرگ چیزوں کی مثال دیں تو بے موقع ہوگی۔ اوران کا رب جو کہ چیزوں کے مرتبوں کو جانتا ہے۔ اور ہر چیز کو اس کے مرتبے میں رکھتا ہے اس کے خلاف ہرگز نہیں فرمائے گا۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ اور وہ جو کافر ہو گئے تو وہ کہتے ہیں باوجود اس کے کہ مثال اور جس کی مثال دی گئی میں مطابقت جانتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ حقیر چیز کی مثال حقیر چیز کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ کس چیز کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا باوجود یکہ اس کی عظمت کی کوئی حد نہیں۔

بِهٰذَا مَثَلًا اس چیز کی مثال دے کر تا کہ سبب ہدایت ہو۔ حالانکہ یہ حقیر چیز اس کی عظمت کے مناسب نہیں۔ اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مثال کو ممثل بہ کے عظمت و حقارت میں مطابق ہونا چاہئے نہ کہ ممثل یعنی مثال دینے والے کے مطابق ہاں حق تعالیٰ نے ان حقیر چیزوں کی تمثیلات قرآن میں لانے سے ایک عظیم کام کا ارادہ فرمایا ہے۔ اور وہ مومنوں اور کافروں کے درمیان امتیاز ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ اس کے سبب سے گمراہ فرماتا ہے باوجود یکہ فی نفسہ وہ سبب ہدایت ہے كَثِيْرًا بہت سے لوگوں کو جو کہ غلط فہمی کی وجہ سے اشیائے حقیر کی اشیاء کے ساتھ تمثیل کو مثال بیان کرنے والے کی عظمت کے منافی جانتے ہیں۔ اور اگر چہ یہ کثیر جماعت ہیں۔ لیکن ان کی کثرت کا کوئی اعتبار نہیں۔ تا کہ ان کے قول کو درستی پر محمول کیا جائے یا ان کی مذمت و طعن کو کسی شمار میں لایا جائے۔

وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا اور اس مثال کے ساتھ ہدایت عطا فرماتا ہے بہت سے لوگوں کو۔ کیونکہ اس مثال کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں بعض اشیاء کی حقارت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں چہ جائیکہ ان کی عبادت کریں۔

جواب طلب سوال: یہاں ایک جواب طلب سوال ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہدایت پانے والوں کو قرآن پاک میں دوسرے مقامات پر قلت کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔ چنانچہ

آیت منهم المومنون واکثرهم الفاسقون اور آیت و قلیل من عبادی الشکور' اور آیت الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وقلیل ماهم میں جبکہ یہاں دونوں فریقوں کو کثرت کے ساتھ موصوف فرمایا یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا بظاہر ان مقامات کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ پس تطبیق کی صورت میں ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی کوئی چیز بذات خود زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن دوسری چیز کی نسبت سے جو کہ اس سے کثیر ہوتی ہے اسے قلیل کہتے ہیں۔ ہدایت پانے والوں کا حال بھی ایسا ہی ہے کہ خود تو وہ زیادہ ہیں۔ لیکن ہدایت نہ پانے والوں کی نسبت سے قلیل ہیں یہاں ہدایت پانے والوں کا بیان ان کی اپنی ذات کے اعتبار سے ہے۔ اور دوسرے مقامات پر ہدایت پانے والوں کے حال کا بیان ہدایت نہ پانے والوں کی نسبت سے ہے۔ پس کوئی تعارض نہیں۔ علاوہ اس کے کہ اگر چہ ہدایت پانے والے گنتی میں قلیل ہیں۔ لیکن حقیقت میں کثیر ہیں چنانچہ کہتے ہیں بیت کہ ہم لوگ شہروں میں بہت ہیں اگر چہ تعداد میں قلیل ہیں۔ جیسا کہ ان کے غیر تھوڑے ہیں اگر چہ گنتی میں کثیر ہیں۔

ایک دوسرا سوال جواب طلب یہ ہے کہ ہدایت پانے والوں کا ذکر پہلے نہیں فرمایا۔ حالانکہ ان کی شرافت مقدم لانے کی متقاضی تھی اور اسی لئے قرآن پاک میں اکثر مقامات پر نیکوں کا ذکر بروں کے ذکر سے پہلے ہے جواب یہ ہے کہ یہ کلام کافروں کی گفتگوں کے رد کیلئے چلائی گئی جو کہ اعجاز قرآن کو باطل قرار دینے کیلئے اس شبہ سے دلیل پکڑ کر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اور گمراہ ہوتے ہیں۔ پس پہلے ان کے حال کو بیان کرنا منظور ہوا اور اسی لئے اس کلام میں کلام سابق کی نسبت جو کہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ہے نشر کو ترتیب لف کے خلاف لائے۔ اور یہ ہدایت اور گمراہی جو کہ قرآن پاک کے نزول اور اس کی تمثیلات کی وجہ سے لوگوں میں تفریق پیدا کرتی ہے اس کی زبردستی ترجیح بلا مرجح نہیں۔ بلکہ قرآن کا نزول دراصل ہدایت کا سبب ہوا نہ کہ گمراہی کا۔ لیکن عقل کے مزاج کا صحیح ہونا شرط ہے۔ اور سننے والے کی استعداد کا قصور روکنے والا ہے۔ اس لئے بنی آدم میں سے صحیح المزاج اور کامل الاستعداد افراد کیلئے قرآن پاک کا نزول گمراہی کا سبب نہیں ہو سکتا۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ اور اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں حقیر اشیاء کی تمثیل بیان فرماتا ہے اس کی وجہ سے گمراہ نہیں فرماتا مگر فاسقوں کو جو کہ حد عقل اور حد شرع سے نکل چکے ہیں۔ اور حق کو سمجھنے کی استعداد کو گم کر چکے۔

فاسق کے معنی کا بیان:

یہاں جاننا چاہئے کہ لفظ فاسق قرآن پاک کے عرف میں دو معنی رکھتا ہے ان دو معنوں میں سے ایک جو کہ اہل شرع کے عرف میں مشہور ہے یہ ہے کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ فرمان بجا نہیں لاتا اور کبیرہ کا مرتکب یا صغیرہ پر اصرار کرنے والا رہتا ہے بغیر اس کے اس کا تدارک توبہ سے کرے اس قسم کا آدمی اہل سنت کے نزدیک مسلمان ہے مگر گناہگار ہے اس کے حق میں نجات اور قبول شفاعت اور گناہ سے معافی ملنے کے امکان کی امید کرنی چاہئے۔ اور اس کے ساتھ مناکحت اور وراثت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے۔ اور مرنے کے بعد اسے مسلمانوں کے طریقے پر غسل دینا چاہئے نماز جنازہ پڑھنی چاہئے۔ اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا چاہئے۔ اس پر لعنت اُس سے بیزاری اور اس کا بغض دین کی رو سے حرام ہے۔ بلکہ اس کی امداد استغفار فاتحہ درود اور صدقات وخیرات کے ساتھ لازم شمار کی جائے۔ اور خارجیوں کے نزدیک کافر ہے اسلام سے باہر اور معتزلیوں کے نزدیک ایمان اور کفر کے درمیان ایک مرتبہ رکھتا ہے نہ مومن ہے نہ کافر اور زیدیوں کے نزدیک امامت کے قابل نہیں کہتے ہیں اس کی امامت میں نماز درست نہیں ہوتی۔ اس نماز کو لوٹانا فرض ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ ایک شخص جو کفر میں حد سے گزر جائے۔ اور سرکشی اور عناد اختیار کرے۔ اور دیدہ دانستہ حق کا انکار کرے۔ چنانچہ آیت بئس الاسم الفسوق بعد الایمان (الحجرات آیت ۱۱) میں پہلے معنی میں استعمال ہوا اور آیت ان المنافقين هم الفاسقون (التوبہ آیت ۶۷) اور آیت منهم المومنون واكثرهم الفاسقون (آل عمران آیت ۱۱۰) میں دوسرے معنوں میں استعمال ہوا اور اس آیت میں بھی اسی معنی میں ہے۔ اس لئے کہ معنی اول کے ساتھ فاسق ابھی فاسد المزاج نہیں ہوا اس مریض کا حکم رکھتا ہے جس

کی مرض عارضی ہے۔ اور اس کی روح کا مزاج عقائد حقہ کا اعتقاد رکھنے کی وجہ سے صحیح ہے۔ قرآن کے مواعظ اور اس کی تمثیلات سے نفع پاتا ہے۔ اور اصلاح قبول کرتا ہے۔ بخلاف فاسق بمعنی دوم کے کہ اس کا کفر جہل بسیط کی رو سے گزر کر جہل مرکب کی حد تک پہنچ گیا۔ قرآن اور اس کی تمثیلات غذائے صالح کی طرح ہیں جو کہ فاسد مزاج میں فاسد ہو کر فساد میں زیادتی کا موجب ہوتی ہے۔

اور اگر کسی کے دل میں آئے کہ فاسق مطلق خصوصاً وہ فاسق جو کہ ان آگے آنے والی صفات سے موصوف ہیں خود گمراہ ہیں۔ گمراہوں کو گمراہ کرنے کا کیا معنی؟ کہ تحصیل حاصل ہے ہم کہتے ہیں گمراہی کے مرتبوں کی ہدایت کے مرتبوں کی طرح انتہا نہیں۔ ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ میں ترقی کرتے ہیں۔ قرآن کے انکار اور اس کی تمثیلات میں طعن سے پہلے انہیں اصل گمراہی حاصل تھی۔ لیکن نزول قرآن اور اس کے اعجاز کے انکار کے بعد انہوں نے گمراہی کا اور مرتبہ حاصل کر لیا ہے جو کہ پہلے انہیں حاصل نہ تھا۔ ہاں اس مرتبہ تک ترقی کی استعداد ان میں چھپی ہوئی تھی جو اس وقت ظاہر ہوئی کیونکہ یہ فاسق

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وہ لوگ ہیں جو کہ اس عہد کو توڑتے ہیں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ باندھا ہے اس کو پختہ کرنے کے بعد۔

یہاں جاننا چاہئے کہ کسی شخص نے جب کلمہ اسلام زبان پر جاری کیا۔ اور پیغمبر علیہ السلام یا اس کے خلفاء میں سے کسی خلیفہ کے ساتھ بیعت کی پیغمبر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا اور اس کا نائب جانا تو اس نے خدا تعالیٰ کے ساتھ عہد باندھا کہ اس کے احکام میں سے جو کچھ بھی اس پیغمبر علیہ السلام کے واسطہ سے اسے پہنچے گا اسے قبول کرے گا۔ اور جب پیغمبر علیہ السلام کی صحبت میں پہنچا یا اس کی سیرت وشمائل کی کتابیں پڑھیں اور جب ان کے عادات واطوار جو کہ سراسر ان کی حقانیت کی دلیل ہیں مطلع ہوا اور ان کے معجزات اور ان کی امت کے اولیاء کے کمالات کو دیکھا یا سنا۔ اس عہد کو پختہ کیا۔

اس حالت کے بعد اگر معاذ اللہ امر اسلام میں اپنے دل میں شبہ کو جگہ دے اور اس شبہ کی وجہ سے احکام شرعیہ میں طعن کرنا شروع کر دے تو یقین ہے کہ یہ شخص عقل وشرع کی حد

سے باہر ہوا اور اس نے گمراہی کے اونچے مرتبے پر ترقی کی جو کہ اسے اسلام میں آنے۔ پیغمبر علیہ السلام اور ان کے معجزات دیکھنے یا ان کے عادات واطوار سننے سے پہلے حاصل نہ تھی۔ پس یہ حالت ظاہر علامت ہے اس پر کہ یہ شخص سرکش اور کفر کی ادنیٰ حد سے خارج اور اس کی اعلیٰ حد کو پہنچنے والا ہے۔

اور مفسرین میں سے بعض نے اس عہد کو الست بربکم والے دن کے عہد پر محمول فرمایا ہے۔ اور کہا ہے کہ بنی آدم کی ارواح میں سے ہر روح کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ان کی پشت سے باہر نکال کر چھوٹی چیونٹیوں کی شکل میں پھیلایا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا علم ان میں ودیعت فرمایا ہے۔ اور ان سے اس مضمون کا اقرار کروایا ہے۔ تو اس وقت تمام نفوس انسانی نے اپنے پروردگار کے ساتھ عہد باندھا ہے کہ اس کے غیر کو اس کے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔ اور اس کے احکام کی اطاعت کی رسی سے باہر نہیں جائیں گے۔

اور اس عہد کو پکا اور پختہ کرنا دو طریقوں سے ہے پہلا طریقہ دلائل توحید کو ان کے حق میں اس طرح گاڑنا کہ اگر وہ اپنی عقلوں کو اوہام کے پردوں سے صاف کر لیں تو ان دلیلوں کو پالیں اور یہی معنی ہے اشھدھم علی انفسھم کا۔ دوسرا طریقہ انہیں یہ عہد یاد دلانے اور شبہات وہمیہ دور کرنے کیلئے رسل علیہم السلام کو معجزات دے کر بھیجنا ہے۔ اور اس عہد کو توڑنا یہ ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید اور اپنی خواہشات اور شہوتوں کی اتباع میں اس قدر نیچے چلے جائیں۔ اور بدنی لذتوں اور دنیوی منفعتوں کو اختیار کریں کہ وہ علم ضروری ان سے چھپ جائے۔ اور اسے ریافت نہ کر سکیں اور جب ان تاکیدوں کے باوجود جو کہ اس عہد میں واقع ہوئیں اسے توڑ دیں اور اس کی مخالفت پر اصرار کریں تو یقین ہے کہ ان کی سرکشی اور عناد کا کمال ثابت ہوگا۔ حالانکہ وہ اسی قدر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ

قطع تعلقات کی صورتیں چند ایک ہیں

وَيَقْطَعُونَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ اور وہ اس تعلق کو قطع کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے۔ پہلا تعلق جو کہ روح کو مبادی عالیہ ملاء اعلیٰ اور عالم جبروت و

ملکوت کے ساکنوں کے ساتھ ہے۔ اور اسے قطع کرنا شہوتوں کی پیروی میں مشغول ہونے' تاریکی پھیلانے والے جواہر دنیوی سے محبت اور گھٹیا فانی امور پر حرص کرنے کی وجہ سے ہے۔ دوسرا تعلق جو کہ حضرات انبیاء علیہم السلام مرشدوں اور واعظوں کے ساتھ جبلت انسانی کے حکم کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اس تعلق کو قطع کرنا کافروں' منافقوں اور بدعتیوں کے پاس بیٹھنے' ان کے شبہات سننے اور نیکوں کے عادات واطوار میں طعن کرنے کی وجہ سے ہے۔ تیسرا تعلق قرابت اور رحم ہے۔ اور ان کا قطع کرنا چند قسموں کا ہے۔ ان میں سے ایک ملاقات ترک کرنا اور حاضری چھوڑ دینا ہے۔ جبکہ اس کی حاضری کی امید کی گئی ہو جیسے شادی' غم' بیمار پرسی اور امداد۔ دوسرا ان کے ساتھ احسان اور مروت چھوڑ دینا' تیسرا انہیں تکلیف پہنچانا اور ان تعلقات کو قطع کرنا باوجودیکہ ان کا لحاظ کرنا مقتضی عقل بھی اور مقتضاء شرع بھی ہے صریح دلیل ہے کہ یہ شخص عقل وشرع کے دائرہ سے باہر نکل چکا ہے۔

وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔

زمین میں فساد کرنے کے چند طریقے

چند طریقوں سے پہلا یہ کہ لوگوں کو ایمان سے متنفر کرتے ہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صلحاء امت کے عیب تلاش کر کے تشہیر کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ پیغمبر علیہ السلام کی صحبت کی تاثیر اور اس دین کی خوبی سے بد اعتقاد ہو جائیں۔

دوسرا یہ کہ بری رسموں اور بری بدعتوں کو لوگوں کے مال' انعام اور احسان میں طمع دلانے کی وجہ سے بدعتیوں اور فاسقوں میں رائج کرتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ اپنی خواہش اور غضب کو جاری کرنے میں بے باکی کرتے ہوئے قتل کرتے' زخمی کرتے' مارتے' گالیاں بکتے' تاوان لیتے اور مال لوٹتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جانوں' مویشیوں اور کھیتیوں کو ضائع کرنے' ڈاکے مارنے اور ذخیرہ اندوزی کرنے تک پہنچ جاتا ہے۔ اور ان چیزوں کی وجہ روئے زمین خراب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ ان حرکات کی وجہ سے اپنے مقصد تک جو کہ دین حق کی توہین اور اہل صلاح اور نیکوں کی تحقیر ہے نہیں پہنچتے بلکہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یہ لوگ وہی خسارے میں ہیں۔ جنہوں نے اپنے راس

المال کو جو کہ عقل تھی اور اس کی وجہ سے انہیں کثیر نفعوں کی امید تھی جو کہ دنیا میں کتاب کے فوائد اور آخرت میں بہشت کی لذیذ نعمتیں ہیں ضائع کر دیا۔ اور اس کی بجائے ان ہلاک کرنے والی چیزوں کو جو کہ مرنے کے بعد سانپوں اور بچھوؤں کی صورت میں نمودار ہوں گی خرید لیا۔ تو ان کے حق میں وہی مثال درست ہوئی اعطیٰ درۃ واخذ اجرۃ موتی دیا اور اینٹ لے لی۔

اور تم اس قرآن پاک کے تتبع سے عاجز ہو گئے۔ اور تمہارے معبود اور مشکل کشا بھی تمہاری مدد کرنے سے عاجز ہو گئے تو معلوم ہوا کہ تم قرآن پاک کو کلام الٰہی جانتے ہوئے انکار کرتے ہو تو یہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے۔ جبکہ آدمی سے اپنی ابتداء اور انتہا کو جاننے کے باوجود خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر کا تصور نہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ تم کس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات سے کفر سکتے ہو وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا حالانکہ تم بے جان قسم تھے تم میں کوئی حس و حرکت نہ تھی پہلے تم عناصر تھے اس کے بعد تم ماں باپ کی غذا ہوئے۔ اس کے بعد نطفہ اس کے بعد جما ہوا خون اس کے بعد گوشت کا ٹکڑا اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ کی عنایت تمہاری طرف متوجہ ہوئی فَاَحْيَاكُمْ ۔ پس اس نے روح پھوک کر تمہیں زندہ کیا۔ یہاں تک کہ تم میں حس و حرکت پیدا ہو گئی لیکن بے عقلی کی وجہ سے مردے کی طرح جاہل تھے یہاں تک کہ اس نے تمہیں عقل کامل بخشی۔ اور تمہیں ایک اور زندگی عطا فرمائی اور ابھی ان چیزوں کو جاننے میں مردہ کی طرح تھے جنہیں عقل دریافت نہیں کر سکتی یہاں تک کہ تم پر کتاب نازل فرمائی اور حضرت پیغمبر علیہ السلام کی زبان پاک سے اس کتاب کی شرح کرائی اور تمہیں ایک اور زندگی بخشی۔

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہیں موت دے گا۔ نہ اس لئے کہ تمہیں نیست و نابود کر دے۔ بلکہ اس لئے کہ اس تنگ فانی سرائے سے کھلی ہمیشہ رہنے والی سرائے میں تمہیں منتقل کرتا ہے۔ تا کہ اپنے علم اور کمائے ہوئے عمل کی جزا اس سرائے میں دیکھو۔

ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ پھر تمہیں زندہ فرمائے گا۔ جبکہ صور میں پھونک ماری جائے گی۔ اور یہ زندگی پہلی زندگی کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ پہلی زندگی میں تم اپنے خالق سے حجاب میں

تھے۔ اور اس زندگی میں حجاب بالکل اٹھ جائے گا۔

ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو جو ابتداء سے انتہاء تک کسی کے احسان کا گروی اور اس کے انعام کا امیدوار ہو۔ اور ہر حال میں اس کا کام اسی ذات سے وابستہ ہو اس سے کیسے ممکن ہے کہ وہ اس ذات کے ساتھ کفر کرے۔

سوالات اور ان کے جوابات

یہاں چند جواب طلب سوال باقی رہ گئے پہلا یہ کہ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا کے جملے کا تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ کے ساتھ کیا رابطہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ حال ہوگا۔ اور اس کے حال ہونے میں چند وجہ سے اشکال آتا ہے۔ پہلا اشکال یہ کہ جملہ ماضی جب حال واقع ہو تو ضروری ہے کہ قد مقدر ہو۔ اور قد کا خاصہ یہ ہے کہ ماضی کو حال کے قریب کر دیتا ہے۔ حالانکہ ان کا ماؤں کے پیٹ میں بے جان ہونا ماضی بعید ہے۔ قد کے داخل ہونے کا محل نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی ماضی بعید کو قریب اعتبار کرتے ہیں۔ اور قد کا لفظ اس پر داخل کرتے ہیں۔ جس طرح کہ اس میں کیف تکذب و قد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المؤمن لا یکذب تو کیسے جھوٹ بولتا ہے۔ حالانکہ رسول کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ مومن جھوٹ نہیں بولتا۔ چونکہ جب حضور علیہ السلام کا قول اس حدیث پاک کو محفوظ کیے ہوئے۔ اور اس پر عمل ہو رہا ہے اسے قریب اعتبار کیا گیا اگر چہ ماضی بعید ہے۔ اسی طرح یہاں جب زندگی کی گھڑیاں اور زمانہ عمر جلدی گزر گیا۔ اور گزرتا ہے۔ اگر چہ دور ہے نزدیک معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا اشکال یہ کہ اس تقدیر پر ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون کا عطف و کنتم امواتاً پر مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ امور صرف زمانہ مستقبل کے ہیں۔ اگر یہ اس پر معطوف ہوں تو حال ہوں گے۔ اور صرف مستقبل حال نہیں ہو سکتا۔ صاحب کشاف نے اس اشکال سے اس طرح جواب دیا کہ صرف جملہ ماضی حال نہیں۔ بلکہ سارا قصہ حال واقع ہوا تو گویا اس طرح ارشاد ہوتا ہے کیف تکفرون باللہ وقصتکم ھذہ القصۃ لیکن اس جواب میں ابھی خدشہ باقی ہے۔ کیونکہ جو قصہ مستقبل کے امور پر مشتمل ہو اس کا عامل کے وجود کی حالت میں مجموعی طور پر ثبوت مشکل معلوم ہوتا

ہے۔اس لئے کشاف کی عبارت کی توجیہہ کرنے والوں میں سے اکثر نے اس طرح اختیار کیا ہے کہ مجموعی قصہ حال واقع ہوا ہے۔لیکن معلوم ہونے کے اعتبار سے نہ کہ وقوع کے اعتبار سے اور اس قصہ کا علم عامل کے قریب ہے۔

اور اس جواب میں الجھن باقی ہے۔اور وہ یہ ہے کہ کافروں کو یہ قصہ معلوم نہیں تھا اور اگر ان میں سے بعض نے دیدہ دانستہ بحث کی ہوگی۔تو احتمال ہے۔لیکن ان میں سے اکثر دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے پر یقین نہیں رکھتے اور پچھلے مفسرین میں سے بعض نے یوں کہا ہے کہ یہاں مستقبل کے امور ثم کے معنی کے اعتبار سے بمعنی ماضی تاویل کیے گئے ہیں۔اس لئے کہ ثم کا معنی تراخی کے ساتھ عطف ہے۔پس کلام کا معنی یوں ہوگا فاحیاکم و تراخی اماتته و تراخی احیاء ہ ایاکم و تراخی رجوعکم الیه یعنی۔پس اس نے تمہیں زندہ فرمایا۔اور اس کا تمہیں موت دینا دیر سے ہوا اور اسی کا تمہیں زندہ کرنا دیر سے ہوا اور تمہارا اس کی طرف رجوع دیر سے ہوا اور اس وجہ میں یہی خدشہ باقی ہے۔اس لئے کہ امور کے دیر سے ہونے کو عدم کفر میں دخل نہیں۔اور اس کے علاوہ تراخی جو کہ ثم کا مدلول ہے ایک حرف کا معنی ہے جس میں استقلال بالکل نہیں۔بلکہ غیر کے ملاحظہ کا آئینہ ہے۔اور بس اور حال کو چاہئے کہ معنی مستقل ہو۔اور اگر حرفی معنوں کو اسمی معنوں میں لے کر وصف اور حال کیلئے استعمال کیا جائے تو حرفی اور اسمی معنی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

پس سب سے صحیح توجیہہ یہ ہے کہ جملہ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ کلام کا مقطع یعنی ختم ہونے کی جگہ ہے۔اور ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ کے جملہ پر معطوف ہے۔اور کلام کا حاصل یہ ہے کہ اپنے حال کی ابتداء جاننے کے باوجود تم سے کفر کا ہونا بعید ہے۔اور اگر یہ سب کچھ جاننے کے باوجود تم کفر اختیار کرتے ہو تو ایک موت اور ایک زندگی پھر تمہارے سامنے ہے اس کفر کی سزا اس موت اور حیات میں چکھو گے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ فَاَحْيَاكُمْ میں فا استعمال کی۔اور اس کے معطوفات میں لفظ ثُمَّ لائے ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو موت وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا میں مذکور ہے وہی ہے جو کہ باپ کی پشت میں نطفہ کو اور ماں کے پیٹ میں مل کو ہوتی ہے۔یعنی

عدم حیات اور یہ عدم حیات' زندہ کرنے کے وقت تک دراز ہے۔ پس احیاء اس سے ملا ہوا ہوگا۔ اور فا کے داخل ہونے کا محل ہوگا۔ اور موت دینا' احیاء سے بہت تاخیر رکھتا ہے۔ اگرچہ حیات سے متراخی نہیں۔ اور اسی طرح احیاء بھی موت دینے سے متراخی ہے۔ اگرچہ موت سے متراخی نہیں ہوگا۔ اور اسی طرح رجوع الی اللہ دوسرے احیاء سے متراخی ہے۔ پس ثم کے آنے کا محل ہوا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ بعض مفسرین نے ثُمَّ يُحْيِيكُمْ کو قبر میں نکیرین کے سوال کیلئے زندہ کرنے پر محمول کیا ہے۔ اور ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ کو حشر ونشر کے دن ثواب وعذاب کیلئے زندہ کر کے اٹھائے جانے پر۔ اس توجیہہ میں بھی کوئی قباحت ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ من حیث اللفظ اگرچہ توجیہہ کا احتمال ہو لیکن معنی کے اعتبار سے موزوں نہیں۔ کیونکہ اگر قبر کی حیات کو حیات حقیقی اعتبار کر لیا جائے تو بعث' حشر اور نشر کے وقت اس حیات پر کسی دوسری حیات کا وارد ہونا کوئی صورت نہیں رکھتا کیونکہ زندہ کو زندہ کرنا بے معنی ہے۔ تو دو امروں میں سے ایک ارتکاب چاہئے یا تو قبر میں ایک اور موت کا قائل ہونا چاہئے۔ اور وہ اجماع کے خلاف ہے۔ نیز اس کلام کے اسلوب کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں یوں کہنا چاہئے تھا کہ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یا اس بات کا قائل ہونا چاہئے کہ بعث حشر اور نشر کی حیات مجازی ہے حقیقی نہیں۔ اور وہ صریح طور پر باطل ہے۔

بلکہ تحقیق یہ ہے کہ حیات کا معنی روح کا بدن سے متعلق ہونا ہے۔ اور قبر میں روح کا تعلق بدن سے بالکل نہیں ہے۔ بلکہ جسم سے جدا ہونے کے بعد روح میں شعور اور ادراک باقی رہنے کو حیات سے تعبیر فرماتے ہیں۔ پس حیات قبر کو مجازیت پر محمول کرنا متعین ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ بعض لوگوں کو قرآنی نصوص کے اعتبار سے تین بار موت درپیش آئی جیسے حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال تک موت دے کر پھر زندہ کئے گئے۔ پھر دوسری موت جو کہ جاری ہے چکھائی گئی۔ اسی طرح بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ جو وبا کے ڈر سے بھاگ کر باہر آ گئے تھے انہیں فرمایا گیا مُوتُوا پھر انہیں زندہ کیا گیا۔ اور اسی طرح بنی

اسرائیل میں سے وہ لوگ جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ میقات میں گئے تھے بجلی سے مر گئے۔ اس کے بعد زندہ کیے گئے۔ چنانچہ اسی صورت میں آتا ہے ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ اور جب موت کے بعد احیاء لازم ہے۔ تو اس جماعت کو احیاء بھی تین مرتبہ واقع ہوا اور اس آیت میں صرف دو موت اور دو حیات پر اکتفا مطلقاً کس طرح درست ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دو موت اور دو حیات پر زیادہ کرنا عادی نہیں۔ اور یہاں ان نعمتوں اور تصرفات کا ذکر ہے جو کہ عادت کے حکم سے جاری ہیں۔ اور ہر کس و ناکس میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس دوبار سے زیادہ موت اور حیات بعض افراد اور بعض جماعتوں کے ساتھ مخصوص ہے قاعدہ کلیہ نہیں۔

اور باوجود اس کے دوبار سے زائد موت و حیات کا علم مخاطبین کو حاصل نہ تھا۔ کیونکہ وہ گزشتہ امتوں کے واقعات پر مطلع نہ تھے۔ اور ان کے خطاب میں زائد کے ذکر کی کوئی وجہ نہ تھی۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اس آیت میں علم عقائد سے عمدہ امور ضرور یہ دلائل کے ساتھ بیان فرمائے گئے۔ سامع کو چاہئے کہ وہ ان امور عظیمہ سے ان کے دلائل سمیت خبردار ہو۔

علم عقائد کا دلائل کے ساتھ بیان

پہلا امر عظیم یہ کہ عالم کو ایک پیدا کرنے والا ہے۔ جاننے والا' طاقتور' زندہ' سننے والا' دیکھنے والا اور اپنے ماسوی سے بے نیاز۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ زندہ کرنے اور موت دینے کی قدرت اس کے غیر کو حاصل نہیں ہے۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ حشر و نشر برحق ہے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ کام کرنے کی نسبت سے دوسری مرتبہ کام کرنا زیادہ آسان ہے۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو امر و نہی کی تکلیف دی ہے۔ اور ان کیلئے عالم آخرت میں خوف اور امید کے اسباب مہیا فرمائے ہیں۔ اور ان میں سے یہ ہے کہ دنیا میں بے رغبتی اختیار کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ اس زندگی کے بعد ایک موت

درپیش ہے۔ اور یہ زندگی موت میں بدل جائے گی۔ اور جو صورت کہ اس حالت میں ہے۔ اور جو مال' اولاد' گھر اور باغ اس زندگی کے نفع کیلئے دیئے گئے واپس لے لیں گے اس حد تک کہ موت کے بعد کسی چیز کا مالک نہ رہے گا۔ اور دنیا سے اس کے پاس کوئی نشان نہیں چھوڑیں گے مدت دراز لحد میں گزرے گی کہ اگرچہ اسے آواز دیں جواب نہیں دیتا اور اگرچہ اس سے پوچھیں کوئی بات نہیں کہتا۔ اور دلوں سے یہاں تک اتر جاتا ہے کہ رشتہ داروں کو اس کی زیارت کی پرواہ نہیں رہتی اور اہل خانہ اور قبیلے والے اسے بالکل بھلا دیتے ہیں۔ جیسا کہ کہنے والے نے کہا ہے کہ (بیت) ایک دن دو بیتوں نے میرا جگر کباب کر دیا کہ ایک کہنے والا رباب کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ اس جگہ ہمارے بغیر بے شمار زمانوں میں پھول آئیں گے۔ اور نئی بہاریں کھلیں گی۔ بہت سے موسم خزاں' موسم سرما اور موسم بہار آئیں گے لیکن ہم خاک اور اینٹ ہوں گے۔

اور جب اس زندگی کی حالت ایسی ہے۔ تو وہ اس قابل نہیں کہ اس سے دل باندھا جائے۔ اور اسے ہمیشہ کی زندگی پر جو کہ آگے ہے پسند کیا ہے۔ اور اگر کافر کہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہمارے زندہ کرنے اور موت دینے کا مصدر ہے۔ لیکن وہ ہم پر کوئی حق ثابت نہیں رکھتا کہ ہمیں اس کی نعمت کی ناشکری اور اس کے غیر کی التجا نقصان دینے والی ہو۔ کیونکہ ہمارے زندہ کرنے اور موت دینے کا صدور اس سے قصد و اختیار کے طریقے سے نہیں۔ بلکہ ہمارے وجود کے اسباب اس سے صادر ہوئے تھے۔ اور اسباب رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچے کہ ہم بھی عرصہ وجود میں آ گئے ابتداء سے ہماری ایجاد کا قصد نہیں رکھتا تھا کہ ہم پر اس کا کوئی احسان ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہارا یہ عقیدہ غلط ہے۔ کیونکہ

هُوَالَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ وہ ذات پاک ایسی ہے کہ جس نے تمہاری پیدائش سے پہلے تمہارے مقدر فرمایا۔

مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا جو کچھ کہ زمین ہے سب کچھ۔ جیسے اچھی غذا' مرغوب خوشبوئیں' اچھی آوازیں' خوبصورت چہرے اور دوسرے مزے' لذتیں' لذیذ چیزیں اور خواہشات۔ اور زمین میں سے بعض چیزوں کو ان مطالب اور ان مرغوبات کو تیار کرنے اور

ان کی استعداد حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا جیسے تیر و کمان' جال اور کانٹا شکار کیلئے۔ اور لکڑی اور لوہا اور بیل اور رسی کاشتکاری اور درخت لگانے کیلئے اور بعض چیزوں کو نقصان دور کرنے اور آرام و قرار کے حصول کا ذریعہ بنایا جیسے گرمی اور سردی کے دفعیہ کیلئے گھر اور خیمہ اور دوائی مرض دور کرنے کیلئے اور بعض چیزوں کو عبرت حاصل کرنے اور زیادہ باخبر ہونے کیلئے پیدا کیا جیسے موت اور بیماری اور مشقت اور درد اور موت میں اور فائدہ بھی ہے کہ اگر پہلے لوگ نہ مرتے اور پچھلے پیدا ہوتے رہتے تو اتنی کثیر تعداد کی زندگی بسر کرنے کو زمین تنگ ہو جاتی اور باہم ازدہام اور تصادم ہوتا پہلے لوگ ریاست اور مرتبے پر غلبہ جمائے رکھتے اور پچھلے ریاست اور حکمرانی کی لذت سے محروم رہتے۔

اسی طرح مشقتوں اور تکلیفوں میں دوسرے فوائد ہیں۔ ان میں سے عمدہ یہ کہ اگر مشقت نہ ہوتی تو اس مشقت کو دور کرنے کا کارخانہ اور ان اسباب کو تیار کرنے والے معطل رہتے۔ مثلاً اگر چور نہ ہوتا تو پہرے دار کیا کام کرتا اور اگر دشمن کا خطرہ نہ ہوتا تو قلعہ اور قلعہ بنانے والے بے کار رہتے اسی طرح اگر موسم سرما کی مشقت نہ ہوتی تو شال بننے والے بے کار ہوتے۔ اور اگر موسم گرما نہ ہوتا تو خس خانہ اور پنکھا معطل ہوتا اور اگر بھوک نہ ہوتی تو باورچی کیا کرتا اور اگر پیاس نہ ہوتی تو پانی والا نوکر اور سقہ بے کار رہتے اور اگر مرض نہ ہوتی تو دوا' طبیب' دوا فروش' فصد کرنے والا۔ اور جراح سب بے فائدہ ہوتے۔

اور بعض چیزوں کو کمالات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے حواس ظاہر اور حواس باطن اور ان امور کی استعدادوں کی مدد کرنے والی چیزیں جیسے دوات' قلم' کاغذ' سیاہی' استاد اور معلم اور بعض چیزوں کو عذر اور کوتاہیوں کو صحیح کرنے کیلئے پیدا فرمایا جیسے بھول اور خطا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ جہان میں ہے سب آدمیوں کے کام میں لگا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ زہر قاتل کہ بعض دواؤں میں اس سے بھی نفع ہوتا ہے۔ اور آدمی کی پیدائش سے پہلے ان چیزوں کو مقدر کرنا اس بات کی صریح دلیل تھی کہ آخر کار ایک مخلوق کو پیدا کیا جائے گا جو کہ ان چیزوں سے کام لے اور مصروف کرے جس طرح کہ آدمی کی پیدائش اور اسے ان ساری چیزوں کا محتاج بنانا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ آدمی میں ان تمام چیزوں کے اسرار رکھے

گئے ہیں ورنہ اس کے ان چیزوں میں تصرف اور انہیں حکمت کے مطابق استعمال کرنے کی صورت نہ بنتی اور جب یہ چیزیں جو کہ زمین میں مقدر تھیں زمین سے خود بخود ظاہر نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ زمین تو صرف قبول کرنے والی ہے۔ اور صرف قبول کرنے والے سے بالفعل کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے تمہاری منفعت کی تکمیل کیلئے ایک اور عنایت فرمائی کہ

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ پھر آسمان کی طرف راست توجہ فرمائی کیونکہ آسمان' زمین کے اندر کی چیزیں حاصل کرنے کیلئے اسباب کو ضمن میں لئے ہوئے تھا۔ فَسَوّٰهُنَّ ۔ پس ان آسمانوں کو اس طرح درست فرمایا کہ ان میں کوئی درز' شگاف اور کجی نہ رہی اور اعتدال کلی حاصل ہوا۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ سات آسمان تا کہ سیر کرنے والے کواکب ان میں حرکت کریں۔ اور ان کی حرکتوں سے قسم قسم کے اطوار ظاہر ہوں۔ اور ان اطوار سے وہ چیزیں جو زمین کے اندر چھپی ہوئی۔ اور مخفی ہیں ظاہر ہوں۔ جیسے بارش کا برسنا' میووں' دانوں اور غلوں اور گھاس کا پکنا سورج کے ساتھ اور رنگ اور مزہ اور خاصیتیں چاند اور دوسرے ستاروں کے ساتھ۔ چاروں فصلوں کی تبدیلی سورج کے قریب اور دور ہونے کے ساتھ اور دانوں اور ہر موسم کے پھلوں کا تیار ہونا اور ان اسباب کی ضرورت کا لاحق ہونا جو کہ ہر موسم کے نقصان کو دفع کرتے ہیں۔ جیسے مضبوط عمارتیں بارش کے وقت' گرم ملبوسات موسم سرما میں' خس خانہ' پنکھا اور برف موسم گرما میں اور ضیاء اور روشنی ہر حال میں آسمان کواکب سے ہے۔ اس لئے کہ زمینی جسموں میں چمکنے والا جوہر آگ کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اس جوہر آتش کی ہمیشگی انسانی بقا میں خلل ڈالتی ہے بخلاف آسمانی چمکنے والے جواہر کے۔

اور باوجود اس کے جسم آتش کا نور عام اور باقی نہیں ہے۔ بلکہ ہر وقت امداد اور ایندھن اور خس و خاشاک کے جلنے والے مادے کے خرچ کرنے کا محتاج ہے۔ جس طرح جو کچھ زمین میں ہے اس کے اسرار آدمی میں دویعت رکھے گئے ہیں۔ اور اس وجہ سے ان سے نفع حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جو کچھ آسمانوں میں ہے اس کے اسرار بھی اس میں رکھے گئے ہیں۔ تا کہ آسمانی چیزوں سے نفع حاصل کرے۔ اور نفع لینے کی ایک قسم جو کہ نفع لینے کی

سب قسموں سے عمدہ ہے نچلی مخلوقات کے اعتبار سے بھی جو کہ زمین میں ہے۔ اور اوپر کی مخلوقات کے اعتبار سے بھی جو کہ آسمانوں سے ہے نوع انسانی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور نفع لینے کی وہ قسم آیات قدرت اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے دلائل سے استدلال ہے۔ چنانچہ اسی نفع لینے کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے سنریهم ایا تنا فی الافاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق۔ (حم السجدہ آیت ۵۳) نیز جو نفع ان چیزوں سے آخرت اور اس جہان کے ثواب وعذاب کو یاد کرانے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے وہ بھی نوع انسانی کے ساتھ خاص ہے۔ اس لئے وہ کہ انس اور لذت کے اسباب جو کہ کھانے اور پینے کی چیزوں اور پھلوں' منکوحات اور سواریوں میں سے جسے دیکھتا اور سنتا ہے جنت کی نعمت کو اسی پر قیاس کرتا ہے۔ اور وحشت اور درد کے اسباب جیسے غم' خوف' گرنے والی بجلی' آگ' درندے' طوق' زنجیر' سانپ اور بچھو کو دیکھتا اور سنتا ہے۔ تو عذاب دوزخ کو اس پر قیاس کرتا ہے۔

اور اس مقام پر سات آسمانوں کے ذکر کی تخصیص اس لئے ہے کہ نچلی کائنات کے آثار جو کہ زیادہ تر نوع انسانی کو مطلوب و درکار ہیں انہیں سات آسمانوں اور ان کے ستاروں کے ساتھ ہیں ورنہ ان چیزوں کے اصول عرش وکرسی کی ارواح مدبرہ سے ظاہر ہوئے ہیں۔ اور انسان بلکہ ہر مخلوق کو سب سے عظیم نفع ان ہی سے ہے۔ لیکن چونکہ نچلی کائنات کا ان سے رابطہ ظاہر بینوں کی نظر سے پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے۔ اس لئے عرش وکرسی بلکہ لوح وقلم کا ذکر بھی اس مقام میں نہیں فرمایا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ آدمی کو زمین وآسمان کی چیزوں سے نفع پہنچانے اور ان چیزوں میں اس کے کام میں آنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں اس امر پر صریح دلیل ہے کہ آدمی کا وجود اور اسکی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے معرض وجود میں آئے وہ اس قبیلے سے نہیں کہ دوسری چیزوں کی پیدائش اس تک کھینچی گئی ہو بغیر اس کے کہ وہ مقصود بالذات ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اس چیز کے سبب سے رابطے کو جانتا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ پس وہ ہر چیز کو جو کہ زمین و

آسمان میں ہے جانتا ہے۔ اور ان تمام چیزوں کے اسرار کو آدمی میں ودیعت رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح وہ ان کی موت کے بعد ہر مرنے والے کے اجزاء کو جانتا ہے۔ پس مردہ کے تمام اجزاء کو اس کے لوٹانے کیلئے جمع کرنا اس کے نزدیک آسان کام ہے۔ نیز ہر عمل کا تقاضا جو کہ اچھی یا بری جزا ہے جانتا ہے۔ اور جو ان نعمتوں کے شکر کا تقاضا ہے۔ اور جو ان نعمتوں کی ناشکری کا تقاضا ہے وہ بھی جانتا ہے۔ پس ان چیزوں کا جاننا آدمی کو مجبور کر کے اس امر پر کھینچتا ہے کہ اس کی نعمت کی ناشکری نہ کرے۔ اور اس کے نازل کئے ہوئے احکام کا انکار نہ کرے۔

سوالات اور جوابات

یہاں دو جواب طلب سوال باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا دلالت کرتا ہے کہ زمین میں جو کچھ ہے اس فائدہ لینا ہر ایک کیلئے مباح ہے۔ جیسا کہ اباحتیوں کا مذہب ہے۔ حالانکہ حرام چیزوں کی حرمت تمام شریعتوں میں یقیناً ثابت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام چیزوں کی تمام آدمیوں کے نفع کیلئے پیدائش اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ ہر چیز سے ہر آدمی نفع لے سکتا ہے۔ بلکہ اس آیت میں جَمِیْعَ مَا فِی الْاَرْضِ کا مقابلہ جمیع بنی آدم کے ساتھ تقاضا کرتا ہے کہ پہلے کے افراد دوسرے کے افراد پر تقسیم ہوں۔ پس جو چیز غیر کے حق کے ساتھ متعین ہوگئی۔ اور اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے کسی کی ملک ہوگئی اس سے نفع لینا صاحب حق کی اجازت کے بغیر جائز نہ ہوگا۔ اور اسی طرح جَمِیْعَ مَا فِی الْاَرْضِ سے بنی آدم کا نفع لینا تقاضا نہیں کرتا کہ ہر کسی کو ہر چیز سے ہر قسم کا فائدہ لینا جائز ہوگا بلکہ فائدہ لینے کی وجوہ کو مقرر کرنے کیلئے شرع شریف کی طرف رجوع کرنا چاہئے مثلاً عورت سے جو فائدہ لینا ہے وہ مقاربت کے ساتھ ہے۔ اور جو فائدہ لینا ماں اور بہن سے ہے وہ شفقت و امداد کے ساتھ ہے۔ اور پانی سے نفع لینا پینے کے ساتھ ہے۔ اور آگ سے فائدہ لینا کھانا پکانے سے ہے۔ بلکہ لفظ لَکُمْ کا لام نفع والا جو کہ اس میں موجود ہے اس بات پر صریح دلیل ہے کہ ان سب چیزوں کو اپنے نفع میں استعمال کرو نہ کہ ضرر میں۔

ضرر کی دو قسمیں ہیں دنیوی اور دینی۔ دنیوی کو اہل تجربہ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اور دینی کو انبیاء علٰی نبینا وعلیہم السلام جان سکتے ہیں۔ کیونکہ دینی نقصان کے ظہور کا وقت آخرت ہے۔ اور اس وقت کو کوئی دریافت کر کے نہیں آیا تاکہ اس نے اس ضرر کا تجربہ حاصل کیا ہو تو اس نقصان کی پہچان کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ پیغمبروں علیہم السلام کی بات سنیں اور اس پر یقین کریں۔ یہی وجہ ہے کہ حرام چیزوں کی حرمت تمام شریعتوں میں واقع ہیں۔

اور اگر کوئی کہے کہ زمین میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن سے نفع لینا شریعت میں ہر طرح رائیگاں قرار دیا گیا ہے۔ اور اسے قیمت والے مال کی جنس خارج کیا گیا ہے۔ جیسے شراب اور خنزیر۔ ان چیزوں سے نفع لینے کی کیا صورت ہوگی۔ ہم کہیں گے کہ جس طرح کہ زمنی چیزوں میں اس طرح کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں جو کہ محض بے قدر ہیں اسی طرح بنی آدم کے گروہ میں ایک ایسا فرقہ پیدا کیا گیا ہے جو کہ اللہ تعالٰی کے ہاں محض بے قدر ہے اس فرقے والے ان بے قدر چیزوں سے نفع یاب ہوتے ہیں۔ اور [illegible] مشہور ہے کہ ہر گندا پکانے والے کو گندا کھانے والا ہے۔ اور اہل عقل وشرع جو اس بے قدر گروہ کو ان چیزوں سے نفع اٹھاتے دیکھتے ہیں۔ اور ان کا نفس بھی ان سے نفع لینے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو حکم شرع کے مطابق اس سے بند رکھتے ہیں انہیں [illegible] یم حاصل ہوتا ہے کہ وہ صبر کے ثواب کے مستحق ہوتے ہیں **اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ**

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے اس کی خلقت آسمانوں کی خلقت سے پہلے ہے۔ اور یہی معنی سورت حم السجدۃ میں پوری صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ اور وہ جو سورت نازعات میں آیا کہ **وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا** صریح دلالت کرتا ہے کہ زمین کو پھیلانا اور بچھانا آسمان کی خلقت اور اسے برابر کرنے بلکہ آپ کی حرکات کے بعد ہے۔ اور دن رات کے ظہور کے بعد اور ظاہر ہے کہ زمین کی خلقت اور جو کچھ زمین میں ہے بغیر زمین کے بچھانے کے ممکن نہیں۔ پس دونوں آیتوں کے مضمون میں تعارض اور ٹکراؤ ہو گیا۔ اور اس کے باوجود **خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا** کم از کم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کچھ زمین میں اس کی خلقت کی

ابتداء سے لے کر اس خطاب کے وقت تک موجود ہوا ہے وہ آسمانوں کے برابر کرنے سے پہلے ہے۔ اور یہ معنی حس اور حقیقت کے خلاف ہے اس سے قطع نظر کہ دوسری آیت کے معارض ہے صحیح نہیں آیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ کو بمعنی قدر لکم سمجھنا چاہئے۔ اور اسی طرح سورۃ سجدہ میں وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا اقواتها کیونکہ جَمِيعً مَّا فِي الْاَرْضِ کی خلقت حرکات آسمانی کے واسطہ کے بغیر واقع نہیں۔ پس آسمان کو برابر کرنا متاخر نہیں ہو سکتا۔ اور وہ جو دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ زمین کا بچھانا آسمان کی خلقت سے متاخر ہے۔ اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ آسمان کا برابر کیا جانا زمین کی خلقت سے متاخر ہے۔ تو یہ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا کے عموم اور آیت رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا سے غفلت پر مبنی ہے ہاں احتمال ہے کہ پہلے زمین کو چھوٹا سا پیدا کیا ہوگا از اں بعد آسمان کی طرف متوجہ ہو کر اور انہیں سات آسمان بنا کر گردش میں لایا گیا رات دن کا نور اور تاریکی ظاہر کر کے پھر زمین کو بچھایا اور جو کچھ تھی اس سے زیادہ وسیع اور فراخ بنائی ہوگی۔ اور اس احتمال پر ساری آیات ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتیں مگر یہ کہ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا کو معدنیات اور نباتات کے ساتھ مخصوص کرنا ضروری ہے۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے اس احتمال کی تائید کرنے والا قول منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ ایک ڈھیلے کی شکل کی شے بنائی جس پر دھواں لپٹا ہوا تھا پھر دھواں اوپر اٹھایا اور اس سے آسمان بنائے۔ اور اس ڈھیلے کو اسی جگہ رو کے رکھا اور اس سے زمین کو پھیلایا۔ پس یہ ہے اللہ تعالیٰ کا قول کَانَتَا رَتْقًا کہ زمین آسمان بند تھے۔

زمین و آسمان کی پیدائش میں چند فوائد

یہاں چند فائدے جاننا چاہئے پہلا یہ کہ سدی کی روایت سے ابن عباس اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دوسری جماعت سے اس ـ ت منقول ہوا ہے کہ آسمان اور زمین کی خلقت سے پہلے دو چیزیں موجود تھیں عرش اور پانی ـ ب اللہ تعالیٰ کا ارادہ آسمان اور زمین کی

خلقت کے ساتھ متعلق ہوا پانی سے ایک دھواں اٹھا اور دھواں اٹھنے کی وجہ بعض روایتوں میں اس طرح آئی کہ اس پر ہوا مسلط کی گئی اور اس ہوا کی وجہ سے پانی میں موجیں اور جوش پیدا ہوا اور موجوں کی تیزی حرکت کی وجہ سے پانی کے جوہر میں ایک گرمی پیدا ہوئی جو کہ دھواں پیدا ہونے کا سبب بنی اور وہ دھواں اوپر کی طرف بلند ہوا اور وہی دھواں آسمان کا مادہ ہے جس کے متعلق ایک اور آیت میں اشارہ واقع ہے ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ (الدخان) پھر کچھ پانی میں خشکی اور سختی پیدا ہو کہ زمین کی خلقت کا مادہ بنی۔ پس اس زمین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے سات زمینیں بنایا اس کے بعد مادہ آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور اسے سات آسمان بنایا۔

اور ان روایات میں زمین کی خلقت کو چار دنوں میں اس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ بروز اتوار اس دھوئیں کی پیدائش جو کہ آسمان کا مادہ ہے۔ اور اس سخت مٹی کی پیدائش جو کہ زمین کا مادہ ہے کی ابتداء واقع ہوئی۔ اور پیر کے دن زمین کو سات قطعے بنایا گیا۔ منگل کے دن پہاڑوں کو زمین پر گاڑا اور نہروں کو جاری کیا۔ اور بدھ کے دن درختوں کو اگایا گیا۔ اور جانوروں کی روزی' دانہ اور گھاس اس میں پیدا کیا۔ اور جمعرات کے دن آسمان کے مادہ کی طرف توجہ فرمائی اور انہیں سات آسمان بنایا۔ اور جمعہ کے دن ہر آسمان میں ستارے بنائے۔ اور ان میں سے ہر ستارے کی گردش مقرر فرمائی اور فرشتوں کو ہر آسمان کے کاروبار کیلئے مقرر فرمایا۔ پس سارے جہان کی خلقت چھ دنوں میں اس تفصیل کے ساتھ واقع ہوئی چنانچہ سورت حم السجدہ میں اس تفصیل کا اشارہ فرمایا۔

لیکن یہاں ایک اشکال ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دن اور رات سورج کے طلوع اور غروب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور آسمان اور زمین کی تخلیق سے پہلے دن رات کا تصور کیسے ہو سکتا ہے۔ علماء میں سے بعض اس کے جواب میں اس طرح کہتے ہیں کہ ان دنوں سے مراد دنوں کی حقیقت نہیں۔ بلکہ دنوں کی مدت ہے۔ یعنی جہان کی ساری خلقت اتنی مدت میں رونما ہوئی کہ اگر اس مدت کو دن رات کی مدت پر قیاس کریں تو چھ دن ہوتے ہیں۔ اور بعض علماء یوں کہتے ہیں کہ دن رات جس طرح سورج کے طلوع وغروب کے ساتھ

صورت پکڑتے ہیں اسی طرح دوسری حرکات اور گھومنے والے حوادث کی وجہ سے بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ پس احتمال ہے کہ آسمان اور زمین کی خلقت سے پہلے کسی وقت عرش کا نور پھیلتا تھا اور اس وقت کو دن اعتبار کرتے تھے۔ اور بعض اوقات چھپ جاتا تھا اور اس وقت کو رات قرار دیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی ان مقامات پر جہاں آفتاب کا طلوع و غروب پہلی حرکت پر نہیں ہوتا جیسے ۹۰ عرض بلد پر اس کا طلوع و غروب اس کی خاص حرکت کے ساتھ جو کہ چھ ماہ کی مدت میں ہوتی ہے۔ اور چھ مہینوں تک باقی رہتی ہے دن اور رات کا مبدء اعتبار کرتے ہیں۔ پس برج حمل کے اول سے سنبلہ کے آخر تک دن کہتے ہیں۔ اور میزان کے اول سے حوت کے آخر تک کو رات کا نام دیتے ہیں اس قیاس پر اس سے پہلے کہ سورج موجود ہو دوسری حرکات اور دیگر حوارث کے ساتھ دن اور رات کی حد بندی ہوتی ہوگی۔ اور اس حساب سے تمام عالم کی خلقت چھ دن کی مدت میں واقع ہوئی۔

اور محققین اس بات پر ہیں کہ جس طرح دن اور رات کی سابقہ حرکات کے ساتھ حد بندی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح لاحق ہونے والی حرکات کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ پس یہ ایام جو کہ آسمان اور زمین کی پیدائش کی مدت' میں اسی پیدائش کی وجہ سے حد اور تشخص میں آ گئے جب ایک کام کیا ایک دن ہو گیا جب دوسرا کام کیا تو دوسرا دن ہو گیا۔ پس دنوں کا معنی دفعات کے معنوں میں ہے۔ یعنی چھ دفعات اور چھ بار میں ہے۔ دو بار آسمان پر توجہ ہوئی' ایک بار اس مشترکہ ہیولا سے جسے پانی سے تعبیر کیا گیا ہے اس کا مادہ اٹھانے کو اور ایک بار صورتیں ڈالنے کو کہ کواکب کا وجود' سات آسمانوں کی ترتیب اور ان سے خاص قسم کی حرکات کا صادر ہونا انہیں صورتوں کے طفیل ہے۔ اور چار دفعہ زمین کے ساتھ توجہ فرمائی ایک بار سفلیات کا مادہ اٹھانے کو' دوسری صورت بسیط ڈالنے کیلئے تیسری صور معدنیہ کا فیض دینے کو اور چوتھی بار نباتات کی صورتیں القاء کرنے کے لئے کہ حیوانات کی زیادہ تر خوراک انہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اور ہم اس پر آ گئے کہ صحیح مسلم' تاریخ بخاری' صحیح نسائی اور حدیث پاک کی دوسری کتابوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا

ہاتھ پکڑا اور ان کی انگلیوں پر شمار فرمایا۔ اور فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا۔ اور اس میں پہاڑ اتوار کے دن' چار پائے اور درخت پیر کے دن' تکلیفات منگل کے دن' نور بدھ کے دن پیدا فرمایا۔ اور اس میں چار پائے جمعرات کے دن پھیلائے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا فرمایا۔ اور یہ روایت سابقہ روایت کے ساتھ ظاہری طور پر تعارض اور تناقض رکھتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں آسمان وزمین کی خلقت کی ابتداء کا بیان نہیں۔ بلکہ زمینی اشیاء کی خلقت کا بیان ہے گو یہ خلقت مسلسل و متصل نہ ہو بلکہ بعض چیزوں کی۔ اور بعض دوسری چیزوں کی خلقت کے درمیان فاصلہ دراز ہوگا۔

آسمان کے مادہ کے بیان میں دوسرا فائدہ

دوسرا فائدہ یہ کہ آسمانی جواہر زمینی جواہر سے جدا ہیں۔ پس وہ جو ربیع بن انس' سلمان فارسی اور کعب احبار رضی اللہ عنہم کی روایات میں واقع ہوا ہے کہ آسمان دنیا ایک موج ہے جو کہ لٹکی کھڑی ہے دوسرا آسمان سفید چاندی سے ہے' تیسرا آسمان لوہے سے ہے' چوتھا تانبے سے' پانچواں سونے سے چھٹا' سبز زمرد سے اور ساتواں یاقوت سرخ سے یا اس قسم کی تمام روایات تشبیہ پر مبنی ہیں۔ یعنی ان جواہر کو جواہر دنیا پر قیاس کریں تو یہ تشبیہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے روایات میں بہت اختلاف آیا ہے۔ اور یہی دلیل ہے اس بات کی یہ سب کلام تشبیہ پر مبنی ہے۔

طبقات آسمان کے بیان میں تیسرا فائدہ

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اہل حکمت نے حرکات کے تقاضا کے مطابق جو کہ انہیں معلوم ہیں یوں قرار دیا ہے کہ آسمان کے نو طبقے ہیں۔ پہلے آسمان کو اوپر کی طرف سے فلک الافلاک کہتے ہیں۔ اور اس یومیہ حرکت کو جو کہ سورج اور دوسرے ستاروں کا طلوع و غروب ہے اس کے سبب سے ہر خاص و عام کو محسوس ہے اسی کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ اور دوسرے طبقہ کو فلک الثوابت کہتے ہیں۔ اور کواکب کی ست رفتار کو جس کی وجہ سے بروج و منازل کی

صورتیں پس و پیش ہوتی ہیں اس کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ اور سات دوسرے آسمان سات ستاروں کیلئے اس ترتیب کے ساتھ ''بیت'' قمر ہے۔ اور عطارد اور زہرہ شمس اور مریخ مشتری اور زحل ثابت کرتے ہیں۔ اور چونکہ تمام نقلی دلائل کے ضمن میں سات آسمان ہیں۔ اس لئے اپنی معلومات کو نقلی دلائل کے ساتھ مطابقت دینے کیلئے کہتے ہیں کہ دو زائد آسمانوں کو شرع شریف میں عرش اور کرسی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ تکلفات پر مبنی اور بے معنی ہے۔ جس طرح کہ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ احتمال ہے کہ ان سات آسمانوں کو ایک مدبر فرشتے نے حرکت یومیہ کے ساتھ جو کہ تمام اجرام کو شامل ہے حرکت دی ہو۔ اور تمام ثابت ستارے آسمان زحل میں گڑے ہوں۔ اور زحل اس آسمان کے حجم میں۔ پس سات آسمانوں سے زیادہ ثابت نہ ہوں۔ اور جو کچھ عرش و کرسی کی تعریف میں روایات شرعیہ میں آیا ہے اکثر ان دو افلاک پر منطبق نہیں ہوتا۔ پس بہتر یہی ہے کہ آسمانوں کی تعداد سات کا اعتقاد کیا جائے۔ اور ان کے علاوہ عرش و کرسی کو ثابت کرنا چاہئے۔

ابوالشیخ نے حضرت امیر المومنین علی مرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کی ہے کہ آسمان دنیا کا نام رقیع اور ساتویں آسمان کا نام براح ہے۔ اور ابن المنذر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آسمانوں کا سردار وہ آسمان ہے جس میں عرش ہے۔ اور زمینوں کی سردار وہ زمین ہے جس پر تم رہتے ہو۔ اور ابن ابی حاتم نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں نے ایک دن حضرت علی کو قسم اٹھاتے سنا کہ اس ذات کی قسم جس نے آسمان کو دھوئیں اور پانی سے پیدا کیا۔ اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ہر چیز میں غور و فکر کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر مت کرو۔ پس تحقیق ساتویں آسمان کے درمیان اس کی کرسی تک سات ہزار نور ہیں۔ اور وہ ان سے وراء ہے۔

یہاں جاننا چاہئے کہ عرش و کرسی کا دو عدد ہونا یعنی علیحدہ علیحدہ دو وجود ہونا ابھی تک دلیل قطعی کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ بلکہ بے شمار دلائل سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمانوں سے اوپر بہت دور جبکہ بے شمار انوار درمیان میں ہیں ایک نورانی جسم ہے کہ اسی جسم کو کبھی عرش کا

نام دیتے ہیں۔ اور کبھی کرسی کا اور وہ جسم تمام آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے۔ چنانچہ آیت وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں بھی اس معنی کی مہک دی گئی ہے واللہ اعلم

خلافت کو آدم کے ساتھ خاص کرنے کا بیان

حاصل کلام یہ ہے کہ آدمی کو جو اس شرافت سے ممتاز کیا گیا۔ اور جَمِیْعَ مَا فِی الْاَرْضِ کو اس کیلئے پیدا کیا گیا۔ اور ساتوں آسمانوں کو اس کے کاروبار کیلئے درست کیا گیا۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں اسرار' اسرار خدائی اور اسرار عالم کا جامع اور وہ تمام جہانوں پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے لائق ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم قسم کی مخلوق کو علویات اور سفلیات سے پیدا فرمایا ہے۔ اور باوجود خالق ہونے اور مالک ہونے کے کمال بے نیازی کی وجہ سے عالم کی کسی چیز سے نفع نہیں لیتا اس لئے کہ کسی چیز سے بھی نفع لینا فرض کریں تو اس چیز کی احتیاج لازمی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی وجہ سے بھی کسی چیز کی احتیاج نہیں رکھتا کیونکہ احتیاج اس کی صمدیت کے منافی ہے۔ تو ایسی مخلوق کا ہونا ضروری ہوا جو کہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق اور اس کے اوصاف سے موصوف۔ اس کے اوامر ونواہی کو نافذ کرنے' دوسری مخلوق پر حکم چلانے' ان کے کاموں کی تدبیر کرنے' ان کے انتظام کی حفاظت اور انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف کرنے کا کام اس سے سرانجام پا سکے ورنہ یہ سب رنگا رنگ کی مخلوقات معطل اور بیکار رہتی اور حکمت اس کے منافی ہے۔ پس اس تدبیر کے ساتھ گویا تمام مخلوقات کے منافع کو اس نائب کے واسطہ سے پورے طور پر حاصل کرنا منظور ہوا چنانچہ کسی کہنے والے نے کہا ہے (بیت) سرمد جو کہ بلبل ہے سونے کی پرواہ نہیں کرتا اس کا یار پھول ہے۔ اور پھول کیلئے سونے کی ایک مٹھی ضروری ہے۔ اور اس خلیفہ کیلئے واجب ہے کہ تمام انواع کی خلقت کے بعد پیدا ہوتا کہ اس سے تمام مخلوقات کی منفعتیں پوری طرح حاصل کرنے کی صورت ہو سکے۔ اور دوسری مخلوقات' ضرورت کی چیزوں اور گھریلو سامان کی طرح جو کہ شادی میں ضروری ہوتی ہیں اس کے وجود سے پہلے مہیا ہو کر اپنی استعداد کی زبان سے اس خلیفہ کے وجود کا تقاضا کریں۔ اور ان کی زبان حال اس بات کا ترانہ گائے کہ تو اس ناقہ پر کب سواری کرے گا جس پر زین ڈالی جا چکی ہے اور وہ مخلوق نہیں ہے مگر

انسان کیونکہ اس کے وجود سے پہلے شعور و ارادہ والی مخلوق میں سے دو قسموں کے سوا کوئی موجود نہ تھا فرشتے اور جن، فرشتوں کے لائق نہ تھا کہ اوپر اور نیچے کی مخلوق کے منافع پوری طرح ظاہر کرسکیں۔ اس لئے کہ ضرورت کی اکثر وجوہ سے پاک اور فارغ پیدا کئے گئے ہیں بیوی' بیٹا' کھانا' پوشاک اور ان امور کے لوازمات کی انہیں ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ خواہش اور غضب نہیں رکھتے۔

جن اگرچہ شہوت و غضب رکھتے تھے لیکن ان کی خیالی قوت ان کی قوت عقلیہ پر اس حد تک غالب ہے کہ جس چیز کا خیال کرتے ہیں اسی کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ کانے پر سوار بچے کی طرح جو کہ اپنے آپ کو حقیقتاً گھوڑے پر سوار سمجھتا ہے۔ اور اپنے لکڑی پر سوار ہونے کو گھوڑ کے لوازمات میں سے ثابت کرتا ہے۔ پس اگر تمام مخلوقات کو اس کے منافع میں مصروف کر دیا جائے تو اس کے خیال کے علاوہ ان سے منفعتیں سرانجام نہیں پا سکتیں۔ حالانکہ ان منافع کی حقیقتوں کو کمی بیشی کے بغیر ظاہر کرنا منظور ہے۔ نیز ثابت قائم دائم تصرف کا اختیار جو کہ ثابت دائم آثار کا مصدر ہو سکتا ہے ان کے غلبہ خیال اور ان کے اقوال و افعال کے رنگا رنگ ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ شعر۔ جس حال پر تو ہوتا ہے اس پر قائم نہیں رہتا جس طرح اپنے کپڑوں میں جن رنگ بدلتا رہتا ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ جنوں کا درجہ آدمیوں کے درجہ کی نسبت سے نقالوں اور بہروپیوں کا سا ہے ان لوگوں کی نسبت سے جن کی قول فعل' شکل اور لباس میں ان کی حکایت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تکلفاً آنکھوں میں سرمہ ڈالنا سرگیں ہونے کی طرح نہیں ہے۔ نیز جنوں کو جسمانی لطافت' تنگ مقامات اور باریک مساموں میں داخل اور جاری ہونے کی قدرت اور ان کی روحوں کے مزاج پر ناریت کے غلبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے تمام اخلاق جیسے صبر' بردباری اور اس قسم کے اخلاق سے بہرہ ور ہونا ممکن نہیں۔ اور نہ ہی اکثر مخلوقات جیسے قلعہ' حویلی' عمارات' اسلحہ اور اس قسم کی چیزوں سے نفع لینے کی صورت اور ضرورت ہے۔

پس یہ گروہ بھی فرشتوں کی طرح تمام مخلوقات کی منفعتوں کو پوری طرح حاصل نہیں کرسکتا

چنانچہ تمام ربانی صفات سے موصوف ہونا اور تمام اخلاق الٰہیہ سے بہرہ ور ہونا ان سے میسر نہیں ہوسکتا تھا۔ پس تمام مخلوقات میں سے آدمی ہی اس منصب کے لائق ہونے کیلئے متعین ہوا اور اگر ان میں سے کوئی اس حقیقت کا منکر ہو جائے تو اسے آدم علیہ السلام کا واقعہ یاد کرائیں۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ اس وقت کو یاد کرایئے جبکہ آپ کے ربّ نے فرمایا آدم کی پیدائش سے پہلے اس کی فضیلت کے اظہار کیلئے تا کہ اس کی پیدائش کے بعد کوئی بھی اسے چشم حقارت سے نہ دیکھے اور اس کے حکم کی اطاعت کرنے سے عار محسوس نہ کرے۔

لِلْمَلٰٓئِكَةِ فرشتوں کو۔ کیونکہ تمام مخلوقات کے منافع درحقیقت فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے کہ ہر مخلوق کی حفاظت اور اس کے خواص کے ظہور کیلئے ہی گروہ معین اور مقرر ہے اگر آسمان اور ستاروں کی گردش ہے۔ تو ان کے ہاتھ میں ہے۔ اگر بارش کا برسنا ہے یا نباتات کا اگنا ہے یا پہاڑوں میں کانوں کا ہونا ہے تو یہ بھی انہیں کے حوالے ہے۔ پس سارا جہان ایک آباد شہر کی مانند ہے۔ جو کہ فرشتوں کے ہاتھ سپرد کیا گیا ہے۔ اور فرشتوں کو حاکم اور کارکن مقرر کیا گیا۔ جب تک کہ یہ خلیفہ وقت کی اطاعت نہ کریں اس کا تصرف کسی چیز میں جاری نہ ہو مثلاً اگر انسان ایک بیج کو زمین میں کاشت کرتا ہے جب تک کہ موکل اس کی اطاعت ثابت نہ کریں کھیتی اور درخت زمین سے باہر نہ آئے۔ اور خلافت کا معنی متحقق نہ ہو۔ اور کیا نہ کیا برابر ہو جائے۔ اور جب یہ گروہ اطاعت کرے۔ پھر کسی چیز سے نافرمانی اور سرکشی کی صورت نہ ہو۔ اور آگے نہ بڑھے اس لئے کہ ہر چیز کے اختیار کی لگام ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور حیوانات اور جن اگرچہ ارادہ اور اختیار کی کچھ آمیزش رکھتے ہیں۔ لیکن فرشتوں کی تسخیر کے مقابلہ میں وہ ارادہ اور اختیار مجبوری اور بے چارگی پر انجام پذیر ہوتا ہے۔ جیسے موکلوں کے طلب کرنے پر جنوں کی بے چارگی اور اپنے سائیس کے ہاتھوں میں جانور کی مجبوری۔

تو چونکہ آدم علیہ السلام کی خلافت کی تمام جہان والوں سے قبولیت کی پیشگی تدبیر منظور تھی اس لئے متعین ہوا کہ پہلے فرشتوں کی جماعت کو اس کے مطیع کیا جائے۔ تا کہ ہر چیز چاروناچار اس کی فرماں برداری کرے۔ اسی لئے جب آدمیوں کی خلافت ظاہرہ حضرت

سلیمان علیٰ نبینا و علیہ السلام کے عہد میں اپنے پورے کمال پر پہنچی تو جنات' ہوا اور دوسری سرکش مخلوق کو فرشتوں نے چار و ناچار مسخر کیا۔ اور اس مخلوق پر حکمرانی واقع ہوئی۔ بلکہ حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ السلام کے عہد کی ابتداء میں بھی جانوروں کی نسبت سے یہی جبری تسخیر وقوع پذیر ہوئی۔ جیسا کہ تاریخوں میں مذکور ہے۔ اسی لئے اس وقت تمام موجودات میں سے صرف فرشتوں کے ساتھ خطاب کو خاص فرمایا گیا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً تحقیق میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ جو میری نیابت کرے اور زمین کی چیزوں میں تصرف کرے۔ اور جب زمین کی چیزوں میں تصرف ان چیزوں کے اسباب میں جو کہ آسمان سے مربوط ہیں تصرف کے بغیر متصور نہیں۔ پس اگرچہ وہ خلیفہ زمین کے عناصر سے پیدا ہو۔ اور ہونے اور مٹ جانے کے مقام میں سکونت پذیر ہو لیکن اس میں آسمانی روح بھی ڈالوں گا کہ اس روح کی وجہ سے آسمان کے رہنے والوں اور ستاروں کے موکلوں پر بھی حکمرانی کرے۔ اور انہیں اپنے کام میں مصروف کرے۔ جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے۔ بیت۔ میں مے خانے کا گدا ہوں۔ لیکن مستی کے وقت دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستارے پر حکم کرتا ہوں۔

خلیفہ کو خلافت دینے کا طریقہ

اور اس خلیفہ کو خلافت دینے کا طریقہ یہ تھا کہ اس کی روح کو اپنی صفات' علم و حکمت کا نمونہ عطا فرمایا جائے جو کہ کلیات اور قواعد کی دریافت کا نام ہے۔ اور ارادہ اور اختیار کیونکہ اس کے سبب سے کلی آراء اور کلی انتظامات کا قصد پیدا ہوتا ہے۔ ان انتظامات کا عالم میں اظہار اور بے شمار صدیوں اور زمانوں تک ان انتظامات کا باقی رکھنا رونما ہوتا ہے۔ اور سننے' دیکھنے اور کلام کرنے کی صلاحیتیں جو کہ اس مراد کو پورا کرنے اور جاری رکھنے میں صرف ہوتی ہیں۔ پھر اسے ایک قدرت دی گئی جو کہ اپنی قدرت کا نمونہ ہے ان معنوں سے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ثابت الآثار بنیادی حقائق کے وجود کا سبب ہے۔ اسی طرح اس خلیفہ کی قدرت جمع و تفریق' تحلیل و ترکیب اور حکایت و تصویر کے ساتھ بے شمار مصنوعات کا سبب ہو۔ اور حقائق مختلفۃ الاثار کے وہ مصنوعات اس انداز میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں کہ

عرصہ دراز تک باقی اور ثابت رہیں۔ پس وہ تمام صفات اور ان کے آثار میں اللہ تعالیٰ کی عالی صفات کی حکایت اور نمونہ ہوا اور خلافت کا معنی محقق ہوا۔

اور علم و حکمت میں اس مرتبہ کو پہنچا کہ ہر نظام کے قواعد کلیہ کو دریافت کر لیا۔ علم طب' علم زراعت' علم کیمیا اور معدنی اجسام کو بدلنے کا علم نکالا۔ گویا اس نے انسانی' حیوانی' نباتی اور معدنی جسموں کے نظام کی حفاظت کو اپنے قابو میں کر لیا بلکہ اصلاح نفس اور روح آسمانی کو پست درجے سے بلند درجہ تک ترقی بخشنے اور درجات سلوک کو طے کرنے کے نظام کا بھی مالک ہو گیا۔ اور اس بزرگ علم کی بدولت ملکوت آسمان میں تصرف کرنا شروع کر دیا۔ اور ستاروں کی قوتوں کو کام میں لانے کا طریقہ اور موکل فرشتوں کو تابع کرنے کا طریقہ بھی جان لیا اور اس کی قدرت یہاں تک پہنچی کہ مخلوقات الٰہی میں سے بعض کو بعض کے ساتھ جمع کر کے جیسے شہد اور سرکہ سکنجبین میں۔ شورہ اور گندھک بارود میں۔ چینی اور ہلیلہ شربت میں یا بعض کو بعض سے جدا کر کے جیسے چکنائی اور پنیر کو ماء الجبن سے زائل کر کے' آگ میں پگھلنے والی دھاتوں سے کشتہ کر کے زہر کو جدا کر کے۔ یا بعض مخلوقات کے اجزاء کو گلا کر فنا کر کے جیسے عرق گلاب اور دوسری عرقیات۔ بعض مخلوقات سے مختلف کیفیت رکھنے والے اجزاء کی ترکیب سے جیسے تریاق فاروق اور مشرودیطوس یا ان میں نیا مزاج پیدا کر کے یا مخلوقات الٰہی میں نئی صورت ڈال کر جیسے برتن اور زیور کی قسمیں جو کہ معدنی جسموں سے بناتا ہے۔ اور توپ اور بندوق جو کہ ان سے لیتا ہے ایسا تصرف کیا بے شمار حقائق اور ان گنت خواص کو کام میں لایا۔

اور سننے اور دیکھنے میں اس قدر وسعت پیدا کی۔ اور گہرائی حاصل کی کہ ستارے دیکھنے والے آلات کی مدد سے آسمان پر ستاروں کو گننا شروع کر دیا۔ اور عالم بالا کے اجرام کی حرکتوں کی مقداروں گھنٹوں' منٹوں اور سیکنڈوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اور آلات موسیقی کی مدد سے بہت سی مسموعات کو کام میں لایا اور ان مسموعات میں سے جو کہ مختلف نغموں سے عبارت ہیں ہر ایک لذت اور کیفیت میں ایک حقیقت ہو گئیں۔ کیونکہ بشری قوت سامعہ اس سے مستفید اور فائدہ حاصل کرتی ہے۔ اور کلام میں اتنی وسعت اور اتنی گہرائی رکھتا ہے کہ

اس کی انتہا پیدا نہیں ہوئی اپنی کلام کو مختلف قسموں اور ان گنت طرزوں پر ڈھال کر برا کہنے' تعریف کرنے' معشوق کے حسن کو اور دوسرے دل لبھانے والے مضامین کو بیان کرنے میں کام میں لایا اور قسم قسم کی مصنوعات میں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نمونہ جمع و تفریق' تحلیل و ترکیب اور حکایت و تصویر سے کرتا تھا اسے لفظ و معنی کے جہان میں جاری کر کے کارخانے کو اٹھا دیا کہ دوسری مخلوقات میں سے کسی کے خیال میں نہیں سماتا۔ لفظ و معنی کے جہان کو عالم اجسام و ارواح کا نمونہ بنا دیا۔

پھر باقی نہ رہنے والی مصنوعات کی حفاظت کیلئے ایسی عجیب تدبیر سوچی کہ قلموں اور کاغذوں سے مدد لے کر ان قرار نہ رکھنے والے امور کو ثبات اور ہمیشگی دی اور ان الفاظ کے خطی نقوش کو ان کے قائم مقام کر دیا۔ اور اس باب میں اور جادو بھی چلائے۔ اور اہمال' اعجام' اعراب' سکون کو بلکہ اظہار و اخفاء اور دوسری چھپی باریکیوں کو صورتوں میں محفوظ رکھا تاکہ زمان و مکان کے دور افتادہ لوگ اس سے نفع پائیں۔

اور جب اس خلافت کا مدار دو چیزوں پر تھا اول نظامات الٰہیہ میں سے ہر نظام کے قواعد و کلیات کا علم' دوسری چیز ان کے مطابق اختیار اور قصد کی توجیہ تاکہ اس نظام کی حکایت کرے یا اس نظام کی حفاظت اور بقا کی کوشش کرے فرشتوں کو اس معنی کے حاصل ہونے کا امکان نہ تھا اس لئے کہ پہلے تو انہیں ہر نظام کے قواعد و کلیات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا ان کے کمال کا معنی یہی ہے کہ وہ اس نظام کے قواعد و کلیات کو کہ جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس نظام کی خدمت کرتے ہیں پہچانیں۔ جیسے آدمی کے بدن میں قوت بصریہ جو کہ آوازوں کے نظام اور ان کے متعلقات سے بالکل بے خبر ہے یا قوت سمعیہ جو کہ رنگوں کے نظام سے غافل مطلق ہے۔ اور اسی قیاس پر تمام قوتیں اور حواس کہ ہر ایک کسی کام میں مشغول ہے اگر دوسرے کام میں مشغول ہو جائے تو اس کام کا تعلق برہم ہو جائے۔ دوسرے اپنی معلومات کی آراء کے مطابق قصد و اختیار کی توجیہ بھی ان سے ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے اختیار کو انہیں کے طور پر کھلا نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ اپنی رضا میں مقید و محصور اور اپنے حکم کا تابع قرار دیا ہے۔ نتنزل الا بامر ربك لا یعصون الله ما امرهم

ویفعلون ما یؤمرون اور اس منصب کے لائق وہ ہو سکتا ہے جس کے اختیار کو اس کے طور پر کھلا چھوڑ دیا گیا ہو بلکہ اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ کے تابع کر دیں تاکہ وہ جس چیز کا ارادہ کرے خود اسے سرانجام فرما کر اس کے حوالہ کر دیں اور نافرمانی اور مخالفت امر بھی اس سے متصور ہو۔ اسی لئے انسان کی قوتوں اور حواس کو ان کی خلافت کے قابل نہیں کیا ہے۔

لیکن فرشتوں نے انی جاعل فی الارض خلیفة سے سمجھا کہ جب یہ خلیفہ زمین میں پیدا ہو۔ اور زمین کے مختلف عناصر سے حصہ حاصل کرے تو سفلی لذتوں کی طرف مائل ہونا اس کی جبلت میں دریعت رکھیں گے۔ کیونکہ اس کے مادے بھی اس میلان کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور وہ غرض بھی جو اس کی خلافت سے منظور ہے۔ یعنی زمینی منافع سے فائدہ حاصل کرنا اس میلان کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ پس اس میں قوت شہویہ بھی پورے طور پر موجود ہوگی۔ اور اس کی قوت غضبیہ بھی مزاحم اور معارضہ کرنے والے کو روکنے کیلئے جوش کرے گی جو کہ اس کے بعض کا مقتضیٰ بلکہ اس کی صورت جامعہ کا مقتضی ہے۔ اور یہ دونوں قوتیں نظامات صالحہ کی برہمی کا موجب ہوں گی اس لئے انہوں نے دربار خداوندی میں دریافت کرنے اور صورتحال کی وضاحت چاہنے کیلئے۔

قَالُوْا عرض کی کہ زمین میں خلیفہ کو پیدا کرنا اگر صرف اس لئے ہے کہ زمین کو آباد کرے۔ اور اس کی اصلاح کرے تو یہ مقصد اس کے زمینی چیزوں کے محتاج ہونے کے بغیر ممکن نہیں۔ اور جب اسے سفلی چیزوں کی ضرورت ہوئی تو اس کی قوت شہویہ جوش میں آئے گی اور جب دوسرے سفلی لذت پورے طور پر حاصل کرنے میں مزاحمت اور معاوضت کریں گے تو اسی وقت اس کی قوت شہویہ غضب کی صورت میں نمودار ہو کر قتل و غارت اور جنگ وجدال تک پہنچ جائے گی۔ پس اس قسم کے خلیفہ کو زمین کی آبادی اور اصلاح کیلئے پیدا کرنا ہماری قاصر نظر میں تیری حکمت کے موافق نظر نہیں آتا۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا کیا تو زمین میں متصرف کرے گا

مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا اسے جو کہ اس زمین میں فساد کرے گا۔ کیونکہ اس کا وجود مختلف عناصر سے جو کہ سفلی لذتوں کے داعی ہیں صورت پکڑے گا۔ اگرچہ تیری کامل صفات کا

نمونہ اس کی روح میں تجلی فرمائے گا ان سب کو وہ سفلی لذتوں میں صرف کرے گا۔ اور شہوتوں کی پیروی کے پیچھے ان پاک صفات کو کدورت کے ساتھ ملوث کرے گا۔ مثلاً اس کا علم وحکمت لذتیں پوری کرنے کیلئے کئی قسم کے حیلوں اور شیطانی تدبیروں میں خرچ ہوگا۔ اور اس کی قدرت حرام کھانے پینے اور رہنے میں خرچ ہوگی۔ اور اس کا ارادہ اور اختیار نافرمانیوں اور قباحتوں کے ساتھ متعلق ہو جائے گا۔ اور اس کے کان اور آنکھ ساز کی تاروں کے نغمات، کھیل کود کی باتیں، غیبت، چغلی، فضول گفتگو سننے اور بے ریش لڑکوں اور عورتوں کو دیکھنے میں ضائع ہوں گے۔ اور اس کا کلام متکبرین کی تعریف اور خوشامد اور نیکوں کی برائی اور مذمت، فحش کلامی، گالی گلوچ اور لعن طعن میں صرف ہو جائے گا۔ پس اس قسم کی مخلوق کو جو کہ شہوت اور غضب کا بندہ ہو اپنی صفات کا نمونہ عطا کرنا کتے کی گردن میں جواہر و مروارید کا ہار ڈالنے کی طرح ہے۔ اور یہ مخلوق اس آگ کی وجہ سے جو کہ اس کے بدن کے عناصر میں سے ہے اسی قدر پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ جب بھی اس کے ابنائے جنس میں سے کسی نے اس کی لذت مقصودہ کو حاصل کرنے میں مزاحمت کی اس کی غضب کی آگ بھڑک اٹھے گی اور وہ جنگ اور لڑائی کیلئے اٹھ کھڑا ہوگا۔

وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ اور وہ خون بہائے گا' چرنے والے جانوروں کا ان کا گوشت کھانے کیلئے اور ان کی کھالیں لینے کیلئے انہیں ہلاک کرے گا۔ اور اڑنے والے جانوروں کو بلکہ دریا کی مچھلی کو لہو اور شکار کیلئے پکڑ کر مارے گا۔ اور اپنی نوع کے لوگوں کو ملک و مال میں مزاحمت سے روکنے کیلئے قتل کرے گا۔ اور ظاہر ہے کہ زمین کی بہترین مخلوق حیوانات ہیں۔ اور حیوان کے اجزاء میں سے افضل خون ہے جو کہ ان کے جسموں کا جزو قریب ہے جب اس قسم کی گراں اور قیمتی جنس کو اس طرح بے دریغ ضائع کرے گا تو اس سے کسی اور اصلاح کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اور اگر اس خلیفہ کو پیدا کرنے سے منظور یہ ہے کہ اپنے پروردگار کو اس کے کمالات کے ساتھ پہنچانے اور نقصان اور تصور سے منزہ اور پاک جانے اور اس کے کمالات اور پاکیزگی کو بیان کی زبان سے ظاہر کرے تو ہم اس امر میں کیا قصور رکھتے ہیں۔
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ اور ہم سب تیری پاک ذات کی تسبیح کرتے ہیں ملا کر بِحَمْدِكَ تیری

تعریف کے ساتھ تیری ذات کے کمالات پر۔ پس ہم تیری ذات وصفات کا حق ادا کرتے ہیں حق ذات کی ادائیگی تسبیح کے ساتھ اور حق صفات کی ادائیگی حمد کے ساتھ۔

وَنُقَدِّسُ اور ہم تیرے افعال کو اس سے پاک جانتے ہیں کہ خلاف حکمت۔ بے مقصدیت اور کم عقلی ان میں راہ پائے اور یہ ہماری تسبیح وتقدیس اور تیرے ذاتی کمالات پر حمد جو ہم سے صادر ہوتی ہے خاص ہے لَكَ تیرے لئے اور کسی دوسرے کو اس میں شرکت نہیں۔ بخلاف اس زمینی مخلوق کے کہ جب اپنی حرص اور خواہش کا بندہ ہوگا تو جس طرف سے اپنے مطلب کے حاصل ہونے کا سوچے گا اس کی تسبیح وتقدیس اور حمد وشکر اسی طرف پھر جائے گا۔ اور اسباب کے ملاحظہ میں اس قدر نیچے چلا جائے گا کہ سبب سے غافل ہو جائے گا۔ پس ہماری نظر میں اس مخلوق کو پیدا کرنا اور اسے منصب خلافت عطا کرنا کسی طرح بھی حکمت کے موافق معلوم نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اس عرض کے جواب میں۔

قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ فرمایا بے شک میں جانتا ہوں۔ تمہاری تسبیح وتقدیس کے قصور' تمام جہان پر میری خلافت کیلئے تمہارے قابل نہ ہونے اور میرے لطیفہ اور قہریہ اسماء کے مقتضی کے ظہور سے۔

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ جو کچھ کہ تم نہیں جانتے ہو اس لئے کہ خلافت الٰہیہ کا معنی اور اوصاف ربانیہ کی تجلی اجتماعی ترکیبی ہیئتوں کی خاصیتوں سے ہے۔

پس ایسی ترکیب چاہئے جو کہ ہر دو عالم کی جامع ہو۔ خواہش اور غضب بھی اس میں ضروری ہے۔ کیونکہ روح کا بدن کے ساتھ تعلق ان دونوں کے بغیر مستقل اور باقی نہیں ہے۔ اور اس میں پاک قوت عقلی بھی ضروری ہے۔ تاکہ کائنات کے مشمولات کی حکایت اور نظام کلی اس میں نقش ہونا مقصود ہو۔ اور ان تینوں قوتوں کی ترکیب کے نتائج ظاہر ہوں۔ پس فرشتوں کے ہر طبقہ کو اپنے کمالات پر اطلاع حاصل ہے۔ پس ان کی حمد واقع نہ ہوگی مگر انہیں کمالات کے مقابلہ میں' نہ ان کمالات کے مقابلہ میں جو کہ ان کے اوپر نیچے ہیں اسی طرح تسبیح وتقدیس بھی واقع نہ ہوگی مگر ان نقصانات کے ساتھ مقید ومحصور ہوکر جو کہ ان کمالات کی ضد ہیں نہ کہ ان کے علاوہ۔

پس فرشتوں کی طرف سے مقام مشورہ میں خلیفہ جامع کے تقرر کو ترک کرنے کیلئے ان تقریروں کے ساتھ عرض کرنا اس شخص کی مثل ہے کہ جس کے قوئ اور اعضاء نے اس سے عرض کی کہ کسی غلام کو پالنے کی ضرورت نہیں ہے ہم سب کفایت کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ پالا ہوا اور تربیت یافتہ غلام اپنے مالک اور پالنے والے کی ہیئات جامعہ کا حامل ہوگا جبکہ اس کے قوئ اور اعضاء ایک ایک شان سے زیادہ اظہار نہیں کرسکیں گے۔ پس ان کے وجود سے جامع ہیئتوں کے حصول میں کفایت نہیں ہوسکتی اور جو کچھ انہوں نے قوت شہوت وغضب کی خرابیوں اور شرور کا ذکر کیا اس میں انہوں نے دو چیزوں سے غفلت اختیار کی اول یہ کہ جب اس کی خواہش کارخانہ حق میں مصروف ہوگی تو اس سے کیسے کیسے عمدہ نتائج ظاہر ہوں گے جو کہ فرشتوں کے حوصلہ میں ہرگز چھپے نہیں ہوں گے جیسے عشق الٰہی کا غلبہ اور شوق اور محبت کا غلبہ اور اسی طرح جب بھی اس کی قوت غضب کارخانہ حق میں صرف ہوئی تو جانبازی' شہادت' جہاد اور دین کی غیرت ظاہر ہوگی۔ دوسری چیز یہ کہ اگر جہان میں شرور اور قباحتوں کا مصدر موجود نہ ہوتو مکلف ہونے' رسل علیہم السلام کو مبعوث کرنے اور کتابیں اتارنے کا مقصد اور کارخانہ وحی' امر و نہی' ترغیب و ترہیب اور وعد و وعید سب ختم ہو جاتا ہے۔ اور آخرت میں جزا دینے کی صورت اور ثواب و عذاب کے گھر کی آبادی نہیں ہوسکتی اور اللہ تعالیٰ کی یہ تمام عظیم شانیں پردے میں اور معطل رہتی ہیں۔ جس طرح کہ کہنے والے نے کہا ہے بیت' عشق کے کارخانہ میں کفر ضروری ہے اگر ابولہب نہ ہوتو دوزخ کسے جلائے گی۔ نیز کہا ہے بیت اس کا قاتل غازی اور مقتول شہید ہے کس کافر کو اس دنیا میں چشم حقارت سے نہ دیکھ۔

چند ضروری فائدے

چند فائدے باقی رہ گئے جن سے خبردار کرنا ضروری ہے۔ پہلا فائدہ یہ کہ جب اس قسم کی مخلوق کو پیدا کرنے اور اسے منصب خلافت عطا کرنے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو چکا تھا تو فرشتوں سے اس غرض کے ظاہر کرنے کی کیا وجہ تھی اور فرشتوں کو اس امر کی خبر دینے میں فرشتوں کو کیا حاصل؟ اس قسم کی خبریں دنیا میں مشورہ کے مقام پر ہوتا ہے۔ اور مشورہ کی حقیقت دوسروں کی عقل سے مدد چاہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کہ ہر شے میں اپنے غیر سے بے

نیاز ہے کسی سے مشورہ کیوں فرماتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خلافت کی حقیقت جس طرح کہ تفسیر میں مذکور ہوئی منافع عالم کو پورے طور پر حاصل کرنا اوران میں تصرف کرنا ہے۔ اور جہان کے تمام منافع فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جس طرح کہ گزرا۔ پس اس شہر کے حاکم اور کارکن فرشتے ہیں۔ اور دوسری چیزیں آلات اور سامان کی طرح ہیں۔ خلیفہ مقرر کرنے سے پہلے کہ جس کے فرمان کی اطاعت ان پر واجب ہوگی انہیں اطلاع دینا اور اس کے فرمان کی اطاعت کیلئے انہیں مسخر کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ اگر اچانک ہی ان پر خلیفہ مقرر ہو جاتا اور وہ اس کے استحقاق خلافت میں اعتراض کرتے تو اطاعت کا مسئلہ جیسے چاہئے تھا صورت نہ پکڑتا اور پیدائش اور خلیفہ مقرر کرنے سے پہلے جب ان کا شبہ زائل ہو گیا تو اطاعت میں پوری رغبت اور خوشی کے ساتھ قدم رکھیں گے۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس معاملہ میں منظور یہ ہے کہ بندے جان لیں کہ عمدہ کاموں میں اس کام کے اہل لوگوں سے مشورہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے مشورہ سے بے نیازی کے باوجود شورہ فرمایا۔ اور خطاب کو مشورہ کی صورت میں القاء فرمایا۔ پس بندے جو کہ ناقص العقل ہونے اور کاموں کے انجام سے بے خبر ہونے کی وجہ مشورہ کے محتاج ہیں وہ کبھی مشورہ ترک نہ کریں اسی لئے حدیث پاک میں وارد ہے **ماخاب من استخار ولاندم من استشار** جس نے استخارہ کیا وہ نامراد نہ ہوا اور جس نے مشورہ کیا وہ نادم نہ ہوا۔

اور بعض صوفیاء نے کہا ہے کہ جو کچھ کائنات میں بنتا ہے اس کے بننے سے پہلے عالم قضا میں اس کی ایک صورت ہوتی ہے۔ پھر لوح محفوظ میں پھر محو و اثبات کی لوح میں جسے اکثر استعمالات شرع میں سماء دنیا سے بھی تعبیر فرماتے ہیں۔ پس لفظ **قال ربك للملائكه** اس صورت کے ان مرتبوں میں نزول سے کنایہ ہے بغیر اس کے کہ درمیان میں کوئی بات کوئی کلام کوئی اظہار اور کوئی مشورہ ہو جس طرح کہ آدمی کو اپنے حال میں غور کرنا ان مرتبوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لئے کہ آدمی کے اعضاء اور جوارح پر جو کہ اس کی کائنات کا عالم شہادت ہیں اقوال اور افعال ظاہر ہوتے ہیں ان کا اپنے مرتبہ روح میں ایک وجود ہوتا

ہے جو کہ اس کے غیب الغیب سے ماوراء ہوتا ہے۔ پھر اس کے قلب میں جو کہ اس کا غیب الغیب ہے۔ پھر اس کی نفسانی قوتوں میں جو کہ اس کی دنیا کا ادنیٰ اور آسمانی غیب ہے۔ پھر اعضاء جوارح پر ظاہر ہوتا ہے۔

حقیقت فرشتہ

دوسرا فائدہ یہ کہ فرشتہ کی حقیقت میں جسے لغت عربی میں ملک کہتے ہیں لوگوں کو اس حقیقت کے ثبوت پر اتفاق کے باوجود بہت اختلاف ہے۔ اکثر مسلمان، یہود اور نصاریٰ اس طرف گئے ہیں کہ ملائکہ لطیف نورانی جسم ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے انہیں قدرت بخشی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مختلف شکلوں اور کئی صورتوں میں ظاہر کر سکتے ہیں۔ اور مجاہدات کرنے والے مکاشفہ کے ذریعے ان صورتوں پر مطلع ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات حاجتوں اور ضرورتوں والوں کیلئے بھی ان کی عجیب وغریب صورتوں اور شکلیں مشکلات کے حل اور مہمات کی کفایت کیلئے ظاہر ہوتی ہیں چنانچہ حکماء کی تاریخوں میں لکھا ہے کہ جالینوس کو جگر میں درد لاحق ہوا اگرچہ کئی قسم کے علاج کئے شفایاب نہ ہوا ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی شخص اسے فرمارہا ہے کہ اس شریان کا فصد جو کہ تیرے دائیں ہاتھ کی پشت پر انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان ہے تیری اس بیماری کو فائدہ دے گا۔ جیسے ہی وہ نیند سے بیدار ہوا اس کو ڈھونڈ کر اس کا فصد کیا۔ اور ٹھیک ہو گیا۔ اور شرعی روایات میں تواتر سے ثابت ہوا ہے کہ ملائکہ کی اس حد تک کثرت ہے کہ دوسری مخلوقات کی کثرت پر اسے قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ آسمان آواز کرتا ہے۔ اور اسے لائق ہے کہ آواز کرے کیونکہ اس آسمان میں کہیں بھی ایک قدم کی جگہ نہیں مگر وہاں ایک فرشتہ موجود ہے جو کہ سجود یا رکوع میں مشغول ہے۔

فرشتوں کی خدمات اور معصومیت کا بیان

اور جو کچھ اس جماعت کے اہل خدمات کے حال سے احادیث صحیحہ کی رو سے ثابت

ہوا یہ ہے کہ ان میں سے بعض عرش کو اٹھانے والے ہیں۔ اوران میں سے بعض اکابر فرشتے کہ عمدہ کام ان کی تدبیر کے ساتھ وابستہ ہیں مثل حضرت جبریل علیہ السلام کے جو کہ صاحب علم ووحی ہیں۔ حضرت میکائیل جو کہ صاحب رزق وغذا ہیں۔ حضرت اسرافیل جو کہ لوح محفوظ' صور اور روحیں پھوکنے والے ہیں۔ حضرت عزرائیل جو کہ ملک الموت ہیں' ان میں سے بہشت کے خازن ہیں۔ ان میں سے دوزخ کے دربان ہیں' ان میں سے آفات اور بلیات سے بنی آدم کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ان میں سے بنی آدم کے اعمال لکھنے والے ہیں۔ اوران میں سے اس جہان کا نظام سنبھالنے والے موکل ہیں۔ جیسے ملک الجبال اور ملک البحار وغیرہ۔

یہاں جاننا چاہئے کہ جمہور علمائے دین اس پر اجماع رکھتے ہیں کہ فرشتے اپنی ساری قسموں سمیت سب گناہوں سے محفوظ اور معصوم ہیں۔ اور صریح آیات اس مضمون پر گواہ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد بل عبادٌ مکرمون لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون (الانبیاء آیت ۲۶) اور اس قسم کی۔ اور بے شمار آیات ہیں۔

ملائکہ کی معصومیت کی مخالفت اور اس کا جواب

اور اس واقعہ میں چند وجوہ کے ساتھ اس عقیدہ کا خلاف پیش آتا ہے۔ چنانچہ فرقہ حشویہ والے ان وجوہ سے دلیل پکڑ کر فرشتوں کی معصومیت کے منکر ہو گئے ہیں اس میں سے وہ ہے جو انہوں نے کہا ہے اتجعل فیها من یفسد فیها اور یہ طریقہ اعتراض کا طریقہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ پر اعتراض کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اور ان میں سے یہ کہ بنی آدم کی طرف قتل وفساد منسوب کیا ہے۔ اور یہ غیبت کے قبیلے سے ہے۔ اور غیبت کبائر میں سے ہے۔ اور ان میں سے یہ کہ خودستائی میں فضول گفتگو کی ہے کہ کہا ہے ونحن نسبح بحمدك و نقدس لك اور یہ خود بینی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ان میں سے یہ کہ حق تعالیٰ نے انہیں فرمایا اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ۔ پس معلوم ہوا کہ وہ کاذب تھے۔ اور ان میں سے یہ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا الم اقل لکم انی اعلم غیب السموت والارض اور اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اس بارے میں کہ اللہ تعالیٰ کل معلومات کو جاننے والا ہے کوئی شک وشبہ تھا

اوران میں سے یہ کہ فرشتوں کا کہنا سبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا عذر اور توبہ کے بیان پر دلالت کرتا ہے۔اور عذر اور توبہ گناہ صادر ہونے کی دلیل ہے۔

اور جمہور علماء نے ان وجوہ کا جواب دیا ہے کہ اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا کہنے سے فرشتوں کی غرض اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا نہ تھا بلکہ اس بات کا بیان ہے کہ ہمیں اس ارادہ میں حکمت کی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے ہماری تسلی کی جائے۔اور جواب مانگنے کیلئے اشکال بیان کرنا بے ادبی نہیں ہے۔جس طرح کہ شاگردوں کا اپنے اساتذہ کے ساتھ یہی طریقہ معمول اور مروج ہے۔اور ہر عقل کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی کے حق میں حکمت کاملہ کا عقیدہ رکھتا ہو اس سے کسی ایک فعل کا علم ہو کہ جس کی وجہ حکمت پوشیدہ ہو تو بے اختیار از رہ تعجب پوچھتا ہے۔اور کہتا ہے کہ اس فعل کا کوئی گہرا راز ہوگا۔

اور بنی آدم کی غیبت جو کہ اس سوال میں واقع ہے اشکال کی جگہ کے درپے ہوتا ہے نہ کہ تحقیر واہانت کے قصد سے اور اس قسم کی غیبت حلال ہے۔جیسا کہ فتویٰ پوچھنے کے اور صورت مسئلہ بیان کرنے کے وقت سے جائز قرار دیا گیا ہے۔اور اس صورت میں سے وہ ہے جو کہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ابوسفیان کی بیوی ہندا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عرض کی کہ ابوسفیان ایک بخیل کنجوس آدمی ہے۔اور اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غیبت سے نہیں روکا۔

اور ان سے خودستائی خود بینی کے قصد سے نہ تھی۔ بلکہ اس سوال سے عذر کیلئے اپنا حال بیان کیا۔یعنی ہمارا یہ سوال اس جہت سے نہیں کہ تیرے منزہ ہونے اور تیرے کمال حکمت میں ہمیں کوئی شک ہے۔اس لئے کہ ہم ہمیشہ تیری تسبیح وتقدس اور حمد وشکر میں مشغول ہیں بلکہ ہمارا سوال صرف وجہ حکمت کی طلب کیلئے ہے۔تا کہ یہ چھپا ہوا راز ہم پر ظاہر ہو جائے۔

اور اللہ تعالیٰ کا انہیں اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ فرمانا ان کے صریح جھوٹ پر دلالت نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اپنی تسبیح وتقدیس اور حمد وشکر کو کامل خیال کرتے ہو۔اور یہ ایسا نہیں۔اور اگر کسی خلاف واقع امر کو غلط فہمی سے کوئی مطابق واقع سمجھ کر خبر دے اسے مذموم جھوٹ نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس صورت میں اگر اس خبر کو قسم کے ساتھ پکا کرے تب بھی اسے پکڑا نہیں جاتا چنانچہ

آیت لا یواخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم میں آتا ہے انشاء اللہ العزیز

اور اسی طرح انہیں اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ان کی طرف سے کسی شک وشبہ کے وقوع پر دلالت نہیں کرتا بلکہ انہیں وہ کچھ یاد دلانے کیلئے ہے جو انہیں معلوم تھا اور سوال کرنے کے وقت اس سے غفلت ہوگئی تھی اور اسی طرح ان کا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ جو کہ عذر لانا اور توبہ کرنا ہے دلالت نہیں کرتا مگر صرف ترک اولیٰ کے وقوع پر یعنی ایسا کام جسے چھوڑنا بہتر تھا۔ کیونکہ افعال الٰہی میں وجوہ حکمت کی تفصیلات کا سوال کرنا اہل کمال کی شان نہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اجمالی ایمان اس قسم کے سوالات سے زبان بندی کر دیتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ کہ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ارشاد فرمایا خالق فی الارض خلیفۃ نہیں فرمایا۔ حالانکہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ کے لفظ کے ساتھ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ خالق فرمایا جاتا چنانچہ دوسری جگہ اسی طرح ارشاد ہوا اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ اس تعبیر میں کیا نکتہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نوع انسانی کو خلافت دینے کا بیان منظور ہے۔ اور خلافت کا معنی دو چیزوں کے بغیر نہیں ہوسکتا ایک زمینی بدن جو کہ عالم خلق سے ہے دوسرا روح آسمانی جو کہ عالم امر سے ہے۔ پس لفظ خالق یہاں مناسب نہیں تھا کہ اس کے اجزاء میں سے صرف ایک جزو پر دلالت کرے۔ اور دوسری جگہوں پر بیان خلافت منظور نہیں۔ بلکہ صرف اس کی خلقت کا بیان ہے لہٰذا ان مقامات پر لفظ خالق چسپاں ہوتا ہے۔

چوتھا فائدہ: خلیفہ کو چاہئے کہ کسی کا جانشین ہو۔ اور اس کے اقوال وافعال کی حکایت کرے وہ کون ہے اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک وہ ذات پاک حضرت حق ہے۔ اور انسان زمین میں اس کا خلیفہ ہے۔ جس طرح کہ اس نوع کے بعض افراد کے حق میں اللہ تعالیٰ کی خلافت صراحت کے ساتھ ثابت ہوئی جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کہ ان کے حق میں ارشاد ہوا ہے یا داؤد انا جعلناك خليفة في الارض فاحكم بين الناس بالحق

اور بعض مفسرین کے نزدیک جنوں کی غلافت مراد ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش

سے چند ہزار سال پہلے زمین میں متصرف تھے۔ اور زمین کی منفعتوں کو اپنی ضرورتوں کے مطابق صرف کرتے تھے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات میں بھی زمین میں جنوں کے تصرف اور ان کے تباہی فتنہ وفساد کے واقعات منقول اور مشہور ہیں چنانچہ حاکم نے ان کی تصحیح فرمائی۔

پانچواں فائدہ: خلافت الٰہی ساری نوع انسان کیلئے ثابت ہے۔ اور کبھی بھی یہ نوع پوری کی پوری فاسد نہیں ہوتی ہے۔ اور سیدھی راہ سے باہر نہیں آتی جس طرح پیغمبر علیہ السلام کی خلافت ساری امت کو مجموعی حیثیت سے ثابت ہے۔ اور اسی لئے اس امت کا اجماع خطا سے معصوم ہے۔ اور جو خصوصیت کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت نوع انسانی انہیں کی ذات شریف میں منحصر تھی۔ اور ان کے بعد وہ ایک ہونے کا کمال کثرت اور شعبوں میں ڈھل گیا۔ پس افراد انسانی میں سے ہر ہر فرد کو خلافت الٰہی نہ پہنچی بلکہ مجموعی عالم انسانیت کو مجموعی حیثیت سے اور اس تقدیر پر کافروں' فاسقوں اور ان کی بری روش کے وجود کے سبب مجموعی نوع کی خلافت کے معنی میں کوئی اشکال نہیں آتا اور اگر ہر ہر فرد انسانی کیلئے خلافت الٰہی ثابت کریں تو درست نہیں۔ کیونکہ خلافت کا معنی جہان کے تمام منافع کو پورے طور پر حاصل کرنا ہے۔ اور کاریگری کے حقائق کو ان کے خواص وآثار سمیت نکالنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ معنی ہر ہر فرد کیلئے ثابت نہیں۔ پس ہر ہر فرد اس کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اور لفظ جو کہ مفرد واقع ہوا بھی ایک شعور دیتا ہے کہ منظور اس نوع کے تمام افراد میں حقیقت وحدانیہ مشترکہ کی خلافت ہے ورنہ خلفاء فرمایا جاتا۔

ملائکہ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ خلیفہ فسادی ہوگا

چھٹا فائدہ: علماء کو اس میں اختلاف ہے کہ فرشتوں نے کہاں سے جانا کہ یہ خلیفہ زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ فرشتے نے آدمیوں کے حال کو جنوں کے حال پر قیاس کر کے یہ حکم لائے جس طرح کہ ابن عباس اور کلبی سے منقول ہے۔ اور بعض دوسروں نے کہا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً تو انہوں نے عرض کی اے ہمارے رب خلیفہ کیا ہوگا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا

کہ اس کی اولاد ہوگی زمین میں فساد کریں گے باہمی حسد کریں گے ایک دوسرے کو قتل کریں گے اس کے بعد فرشتوں نے عرض کی اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ اور یہ توجیہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اکابر ملائکہ کو لوح محفوظ پر اطلاع حاصل تھی اور عوام ملائکہ لوح محفوظ کے بعض مضامین کو اپنے اکابر سے حاصل کرتے تھے اس خلیفہ کے وجود اور اس کے برے افعال کی خبر بھی انہیں اسی راہ سے معلوم ہوئی تھی۔ بلکہ بعض روایات میں اس طرح وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا فرمایا اسے دیکھ کر فرشتوں کو شدید خوف پیدا ہوا۔ عرض کی کہ یہ مخلوق کس چیز کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا نافرمانوں اور فرمانبرداری نہ کرنے والوں کیلئے اور اس وقت فرشتوں کے علاوہ شعور وارادہ والی کوئی مخلوق موجود نہ تھی جب ارشاد ہوا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً انہوں نے جان لیا کہ معصیت اور نافرمانی کا مصدر یہی مخلوق ہوگی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ خلیفہ حکم اور فیصلہ میں خدا تعالیٰ کا نائب ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حاکم کی ضرورت نہیں ہوتی مگر باہمی جھگڑے اور ایک دوسرے پر ظلم کرنے کے وقت۔ پس لفظ خلیفہ سے التزاماً دریافت کیا کہ فساد اور شر واقع ہوگا۔ اور تفسیر میں فرشتوں کے اس معنی کو پانے کی ایک اور وجہ گزر چکی ہے وہ یاد کرنی چاہئے۔

ساتواں فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین میں خونریزی اور فساد بدترین گناہ ہے۔ اور اسی طرح فرشتوں کے نزدیک بھی۔ لہٰذا اس خلیفہ کی برائی اور گھٹیا پن کے اظہار کے مقام پر اسی گناہ کا ذکر حضور خداوندی میں پیش کیا۔ نیز معلوم ہوا کہ اپنی عقل ناقص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے افعال اور احکام میں اس کی حکمت کی وجوہ کا سوال کرنا بے ادبی کی ایک قسم ہے۔

آٹھواں فائدہ: یہاں اس واقعہ کا بقیہ محذوف ہے۔ کیونکہ غرض پورا قصہ بیان کرنے سے متعلق نہ تھی۔ بلکہ جس قدر واقعہ خلافت کی اہلیت کے بیان میں دخل رکھتا تھا تمام واقعہ سے چن کر بیان فرما دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا باقی حذف شدہ واقعہ

پورا واقعہ یہ ہے کہ ابوالشیخ اور دوسرے محدثین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمائے۔ جبریل علیہ السلام کو بھیجا اور فرمایا کہ تمام روئے زمین سے سفید۔ سیاہ اور سرخ' شور اور شیریں' نرم اور سخت زمین سے ایک مٹھی اٹھا کر لائے کہ میں اس سے ایک مخلوق کو پیدا کروں گا جب جبریل علیہ السلام زمین کے پاس گئے اور چاہا کہ اس سے مٹھی بھر لیں تو زمین نے پوچھا کہ آپ مجھ میں نقص کیوں ڈالتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے ایک مخلوق پیدا فرمائے گا جسے زمین کی خلافت بخشی جائے گی۔ اور وہ ایسے ویسے عمل کرے گا۔ اور ثواب اور عذاب میں پڑے گا۔ زمین نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی عزت کی پناہ لیتی ہوں اس سے کہ آپ مجھ سے مٹھی بھریں کہ اس میں سے بعض جہنم کے نصیب ہو۔ جبریل علیہ السلام واپس چلے گئے اور عرض کی اے خدا تعالیٰ! زمین نے تیری عزت کی پناہ لی میں تیرے نام پاک اور تیری عزت کا ادب کرتے ہوئے واپس آ گیا اور اس کے درپے نہ ہوا۔

حق تعالیٰ نے میکائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ میکائیل علیہ السلام بھی اسی طریقہ سے واپس آ گئے۔ پھر اسرافیل علیہ السلام کو بھیجا۔ وہ بھی واپس آ گئے۔ پھر ملک الموت علیہ السلام کو بھیجا۔ ملک الموت علیہ السلام نے زمین کی زاری نہ سنی اور کہا کہ میں فرمان الٰہی کا مطیع ہوں۔ تیری زاری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے باز نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے روحیں قبض کرنے کا کام انہیں کے سپرد فرمایا۔ اور فرمایا کہ خاک کی مٹھی کو اس جگہ جہاں اب کعبہ معظمہ بنا ہوا ہے جمع کرے۔ اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس مٹی کا گارا بنائیں۔ اور چالیس دن تک اس مٹی پر بارش برسی۔ ۳۹ دن غم واندوہ کی بارش اور ایک دن خوشی اور شادی کی بارش۔ اسی وجہ سے انسان کے غم اور اندوہ کے اوقات خوشی اور شادی کے اوقات سے زیادہ ہوتے ہیں اس کے بعد اس مٹی کو خشک کیا گیا۔ یہاں تک کمہاروں کے پیالے کی طرح ہو گئی۔ اور ہواؤں کے چلنے سے اس میں آواز پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اس خشک شدہ گارے کو صلصال کا لفظ فرمایا ہے۔ یعنی ٹھیکری کی طرح بجنے والی مٹی۔

اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس خشک شدہ گارے کو مکہ اور طائف کے درمیان وادی نعمان میں جو کہ عرفات کے متصل ہے لے جا کر رکھ دیں اور حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ہاتھ سے اس سخت مٹی سے آدم علیہ السلام کے جسم کی تصویر بنائی۔ فرشتوں نے چونکہ اس شکل کی مانند کبھی نہ دیکھی تھی تعجب کی وجہ سے اس کے ارد گرد گھومتے تھے۔ اور اس کی صورت کی خوبی سے حیرت کرتے تھے۔ ابلیس بھی اس جسم کو دیکھنے کیلئے آیا اور اس کے گرد گھوما اور کہنے لگا اس جسم سے کیا تعجب کرتے ہو کہ ایک جسم ہے جو اندر سے خالی ہے جگہ جگہ سے کھوکھلا ہے۔ یہ پر کئے بغیر سیر نہیں ہوگا۔ اگر اس کے خلا کو پر نہ کیا گیا تو کمزوری کی وجہ سے زمین پر گر پڑے گا۔ اور اگر اسے پر کر دیں تو اس کے اعصاب میں کھچاؤ ہوگا۔ اور چلنے میں سستی کرے گا۔ تو اس کھوکھلے جسم سے کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ مگر اس کے سینے کے بائیں جانب دروازے بغیر ایک حجرہ ہے مجھے معلوم نہیں کہ اس میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہی مقام لطیفہ ربانی کا مقام ہو جس کی وجہ سے مستحق خلافت ہوگا۔

اس کے بعد روح کو حکم ہوا کہ اس جسم میں داخل ہو۔ اور اس جسم کے خالی حصوں میں پر ہو جائے۔ جب روح اس صورت والے جسم کے قریب گئی اس نے دیکھا کہ ایک تنگ و تاریک مقام ہے وہاں داخل ہونے سے رک گئی۔ اسے اللہ تعالیٰ کے دربار سے مجبور کر کے جسم میں داخل کیا گیا ابھی اس کے سر میں روح آئی تھی کہ اس نے چھینک ماری اور الہام خداوندی کی وجہ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ زبان پر جاری ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا یرحمک اللہ۔ حاکم نے اسے اسی طرح روایت کیا۔ اور ابن عباس سے اس کی تصحیح کی۔ اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں ابن مسعود اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک اور جماعت سے روایت کی کہ جب روح حضرت آدم علیہ السلام کی کمر تک پہنچی۔ اچھل کر کھڑے ہو گئے ابھی روح ان کے جسم کے نچلے حصہ میں نہیں آئی تھی اس لئے زمین پر گر گئے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء آیت ۳۷) اس کے بعد کہ روح ان کے تمام بدن میں چلی گئی۔ حکم ہوا کہ فرشتوں کی جماعت پر گزر کرو۔ اور انہیں السلام علیکم کہو۔ اور دیکھو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں پر گزر کیا۔ اور فرمایا السلام

علیکم۔ فرشتوں نے کہا وعلیک السلام ورحمتہ اللہ حکم ہوا کہ انہیں کلمات کو میں نے تیرے اور تیری اولاد کیلئے ملتے وقت کی دعا قرار دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی اے خداوند کریم! میری اولاد کیا ہے؟ فرمایا کہ تیری اولاد میرے دونوں ہاتھوں میں ہے۔ ان دونوں ہاتھوں میں جسے تو پہلے اختیار کرے گا اس ہاتھ سے وابستہ چھپی ہوئی چیزوں کو تیرے لئے پہلے ظاہر کروں گا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ میں نے پہلے اپنے پروردگار کا دایاں ہاتھ اختیار کیا۔ اور میرے پروردگار کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہاتھ کو ان کی پشت پر پھیرا اور قیامت تک پیدا ہونے والے نیک بختوں کو ان کی پشت سے کھینچا اور ان کی تصویریں آپ کو اپنے ہاتھ میں دکھائیں۔ پھر دوسرا ہاتھ ان کی پشت پر گزارا اور بدبختوں کو کھینچا اور ان کی تصویریں انہیں دکھائیں۔

جب حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی تصویریں ملاحظہ کیں۔ دیکھا ان کے درمیان بہت فرق واقع ہوا ہے۔ بعض خوبصورت، بعض بدصورت، بعض امیر، بعض فقیر، بعض لمبے قد والے، بعض چھوٹے قد والے۔ بعض صحیح خلقت والے اور بعض ناقص الخلقت۔ عرض کی اے خداوند کریم! یہ سب تیرے بندے ہیں تو نے انہیں یکساں پیدا کیوں نہیں فرمایا؟ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر انہیں میں یکساں پیدا کرتا تو کوئی بھی میرا شکر ادا نہ کرتا اب جبکہ ان کے درمیان فرق واقع ہوا تو ہر شخص جو حاصل شدہ نعمت کو پہنچانے گا میرا شکر کرے گا۔

اس کے بعد آپ نے انبیاء علیہم السلام کو دیکھا جو کہ آپ کی ساری اولاد میں سے نور عظیم کا امتیاز رکھتے ہیں جو کہ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان چمکتا تھا۔ ان پیغمبروں علیہم السلام میں سے جو نور حضرت داؤد علیہ السلام کی پیشانی پر چمکتا تھا حضرت آدم علیہ السلام کی نظر میں بہت خوشنما معلوم ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام انبیاء علیہم السلام میں سے خلاف اولیٰ کام کرنے کے مرتکب ہوئے جسے آپ نے اپنے عرفان خداوندی سے معمور اور تجلیات صفاتی سے منور قلب مقدس کے نازک احساسات کے مطابق

خطا قرار دیا جبکہ حقیقت میں وہ ایسی خطا نہ تھی کہ معصیت کے دائرے میں داخل ہو۔ اور اس کے تدارک کیلئے اس حد تک توبہ استغفار اور زاری کی کہ انسانوں میں سے کسی کیلئے بھی ایسا تدارک ممکن نہیں ہوا۔ پس ان کا نور نبوت ان کی توبہ اور ندامت کے نور سے مل کر ایک عظیم چمک رکھتا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اس قسم کی صورت حال پیش ہوئی کہ انہوں نے تعمیل حکم میں فروگذاشت کی بنا پر اس کا تدارک توبہ ندامت' استغفار اور پہلے کی نسبت زیادہ آہ و زاری کر کے کیا۔ لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام کے نور کو حضرت آدم علیہ السلام کے نور سے پوری مناسبت حاصل ہوگئی۔ مناسبت جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر محبت زیادہ ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے نور داؤدی کو دیکھ کر عرض کی کہ یا اللہ یہ تیرا کون سا بندہ ہے۔ اور اس کا کیا نام ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہ آپ کا بیٹا داؤد ہے۔ عرض کی کہ اس کی عمر کتنی مقرر فرمائی ہے؟ ارشاد ہوا ساٹھ سال عرض کی کہ میری عمر کس قدر ہے ارشاد ہوا ہزار سال۔ عرض کی میری عمر سے چالیس سال کم کر کے اس کی عمر میں زیادتی کر دی جائے۔ اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر سے چالیس سال باقی رہ گئے ملک الموت علیہ السلام اور ان کے مددگار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کی کہ آپ کی وفات کا وقت آ پہنچا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ ابھی میری اجل سے چالیس سال باقی ہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ وہ چالیس سال آپ نے اپنے بیٹے حضرت داؤد علیہ السلام کو دے دیئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کسی کو دیئے ہوں۔ اور کوئی شخص اپنی عمر میں سے کسی کو نہیں دیتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے لینے دینے کا معاملہ فراموش ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا۔ یہی رسم ان کی اولاد میں باقی ہے۔ اور اسی وقت سے حکم ہوا کہ جو کوئی کسی کو چیز دے چاہئے کہ ہبہ نامہ لکھ لے اور شاہد اور گواہ طلب کرے تاکہ حاجت کے وقت کام آئے۔

امام احمد اور ابن ابی شیبہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جب

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد دکھائی۔ فرشتوں نے عرض کی کہ اے خداوند کریم اتنی کثیر تعداد کیلئے زمین میں گنجائش نہ ہوگی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے انہیں کم کرنے کیلئے ایک چیز کو مقرر کیا ہے۔ اور وہ موت ہے۔ فرشتوں نے عرض کی کہ اگر یہ اپنی موت کو اسی طرح دیکھیں گے انہیں زندگی ہرگز گوارا نہ ہوگی۔ موت کی یاد ان کی زندگی کو تلخ کردے گی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان پر غفلت ڈالنے کیلئے آرزو اور امید کی درازرسی دے دوں گا کہ اس کی وجہ سے موت سے غافل رہیں گے۔

رنگوں اور عادتوں میں اختلاف کی وجہ

اور صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کے سارے قبض کئے ہوئے اجزاء سے پیدا فرمایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آدمی رنگ میں بھی مختلف ہوتے ہیں سرخ' سفید اور سیاہ اور طبعی عادات میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ نرم' سخت اور نیت میں اچھے اور برے اور خبیث اور طیب اور بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ فرشتے اس خلیفہ کے پیدا ہونے سے بہت ڈرتے تھے کہ جب خلیفہ ہم پر حکمرانی کرے گا اس کے ساتھ کیا معاملہ واقع ہوگا؟ ابلیس آیا اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کے ایک ایک عضو کو ملاحظہ کیا۔ اور کہنے لگا اس سے نہ ڈرو۔ پس تمہارا رب صمد ہے۔ اور یہ کھوکھلا ہے اگر مجھے اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے ہلاک کردوں گا۔

اور دیلمی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت لائے کہ خواہش' آزمائش اور شہوت کو چالیس دن کی مدت تک حضرت آدم علیہ السلام کے گارے میں خمیر کرایا گیا۔ اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین دن روز جمعہ ہے۔ کیونکہ اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔ اور اسی دن انہیں جنت میں داخل کیا گیا۔ اور اسی دن انہیں جنت سے زمین پر اتارا گیا۔ اور اسی دن آپ نے وفات پائی اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔

امام احمد' طبرانی اور دوسرے محدثین کی روایات میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ بہشتی جب بہشت میں آئیں گے بے ریش اور ان کے جسم بالوں سے خالی ہوں گے۔ اور ان کے رنگ سرخ وسفید اور ان کے سروں کے بال گھنگھریالے اور ان کی آنکھیں سرمگیں گویا کہ تینتیس سال کے ہیں۔ اور وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کی صورت میں ہوں گے ان کے قد ساٹھ ہاتھ اور ان کا عرض اسی طول کے مناسب ہوگا۔

اور ابن سعد' ابن جریر' ابن ابی حاتم اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام روئے زمین سے پیدا فرمایا شور اور شیریں سے۔ آپ کی اولاد میں سے جس پر میٹھا جزو غالب آیا وہ آخر نیک بختی میں آ جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے ماں باپ کافر ہوں۔ اور آپ کی اولاد میں سے جو شور کا جزو غالب رکھتا ہے وہ آخر کار بد بخت ہوگا اگرچہ کسی عظیم کا بیٹا ہو۔

اور چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے سے منظور روئے زمین کی خلافت تھی اور خلافت کو دو چیزیں لازم ہیں۔ اول اس کی صفات وافعال کو جاننا جو اسے خلیفہ مقرر کرے تا کہ ان کے موافق اپنی طرف سے صفات وافعال سرانجام دے سکے۔ دوسری چیز ان چیزوں کو جاننا جو اس کی خلافت کے فرمان میں داخل ہیں۔ تا کہ ہر چیز کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو اس کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اور ٹوپی کو پاؤں میں اور جوتے کو سر پر نہ ڈالے۔ پس حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اور مخلوق کے اسماء کی تعلیم ضروری ہوئی تا کہ اسمائے الٰہی کے ساتھ حقائق کونی میں تصرف کریں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد اس علم کو ان کے دل میں ڈالا اس کے بغیر کہ کوئی کلمہ' کلام' صرف اور آواز درمیان میں ہو۔

تعلیم آدم اور اس میں علماء کے ایک شبہ کا جواب

وَعَلَّمَ اٰدَمَ اور تعلیم فرمائی حضرت آدم علیہ السلام کو اس طرح کہ ان کے دل میں ڈالا کہ فلاں چیز کا فلاں نام ہے۔ اور فلاں چیز کا فلاں نام۔ اور یہاں بعض علماء کو شبہ ہوتا ہے کہ اسماء کی تعلیم بعض لغات کو جاننے پر موقوف ہے۔ کیونکہ اسماء کی تعلیم اسی سے عبارت ہے کہ کہیں کہ فلاں چیز کا فلاں نام ہے۔ اور فلاں چیز کا فلاں نام اور اس کلام کو سمجھنا بغیر جاننے

ان سب کے مفردات کے مفہوموں کے ممکن نہیں ہے۔ پس چاہئے کہ تعلیم اسماء میں حضرت آدم علیہ السلام کو دور لازم آئے کیونکہ تعلیم اسماء بعض اسماء کے کو جاننے پر موقوف ہے۔ اور ان اسماء کو جاننا تعلیم پر موقوف ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم اسماء دو وجہ پر تھی۔ ان چیزوں کی ضروری مقدار کہ باہمی خطاب' فائدہ دینا اور لینا اس پر موقوف تھا حروف آواز' کلمہ' کلام کے واسطہ کے بغیر ان کے دل میں ڈال دیں گئی اور جو باقی رہ گئیں انہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو معلوم الفاظ کے واسطہ سے بیان فرمایا۔ پس یہ ایک بے مقصد طول دینا ہے۔ پہلے سے یہی کہنا چاہئے کہ یہ تعلیم الفاظ کے واسطہ سے نہ تھی۔ بلکہ دل میں ڈالنے کے طریقے سے تھی۔ اگرچہ اسی طریقہ سے بعض اسماء کی تعلیم حضرت آدم علیہ السلام کو آپ کی پیدائش ساتھ ہی تھی کیونکہ آپ کی روح آپ کے نچلے بدن میں نہیں آئی تھی کہ آپ نے چھینک کے شکریہ میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا اور اس کے جواب میں یرحمك اللہ سنا لیکن پیدائش کے بعد آپ کو عام وسیع تعلیم دی گئی۔

اَلْاَسْمَآءَ کُلَّهَا تمام چیزوں کے ناموں کی۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ کو ہر شے کے نام کی تعلیم دی حتیٰ کہ بڑے پیالے اور چھوٹی پیالی کی۔ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہاں تک کہ اونٹ' گائے اور بکری کی۔ اور ان کے ناموں کی تعلیم اس لئے واقع ہوئی کہ نام ایک لفظ سے عبارت ہے جو کہ ایک حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ اور منظور حقائق کے علم کا فائدہ دینا تھا تا کہ خلافت کا کام سرانجام دیا جا سکے۔ اور نام اس چیز کا سب سے قلیل حصہ ہے جس کی وجہ سے حقائق کے درمیان امتیاز ہوتا ہے۔ نیز منظور یہ تھا کہ تمام چیزوں کے خواص اور ان کے نفعوں اور نقصانوں کی آپ کو تعلیم دی جائے۔ اور ان خواص کے استعمال کا طریقہ بھی۔

اور اس تعلیم کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ پہلے آپ کو ہر چیز کے نام کی تعلیم دیں تا کہ یہ بیان کرنے کے وقت کہ فلاں چیز فلاں خاصیت رکھتی ہے۔ اور فلاں منفعت کو اس سے فلاں طریقے سے لیا جا سکتا ہے۔ اور فلاں ضرر کو اس سے فلاں طریقے سے زائل کیا جا سکتا ہے غرکو لمبا کرنے کی ضرورت نہ ہو۔

یہاں جاننا چاہئے کہ فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کے امتیاز کی وجہ جس کی وجہ سے ان پر فوقیت حاصل کی صرف تعلیم اسماء اور اشیاء اور ان کے نفع ونقصان کی معرفت نہیں۔ کیونکہ یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کا خطاب فرشتوں کی طرف متوجہ ہوتا تھا کہ فلاں چیز کو اس طرح کرو اور فلاں کو اس طرح۔ جیسا کہ اسی واقعہ میں گزرا کہ پہلے جبریل علیہ السلام کو روئے زمین سے مٹی کی مٹھی لانے کیلئے بھیجا اس کے بعد دوسرے فرشتوں کو تو اگر فرشتوں کو حقائق اور ان کے اسماء کا علم نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ مخلوقات کے حق میں حکم صادر فرماتا تھا وہ کس طرح بجالا سکتے بلکہ آدم علیہ السلام کا فرشتوں سے امتیاز دو مرتبوں ۔ تا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے فرشتوں سے امتیاز کی دو وجوہات

بلکہ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے دو وجھوں کی بنا پر ممتاز تھے۔ ایک یہ کہ آدم علیہ السلام کی خلقت سے پہلے فرشتوں کو ہر چیز کے اسماء کا علم حاصل نہ تھا بلکہ ان کا علم انہیں حقائق اور اسماء میں منحصر تھا جن کا ان کے کام اور خدمت سے تعلق تھا اور دوسرے حقائق اور ان کے اسماء کے ساتھ انہیں کوئی سروکار نہ تھا اور ان پر انہیں اطلاع حاصل نہ تھی۔ بخلاف حضرت آدم علیہ السلام کے کہ انہیں خلیفہ بنانے کی نسبت سے عام تعلیم دی گئی تا کہ ہر حقیقت کے نفع اور نقصان سے آگاہ ہوں۔

چنانچہ حاکم اور ابن عساکر نے مرفوعاً روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسماء کی تعلیم کے ضمن میں حضرت آدم علیہ السلام کو قسم قسم کے پیشوں سے ایک ہزار پیشے کی تعلیم دی اور ارشاد فرمایا کہ اے آدم! اپنی اولاد اور نسل سے کہو کہ اگر تم دنیا سے صبر نہیں کر سکتے ہو تو اس دنیا ان پیشوں کے ساتھ طلب کرو اور دنیا کو دین کے ساتھ طلب نہ کرو کیونکہ دین صرف میرے لئے ہے۔ اس پر افسوس ہے جو دنیا کو دین کے ساتھ طلب کرے

اور دیلمی ابو نافع سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کی تصویریں مٹی اور پانی میں بنا کر مجھے دکھائی گئیں اور مجھے تمام اسماء کی تعلیم دی گئی جس طرح آدم علیہ السلام کو تمام ناموں کی تعلیم دی گئی اور اس آیت میں کلہا کا لفظ جو کہ عموم

اسماء کی تاکید کیلئے بڑھایا ہے اسی نکتہ کیلئے ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا فرشتوں سے امتیاز یہی عام تعلیم تھی نہ کہ تعلیم اسماء۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس عام تعلیم کی ابتداء بھی حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور اس کے بعد کہ حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو ہر چیز کے نام کی خبر دی اور فرشتوں نے ہر چیز کے نام کا استعمال حضرت آدم علیہ السلام اور آدمیوں سے سنا ان میں سے بعض جیسے حضرت جبریل علیہ السلام اور دوسرے اکابر ملائکہ کو ہر چیز کے ناموں کا علم حاصل ہو گیا کیونکہ یہ بات شرائع سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت جبریل اور دوسرے اکابر ملائکہ علیہم السلام انبیاء علیہم السلام کی خدمت میں آئے تھے۔ اور ہر چیز میں بحث و تفتیش کرتے تھے۔ اور مختلف امور کا ذکر درمیان میں آتا تھا۔ اور وہ کبھی بھی فائدہ دینے اور لینے اور گفت و شنید میں دقت محسوس نہیں کرتے تھے۔ اور پوچھتے نہیں تھے کہ فلاں نام کس چیز کا نام ہے۔ اور یہ لفظ کیا معنی رکھتا ہے؟ اور فلاں چیز کی حقیقت کیا ہے؟ ہاں اس عام تعلیم کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے خصوصی طور پر ہوئی تا کہ فرشتوں پر ان کے علم کی زیادتی خصوصاً اس علم کی جو کہ سیاست اور خلافت سے متعلق ہے ظاہر ہو۔ اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کی صرف تعلیم پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ پھر اللہ تعالیٰ نے ان ناموں کو فرشتوں کے سامنے اس طرح پیش فرمایا۔ ان چیزوں کی تصویریں پیش کیں جن کے ناموں کی حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم دی گئی۔

فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ ۔ پس فرمایا کہ اے فرشتو! مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ کیونکہ نام حقائق کی تمیز دینے والوں میں سے سب سے کم تر شے ہے۔ اور خلافت کے استحقاق کیلئے حقائق کی معرفت اور ان کا امتیاز شرط ہے اگر تمہیں ان چیزوں کے ناموں کی خبر ہوگی تو تمہاری طرف سے خلافت کا دعویٰ ممکن ہوگا ورنہ جب تم ان چیزوں کے ناموں سے بے خبر ہو گے تو خلافت کا کام جو کہ چیزوں میں تصرف کا نام ہے تم سے کس طرح سرانجام پائے گا اور اگرچہ تم نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ تمہاری گفتگو کا

ازم ہے۔ پس اس دعویٰ کی شرطوں کو ثابت کرو۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اپنی گفتگو میں سچے ہو کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ کیونکہ اس کلام کا معنی یہ ہے کہ ہماری تسبیح و تقدیس کمال کی بلندی کو پہنچ چکی ہے۔ اور ہماری حمد و شکر انتہاء تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کمال تسبیح و تقدیس بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کے ساتھ ہو۔ اور اسی طرح حمد و شکر کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کمال اور نعمت کے مقابلہ میں ہو۔ اور اسے جمیع اسماء الٰہی' کائنات کے تمام اسماء اور اللہ تعالیٰ کے تمام کمالات اور نعمتوں کا علم درکار ہے۔ اور حقائق عالم کی تفصیلی معرفت کے بغیر اس علم کی صورت نہیں بنتی اور حقائق کے درمیان بے شمار وجہوں سے امتیاز ہے کہ ان وجوہ میں سب سے ادنیٰ وجہ امتیاز نام ہے اگر تمہیں اس قدر بھی حاصل نہیں تو تسبیح و تقدیس علی الاطلاق اور حمد کامل کا دعویٰ تمہاری طرف سے کس طرح درست ہوگا۔

اس مقام کے متعلق چند بحثیں

اس جگہ چند بحثیں باقی رہ گئیں جنہیں مفسرین یہاں ذکر کرتے ہیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ اکثر علماء نے اس آیت سے اس بات پر دلیل لی ہے کہ الفاظ کو معنوں کیلئے مقرر کرنے کی ابتداء حق تعالیٰ کی جانب سے ہے کہ اس آیت میں فرمایا وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اور اگر معنوں کیلئے الفاظ وضع کرنے والے آدم یا اولاد آدم ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم کی گنجائش نہ ہوتی لیکن اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع لغات حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ ملی ہوئی نہیں۔ بلکہ اس سے بہت عرصہ پہلے اور فی الواقع اسی طرح ہے۔ اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کے نام اور دوسری چیزوں کے نام جنہیں سرانجام دینے کا فرشتوں کو حکم ہوتا تھا مقرر تھے۔ اور فرشتوں کا باہم ایک دوسرے کو خطاب کرنا اور احکام الٰہیہ کے مضمون کو الفاظ کے واسطہ سے سمجھنا جو کہ ان سے واقع تھا یقینی اور قطعی طور پر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ثابت تھا۔ جو لوگ کہ لغات کی وضع کو حضرت آدم اور آدمیوں کی اصطلاح سے جانتے ہیں وہ فرشتوں کے آپس میں مکالمات سے صریح غافل ہیں۔

اور وہ جو علماء نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم اسماء کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں خواہش ڈالی کہ وضع الفاظ کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر انہیں وضع کا طریقہ تعلیم دیا۔ جیسا کہ وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ کا معنی بھی یہی ہے۔ اس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو اس امر کا مکلف کرنا کہ وہ آدمیوں کی اصطلاح کے الفاظ اور معنوں کی خبر دیں یہ تکلیف مالا یطاق کے زمرے میں ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بے حاصل سی بات ہوگی کیونکہ اگر کسی کو کسی کی اصطلاح پر اطلاع نہیں تو اس کے علم میں کیا قصور اور اس دوسرے کو اس پر کیا فضیلت۔ ورنہ علمائے عرب کو ترکوں کی اصطلاحات پر اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے ایک قسم کا قصور لازم آیا اور ترکوں کو ان پر ایک فضیلت ثابت ہوئی۔ ہاں علم لغات و اسماء جو کہ علم الٰہی میں مخصوص معنوں کیلئے مقرر ہیں کو نہ جاننا قصور کی علامت ہے۔ اور اسے جاننا ترجیح و فضیلت کی دلیل۔ اس لئے کہ معلومات الٰہی کا احاطہ جتنا زیادہ ہو گا اسی قدر اس دربار عالی سے مناسبت و مشابہت زیادہ ہوگی۔ اور جناب الٰہی سے مشابہت کی زیادتی مخلوق کی فضیلت کا سبب ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ ثم عرضہم کی ضمیر ظاہر ہے کہ اسماء کی طرف لوٹنے والی ہے مگر مسمیات کے اعتبار سے اور اسماء کے مسمیات ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں تھے۔ یہ ضمیر جو کہ ذوی العقول مذکروں کے ساتھ مخصوص ہے کیوں لائی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان مسمیات کا فرشتوں پر پیش کیا جانا ان مسمیات کے جسم کے اعتبار سے نہ تھا جو کہ مذکر و مونث' ذوی العقول اور غیر ذوی العقول کا محل ہے۔ بلکہ روحی ملکوتی وجود کے اعتبار سے تھا کہ تمام مخلوقات اس کے مطابق عقل اور ادراک والی ہے اور مذکر و مونث ہونے سے پاک ہے ہاں اس وجود میں تانیث نہ ہونے کی وجہ سے تذکیر کے الفاظ اور اس کے صیغے ان کے حق میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ ملائکہ کے حق میں بھی اسی اعتبار سے تذکیر کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ انبئونی میں امر کا صیغہ عاجز کرنے اور الزام دینے کیلئے مکلف کرنے اور تعمیل کرنے کیلئے نہیں تو جنہوں نے اس صیغہ سے دلیل لے کر تکلیف

مالایطاق یعنی ایسا حکم دینا جس کی تعمیل کی طاقت نہ ہو کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے خطا کی ہے۔ اور اسی لئے ملائکہ نے یہ امر اور یہ خطاب سنتے ہی اپنی عاجزی کا اظہار شروع کر دیا اس طرح کہ قَالُوا سُبْحَانَكَ انہوں نے کہا اے پروردگار ہم تجھے جانتے ہیں اس سے کہ تیرے علم میں کوئی قصور ہو یا تیرا کوئی کام بے مقصد ہو۔ اور حکمت کے خلاف واقع ہو۔ اور ہمارا سوال نہیں تھا مگر ہدایت وارشاد کی طلب کیلئے اس لئے کہ

لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں کوئی علم حاصل نہیں ہوتا مگر وہ جو تو نے ہمیں تعلیم فرمایا یہی وجہ ہے کہ ہم اس خلیفہ کے پیدا کرنے کی حکمت نہیں جان پائے اور اپنی تسبیح و تقدیس کو اور اپنی حمد و شکر کو کامل سمجھ بیٹھے اور حقائق اشیاء کی تفصیلی معرفت اور ان کے ممیّزات کو جن میں ان کے نام بھی ہیں ہمیں معلوم نہ ہوئے۔ اور اگر ہمیں جناب پاک سے یہ علوم ابتداء ہی سے حاصل نہیں ہوئے تو کوئی محل اعتراض نہیں۔ کیونکہ

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ تحقیق تو نہایت جاننے والا ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہمارے حقائق کا تقاضا نہیں کہ اس علم کو واسطہ کے بغیر تجھ سے حاصل کر سکیں۔ اسی لئے تو نے اس مخلوق کو اپنا خلیفہ بنایا۔ اور انہیں افعال پر ایک قسم کی قدرت دی ہے۔ اور ہمیں اس کے مقاصد خدمت اور اس کے اسباب پورا کرنے کیلئے تو نے مامور فرمایا تا کہ ہم بھی اس خلیفہ اور اس کی خدمت کے واسطہ سے ان افعال اور حقائق پر اطلاع پائیں کیونکہ تو

اَلْحَكِيْمُ کامل حکمت والا ہے اس تدبیر کے ساتھ ہمارے حقائق کو بھی ان علوم کے ساتھ بہرہ ور فرمائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے یہ عاجزی اور تضرع اور اپنے علم و حکمت کے کمال کا اقرار پسند فرمایا۔

قَالَ يَآ اٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ فرمایا اے آدم! ان فرشتوں کو خبر دو اگر چہ جسمانی عوارض سے مجرد ہونے میں تو ان سے بہت کم ہے۔ اور مقرر ہے کہ جس قدر تجرد زیادہ ہوگا اسی قدر چیزوں کے حقائق پر اطلاع زیادہ ہوگی۔

بِاَسْمَآئِهِمْ ان چیزوں کے ناموں کی جو کہ ہم نے فرشتوں پر پیش کیں اس لئے کہ ان چیزوں کو ان کے خواص، منافع اور نقصان کے ساتھ نہیں جانا جا سکتا مگر اس عقل کے

ساتھ جو کہ وہم' شہوت اور غضب کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ اور یہ معنی صرف تمہارے ساتھ خاص ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جب یہ حکم سنا تو ان حقائق' اسماء اور ان کی صفات ۔ فرشتوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور ہر چیز کے نام کو اس کے تمام خواص اور آثار سمیت۔ ان پر واضح فرمایا۔

فَلَمَّا اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ تو جب حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو ان چیزوں کے ناموں کی خبر دی۔ حالانکہ وہ چیزیں گنتی اور احاطہ سے باہر تھیں۔ اور اس بیان میں ان سے بالکل غلطی نہ ہوئی۔ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کے علم کی وسعت کے کمال سے حیران ہو گئے۔ اور اس وقت

قَالَ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کی مزید تاکید کیلئے فرشتوں کو فرمایا

اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ کیا میں نے تمہیں نہ کہا تھا اس مخلوق کی پیدائش سے پہلے کہ

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ تحقیق میں جانتا ہوں ان چیزوں کو کہ تم نہیں جانتے ہو۔ اور اس کلام سے میری غرض یہ تھی کہ میں جانتا ہوں۔

غَیْبَ السَّمٰوٰتِ ان چیزوں کو جو کہ عالم بالا میں پوشیدہ ہیں۔ ستاروں کے اطوار' افلاک کی حرکات اور ان کے خوص و آثار سمیت اور باوجودیکہ تم عالم بالا کے ساکن ہرگز ان چھپے اطوار کو نہیں جانتے ہو۔ اور یہ مخلوق باوجودیکہ سفلی عناصر سے پیدا کی گئی ہے ان سب سے واقف ہے صغریٰ' کبریٰ' وسطی اور عظمی قرانات (ستاروں کا ملنا مراد ہے) سورج اور چاند گرہن اور ستاروں کے دوسرے احوال کو ان کے پیدا ہونے سے ہزاروں سال پہلے جانتا ہے۔ اور ہر ایک کو ایک نام سے موسوم کرتا ہے۔ اور ان تمام احوال کے مجموعی طور پر اور فرداً فرداً احکام نکالتا ہے۔

وَ اور جانتا ہوں غیب الْاَرْضِ یعنی جو عالم سفلی میں چھپا ہے۔ حالانکہ عالم سفلی حس کے نزدیک بہت زیادہ ظاہر ہے۔ لیکن تمہیں نباتات کے ہونے معدنی اجسام کے بدلنے' عجیب شکل والے حیوانات کے پیدا ہونے کے طریقے' پیوند کاری کے فوائد' ترکیب و تالیف کی صنعتیں جیسے بیل گاڑی کہ ایک حقیقت ہے جو کہ انسان' لکڑی' حیوان اور لوہے وغیرہ سے

مرکب ہے معلوم نہیں۔ اور یہ مخلوق اس قسم کی چھپی ہوئی بہت سی چیزوں کو جانتی ہے۔ اور اسے بنا سکتی ہے۔ جبکہ تمہارا علم ان کے ناموں تک نہیں پہنچتا باوجودیکہ سفلی عوارض سے جو کہ عقل وادراک سے مانع ہیں پورے طور پر پاک ہو۔

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ اور میں اس چیز کو جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو یعنی تسبیح' تقدیس اور اسماء الٰہی کی معرفت اس قدر جتنی کہ تمہارے حوصلہ کی استعداد میں گنجائش ہے۔

وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اپنے قوی اور افعال سے اور تم ان پر بالکل مطلع نہ تھے کہ ہم میں وہ قوی اور افعال مخلوق ہیں۔ جیسے رحم میں بنی آدم کی صورت بنانا' مسجدوں کی خدمت' ذکر الٰہی سے انس حاصل کرنا' نیک لوگوں کے متبرک مقامات پر حاضری' غازیوں اور حاجیوں کی امداد' اسم قہار اور غفار کے مظہر کا تماشا اور اسمائے الٰہی میں سے ان ہر دو کی مانند' زندوں کی طرف سے مردوں کو ثواب اور ہدیے پہنچانا' اچھے اعمال اوپر لے جانے کے فوائد' راہ خدا کے سالکوں کو ترقی دینا' عالم مثال میں تجلیات شہودی کی خدمت کرنا جو کہ اس خلیفہ کی اولاد میں کاملوں کیلئے ہونے والی ہیں وحی نازل کرنا' اور کتب الٰہیہ نازل کرنا' شریعتوں' دینوں' ملتوں اور فرق و مذاہب [illegible] غیر ذالک۔ حالانکہ یہ سب چیزیں بالقوۃ تم میں موجود تھیں۔ [illegible] ہم نے ان چیزوں کا ظہور اس خلیفہ کے وجود پر موقوف رکھا تھا تاکہ اس خلیفہ کے واسطہ سے تمہیں ان چیزوں پر آگاہ کریں۔ اور تم اس خلیفہ کی خدمت کی وجہ سے اپنے بالقوۃ کمالات کو فعل میں لاؤ۔ اب یہ خلیفہ معرض وجود میں آ گیا۔ اور اس نے تمہیں ان چیزوں کی خبر دی تم نے جان لیا کہ اپنے میں ہم کیا چیزیں رکھتے تھے۔ پس اس خلیفہ کا تمہاری گردن پر عظیم حق ہے کہ اس نے تمہیں اپنی حقیقت سے آگاہ کیا۔ اور جناب الٰہی میں زیادہ قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہوا۔

لازم ہے کہ اس خلیفہ کو استاد اور مرشد کی طرح سمجھو اور اس کی تعظیم کے آداب بجالاؤ۔

چند بحثیں

[illegible] چند [illegible] میں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ کہ جب فرشتوں کو حقائق اشیاء کا علم حضرت آدم علیہ السلام کے طفیل حاصل ہوا تو علمهم کیوں نہ فرمایا۔ اور انبهم فرمایا جس

طرح کہ اَنۡبِئُوۡنِیۡ فرمایا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استاد سے علم اور اس کی مشق حاصل کرنا جمعیت انسانی کی ہیئت کی خصوصیت ہے ملائکہ کو یہ ترقی ممکن نہیں۔ اس لئے کہ فرشتوں کے سب کمالات ان کے وجودوں کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہاں حضرت آدم علیہ السلام کے طفیل ملائکہ کی قسموں میں سے ہر قسم کو اپنی معلومات کی جنس سے بہت کچھ حاصل ہوا کہ اس سے پہلے حاصل نہ تھا۔ لیکن معلومات کی یہ کثرت مرتبہ علم کی ترقی کا سبب نہیں ہوتا جس طرح کہ آدمی میں دیکھنے کی قوت کی نظر میں آنے والی چیزوں کی کثرت کی وجہ سے علم میں اس کے مرتبہ کو زیادتی نہیں ملتی بلکہ کثرت مبصرات کے باوجود اس سے ممکن نہیں کہ مبصرات کے علاوہ کسی دوسری چیز کو قبول کرے اسی طرح فرشتوں کا حال ہے اپنی معلومات میں حضرت آدم علیہ السلام کے طفیل زیادتی کی وجہ سے اور اسی نکتہ کو سمجھانے کیلئے اَنۡبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ فرمایا۔ اور علمهم باسماء هم نہ فرمایا۔

فضیلت علم کی دلیل

دوسری بحث یہ ہے کہ یہ آیت اور یہ واقعہ فضیلت و شرافت علم پر واضح دلیل ہے۔ اس لئے کہ عالم امکان میں علم کے علاوہ کوئی دوسری چیز اس قدر شرافت والی ہوتی تو فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کے اظہار کے مقام پر ضرور اسی چیز کو پیش کرتے۔ نیز اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ باوجودیکہ فرشتے عالم قدس کے باسی ہیں۔ اور ان کی عبادت اور اخلاص آدمیوں کی عبادت اور اخلاص سے کئی مرتبہ زیادہ ہے۔ اور پاک اور گناہوں سے معصوم ہونا ان کے جوہر ذاتی کو لازم ہے۔ اور ہر باب میں لَا يَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَ يَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ ان کی شان ہے۔ اور کھانے پینے' نکاح' سواری اور دوسری سفلی ضرورتوں اور جسمانی عوارض سے بے رغبتی اور بے نیازی انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور مشکل کاموں پر جو انہیں قدرت ہے آدم علیہ السلام اور آدمیوں کو اس سوواں حصہ بھی نصیب نہ ہوا اور حجاب کا اٹھنا' تجلیات الٰہی کا معاینہ اور اللہ تعالیٰ کے خطاب بلا واسطہ سننا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں جو قرب اور مرتبہ حاصل ہے شروع میں آدمیوں کو میسر نہیں۔ اور ان تمام انعامات کے باوجود خلافت کا حق انہیں حاصل نہ ہوا کیونکہ وہ کائنات کے حقائق کا علم

نہیں رکھتے تھے۔ اور بننے بگڑنے والے جہان کی رعایا کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔

تین قسم کی نگہبانی شرط خلافت ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ عصمت و طہارت یا کامل درجہ ولایت یا خوارق و کرامات کا ظاہر ہونا کثرت عبادت و زہد یا فنا و بقا کے مرتبہ کا حاصل ہونا اور تجلیات الٰہی سے مشرف ہونا اور جہاں رغیب کو دیکھنا اور ہاتف کی آوازیں سننا خلافت کی شرطوں میں سے نہیں ہے جو فضیلت کہ خلافت کی شرط ہے یہ ہے کہ تین قسم کی نگہبانی اور حکومت کے علم میں زیادہ ہو۔ نگہبانی منزل' نگہبانی ملک' نگہبانی دین اور اس تین قسم کی سیاست میں پوری مہارت حاصل کی ہو۔ اور یہی اہلسنّت و جماعت کا مذہب ہے کہ انہوں نے استحقاق خلافت کا مدار اس علم میں فضیلت حاصل کرنے کو قرار دیا ہے۔

علم کی فضیلت کا بیان - عالم کی مجلس کی برکات

علماء اور حکماء نے علم کی فضیلت کے باب میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندی نے کہا ہے کہ عالم کی مجلس میں حاضر ہونا اس کے بغیر کہ اس سے فائدہ لے یا مسئلہ یاد کرے سات کرامتوں کا موجب ہے ایک یہ متعلموں کے زمرہ میں گنا جاتا ہے۔ اور اس ثواب میں شریک ہو جاتا ہے جس کا متعلمین کیلئے وعدہ ہے۔ دوسری کرامت یہ کہ اس محفل میں حاضری کی مدت تک گناہوں سے بند رہتا ہے۔ تیسری یہ کہ جب طلب علم کی نیت سے گھر سے باہر آتا ہے اس ثواب میں جس کا طالبان علم کے ساتھ وعدہ ہے داخل ہو گیا۔ چوتھی کرامت یہ کہ حلقہ علم میں نزول رحمت کے وقت شریک ہو جاتا ہے۔ پانچویں کرامت یہ کہ جب تک علمی مذاکرات سنتا ہے عبادت میں ہے۔ چھٹی کرامت یہ ہے کہ جب وہ کوئی مشکل مسئلہ سنتا ہے۔ اور اس کی سمجھ اس کی حقیقت تک نہیں پہنچتی تو دل تنگ ہوتا ہے۔ اور اس کا دل منکسر ہوتا ہے۔ تو منکسرۃ القلوب کی جماعت میں شمار کیا جاتا ہے۔ ساتویں کرامت یہ کہ علم کی عزت اور فسق و جہالت کی ذلت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور جاہلوں اور فاسقوں سے متعلق اسے ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ حال اس شخص کا جسے کہ علماء کی مجلس

سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ اور اس شخص کا حال جو ان کی صحبت سے بے شمار دینی دنیوی فائدے حاصل کرتا ہے یہاں سے قیاس کیا جاسکتا ہے۔

علم کی مال پر فضیلت کی سات وجوہ

حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ علم کو مال پر سات وجہوں سے فضیلت ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ علم پیغمبروں علیہم السلام کی میراث اور مال فرعون' ہامان' شداد اور نمرود کی وراثت ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ علم خرچ کرنے سے گھٹتا نہیں۔ بلکہ بڑھتا ہے۔ جبکہ مال خرچ کرنے کی وجہ سے گھٹتا ہے۔

تیسری وجہ یہ کہ مال حفاظت کرنے والے کا محتاج ہے۔ جبکہ علم خود آدمی کا نگہبان ہے۔ چوتھی وجہ یہ کہ جب آدمی مرتا ہے مال کو چھوڑ کر مرتا ہے۔ جبکہ علم آدمی کے ہمراہ قبر میں داخل ہوتا ہے۔ پانچویں وجہ یہ کہ مال ایک ایسی نعمت ہے جس کے شرکاء خسیس ہیں' مومن و کافر کو حاصل ہے۔ اور علم نافع حاصل نہیں ہوتا مگر باایمان شخص کو' چھٹی وجہ یہ ہے کہ آدمیوں کا کوئی گروہ ایسا نہیں جو کہ عالم کا اپنے دین کے معاملہ میں محتاج نہ ہو۔ اور کئی ایسے گروہ ہیں جو کہ مال داروں کے محتاج نہیں ہیں۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن علم پل صراط سے گزرنے کی قوت دے گا جبکہ مال کمزوری کا باعث ہوگا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سات چیزوں کیلئے فرمایا ہے کہ باہم برابر نہیں ہیں بلکہ ایک دوسری سے بہتر ہے پہلی۔ **قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لايعلمون** (الزمر آیت ۹) کیا جاننے والا اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟ دوسری چیز **قل لا يستوى الخبيث والطيب** (المائدہ آیت ۱۰۰) فرمادیجئے ناپاک اور پاک برابر نہیں ہیں۔ تیسری چیز **لا يستوى اصحاب النار واصحاب الجنة** (الحشر آیت ۲۰) جہنم والے اور جنت والے برابر نہیں ہیں۔ چوتھی' پانچویں' چھٹی اور ساتویں چیز۔ **وما يستوى الاعمى والبصير ولا الظلمات ولاالنور ولا الظل ولاالحرور وما يستوى الاحياء ولاالاموات** (فاطر آیت ۱۹ تا ۲۲) نابینا اور بینا' تاریکیاں اور نور' سایہ اور گرمی اور زندے اور مردے برابر نہیں ہیں۔ اور ان سات قسم کی چیزوں میں تفضیل کا مرجع عالم کو جاہل پر فضیلت

دینا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ جو فضیلت بھی ہے وہ عالم کو جاہل پر فضیلت دینے کی طرف لوٹتی ہے۔ اسی لئے حدیث پاک میں بار بار مختلف عبارتوں کے ساتھ عالم کو عابد پر ترجیح دی گئی ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بعض پر بعض کو فضیلت دینے کے مقام میں اسی صفت اور اس صفت کے شعبوں کو ترجیح دی ہے۔ خصوصاً انبیاء علیہم السلام میں سے سات افراد کو سات علموں سے فضیلت دینے کی صراحت فرمائی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو علم لغت کے ساتھ وعلم آدم الاسماء کلھا (البقرہ آیت ۳۱) حضرت خضر علیہ السلام کو علم فراست کہ وعلمناہ من لدنا علما۔ (الکہف آیت ۶۵) حضرت یوسف علیہ السلام کو علم تعبیر وعلمتنی من تاویل الاحادیث (یوسف آیت ۱۰۱) حضرت داؤد علیہ السلام کو علم صنعت وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم (الانبیاء آیت ۸۰)' حضرت سلیمان علیہ السلام کو جانوروں کی زبان جاننے وعلمنا منطق الطیر (النمل آیت ۱۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو علم تورات و انجیل ویعلمہ الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل (آل عمران آیت ۴۸) اور حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علم اسرار کے ساتھ وعلمك مالم تکن تعلم (النساء آیت ۱۱۳)

کہتے ہیں کہ ان سات علموں نے ان سات رسل علیہم السلام کے حق میں عجیب ثمرات ظاہر کئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے علم نے مسجود ملائکہ بنایا۔ حضرت خضر علیہ السلام کو ان کے علم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی شخصیت کی استادی کا شرف بخشا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے علم نے سرزمین مصر کی بادشاہی تک پہنچایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کے علم نے بلقیس جیسی خاتون ملک' حشم اور مال کے مرتبہ اور دولت کے ساتھ بخشی۔ (اقول باللہ التوفیق۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ نکتہ شایان شان نہیں کہ آپ کے علم نے آپ کو ایک خاتون بخشی۔ یہ اعزاز تو اس خاتون کے لئے تھا کہ جلیل المرتبت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پہنچ گئی اور دولت ایمان سے مشرف ہو کر زوجیت کی عزت پائی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے دیگر نوازشات الہیہ کافی ہیں جو کہ کتاب مجید میں مذکور ہیں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ) حضرت داؤد علیہ السلام کو ان کے علم نے ریاست و بادشاہی تک پہنچایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے علم نے والدہ محترمہ سے

تہمت زائل کرنے کا شرف عطا کیا۔ اور حضرت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے علم نے خلافت کبریٰ' شفاعت عظمیٰ سے سرفراز کیا۔

نکتۂ نفیس

اہل نکات کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو علم اسماء مخلوقات نے سے مسجود ملائکہ بنایا۔ تو اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات کو جاننا کہاں تک پہنچائے گا؟ اور حضرت خضر علیہ السلام کو علم فراست نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت کا شرف بخشا۔ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوت التسلیمات کو علم حقیقت و شریعت و طریقت اگر انبیاء علیہم السلام کی صحبت تک پہنچادے تو کیا بعید ہے فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين

حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر جاننے نے قید خانہ سے رہائی بخشی اگر امت کے مفسرین کو کتاب اللہ کی تاویل' شبہات کے قید خانہ سے اور آخرت کی جیل سے نجات بخشے تو کیا بعید ہے؟

حکایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے مضبوط وسیلے کے ذریعے ایک بادشاہ کی ملازمت حاصل کر لی اور بادشاہ سے درخواست کی کہ دوسرے خواص کے دستور کے مطابق مجھے بھی اپنے دربار کی خدمات پر مامور فرمائیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ پہلے جاؤ اور علم حاصل کرو تا کہ تو میرے لائق ہو جائے۔ وہ شخص حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا اور علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کہ علم کی لذت پائی اور بادشاہوں کی صحبت کی آفات کو جانا' بادشاہ نے اسے طلب کیا۔ اور امتحان لیا اور امتحان کے بعد کہا کہ تو میری خدمت کے قابل ہو گیا۔ علم کی طلب سے بس کر اور میری خدمت میں مصروف ہو جا۔ اس شخص نے عرض کی کہ جس وقت میں آپ کی خدمت کرنے کے قابل تھا آپ نے مجھے قبول نہیں کیا۔ اور اب جبکہ میں اللہ تعالیٰ کی خدمت کے قابل ہو گیا تو میں آپ کو قبول نہیں کرتا۔

نکتۂ زریں در فضیلت علم

کہتے ہیں کہ فضیلت علم میں یہی کافی ہے کہ سکھائے ہوئے کتے کا شکار حلال ہے۔

صرف تعلیم کی برکت سے۔ حالانکہ نجس الاصل ہے۔ کمزور چیونٹی کو اس مرتبہ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ایک علمی نکتہ کی برکت سے اس قدر پسند فرمایا کہ اس نکتے کو اس کی زبان سے اپنی کلام میں نقل فرمایا۔ اور ساری سورت کو اس چیونٹی کی طرف منسوب فرمادیا اور سورۃ النمل نام رکھا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی لشکری دیدہ ودانستہ کمزور چیونٹی پر بھی ظلم نہیں کرتے چنانچہ اس کی زبان سے نقل فرمایا لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (النمل آیت ۱۸)

اس فرقہ کی مذمت جو کہ اصحاب پیغمبر علیہ السلام کو ظالم اور غاصب کہتے ہیں

پس صحبت انبیاء علیہم السلام کی قدر کو جاننا چاہئے کہ ان کی سرسری صحبت نے جو کہ لشکریوں کو میسر تھی ان کے باطن کو روشن کرنے اور تاریکیاں دور کرنے میں ایسی تاثیر کرے کہ دیدہ دانستہ کمزور چیونٹی پر بھی ظلم نہیں کرتے۔ پس افسوس ان لوگوں کے حال پر جو کہ پیغمبر علیہ السلام کے پرانے مصاحبوں کو ظالم اور پیغمبر علیہ السلام کے خاندان کے حقوق کے غاصب گمان کرتے ہیں۔ ان بوڑھے نابالغوں کی عقل اس چیونٹی کی عقل سے بھی بدرجہا کم ہے۔ اور ان نفاق پیشہ لوگوں کا عقیدہ اپنے پیغمبر علیہ السلام کے بارے میں اس چیونٹی کے عقیدہ سے ہزاروں مرتبہ کمزور ہے جو کہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں تھا۔

علماء کرام کی فضیلت کا بیان

اور قرآنی آیات جو کہ علم اور عالموں کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں بہت زیادہ ہیں انشاء اللہ العزیز ہر ایک کی اس کے مقام میں شرح کی جائے گی (اقول وباللہ التوفیق اس سے اشارہ ملتا ہے کہ مفسر علام قدس سرہ نے پورے قرآن کریم کی تفسیر کی ہے یا اس کا عزم تھا۔ واللہ اعلم بالصواب محمد محفوظ الحق غفرلہٗ) اور جو اس مقام کے لائق ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا خوف خاص نصیب علماء قرار دیتے ہوئے فرمایا: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر آیت ۲۸) اور دوسرے مقام پر بہشت خوف کرنے والوں کا حصہ قرار دی اور فرمایا ہے ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ (البینۃ آیت ۸)۔ پس دونوں آیات کے مجموعہ سے معلوم ہوا

کہ بہشت خاص علماء کا حصہ ہے۔ اور بس۔

اور علماء کرام کو اپنے خوف کے ساتھ مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جو کسی چیز کو جانتا ہی نہیں محال ہے کہ اس سے ڈرے پھر کسی چیز کی ذات کو جاننا اس سے ڈرنے کا موجب نہیں۔ بلکہ اس کی ذات کو جاننے کے ساتھ ساتھ تین دوسری چیزوں کو بھی جاننا چاہئے تا کہ خوف اور ڈر حاصل ہو۔ ایک یہ کہ اسے قادر اور طاقتور جانے اس لئے کہ ہر بادشاہ جانتا ہے کہ میری رعایا میرے برے افعال پر مطلع ہے۔ اور ان افعال کو برا اور مبغوض بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی رعیت سے نہیں ڈرتا کیونکہ جانتا ہے کہ انہیں میرے مقابلہ اور ہٹانے کی قدرت نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ کہ اس چیز کو اپنے حال سے واقف بھی سمجھے کیونکہ جو چور کہ کسی بادشاہ کے خزانہ سے کوئی چیز چراتا ہے وہ یقین سے جانتا ہے کہ بادشاہ کو مجھے سزا دینے کی قدرت حاصل ہے۔ لیکن بادشاہ میرے حال سے واقف نہیں اسی وجہ سے وہ نہیں ڈرتا۔ تیسری چیز یہ کہ اس چیز کو حکیم بھی مانے کیونکہ مسخرے بادشاہ کی موجودگی میں برے کام کرتے ہیں۔ بادشاہ اور دوسرے بڑے امراء کو گالیاں دیتے ہیں۔ اور یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ بڑے امراء ہمارے افعال کی قباحتوں کو جانتے ہیں۔ اور روکنے اور تنبیہ کرنے پر واجبی قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن نفس کے کمینہ پن کی وجہ سے ان برے افعال اور اس گالی گلوچ سے راضی اور خوش ہیں۔ اس جہت سے وہ ان سے ڈرتے نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے ڈرنا حاصل نہیں ہوتا مگر اس وقت جبکہ جانے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا اور ہر چیز پر قادر ہے۔ اور حکیم ہے۔ سفیہ نہیں جو کہ منکرات اور قبیح افعال کو پسند فرمائے۔ حاصل کلام یہ کہ علم کی پہلی فضیلت نے جہان میں یہی ظہور کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اسی فضیلت کی وجہ سے فرشتوں کی استادی کا منصب حاصل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس استادی کا حق فرشتوں سے چاہا اور فرشتوں سے ان کی انتہائی حد تک تعظیم کرائی چنانچہ اس معنی کی شرح میں فرمایا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ان کافروں کو یاد کرائیں جو کہ اس کلام کے تتبع سے عاجز ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مطیع نہیں کرتے۔ اور خشوع وخضوع سے پیش نہیں آتے اور تکبر وعناد اختیار کرتے

ہیں وہ وقت کہ ہم نے کہا اس کے بعد کہ فرشتے اسمائے حقائق کے بیان سے عاجز ہو گئے۔ اور آدم علیہ السلام نے ان سب اسماء کو ان کے سامنے بیان کیا۔ اور ان کی خلافت جناب الٰہی سے بلا واسطہ ثابت ہوئی۔ جس طرح کہ اس قرآن کے تتبع سے کافروں کے عاجز آنے سے آپ کی نبوت اور تعلیم قرآن بلا واسطہ ثابت ہوئی۔

لِلۡمَلٰٓئِكَةِ فرشتوں کو جو کہ ملاء اعلیٰ کے ہوں یا نچلی کائنات کے کیونکہ آدم علیہ السلام کی خلافت اور آپ کی فضیلت ان سب پر ثابت ہو گئی تھی۔ پس ملائکہ کی نچلے طبقہ کے ساتھ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ اور یہ روایات کے خلاف ہے۔ چنانچہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ضمرہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے اس سے سنا جو ذکر کر رہا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے حضور سجدہ کرنے کا حکم دیا سب سے پہلے حضرت اسرافیل سجدہ میں گرے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے بدلے یہ جزا دی کہ ان کی پیشانی میں قرآن پاک لکھ دیا۔

اور ابن عساکر نے عمر بن عبدالعزیز سے روایت کی کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو سب سے پہلے جس نے سجدہ کیا وہ اسرافیل علیہ السلام تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تعمیل حکم میں اس جلدی کرنے کی جزا میں یہ مرتبہ بخشا کہ سارا قرآن پاک ان کی پیشانی میں لکھ دیا اور علاوہ ازیں قرآن مجید میں دوسری آیت فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ہے عموم و استغراق میں اس قدر صریح ہے کہ اس کی تخصیص معرفہ بنا دیتی ہے اور فی الواقع جس طرح سفلیوں کو اس خلیفہ کے وجود سے اپنے کمالات کی وسعت نصیب ہوئی علویوں کو بھی اپنے کمالات کی وسعت حاصل ہوئی۔ بعثت انبیاء علیہم السلام۔ وحی نازل کرنے' شریعتوں کو مقرر کرنے' فرعونوں اور جابروں کو سزا دینے اور ان سے دنیوی انتقام لینے کا کارخانہ' قبر سے لے کر جنت اور دوزخ تک اخروی جزا کا کارخانہ' توبہ و انابت سے لے کر فنا و بقا تک سلوک الی اللہ کا کارخانہ اور تجلیات و تدلیات اور شعائر اللہ کو قائم کرنے کا کارخانہ سب کا سب ملاء اعلیٰ والے فرشتوں کی خدمت کے ساتھ وابستہ ہے۔ تو جس طرح سفلی ملائکہ اس خلیفہ کے خادم ہیں علوی ملائکہ نے بھی

اس خلیفہ کی خدمت سے حظ وافر حاصل کیا ہے۔ اور یہ خلیفہ ان کی نسبت سے بھی تقرب الی اللہ کا قبلہ بنا اور اس نے کعبہ کا حکم پایا اس بنا پر علویوں اور سفلیوں میں سے سب فرشتے اس خطاب سے مخاطب ہوئے کہ

اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کرو اس طریقہ سے کہ اسے اپنے سجدہ کا قبلہ بنا لو۔ تاکہ اس خلیفہ کے بارے میں جو حکم دوں گا اس کی تمہاری طرف سے اطاعت کی دلیل ہو جائے۔ گویا تم اول سے ہی یہ سجدہ کر کے امر الٰہی کی اطاعت کیلئے تیار اور مستعد ہو چکے ہو گے جو کہ اس خلیفہ کی جزوی خدمات کے حق میں ہر وقت کے مطابق تفصیلی طور پر وارد ہو گا جیسے بادشاہ جب کسی کو اپنی جگہ پر ولی عہد اور خلیفہ مقرر کریں تو ارکان مملکت کو حکم دیتے ہیں کہ اسے مجرا کرکے' نذر دے کر اور دوسرے افعال و اقوال سے اس کی تعظیم بجا لائیں تا کہ تفصیلی اطاعت اور فرماں برداری پر دلیل ہو۔

لیکن اس طرح بعض مخلوقات کا بعض دوسری مخلوق قبلہ بنانا حکمت الٰہی میں دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی یہ کہ وہ قبلہ اپنا ہم جنس نہ ہو بلکہ اپنی جنس کا غیر ہو اسی لئے کہ اس صورت میں کہ قبلہ اپنا ہم جنس ہو گا شرک اور مستقل جاننے کا وہم ہو گا۔ جیسے ان صلحاء کی تصویروں کو سجدہ کرنا جو کہ آدم علیہ السلام کی جنس اور جنوں سے گزرے اور آدم اور جن اس امر میں ایک جنس ہیں۔ کیونکہ تکلیفی احکام دونوں شریک ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ یہ قبلہ بنانا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہو نہ کہ عقل کے اچھا جاننے پر کیونکہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ قرار دینا شان الٰہی کے طور طریقے پر موقوف ہے۔ اس وقت اس خاص طریقہ کے ساتھ شان الٰہی کے ظہور پر موقوف ہے۔ اور نئے نئے شیون الٰہی کا علم اس زمرے سے نہیں کہ کسی مخلوق کی عقل خود بخود اسے دریافت کر سکے۔ پس جہاں یہ دونوں شرطیں پائی جائیں اسے شرع شریف میں قبلہ توجہ بنانا جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ جیسے کعبہ معظمہ اور صخرۃ اللہ انسانوں اور جنوں کے حق میں اور جیسے حضرت آدم علیہ السلام ملائکہ کے حق میں۔

اور یہاں سے لازم نہیں آتا کہ قبلہ اس کی طرف متوجہ ہونے والے سے افضل ہو۔

کیونکہ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ کعبہ معظمہ خاتم الانبیاء علیہ السلام کی ذات پاک سے افضل نہ تھا اور اس کے باوجود آپ کا قبلہ تھا اور شاید غیر جنس کو قبلہ قرار دینے کی تخصیص قبلہ قرار دینے میں غیر جنس کی تخصیص میں یہی نکتہ ہے جنسیت کی صورت میں پوری افضلیت کا اظہار نہیں ہوتا اور افضلیت نامہ کے بغیر یہ معنی خلاف حکمت معلوم ہوتا ہے۔ اور شاید اسی نکتہ کیلئے سودی چیزوں میں جنس کے متحد ہونے کے وقت بڑھوتری حرام لکھی ہے۔ تو جنہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا قبلہ قرار دینے سے تمام فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی افضلیت کی دلیل لی ہے وہ درست راہ پر نہیں گئے۔

اور جب تمام ملائکہ علویین سفلیین سے اس خلیفہ کی اطاعت' فرمانبرداری اور اعزاز و اکرام کے ساتھ مامور ہوئے تو جنات جو کہ اس وقت فرشتوں کے حاشیہ بردار تھے خصوصاً ابلیس جو کہ کمال مخالطت کی وجہ سے فرشتوں میں شامل تھا اس حکم میں داخل ہوا۔

فَسَجَدُوْا ۔ پس سجدہ کیا تمام فرشتوں اور ان کے تابعین جنوں نے جو کہ شعور و ادراک اور سمجھ اور خطاب میں فرشتوں کا حکم رکھتے تھے۔

اِلَّا اِبْلِیْسَ مگر ابلیس جو کہ دراصل فرقہ جن سے تھا اور فرشتوں کے ساتھ کمال میل جول کی وجہ سے انہیں میں رہتا تھا۔

ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی وجہ

اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے اس کے باز رہنے کا سبب یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے معرض وجود میں آنے سے چند ہزار سال پہلے جنوں کی اولاد زمین میں متصرف تھی۔ اور وہ حیوانات اور نباتات سے اپنے حوصلہ کی استعداد کے مطابق نفع لیتے تھے۔ اور آسمان پر بھی سیر اور چکر رکھتے تھے۔ جب جنوں کے درمیان فتنہ و فساد اور خونریزی زیادہ ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے آسمان دنیا کے فرشتوں کو حکم دیا کہ جنوں کو روئے زمین سے دور کرو تا کہ زمین ان کی آلودگی سے پاک ہو۔ آسمان دنیا کے فرشتوں نے زمین پر آکر جنوں کی اولاد کا ایک حصہ قتل کر دیا۔ اور ان میں سے کچھ بھاگ کر جزیروں اور پہاڑوں میں چھپ گئے۔ ان میں سے ابلیس جو کہ اس وقت عزازیل نام رکھتا تھا اور علم کی کثرت اور

عبادت میں کوشش کی وجہ سے جنوں کی اولاد میں ممتاز تھا۔ فرشتوں کے ہمراہ آسمان دنیا پر چلا گیا۔ اور اپنا عذر بیان کیا کہ میں اس فساد اور خونریزی میں جنوں کی اولاد کے ساتھ شریک نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان دنیا کے فرشتوں کی سفارش کی وجہ سے نکالنے اور دھتکارنے سے محفوظ رکھا۔ اس نے اس طمع سے کہ جن کی ساری اولاد کی جگہ ساری زمین میں تصرف کروں عبادت کرنے میں زیادہ کوشش شروع کر دی۔

اور جب بھی آسمان دنیا کے فرشتوں کو دربار خداوندی سے کوئی حکم پہنچتا تھا کہ فلاں مہم اس اس طرح کوشش کرو۔ یہ لعین سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اس مہم میں دوڑتا تھا اور سرانجام دیتا حتیٰ کہ اسے آسمان دنیا کے فرشتوں میں ایک قدر اور عزت مل گئی۔ اور یہ اپنے دل میں خلافت کی توقع رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ فرشتوں کو حکم الٰہی انی جاعل فی الارض خلیفة اس وقت اسے پتہ چلا کہ یہ منصب مجھے نہیں دیں گے۔ اور یہ رب تعالیٰ کی ساری عبادت اور طاعت ضائع ہو جائے گی اس وجہ سے اس کی رگ حسد پھڑکی اور اس کے رشک کی دیگ نے جوش مارا۔ وہ اس خلیفہ کی قدر کو توڑنے کی فکر میں رہتا تھا۔ جب اس نے سجدہ کا حکم سنا تو بے پردہ مخالفت کی یہاں تک کہ:

اَبٰی اس نے انکار کیا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے اور یہ وجہ حکمت طلب کرنے اور رشد و ہدایت طلب کرنے کیلئے نہ تھا بلکہ اس نے اپنے آپ کو حضرت آدم علیہ السلام سے بہتر جانا۔

وَاسْتَکْبَرَ اور اس نے تکبر کیا کہ میرے جیسے کو جو کہ آگ کے چمکتے جوہر سے پیدا ہوا اور کئی صدیوں سے عبادت و طاعت میں معروف رہا اور مہموں کو نمٹانے اور احکام الٰہی کو نافذ کرنے میں بہترین کوششیں کیں۔ حکم فرمائیں کہ ایک مخلوق کو جس کے جسم کو میرے سامنے سیاہ مٹی سے بنایا ہو۔ ابھی کسی موزوں کام اور تردد کا مصدر نہ ہوا ہو۔ اور اس کے جوہر بندگی کی اچھائی ابھی تک امتحان کی کسوٹی پر نہ پہنچی۔ سجدہ کروں اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگ جاؤں۔ جو کہ صریح طور پر خلاف حکمت' ناقدری اور میری خدمت کے حق کو ضائع کرنا ہے۔ اور اس تکبر نے چلتے چلتے اس حد تک پہنچا دیا کہ حکم الٰہی کو خلاف حکمت کہنے لگا اور

اس کام کی اچھائی کا انکار کیا۔

وَ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ اور کافروں سے ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے امر قطعی کی تعمیل کے برحق ہونے کا انکار کیا۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے قطعی اوامر میں سے کسی امر کی تعمیل کے واجب ہونے کا انکار کرے کافر ہے۔ جیسے وجوب نماز اور زکوٰۃ اور ان کی مانند احکام کا انکار۔ پس اس قرآن پاک کے منکروں کو سمجھاؤ کہ جب احکام الٰہی میں سے ایک قطعی حکم کا انکار اس کفر اور ملعونیت کا موجب ہوا تو تم جو قرآن پاک کے تمام واجبات کا انکار کرتے ہو باوجودیکہ قرآن پاک کے مقابلہ سے اپنی عاجزی کی وجہ سے تم نے یقینی اور قطعی طور پر جان لیا ہے کہ یہ قرآن کلام الٰہی ہے کفر اور ملعونیت کی کس حد تک پہنچو گے۔

تفسیری متعلقات

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں جو کہ اس مقام کی تفسیر کے متعلقات میں سے ہیں۔

پہلی بحث یہ ہے کہ ان آیات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، تعلیم اسماء اور ان اسماء کے بیان سے فرشتوں کے عجز کے اظہار کے بعد ہوا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں دوسری آیات سے جو کہ دوسری سورتوں میں واقع ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کو حکم ہوا تھا فاذا سويته ونفخت فيه من روحي فقعوا له ساجدين (الحجر آیت ۱۹) جب میں اسے درست کر کے بنالوں اور اس میں اپنی طرف سے روح ڈال دوں تو اس کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ۔ نیز ان آیات کو دوسری آیات کے ساتھ وقوع سجدہ کے وقت میں بھی اختلاف ہے۔ کیونکہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف روح پھونکنے کے ساتھ ہی فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے حضور سجدہ کا حکم تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی حکم ہوا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی پیدائش کے بعد سجدہ کریں لیکن سجدہ کی ادائیگی کا وجوب دوسرے حکم سے ثابت ہوا۔ جیسا کہ نو آموز بچے کو نماز کا وقت ہونے سے پہلے کہتے ہیں کہ جب سورج ڈھل جائے تو وضو کر اور نماز پڑھ اور سورج ڈھلنے کے بعد پھر سے پابند کریں کہ اب نماز کا وقت ہو گیا ہے وضو کر اور نماز ادا کر۔

رہا دوسرا تعارض۔ پس اس کا دفعیہ یہ ہے کہ روح پھونکنے سے مراد اس پھونکنے کے آثار کا فرشتوں کی عقلوں میں ظاہر ہونا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی روح خاص جو کہ اللہ تعالیٰ کے شیون کثیرہ کی جامع ہو سکتی تھی اور اسی روح کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت کی اہلیت نصیب ہوئی کا اثر اس وقت حاصل ہوا جبکہ اس کی تعلیم اسماء ملاحظہ کی۔ اور اپنے اندر یہ جامعیت اور وسعت نہ پائی۔ اور اس کے باوجود اس مقام کی آیات میں کوئی تصریح نہیں ہے کہ سجدہ کرنے کا واقعہ، تعلیم اسماء اور فرشتوں کے عاجز کرنے کے واقعہ کے بعد ہوا ہو۔ ہاں حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت سے متعلق واقعات کے بیان کی ترتیب اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اور احتمال ہے کہ پہلے واقعہ کو ترتیب بیانی میں بعد میں لایا گیا ہو۔

دوسری بحث یہ ہے کہ سجدہ کی حقیقت پیشانی کو زمین پر پہنچانا ہے۔ اور یہ معنی شرع میں غیر خدا کیلئے جائز نہیں ہے۔ اور یہاں فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کیلئے اس فعل کی ادائیگی کا حکم دیا گیا۔ اس امر کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیشانی زمین تک پہنچانا دو طریقوں سے واقع ہوتا ہے ایک یہ کہ معبودیت کا حق ادا کرنے کیلئے ہو۔ اور یہ قسم تمام دینوں اور تمام ملتوں میں غیر خدا کیلئے حرام اور ممنوع ہے۔ اور کبھی بھی جائز نہ ہوا کیونکہ یہ محرمات عقلی میں سے ہے۔ اور محرمات عقلی دینوں اور ملتوں کے بدلنے سے نہیں بدلتے اور اس کی دلیل یہ ہے اس قسم کی تعظیم انتہائی عاجزی کا پتہ دینے والی ہے۔ اور انتہائی عاجزی اس کے حضور کیلئے لائق ہے جو انتہائے عظمت میں ہو۔ اور انتہائی عظمت یہ ہے کہ ذاتی ہو۔ اور عظمت ذاتی حضرت حق کیلئے خاص ہے۔ اور کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔

دوسرا یہ کہ عزت کرنے اور سلام کرنے کیلئے ہو جیسے سلام اور سر جھکانا۔ اور یہ معنی رسوم وعادات کے اختلاف اور زمانوں اور اوقات کے بدلنے کی وجہ سے مختلف ہے۔ کبھی جائز ہوا ہے کبھی حرام۔ یہ پہلی امتوں میں جائز تھا۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے واقعہ میں ہوا کہ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (یوسف آیت ۱۰۰) اور ہماری شریعت میں یہ طریقہ بھی مخلوقات کے درمیان حرام اور ممنوع ہے ان متواتر احادیث کی دلیل سے جو کہ اس باب میں وارد ہیں۔ اور فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ اسی طریقے سے تھا اس

لئے کہ تعلیم اسماء کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر ایک احسان اور برتری حاصل ہو گئی تھی اور فرشتوں سے آدم علیہ السلام کے متعلق ان کی پیدائش سے پہلے ایک خلاف ادب بات ہو گئی تھی اس احسان کا بدلہ چکانے اور اس بے ادبی کا کفارہ ادا کرنے کیلئے نہیں اس قسم کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا گیا۔

ابلیس فرشتوں میں سے نہیں

تیسری بحث یہ ہے کہ بعض ظاہر بین مفسرین نے ابلیس کو فرشتوں میں سے شمار کیا ہے۔ اس دلیل سے کہ اگر فرشتوں میں سے نہ ہوتا تو حکم سجدہ اسے شامل نہ ہوتا۔ اور سجدہ ترک کرنے میں اس پر کوئی ملامت اور عتاب متوجہ نہ ہوتا۔ اس لئے کہ حکم سجدہ فرشتوں کے ساتھ خاص تھا۔ نیز فرشتوں سے اس کی استثناء جو کہ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ میں وارد ہے متصل نہ ہوتی کیونکہ غیر جنس کی استثناء متصل نہیں ہوتی۔ اور استثناء میں اصل اتصال ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ابلیس فرشتہ نہ تھا۔ جیسا کہ تفسیر میں گزرا۔ اور سورت کہف میں اس کے متعلق صراحت ہے کان من الجن (الکہف آیت ۵۰) اور سورت سبا میں بھی صریح کے قریب ہے یوم نحشرهم جميعا ثم نقول للملائكة اهولاء اياكم كانوا يعبدون قالوا سبحانك انت ولينا من دونهم بل كانوا يعبدون الجن ۔(الکہف آیت ۵۰) نیز قرآن مجید میں ابلیس کیلئے اولاد ثابت کی ہے۔ افتتخذونه وذريته اوحياء من دوني حالانکہ فرشتوں کی اولاد نہیں ہے۔ کیونکہ ذرّیت اولاد ہے۔ اور اولاد میاں بیوی سے ہوتی ہے۔ اور فرشتوں میں مادہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر انکار فرمایا ہے وجعلوا الملائكة الذين هم عباد الرحمٰن اناثا (الزخرف ۱۹)۔ نیز جگہ جگہ فرشتوں کو عصمت اور طہارت کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ اور ابلیس کا حال سراسر ان دونوں صفتوں کے خلاف ہے۔

اور وہ جو کہتے ہیں کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کے ساتھ خاص تھا۔ پس صحیح ہے۔ لیکن اصالتاً فرشتوں کے ساتھ خاص تھا اور جن خصوصیت سے ابلیس تابع ہو کر اس حکم میں داخل تھا۔ جیسا کہ بادشاہ اپنے لشکریوں کو کوئی حکم دیتے ہیں۔ اور یہ حکم لشکر کے شتربانوں، سائیسوں،

فراشوں اور شہدوں کو شامل ہوتا ہے۔ اور اسی تبعیت کی بنا پر فرشتوں سے ابلیس کی استثناء بطریق اتصال صحیح ہوتی ہے۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس واقعہ سے دلیل لی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام فرشتوں سے خواہ وہ عالم بالا کے ہوں خواہ زمین کے ہوں افضل ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکام دینا اس کے بغیر کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ان پر کوئی فضیلت ہو حکمت کے خلاف ہے۔ لیکن یہ استدلال اس وقت صحیح ہوتا ہے۔ جبکہ سجدہ حقیقتاً آدم علیہ السلام کی طرف ہو۔ اور اگر آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کی غرض انہیں قبلہ بنانا ہو تو یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قبلہ کیلئے لازم نہیں ہے کہ وہ اس کی طرف منہ کرنے والے سے افضل ہو ورنہ کعبہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوگا۔ اور وہ اجماع کے خلاف ہے۔

پانچویں بحث: اس واقعہ میں سجدے کی فضیلت پر واضح دلیل ہے۔ اور اس پر کہ تمام افعال میں سے جو کہ تعظیم کیلئے بنائے گئے ہیں سجدے کی شان عمدہ ہے۔ کیونکہ بندے کیلئے جو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس کو چھوڑنے کی وجہ سے ابلیس کو اس برے حال تک پہنچایا گیا کہ ابدی لعنت کا مستحق ہوا۔ تو بے شمار سجدوں کا ترک کرنا جو کہ اس نے اپنے لئے طلب کئے ہیں کس حد تک پہنچائے گا۔

اور روایات میں آیا ہے کہ جب دوزخ کو قیامت کے میدان میں حاضر کریں گے۔ اور اس کی آگ شعلہ مارے گی تو اس پر ہول وقت میں مسلمان اور کافر مخلص اور منافق کے درمیان تمیز کرنے کیلئے سجدے کا حکم ہوگا۔ مخلص مسلمانوں کو سجدہ میسر آئے گا اور کافر اور منافق جب چاہیں گے کہ سجدہ کریں تو ان کی پشت لوہے کی طرح سخت ہو جائے گی۔ اور خطاب پہنچے گا کہ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (یٰس) ۔ پس معلوم ہوا کہ یہی سجدہ ہے۔ جسے دوست اور دشمن کافر و مومن کے امتحان کیلئے مقرر کیا گیا۔ ابتداء میں بھی اسی سے امتحان فرمایا۔ اور آخر میں بھی اسی کے ساتھ امتحان کریں گے۔ اور حدیث شریف میں وارد ہے جب مسلمان اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ میں جاتا ہے۔ تو شیطان اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہے۔ اور

واویلا کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اس آدمی کو اللہ نے سجدے کا حکم دیا وہ بجالایا۔ پس اس کیلئے بہشت ہوئی۔ اور مجھے سجدہ کا حکم فرمایا۔ اور میں نے انکار کیا۔ پس آگ میرا نصیب ہوگئی۔

اور یہیں سے معلوم ہوا کہ اللہ کے غیر کو سجدہ کرنے کو کفر کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ آدم زاد کو اسی لئے شرافت ہے کہ آدم کا بیٹا ہے۔ اور آدم علیہ السلام کو یہی شرافت ملی کہ ان کو سجدہ ترک کر کے شیطان ملعون ہوا۔ گر یہ ناخلف بیٹا دوسرے کیلئے بجا لائے تو اپنے باپ کی شرافت کو برباد کردے گا۔

ابلیس کا موسیٰ علیہ السلام کے پاس آنا

ابن ابی الدنیا نے مکائد الشیطان میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ ایک دن شیطان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا اور کہنے لگا کہ اے موسیٰ علیہ السلام آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے ساتھ چنا اور آپ سے ہمکلامی کی۔ اور میں گناہگار ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ توبہ کروں میری سفارش کیجئے تا کہ حق تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں دربار الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ تیری توبہ کو قبول فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا میں مشغول ہوئے۔ بارگاہ خداوندی سے فرمان پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ کو آپ کی سفارش کی وجہ سے قبول فرمایا۔ آپ اس سے کہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر کی طرف سجدہ کرے تا کہ اس کی تقصیر کو معاف کردوں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ماجرا ابلیس سے کہا۔ ابلیس نے کہا کہ میں نے ان کو زندہ ہونے کی صورت میں سجدہ نہیں کیا ان کے فوت ہونے کے بعد کیوں سجدہ کروں۔ پھر ابلیس نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ آپ کا مجھ پر ایک حق ثابت ہوگیا کہ آپ نے میری سفارش کی۔ میں آپ کو فائدہ دیتا ہوں۔ اپنی امت کو فرمائیں کہ مجھ سے تین حالتوں میں خبردار رہیں کہ میں ان ہی تین حالتوں میں بنی آدم کو خراب کرتا ہوں۔ اول غضب کی حالت میں کہ میں اس حالت میں خون کی جگہ دوڑتا ہوں۔ اور آدمی کی آنکھ کان زبان ہاتھ اور پاؤں کو اس کے قبضہ و اختیار سے کھینچ لیتا ہوں۔ اور جو چاہوں کراتا ہوں۔ دوسرے حالت جنگ و قتال میں کہ اس وقت گھر بیوی اور اولاد کا خیال اس کے دل میں گزارتا ہوں۔ اور اسے ان خیالات کے

ساتھ میدان جنگ سے بھگاتا ہوں۔ تیسری غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت کی حالت میں کہ میں کنگھی کرنے اور دلالی کرنے میں جادو چلاتا ہوں۔ اور دونوں کے دل میں دھو کے کے فنون کے ساتھ نافرمانی کا قصد ڈالتا ہوں۔

ابن المنذرؒ عبادہ بن ابی امیہ سے روایت کرتے ہیں کہ پہلا گناہ جو جہاں میں ہوا حسد تھا۔ ابلیس کو حضرت آدم علیہ السلام کے حسد نے یہاں تک پہنچا دیا کہ اس نے فرمان الٰہی کی مخالفت کی۔ اور ملعون ہوا۔ حاصل کلام یہ کہ اس واقعہ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اس زمین میں اکیلے پھرتے تھے۔ ادھر جانور کو اپنی جنس کا غیر دیکھتے تھے۔ اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

حضرت حواء رضی اللہ عنہ کی پیدائش کا بیان

اور اپنے دل میں آرزو کرتے تھے کہ کوئی شخص میری جنس سے پیدا ہو کہ اس کی صحبت سے انس حاصل کروں۔ حق تعالیٰ نے ان کی اس خواہش پر رحمت فرمائی۔ اور جمعہ کے دن ان کی خواب کی حالت میں فرشتوں سے فرمایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان کے بائیں پہلو کو چاک کیا۔ اور وہاں سے ایک خوبصورت عورت نکالی کہ ایک لحہ میں اس کا قد وقامت درست ہو گیا پھر آپ کے چاک شدہ پہلو کو جوڑ دیا گیا۔ اور اس دوران حضرت آدم علیہ السلام کو کوئی تکلیف اور درد محسوس نہیں ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام جب خواب سے بیدار ہوئے دیکھا کہ میری جنس سے ایک دوسرا شخص میرے پہلو میں بیٹھا ہے۔ پوچھا کہ تو کون ہے؟ فرمان پہنچا کہ یہ ہماری کنیز ہے جس کا نام حوا ہے آپ کو مانوس کرنے کیلئے ہم نے اسے پیدا کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے چاہا کہ اس تک ہاتھ پہنچائیں حکم پہنچا کہ اسے ہاتھ نہ لگائیں تاوقتیکہ اس کا مہر ادا نہ کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ اس کا مہر کیا ہے حکم ہوا کہ اس کا مہر یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل پر دس بار درود بھیجیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں حکم ہوا آپ کی اولاد سے پیغمبروں کے خاتم ہیں۔ اور اگر اس کی پیدائش منظور نہ ہوتی تو میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے دس مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر

درود شریف بھیجا، فرشتے گواہ ہوئے۔ اور ان دونوں کے درمیان عقد نکاح منعقد ہوا۔ اس کے بعد اس جمعہ کے دن کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اور حضرت حواء کو قسم قسم کے زیور اور زینت کے ساتھ سونے کے بازوبند، کمر بند، پازیب اور یاقوت و مروارید سے جڑاؤ کیے ہوئے دستانے اور دیگر زینتوں سے سجا سنوار کر سونے کے تخت پر بٹھا کر بادشاہوں کی طرح ان کو بہشت میں داخل کریں۔

وَقُلْنَا يَاآدَمُ اور ہم نے فرمایا اے آدم! اگرچہ ہم نے تجھے زمین کی خلافت اور اس کی عمارت کیلئے پیدا کیا ہے مگر تجھے خلافت کا ڈھنگ اور اس کی عمارت کا طریقہ معلوم نہیں ہوسکتا مگر اس وقت جبکہ تو کچھ مدت جنت میں سکونت اختیار کرے۔ اور بہشت کے حقائق کو ملاحظہ کرے۔ تاکہ تو ان حقائق کے نمونوں کو زمین میں اپنی صنعت کے ساتھ درست کرے۔ نیز زمین کی عمارت موقوف ہے بعض بیج اور بعض آلات کے لانے پر جو کہ بہشت میں موجود ہیں۔ اور دوسری جگہ نہیں پائے جاتے۔ پس تجھے چاہئے کہ اس باغبان کی طرح جسے فارغ پڑی ہوئی زمین میں کاشتکاری، یا کسی میدان میں باغ لگانے کیلئے مقرر کریں جب تک وہ باغبان میوہ پیدا کرنے والے علاقے کی سیر نہ کرے۔ اور باغ لگانے، کاشتکاری کرنے، کھالے اور چھوٹی نہریں نکالنے اور درختوں کی پیوندکاری کو نہ دیکھے اس سے وہ سرانجام دینا ممکن نہ ہوگا۔ یا اس انجینئر کی طرح جسے مالک کسی جگہ قلعہ اور حویلی تعمیر کا حکم دے جب تک وہ انجینئر اپنے مالک کے آباد قلعوں اور محلات کو ملاحظہ نہیں کرتا تب تک اس سے قلعہ بنانا اور برج اور فصیل کو اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ پس تو جنت کی آبادی کا قصد کر اور صرف سیر اور چکر لگانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ کچھ وقت کیلئے ٹھہرنے اور وطن اختیار کرنے کے طریقے سے۔

اسْكُنْ أَنْتَ سکونت اختیار کر اس جگہ تاکہ عمارت بنانے کی کیفیت، باغ و بوستان اور کاشتکاری کا کام سرانجام دینے اور نہروں اور کھالوں میں پانی جاری کرنا ملاحظہ کرے۔ اور اسی کے مطابق زمین کی تعمیر میں کام کرے۔ اور یہ کام صرف تجھ سے ہی سرانجام نہیں ہوگا بلکہ

وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ اور آپ کی بیوی بھی بہشت میں سکونت اختیار کرے۔ دو جہت کیلئے، ایک یہ کہ زمین کی تعمیر میں جو چیز عورتوں کے ذمہ ہے ان کی آرائش اور زیب و زینت اور زیورات اور پوشاک کے استعمال کا طریقہ جنتی چیزوں کو دیکھ کر سیکھے اور اسی کے مطابق

زمین میں عمل کرے۔ اور مردانہ اور زمانہ دونوں طرح کی تعمیر ہو جائے اگر تیری بیوی ان چیزوں کو نہ جانے تو تمام زمین ایک گھر کی مانند ہوگی جس کی کوئی مالک نہ ہو یا بے عقل مالک ہو اس لئے کہ عورتوں سے متعلق کام مردوں سے سرانجام نہیں دیئے جا سکتے۔

دوسرے یہ کہ اگر تیری بیوی بہشت میں تیرے ہمراہ نہ ہوگی تو تیرا دل اسی کی طرف متعلق رہے گا اور تجھے بہشت میں پوری طرح قرار حاصل نہیں ہوگا کیونکہ آدمی اسی مکان کو وطن سمجھتا ہے جس میں بیوی بچے ہوں۔ اور پوری طرح قرار اور جگہ پکڑے بغیر اس عالم کے حقائق کی دریافت تم سے ممکن نہ ہوگی۔ اور تم ہر دو کو چاہئے کہ جنت کی سکونت میں اس جگہ کے پھلوں کو صرف دیکھنے پر ہی اکتفانہ کریں کیونکہ ماکولات اور مشروبات کی حقیقت کھائے پیئے بغیر اور ذائقہ، بو، خواص، نفع و نقصان کی دریافت تجربہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی بلکہ چاہئے کہ تم اس جگہ کے پھلوں میں تصرف کرو تا کہ ان کی کیفیتوں کو یاد رکھو۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا اور اس بہشت سے خوب کھاؤ وسعت کے ساتھ۔ اس لئے کہ ماکولات اور مشروبات کو صرف چکھنے سے اور ان سے سیر ہوئے بغیر۔ جیسا کہ چاہئے خواص اور نفع و نقصان کا پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ جنت کا ہر طبقہ آپ وہوا جدا جدا رکھتا ہے۔ اور ہر طبقہ کی عمارتیں، منزلیں، محلات اور نہریں مختلف رنگ ظاہر کرتی ہیں۔ پس تم دونوں کو چاہئے کہ ایک طبقہ کی سکونت اور اس کے ایک قطعہ کے پھل کھانے پر اکتفانہ کرو بلکہ

حَيْثُ شِئْتُمَا جہاں تم دونوں چاہو سکونت اختیار کرو اور اس کے پھلوں میں تصرف کرو تا کہ بہشت کے تمام طبقات اپنے تمام مشمولات سمیت تمہارے خیال میں محفوظ رہیں۔ اور جب زمین میں آگیں تو اپنے ذہنی محفوظ کے نمونہ کو ظاہر کرو اور خلافت داخلی و خارجی، مدنی و منزلی مرد اور عورت کے اجتماعی مشورہ سے صورت پذیر ہو لیکن تمہیں اس وسعت اور عام اجازت کے باوجود ذمہ داری قبول کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منع کی گئی چیزوں سے پرہیز کرنے کی ورزش کیلئے جو کہ تمہاری جبلت کے جوہر میں ودیعت ہے۔ اور زمین میں تمہاری خلافت کے اثر کے ظاہر ہونے کے وقت جلوہ گر ہوگی جنت کی بعض چیزوں سے منع کرنا بھی ضروری ہے۔ تا کہ عام اجازت کی وجہ سے عادت نہ بن جائے۔ اور نفس کی لذیذ اور طبیعت کی مرغوب چیزوں سے پرہیز تم پر مشکل نہ ہو۔ اور وہ چیز جس سے

روکا جائے چاہئے کہ ایسی جنس سے ہو کہ اس میں عقلی اور طبعی طور پر کوئی قباحت نہ ہو ورنہ ان عقلی اور طبعی قبائح سے بچنا تو جبلت انسانی کا تقاضا ہے اس میں شریعت کے احکام کی اطاعت معلوم نہیں ہوتی اس بنا پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جنت کے بے شمار درختوں میں سے اس درخت کو اپنے اوپر حرام سمجھو اور اس درخت سے نقصان کی وجہ کی تحقیق کئے بغیر اس سے پرہیز لازم شمار کرو۔

وَلَا تَقْرَبَا اور نزدیک نہ ہونا چہ جائیکہ اس سے کوئی چیز پکڑ کر کھاؤ۔

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ اس درخت کے۔ اور جنت کے درختوں میں سے ایک درخت کی طرف اشارہ فرمایا۔ اور اس درخت کا تعین ضروری نہیں ہے کہ گندم تھا۔ جیسا کہ اکثر روایات میں ہے۔ اور ابن عباس اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ اور وہب ابن منبہ نے یوں کہا ہے کہ اس گندم کا ہر دانہ جنت میں بیل کے گردے کے برابر تھا۔ مکھن سے زیادہ نرم اور شہد سے زیادہ میٹھا یا انگور کا پودا تھا۔ جیسا کہ ابن مسعود اور جعد ابن ہبیرہ سے منقول ہے۔ اور کہتے ہیں یہی درخت ہے جس کے پھل سے قوی منشیات بناتے ہیں۔ اور دنیا میں فتنہ وفساد کا باعث بنتا ہے۔ اور بے عقلی، بے حیائی اور ستر کھلنے کا موجب ہوتا ہے یا انجیر تھا۔ جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے یا لیموں تھا۔ جیسا کہ ابوالشیخ نے یزید بن عبداللہ بن قسیط سے روایت کی یا ایک ایسا درخت تھا کہ جو بھی اس سے کھائے اسے پاخانے کی حاجت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابوالعالیہ سے روایت کی ہے۔

اور اسی طرح اس درخت کے حرام کرنے کی حکمت کی وجہ کا سوال کرنا بے فائدہ بلکہ مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہے۔ کیونکہ اس حرام کرنے سے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ کی ورزش پیش نظر تھی تاکہ مکلف کئے جانے اور پسندیدہ اور مرغوب چیزوں کو کہ جن کی عقلی اور طبعی طور پر مضر ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو حرام قرار دینے کے وقت لیت ولعل اور توقف نہ کریں۔ اور اس غرض کے حصول میں اگر اس کی حرمت کی وجہ عقلی یا طبعی ان پر یا ان کی اولاد پر ظاہر ہو تو مضر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا حسن وقبح شرعی کی اطاعت کرنا بغیر اس کے کہ عقلی یا طبعی حسن اور قبح اس کے ساتھ ملا ہوا ہو اس صورت میں ظاہر نہیں ہوتا اور اسی لئے اس درخت کے پھل کو کھانے کی جزا کے دوران کسی عقلی اور طبعی ضرر کو بیان نہیں فرمایا ہے۔

بلکہ یہی ارشاد ہوا کہ اگر تم اس درخت کے قریب گئے یا اس میں سے کوئی چیز کھائی تو تمہاری طرف سے میرے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔

فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ تو تم ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ کیونکہ ظلم حق تلفی کا نام ہے۔ اور مالک کا حق یہ ہے کہ مملوک اس کے کہے سے بال برابر بھی آگے نہ جائے۔ اور وہ مالک جو تمہیں اس طرح عدم کے پردے سے وجود میں لایا پھر تمہیں ہر چیز کے اسماء کی تعلیم فرمائی اور اپنی بہترین مخلوق پر جو کہ فرشتے میں اس قدر ترجیح دی کہ ان کی عبادت کا قبلہ بنا دیا پھر زمین کی خلافت کے آئین کی تعلیم دینے کیلئے تمہیں اپنے حرم خاص بہشت میں مطلق العنان کیا۔ اور اگر ایک قسم کے درخت سے منع فرمائے۔ اور تم نے اس سے پرہیز نہ کی۔ اور اس کے حکم کے خلاف کھایا تو تم نے اس کے حقوق کو کس قدر ضائع کیا ہوگا۔

جب شیطان نے معلوم کیا کہ اس وقت تک انہیں کسی قسم کی ناگوار تکلیف نہیں دی گئی ہے۔ اور ہر طرف سے چھٹی اور اجازت فرمائی میرا مکر نہیں چل سکا۔ کیونکہ نافرمانی کا صادر کرنا اور پھسلنا تنگی اور احتیاج کے وقت ہوتا ہے۔ اور انہیں کسی چیز سے روکا نہیں گیا اب جبکہ انہیں اتنی سی تنگی پیش آئی کہ جنت کی بعض چیزوں سے روک دیئے گئے۔ میرے قابو میں گئے تو اس نے انہیں اغوا کرنے کی فکر شروع کی۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا کہ آپ کچھ جانتے ہیں کہ آپ کے کام کا انجام کیا ہے؟ اس تکریم و تعظیم سے دھوکا نہ کھائیں آخر آپ کے کام کا انجام موت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا موت کیا ہے؟ شیطان نے اپنے آپ کو مردہ جانور کی شکل میں ان کے سامنے ڈال دیا اور تنگی نزع، روح کا نکلنا اور نزع کے وقت ہاتھ پاؤں مارنا انہیں دکھایا۔ صرف اس حال کو دیکھ کر ان پر خوف اور ڈر غالب ہوا پوچھا کہ تدبیر کیا ہے۔ تا کہ ہم اس حالت سے محفوظ رہیں۔ شیطان نے کہا هل اُدُلُّكَ علی شجرة الخلد وملك لا یبلی (طٰہٰ آیت ۱۲۰) کیا میں آپ کو ہمیشگی کے درخت اور نہ ختم ہونے والی بادشاہی پر دلالت نہ کروں۔ یعنی میں آپ کو ایک درخت کا نشان دیتا ہوں کہ جس نے اس سے کچھ کھا لیا وہ نہیں مرے گا اور اس کی بادشاہی فنا نہیں ہوگی۔ آپ نے پوچھا وہ درخت کونسا ہے اس نے اسی درخت کی طرف اشارہ کیا جس سے آپ کو روکا گیا تھا اور کہا کہ یہی درخت ہے۔

آپ نے کہا کہ یہ درخت فنا کا درخت ہے ہمیشگی کا درخت نہیں ہے۔ اور ملک کے زوال کا سبب ہے۔ سبب دوام نہیں ہے۔ بلکہ رسوائی اور دربار خداوندی سے دوری کا سبب ہے۔ اور قرب وعزت کا سبب نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس درخت کے نزدیک جانے سے منع فرمایا ہے اگر اس درخت میں یہ فائدے تھے تو ہمیں اس کے قریب جانے سے کیوں منع فرمایا۔ وہ تو ارحم الراحمین ہے۔ شیطان نے کہا مانھکما ربکما عن هذه الشجرة الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخالدین (الاعراف آیت ۲۰) اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت سے اس لئے منع نہیں فرمایا کہ اس کا پھل کھانے سے آپ کو نقصان پہنچے گا بلکہ اس لئے منع فرمایا کہ آپ اسے کھا کر فرشتوں کی طرح ہو جائیں گے جو کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اور کھانے پینے اور اہل وعیال کی فکر میں نہیں رہتے اور جب آپ کو حالت ملکیت مل جائے گی تو آپ روئے زمین کی خلافت کا قیام نہیں کر سکیں گے لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ آپ کو کھانے پینے اور اہل وعیال کے فکر میں مصروف رکھے۔ اور کچھ وقت آپ کو اپنی یاد سے غافل کردے تاکہ آپ کے ذریعے سے خلافت کا کام سرانجام دے۔ پس حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ آپ اس سے دور رہیں۔ اور اس درخت کا میوہ کھانا قرب واتصال کا سبب ہے۔ پس یہ منع فرمانا اس کی مانند ہے کہ بادشاہ کسی کو کسی مہم کی تدبیر کیلئے دور بھیجتے ہیں تو دربار کی خدمتوں کا حکم نہیں دیتے۔ یا اس لئے ہے کہ آپ اس درخت کا میوہ کھانے کی وجہ سے بہشت سے نکالے جانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اور بہشت میں موت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ آپ جنت کی سکونت سے خلافت کا طریقہ اور آئین یاد کر کے دنیا میں جائیں۔ اور وہاں آپ کو موت لاحق ہوتا کہ آپ کی نسل صدیوں تک روئے زمین کی خلافت برپا رکھے۔ اور رہائش کا یہ قرب جو اللہ تعالیٰ کے دربار کے ساتھ آپ کو حاصل ہے فوت ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ نہی الٰہی تنزیہی اور ارشادی ہے اس نہی کی تعمیل سے ملنے والے مرتبہ سے زیادہ بلند مرتبہ حاصل کرنے کیلئے اس کی مخالفت کا کوئی ڈر نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو اس کی فریب والی گفتگو سن کر تردد لاحق ہوا اور اس وقت شیطان نے تاکیدی قسمیں کھائیں کہ میں صرف آپ کی خیر خواہی کا ارادہ رکھتا ہوں

کیونکہ میری طرف سے آپ کے حق میں بے ادبی واقع ہوئی کہ میں نے سجدہ نہ کیا۔ اور اس کی وجہ سے ملعون ہوا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس بے ادبی کی آلائش کو اپنے سے دھوڈالوں اور آپ کو ایسے مرتبہ پر پہنچاؤں کہ عمر بھر آپ میرا شکریہ ادا کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں یہ بات آئی کہ مخلوق میں سے کسی کو یہ طاقت نہیں کہ اپنے خالق کی قسم اس تاکید سے کھائے بے شک اس نے سچ کہا ہوگا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا۔ پس ان دونوں کو شیطان نے اس درخت کی پرہیز سے لغزش دی۔ اس طرح کہ پہلے مور کے پاس گیا۔ اور اسے کہا کہ بہشت میں جا کر آدم وحوا کے سامنے جا کر اپنے آپ کو سجائے۔ اور ان کے سامنے رقص کرے۔ اور جب دونوں اس کے تماشا سے فریفتہ ہو جائیں۔ اور آہستہ آہستہ پھر کر اپنے آپ کو جنت کی دیوار تک پہنچائے اور جب دونوں دیوار کے قریب آئے تو ایک سانپ کے پاس جا کر اس کے منہ میں بیٹھ کر اس سانپ سے کہا کہ مجھے دیوار کے اوپر پہنچا دے۔ اور دیوار کے اوپر حضرت آدم علیہ السلام اور حوا سے ملاقات کر کے ممنوع درخت کھانے کی ترغیب کا وسوسہ شروع کیا۔ اور اتنا تکلف اس لئے کیا کہ اسے سجدہ آدم سے انکار کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکال دیا تھا اور بہشت کے دربان اسے اندر نہیں آنے دیتے تھے اس تدبیر کے ساتھ اس نے چاہا کہ حضرت آدم وحوا کو بھی اس جگہ سے نکال دے۔

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۔ پس اس نے ان دونوں کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے کہ نفیس میوے چکھتے تھے۔ اور صاف ہوا کے ساتھ مرغوب لذتیں، باغات کے سائے، جاری نہریں اور دوسری قسم قسم کی نعمتیں انہیں میسر تھیں۔

اور حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کے بہشت سے نکالنے کی کیفیت، ان کا ممنوعہ درخت سے کھانا، بہشتی لباس سے محروم ہونا، اپنی ستر پوشی کیلئے ان کو حیرانی اور سرگردانی اور ستر پوشی کیلئے درختوں سے پتے طلب کرنا قرآن مجید کی دوسری سورتوں لکھا ہوا ہے اس سورت میں معصیت کی نحوست کے اظہار کیلئے اسی قدر پر اکتفا فرمایا کہ

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا اور ہم نے آدم وحوا، ان کی اولاد جو کہ ان کی نسل میں مقدر تھی اور شیطان کو کہا کہ بہشت سے اتر جاؤ۔ کیونکہ بہشت دار العصیان نہیں۔ عاصیوں کیلئے

دار الابتلاء ہے جو کہ سراسر رنج و مشقت کا گھر ہے۔ اور ہاں رنج و تکلیف کا سب سے کم مرتبہ اپنے درمیان عداوت ہے جو کہ دنیا میں یہی اور آخرت میں بھی نقصان دیتی ہے۔ اور ابتلاء کی وجہ سے یہ مرتبہ تمہارے پیش آنے والا ہے۔ کیونکہ

بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ تم سے بعض' بعض کا دشمن ہے۔ شیطان ہمیشہ آدمی کو گمراہ کرنے کے درپے ہے۔ اور آدمی ہمیشہ شیطان کو ذلیل کرنے کے درپے ہے۔ پس ان دونوں کے درمیان شرعی اور دینی دشمنی ہے۔ جیسا کہ آدمی' سانپ اور مور کے درمیان طبعی دشمنی ہے۔ اور آدم علیہ السلام کی اولاد میں اگرچہ باہم یگانگت اور اتحاد جنسی ہے۔ لیکن ان میں سے بعض شیطان سے سیکھنے کی وجہ سے شیطانی آئین مہیا کرتے ہیں۔ اور طبعی طور پر اپنی نوع کے افراد کو تکلیف دینے والے ہو جاتے ہیں۔ اور دشمن ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض سانپ کی طبیعت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان کی کاٹ کھانے کی۔ اور غضب کی قوت جوش مارتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو ڈنگ مارنے کی عادت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض مور کی طبیعت جو کہ شہوت پرستی' خود آرائی' خود بینی اور غرور ہے کے تابع ہو کر ہم جنسوں کا حسد' کینہ' بغض اور کھوٹ مہیا کرتے ہیں۔ اسی لئے انہیں نکالنے کے بعد بہشت میں عنقریب واپس آنا میسر نہیں ہے۔ کیونکہ بہشت بغض و عداوت اور دشمنوں کے جمع ہونے کی جگہ نہیں۔ بلکہ تمہاری بود و باش زمین میں ہے۔

وَلَكُمۡ فِي الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ اور تمہارے لئے زمین میں دیر تک رہنا ہے۔ اور اس استقرار کی وجہ سے تمہاری حرص کا رشتہ لمبا ہو جائے گا۔ اور تمہارے لالچ کا دروازہ کھلا ہوگا۔ ہر ایک اپنے لئے طویل عرصہ تک باقی رہنے کی فکر کر کے دوسرے سے جھگڑا کرے گا۔ اور درمیان میں دشمنی کے اسباب پہنچیں گے۔

وَمَتَاعٌ اور فائدہ لینا ہے زمین کی چیزوں سے اور وہ فائدہ لینا تمہیں شہوتوں میں ڈال دے گا اور بہشت میں واپسی کی فکر تمہارے دل سے بھلا دے گا۔ لیکن یہ قرار اور فائدہ لینا دائمی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ختم ہو جائے گا۔

اِلٰى حِيۡنٍ وقت معین تک جو کہ موت کا وقت ہے۔ ہر ہر فرد کے حق میں اور قیامت کا وقت ہے تمام نوع انسانی کے حق میں۔ اور جب حضرت آدم علیہ السلام نے یہ عتاب آمیز

خطاب سنا اور بہشت سے باہر آئے انہیں بہت ندامت اور شرم ساری لاحق ہوئی۔ اور گریہ زاری میں وقت گزارتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ان تک پہنچی۔

فَتَلَقّٰی آدَمُ . پس آدم علیہ السلام نے سیکھے مِنْ رَّبِّهٖ اپنے پروردگار کے الہام سے کَلِمٰتٍ چند کلمات جو کہ ان کی توبہ کی قبولیت کا سبب ہوئے۔ اور وہ کلمات یہ ہیں رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (البقرہ آیت ۳۷)

اور طبرانی نے معجم صغیر میں، حاکم، ابو نعیم اور بیہقی نے حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے فروگذاشت ہوئی۔ اور عتاب ہوا اپنی توبہ کی قبولیت کے بارے میں حیران تھے۔ انہیں یاد آیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا فرمایا تھا اور خاص روح مجھ میں پھونکی۔ میں نے اس وقت اپنے سر کو عرش کی طرف اٹھایا۔ دیکھا کہ وہاں لکھا ہوا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ یہاں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس ذات کے برابر کوئی نہیں جن کے نام کو اپنے نام کے برابر فرمایا ہے۔ تدبیر یہ ہے کہ اسی شخصیت کے وسیلے سے بخشش کا سوال کروں۔ پس اپنی دعا میں کہا: اسئلك بحق محمد الاغفرت لی کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا اور وحی بھیجی کہ تو نے محمد علیہ السلام کو کہاں سے جانا آپ نے سارا ماجرا عرض کیا۔ فرمان پہنچا کہ اے آدم علیہ السلام! تیری اولاد میں سے محمد علیہم السلام پیغمبروں علیہ السلام میں سے آخری ہیں۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا نہ کرتا۔

کسی کے حق کے ساتھ دعا کرنے کا بیان

یہاں جاننا چاہئے کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ کسی کے حق کے ساتھ دعا کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ کسی کا خدا تعالیٰ پر کوئی حق نہیں ہے۔ اور اس مقام کی تفصیل یہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک جو کہ بندوں کے افعال کو بندوں کی مخلوق جانتے ہیں ان افعال کی جزا بندوں کا حقیقی حق ہے۔ اور اہلسنت و جماعت کے مذہب کے مطابق بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ پس ان افعال کی وجہ سے بندوں کیلئے کوئی حقیقی حق ثابت نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ

کے وعدے اور اجرت کے طور پر۔ چنانچہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی۔ رمضان کے روزے رکھے اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اسے جنت میں داخل فرمائے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کی ہو یا اپنی زمین بیٹھا رہا جہاں پیدا ہوا۔

نیز حدیث صحیح میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے آیا کہ کیا تو جانتا ہے کہ بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے۔ پس حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ والی حدیث میں جو وارد ہوا اسی مزدوری والے اور تفضیلی حق پر محمول ہے۔ اور جو کتب فقہ میں ممنوع حق حقیقی ہے۔ اور گزشتہ زمانے میں معتزلہ کا مذہب نہایت ہی زیادہ رواج رکھتا تھا اور اس لفظ کے استعمال سے ان کے مذہب کا وہم ہوتا تھا تو فقہاء نے مطلقاً اس لفظ کے استعمال سے منع فرما دیا تا کہ کسی کا خیال اس مذہب کی طرف نہ جائے۔

یہ وہ ہے جو کہ اس مقام پر علماء ظاہر کی قرارداد کے مطابق ہے۔ اور اہل تحقیق نے کہا ہے کہ بنی آدم کے کاملین میں سے ہر ایک کیلئے اس کی صورت کمالیہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے جو کہ اس کی تربیت فرماتا ہے۔ پس کاملوں میں سے کسی کامل کے حق کے ساتھ سوال کرنا اس اسم کی طرف اشارہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس لفظ کو استعمال کرتے وقت اس معنی کو زیر نظر رکھے تو اس پر قطعاً کوئی ملامت یا عتاب وارد نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی دعاؤں کا بیان

اور طبرانی نے معجم اوسط میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا وقت پہنچا آپ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اور اللہ تعالیٰ کے الہام سے یہ دعا ان کی زبان پر جاری ہو گئی۔ **اللھم انك تعلم سری وعلانیتی فا قبل معذرتی وتعلم حاجتی فاعطنی سولی وتعلم ما فی نفسی فاغفرلی ذنبی اللھم انی اسئلك ایمانا یباشر قلبی و یقینا صادقا حتی اعلم انه لا یصیبنی الا ما کتبت لی و ارضنی بما قسمت لی** اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ آپ کی توبہ قبول ہوئی۔ اور

دعا منظور اور آپ کی اولاد میں سے جو کوئی اس دعا کے ساتھ توسل کرے گا اس کا مدعا حاصل ہو جائے گا اس حدیث کو ازرقی نے تاریخ مکہ' جندی نے فضائل مکہ اور بیہقی نے اپنی کتاب الدعوات میں بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے متعدد سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور عبد بن حمید ضحاک کی روایت کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لائے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی توبہ کی فکر میں دو سو سال تک گریہ وزاری کرتے رہے ایک دن اپنے ہاتھ کی ہتھیلی اپنی پیشانی پر رکھ کر اور اپنے سر کو زانو پہ ڈالے گریہ زاری میں مشغول تھے کہ اچانک جبریل علیہ السلام وارد ہوئے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کی گریہ زاری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان پر بھی گریہ طاری ہو گئی؟ اور پوچھا کہ آپ کی اس قدر گریہ وزاری کس وجہ سے ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں کیونکر گریہ نہ کروں جبکہ رب تعالیٰ نے مجھے اس کام کی نحوست کی وجہ سے آسمانوں کی بلندی سے زمین کی پستی میں ڈال دیا اور قائم رہنے والے گھر سے دار الزوال میں ڈال دیا اور نعمت خانہ سے نکال کر رنج ومصیبت کے گھر میں پہنچا دیا اور ہمیشہ کے مقام سے فنا کے مقام پر لا کھڑا کیا۔ اے جبریل علیہ السلام اگر اس مصیبت کی سختیاں شمار کروں تو نہ کر سکوں حضرت جبریل علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو کر یہ ماجرا عرض کیا۔ حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کے پاس جاؤ اور کہو کہ تم پر جو ہمارے انعام تھے انہیں یاد کرو پہلے میں نے تجھے اپنے دست قدرت سے بنایا پھر میں نے تیرے ڈھانچے میں اپنی خاص روح پھونکی پھر میں نے اپنے فرشتوں کو تیرے سامنے سجدہ ریز کیا۔ اور تو نے میری ان نعمتوں کی قدر نہ کی۔ اور میرے حکم کی تعمیل میں فروگذاشت کی۔

حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کیوں نہیں اے میرے پروردگار! یہ تقصیر مجھ سے واقع ہوئی۔ اور میں نادم ہوں۔ حکم پہنچا میری رحمت میرے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ میں نے تیری آواز سنی۔ تیری عاجزی اور زاری پر میں نے رحم کیا۔ اور تیری تقصیر سے درگزر فرمایا یہ کلمات کہیں **لا الہ الا انت سبحنك وبحمدك عملت سوء و ظلمت نفسي فاغفرلي ذنوبي انك انت خير الغافرين لا الہ الا انت سبحانك وبحمدك عملت سوء وظلمت نفسي فارحمني انك انت خير الراحمين لا الہ الا انت سبحنك**

وبحمدك عملت سوء و ظلمت نفسي فتب علي انك انت التواب الرحيم

اور ابن المنذر کی حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے روایت میں یہ الفاظ ان الفاظ کی زیادتی سے وارد ہوئے اللھم اسئلك بجاہ محمد عبدك و کرامته علیك ان تغفرلي خصیتي اور دعا کی ابتداء میں لا اله الا الله وحده لا شریك له وھو علی کل شيء قدیر بھی وارد ہوئے۔ اور خطیب اور ابن عساکر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے مرفوعا اس طرح لائے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اس فعل کی نحوست کی وجہ سے بہشت سے زمین پر آئے تو آپ کا

ایام بیض کے روزوں کا بیان

رنگ سیاہ ہو گیا تھا جب توبہ کا وقت آپہنچا تو حکم ہوا کہ مہینے کی تیراں تاریخ کا روزہ رکھیں آپ نے وہ روزہ رکھا۔ جسم شریف کا تیسرا حصہ اصلی حالت پر آ گیا پھر فرمایا کہ چوداں تاریخ کا بھی روزہ رکھیں۔ ان کے بدن کے دو حصوں کا رنگ درست ہو گیا۔ پھر پندرہویں تاریخ کا بھی روزہ رکھنے کا حکم ہوا تو سارا جسم اپنی اصلی حالت پر آ گیا اس کے بعد ان تین دنوں کے روزے آپ پر اور آپ کی اولاد پر فرض ہو گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ تک۔ لیکن ان تین دنوں کے روزے توبہ کی تکمیل کیلئے ظاہر ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ صحیح روایات میں وارد ہے کہ آپ کی توبہ کی قبولیت عاشورا کے دن ہے۔ اور ابن عساکر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بہشت سے باہر زمین پر آ کر اس قدر گریہ وزاری کی کہ اگر تمام بنی آدم کی گریہ زاری اور حضرت داؤد علیہ السلام کی گریہ وزاری کو ان کے سامنے لائیں۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کی گریہ و زاری زیادہ ہو گی۔

اور بیہقی نے شعب الایمان میں بریدہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کی کہ اگر آدم علیہ السلام کے آنسوؤں کو انکی تمام اولاد کے آنسوؤں کے ساتھ تولیں تو آپ کے آنسو وزن میں زیادہ ہوں گے۔ اور امام احمد کتاب الزہد میں امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے لائے ہیں کہ اس فعل کے صادر ہونے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی یہ حالت تھی کہ

آپ کی اجل آپ کی آنکھوں کے سامنے اور آپ کی امید آپ کے۔ پس پشت تھی اور جب یہ فعل سرزد ہوا تو ان کی امید ان کی آنکھوں کے سامنے کر دی گئی اور ان کی اجل ان کے۔ پس پشت۔

اور ابن عساکر مجاہد کی روایت سے لائے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو باہر نکلنے کا حکم ہوا تو حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہ السلام آئے۔ اور آپ کے سر سے تاج اتار لیا اور لباس بھی سلب ہو گیا۔ اور عربی زبان بھی سلب کر لی گئی اور اس کے بجائے سریانی زبان جاری کر دی گئی۔ قبول توبہ کے بعد پھر حکم ہوا تو عربی زبان میں گفتگو فرماتے۔ مختصراً یہ کہ بہت کدوکاوش کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی دعا بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی۔

فَتَابَ عَلَیۡهِ ۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر رحمت سے توجہ کی۔ اور توبہ قبول فرمائی۔ اور آئندہ کیلئے معصیتوں سے معصوم کر دیا۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے کمال اور عنایت کی فراوانی کی وجہ سے ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ تحقیق وہ وہی ہے بندوں کی دعاؤں کو قبول کرنے والا۔ اور مہربان کہ ان کے گناہوں کو بار بار معاف فرماتا ہے۔ اور اپنے بندوں کے ساتھ عموماً اور حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ خصوصاً اس کمال کی رحمت و عنایت کے باوجود جو کہ ہم رکھتے ہیں توبہ قبول کرتے ہی فی الفور ہم نے انہیں جنت میں اٹھا کر داخل نہیں فرمایا۔

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا ہم نے فرمایا کہ ابھی اپنے اترنے کی جگہ پر رہو مِنۡهَا بہشت سے دور رہ کر جَمِیۡعًا جمع ہو کر۔ اور اگر تمہیں اس وقت ہم بہشت میں اٹھا لے جائیں تو تمہاری اولاد میں تفرقہ لازم آئے گا۔ نیک لوگوں کو جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کے پیچھے چل کر بہشت کے مستحق ہوئے ہوں گے بہشت میں پہنچا دیا جائے۔ اور بروں کو جنہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے طریقے کے خلاف روش اختیار کی ہوگی دنیا میں چھوڑ دیا جائے یا دوزخ میں۔ اور یہ تفرقہ زمین پر اتارنے کی غرض کے منافی ہے۔ کیونکہ اس اتارنے سے مقصود بالذات تکلیف میں مبتلا کرنا اور امر و نہی کے ساتھ امتحان لینا ہے۔

فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے جس

کا عقلی دلائل اور قولی اور فعلی معجزات کے ساتھ میری طرف سے ہونا ثابت اور یقینی ہو جائے۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ تو جس نے اس ہدایت کی میری ہدایت سمجھ کر پیروی کی فَلاَ خَوْفٌ عَلَیْهِمْ ۔ پس ان پر کوئی خوف نہیں اس سے کہ وہ ہدایت میری طرف سے کوئی دھوکا یا شیطان کے فعل سے ہو یا بعض آسمانی اطوار اور زمینی استعدادوں کی وجہ سے رونما ہوئی ہو اس لئے کہ عالم بالا کے علوم میں اس قسم کے احتمال نقصان نہیں دیتے۔

وَلاَ هُمْ یَحْزَنُوْنَ نہ وہ غمگین ہوں گے بہشت کی سکونت اور اس کی لذتوں کے فوت ہونے سے جو کہ ان کے باپ کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس فعل کے رونما ہونے کی وجہ سے اس لئے کہ انہیں جسموں سے جدا ہونے کے بعد پھر اس کی طرف لوٹنا حاصل ہوگا۔ اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پہلے کی نسبت زیادہ سرور اور لذتیں حاصل ہوں گی۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اور جنہوں نے انکار کیا اس ہدایت کا اور بعید احتمالات کو اپنے دل میں راہ دی اور باطل شقوں کو اپنے ذہن میں راسخ کیا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اور ہماری بھیجی ہوئی علامات کی نسبت جھوٹ کی طرف کر دی کہ ان علامات کی وجہ سے سچائی یقینی ہو جاتی ہے۔ پس وہ اس سے محروم ہو گئے کہ پھر بہشت دیکھیں اور اپنے اترنے کی جگہ جو کہ زمین سے ترقی کریں بلکہ اس مقام سے بھی انہیں نیچے گرا دیا جائے گا کیونکہ

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہ لوگ دوزخ والے ہیں کہ کبھی بھی اس سے جدا نہ ہوں گے۔ اور وہاں سے منتقل بھی نہ ہوں گے۔ بلکہ

هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیونکہ ہمیشہ کے عذاب کے وعدے کے بغیر امتحان پورا نہیں ہوتا کیونکہ منقطع ہونے والے عذاب کو وہم خاطر میں نہیں لاتا اور اس سے نہیں ڈرتا اور جب ہمیشہ کے عذاب کا وعدہ واقع ہوا تو اس کا پورا کرنا لازم آیا کہ وعدہ خلافی کرنا نقص اور عیب ہے۔ اور جناب الٰہی نقص کے عیب سے پاک اور مبرا ہے۔

چند بحثیں

اس واقعہ میں چند بحثیں باقی ہیں کہ ان کے درپے ہونا ضروری ہے۔ پہلی بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہشت کی سکونت کو اصالتاً حضرت آدم علیہ السلام کیلئے فرمایا۔ اور ان کی

زوجہ جو کہ حضرت حواء تھیں ان کے تابع فرمایا کہ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ اور میوے کھانے میں دونوں کو باضابطہ خطاب فرمایا وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا اور اسی طرح ممنوع درخت کے قریب جانے سے روکنے میں دونوں کو شریک فرمایا اس اسلوب میں نکتہ یہ ہے کہ سکونت کے مکان کے تعین میں مرد کو اختیار ہے عورت کو اس میں کوئی دخل نہیں جہاں چاہے لے جائے اور کھانے پینے اور ممنوعات سے پرہیز کرنے میں دونوں برابر ہیں کوئی بھی دوسرے کا تابع نہیں۔

دوسری بحث یہ ہے کہ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ کا عطف اسکن کی ضمیر پر ہے۔ پس چاہئے کہ اسکن ' زوجک کی طرف مسند ہو۔ حالانکہ امر حاضر کے صیغے کو ظاہر کی طرف مسند کرنا جائز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عطف' اصل نسبت میں مشارکت کا موجب ہوتا ہے نہ کہ کیفیت نسبت میں۔ جاء نی زید لا عمر کی دلیل ہے۔ حالانکہ معطوف علیہ میں نسبت ثبوتی ہے۔ اور قامت ہند و زید کی دلیل ہے۔ حالانکہ زید کے عامل کو تانیث جائز نہیں۔ اور اسی لیے یوں نہیں کہا جا سکتا قامت زید یہاں بھی اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ بمعنی اسکن انت ولتسکن زوجتك سمجھنا چاہئے۔

تیسری بحث یہ ہے کہ یہ بہشت جس میں حضرت آدم علیہ السلام کو سکونت دی گئی وہی بہشت ہے جس میں قیامت کے دن بہشتیوں کو داخل فرمائیں گے یا کوئی دوسرا قطعہ زمین ہے جو کہ بہشت کی طرح پھل دار درختوں' چشموں اور نہروں سے تھا۔ سب سے صحیح یہ ہے کہ وہی بہشت ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور بے شمار احادیث اور آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت زمین پر تھی۔ اگر اس بہشت میں آپ کو منتقل فرماتے تو اس واقعہ میں ان کے آسمان کی طرف ایک طبقہ کے بعد دوسرے طبقہ کی طرف چڑھنے کا ذکر ضرور ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں غرض اس سفر کی منزلوں کے ذکر سے متعلق نہ تھی جو مدعا ہے مقصد کے متعلق ہے جو کہ بہشت ہے لہٰذا مقصد کے ذکر پر اکتفا فرمایا بخلاف معراج محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے کہ اس سفر کے دوران ہر منزل میں عجیب واقعات ارواح انبیاء علیہم السلام اور ہر آسمان کے فرشتوں سے

ملاقات ہوئی اسی وجہ سے احادیث معراج میں ان منزلوں کی تفصیل مذکور ہوئی۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ اس سورت میں وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حرف واوَ کے ساتھ مذکور ہے۔ جبکہ سورۂ اعراف میں یہی واقعہ نکلا یعنی حرف فا کے ساتھ ہے۔ یہ فرق کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات قرآن مجید میں جگہ جگہ مقام کے تقاضا کے مطابق تکرار سے بیان ہوئے۔ اور ان واقعات کے بیان میں ہر جگہ اس مقام کے مقتضی کی رعایت فرمائی گئی ہے۔ یہاں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ زمین میں ان کی خلافت کے ذکر کے مسئلہ کے ساتھ بیان ہوا جو کہ سکونت کے باب سے ہے۔ اور زمین کی سکونت کے طریقہ اور اس کے منافع میں تصرف کی تعلیم کے لئے بہشت کی سکونت بھی مذکور ہوئی۔ پس سکونت اصل مقصد ہے۔ کھانے پینے کا وسیلہ نہیں۔ اگر یہاں فکلا فرمایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ سکونت میوے کھانے کے لئے تھی۔ اور مقصود بالذات میوے کھانا تھا جبکہ سورت اعراف میں پہلے اور بعد میں آدمیوں کے لئے اسباب معیشت مہیا کرنے کا ذکر ہے۔ اور یہ امر زیادہ تر کھانے پینے کی طرف لوٹتا ہے' جیسا کہ اس واقعہ سے پہلے بھی فرمایا ہے۔ وجعلنا لکم فیھا معایش (الاعراف آیت ۱۰) اور اس واقعہ کے بعد بھی کلوا واشربوا ولا تسرفوا ارشاد ہوا (الاعراف آیت ۳۱) اور درمیان میں پاکیزہ چیزوں کے رزق کا حلال کرنا بیان ہوا۔ پس آدم علیہ السلام کا واقعہ وہاں معاش کی اچھائی اور کھانے پینے کی خوبی کے مسئلہ کے ساتھ مذکور ہوا۔ اسی لئے حضرت آدم علیٰ نبینا علیہ السلام سے بہشتی لباس اتارنے اور اس کے عوض دنیوی لباس کے طریقے کے الہام کرنے کو تفصیل سے بیان فرمایا۔ پس اس سورت میں مقصود بالذات بہشتی میووں کا کھانا پینا ہے اور بہشت کی سکونت اس کا وسیلہ ہے۔ پس فا کو فکلا میں وہاں لانا ضروری ہوا۔ اور اس بنا پر کہ مقصود بالذات کھانا پینا ہے کھانے میں وسعت دینا وہاں بیان نہیں فرمایا اور اسی قدر پر اکتفاء فرمایا فکلا من حیث شئتما۔ اور یہاں چونکہ کھانا مقصود نہ تھا اس لئے کھانے میں وسعت دینا رغدًا کے ذکر سے منظور ہوا۔ کیونکہ جب کوئی چیز مقصود بالذات ہوئی خود بخود اس میں وسعت دینا لازم آیا۔ تاکید کی حاجت نہیں۔ پانچویں بحث یہ ہے کہ لا تقربا نہی ہے۔ اور دربار

خداوندی سے نہی دو طریقوں سے وارد ہوتی ہے۔

اول تحریم شرعی کے طریقے سے کہ اس کے ارتکاب میں وہی نقصان ہوتا ہے۔ اور وہ فعل اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب ہوتا ہے۔ اور دوسرا طریقہ ارشاد پرہیز اور احتیاط دنیوی نقصان سے۔ جیسا کہ لا تسئموا ان تکتبوہ صغیرا او کبیرا الی اجلہ (البقرہ آیت ۲۸۲) اور اس کی امثال واقع ہیں۔ پس پہلے طریقے میں اس نہیں کی مخالفت گناہ کا موجب ہوتی ہے۔ اور اس کا مرتکب توبہ واستغفار کا محتاج ہوتا ہے۔ اور دوسری نہی میں اس باب میں سے کچھ بھی لازم نہیں آتا بلکہ ترک اولیٰ اور کسی مصلحت کے خلاف کرنا لازم آتا ہے۔
اور علماء کو اختلاف ہے کہ یہ نہی کس قبیلے سے تھی ایک جماعت کے لوگ اس طرف گئے ہیں کہ دوسرے قبیلے سے تھی۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ پہلے قبیلے سے ہے۔ کیونکہ لاتقربا اس درخت کے نزدیک ہونے سے منع کرنے پر دلالت کرتا ہے چہ جائیکہ اس سے کچھ کھائیں اور اس قدر تاکید دنیوی پرہیز اور احتیاط کیلئے نہیں ہوتی۔ اسی لئے یہ صیغہ سخت حرام چیزوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لاتقربوا الزنا (بنی اسرائیل آیت ۳۲) ولا تقربوا مال الیتیم (بنی اسرائیل آیت ۳۴) ولا تقربوھن حتّٰی یطھرن (البقرہ آیت ۲۲۲) اور لفظ فتکونا من الظالمین بھی اس کی تائید کرنے والا ہے۔ اور اس فروگذاشت کی جزا کے طور پر بہشت سے نکالنا اور اس کے خوف سے حضرت آدم علیہ السلام کی گریہ وزاری اور تلقین توبہ اور لفظ فتاب علیہ اور ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین سب اسی قول کی ترجیح کے دلائل ہیں۔

چھٹی بحث یہ ہے کہ جب ممنوع درخت کا کھانا زیادہ ترجیح والے قول کے مطابق معصیت ہوا تو حضرت آدم علیہ السلام سے معصیت کا وقوع لازم آیا اور انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے قانون کے خلاف ہے بعض مفسرین نے اس شبہ کا جواب یوں دیا ہے کہ ان سے یہ معصیت نبوت سے پہلے واقع ہوئی۔ اس لئے کہ آپ کو زمین پر اترنے کے بعد مرتبہ نبوت حاصل ہوا لیکن یہ جواب قوی نہیں ہے۔ کیونکہ مرتبہ نبوت تو آپ کو صرف پیدائش کے ساتھ ہی حاصل تھا بلا واسطہ تعلیم اسماء کی دلیل سے اور اس دلیل سے کہ فرشتوں کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم فرمایا گیا۔ اور اس کا التزام کہ تمام فرشتے غیر نبی کو سجدہ کریں بہت بعید ہے۔

اور طبرانی' ابوالشیخ اور ابن ابی شیبہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ آپ خبر دیں کہ آدم علیہ السلام نبی تھے؟ فرمایا ہاں نبی رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے مشافہۃً گفتگو فرمائی۔ آپ سے فرمایا یَـــا آدَمُ اسْـكُـنْ اَنْـتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا! یا ربّ تو نے آدم علیہ السلام کے ساتھ جو اچھا سلوک کیا وہ اس کا شکر یہ کس طرح ادا کر سکتے ہیں تو نے انہیں اپنے ہاتھ سے بنایا۔ اور اس میں اپنی خاص روح پھونکی۔ اپنی جنت میں ٹھہرایا۔ اور تو نے فرشتوں کو حکم دیا تو انہوں نے اسے سجدہ کیا۔ تو فرمایا اے موسیٰ! اس نے جانا کہ یہ سب کچھ میری طرف سے ہے۔ تو اس نے میری حمد کی تو یہ میرے اس حسن سلوک کا شکر تھا۔

اور اسی لئے اکثر محققین اس طرف گئے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے اس فعل کا ارتکاب ذلت کے طریقے سے تھا اور ذلت کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی امر مباح یا کسی نیکی کا قصد کرے۔ اور غفلت اور بے احتیاطی کی وجہ سے اس امر مباح یا مستحب میں اس سے خلاف شرع کام سرزد ہو جائے۔ پس اس عمل کی صورت معصیت کی صورت ہے۔ اور اس کا معنی طاعت یا مباح کا معنی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ابلیس کے قسم کھانے اور اس کی دل کو فریب دینے والی تقریر سے یوں معلوم ہوا کہ مجھے اس درخت سے کھانے سے خلافت زمین کی وجہ سے منع فرمایا ہے۔ اور اس درخت سے کھانے کی صورت میں خلافت زمین کے مرتبہ سے ایک اور اعلیٰ مرتبہ مجھے حاصل ہوگا۔ اس جہت سے اسے کھانے کا اقدام کیا۔ اور جب ان سے بہشت کا لباس اور زیور کھینچ لیا گیا تو جانا کہ میرا یہ سمجھنا خطا تھا اور ممنوع درخت سے کھانا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوا اس بناپر توبہ واستغفار میں کوشش کی۔ اور یہی کاملوں کی شان ہے کہ تھوڑی گناہ کو بہت سمجھتے ہیں۔ اور ترک اولیٰ یا بے احتیاطی پر گھبراتے اور پریشان ہوتے ہیں۔

ساتویں بحث یہ ہے کہ سورت اعراف میں مذکور ہے کہ شیطان کو صرف اس وجہ سے

کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا بہشت سے نکال دیا گیا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے بہشت میں سکونت اختیار کی۔ پس شیطان کو یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ دیا اور ممنوع درخت سے کھانے پر جرأت دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تفسیر میں گزرا کہ مور اور سانپ کی وساطت سے اس لعین نے اس مہم کو سرانجام دیا اور اہل اسرار نے شیطان کی وساطت کیلئے ان دونوں جانوروں کی تخصیص میں یوں لکھا ہے کہ شیطان اگرچہ آدمی کو نیکی کی راہ سے دور ڈالنے اور گمراہی کی راہ چلانے کیلئے پوری کوشش کرتا ہے اس کا یہ مقصد ہرگز میسر نہیں آتا مگر جبکہ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ انسان کو اپنے قابو میں کر لیتی ہیں۔ کیونکہ یہی دو قوتیں آدمی کے نفس پر غالب ہیں۔ مور قوت شہویہ کا مظہر ہے۔ اور سانپ قوت غضبیہ کا۔ جس طرح کہ شیطان قوت وہمیہ کا مظہر ہے۔ اور زیادہ تر شہوتوں کا قبضہ بدن کے باہر سے ہے۔ اور غضب کا تسلط جسم کے اندر سے۔ شیطان کے وسوسہ کی صورت اس طرح ظاہر ہوئی ہے کہ مور کو باہر سے بھیجا اور سانپ کو بہشت کی دیوار پر آنے کا وسیلہ بنایا۔ تاکہ اس بات کا اشارہ ہو کہ قوت غضبیہ افق روحانی اور لطیفہ قلبی سے قوت شہویہ کی نسبت زیادہ قریب ہے۔

آٹھویں بحث یہ ہے کہ اِھْبِطُوْا جمع کا صیغہ ہے۔ اور بہشت میں حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کے بغیر کوئی اور نکالنے کے قابل نہ تھا۔ پس چاہئے تھا کہ **اهبطا** فرمایا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ آدمیوں کی ساری نوع سے خطاب مراد تھا۔ اور یہ دونوں اس نوع کی اصل ہیں۔ پس ان دونوں کے خطاب میں جمع کا صیغہ لائے تاکہ اس امر پر دلالت کرے کہ منظور اس ساری نوع کو نکالنا ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ابلیس، سانپ اور مور بھی اس خطاب میں شریک ہیں۔

نویں بحث: بنی آدم کیلئے گناہوں سے بچنے اور معصیت سے پرہیز کے بارے میں اس واقعہ میں ایک عجیب عبرت اور موثر نصیحت ہے۔ چنانچہ کہنے والے نے کہا ہے اے سونے والے کی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے اور ایسے کام کا مشاہدہ کرنے والے جو مشاہدہ کے لائق نہیں تو گناہوں کو گناہوں کے ساتھ ملا رہا ہے۔ اور درجات جنت اور

عبادت گزار کا اجر پانے کی امید کرتا ہے۔ کیا تو بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس سے ایک فعل کی وجہ سے دنیا کی طرف نکال دیا۔

دسویں بحث یہ ہے کہ ایک بار قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فرمایا ۔ اور مقصد جو کہ بہشت سے نکالنا تھا اس سے معلوم ہو گیا۔ دوسری بار کیا ضرورت تھی کہ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ارشاد ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی بار یہ حکم بہشت سے نکالنے کیلئے تھا اور دوسری بار زمین میں قرار پکڑنے اور فی الفور بہشت کی طرف لوٹنے کی امید ختم کرنے کیلئے تھا۔ تاکہ توبہ کی قبولیت کی وجہ سے یہ آرزو نہ کریں کہ ہم پھر بہشت میں آئیں اور اس جگہ کی نعمتوں سے فائدہ حاصل کریں۔

گیارہویں بحث یہ ہے کہ اما حرف شک ہے۔ اور ن تاکید جو کہ یاتینکم میں موجود ہے یقین پر دلالت کرتا ہے شک اور یقین کے درمیان جمع کس طرح سمجھی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سننے والوں کے علم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے آنے کا یقین مشکوک تھا۔ اس وجہ سے حرف شک لائے تو گویا آمد ہدایت اور یقین کے مجموعے پر حرف شک داخل ہوا یعنی اگر تمہارے نزدیک میری طرف سے ہدایت کا آنا متحقق ہو جائے۔ اور اس صورت میں کوئی اشکال لازم نہیں آتا کیونکہ شک کا متعلق آمد متحقق ہے۔ اور یقین کا متعلق صرف آمد ہدایت۔ پس شک اور یقین کا مورد جدا جدا ہو گیا۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہدایت کا آنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک یقینی اور سننے والوں کے نزدیک مشکوک تھا اور علم معانی کا قاعدہ ہے کہ اس باب میں سامع کا یقین کرنا یا یقین نہ کرنا بھی معتبر ہے۔ پس نون ثقیلہ کی تاکید اس جہت سے ہے کہ متکلم کے علم اور ارادہ میں فعل کا وقوع یقینی ہے۔ اور ان کا لانا جو کہ حرف شک ہے اس جہت سے ہے کہ سامع کے نزدیک فعل کا واقع ہونا مشکوک ہے۔ پس شک سامع کے اعتبار سے ہوئی۔ اور یقین متکلم کے اعتبار سے اور شک اور یقین کا اجتماع ایک شخص کی نظر سے محال ہے نہ کہ دو کی نظر سے۔

حقیقت توبہ کی ترکیب

بارہویں بحث یہ ہے کہ توبہ کی حقیقت تین چیزوں سے مرکب ہے علم، حال اور عمل۔

علم' گناہ کے نقصان کو جاننا ہے۔ اور اس بات کو کہ یہ گناہ بندے اور رحمت الٰہی کے درمیان پردہ واقع ہو گیا۔ اور جب یہ جان لینا ذہن میں قرار پکڑتا اور مستحکم ہوتا ہے۔ تو دل کو محبوب کے گم ہونے سے ایک طیش اور بے چینی پہنچتی ہے۔ اور جس کام کی وجہ سے محبوب کو نہ پانا رونما ہوتا ہے اس پر ایک افسوس حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ افسوس کرنا دل کے حالات میں سے ایک حال ہے۔ جسے ندامت کہتے ہیں۔ اور اس حالت کے تین تعلق ہے ایک تعلق ماضی کے ساتھ اور وہ جو فوت ہوا اس کی تلافی اور کفارہ دینا اور قضا کرنا ہے اگر کفارے اور قضا کے قابل ہو۔ اور ایک تعلق حال کے ساتھ ہے اور وہ اس فعل کو فی الفور ترک کرنا ہے۔ اور ایک تعلق مستقبل کے ساتھ ہے۔ اور وہ اس ارادے کو پختہ کرنا ہے کہ یہ کام پھر نہیں کروں گا۔

پس ان امور کا مجموعہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے لطف کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لئے حصر کے لفظ کے ساتھ فرمایا اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ اور تواب میں تاکید کا معنی یہ ہے کہ آدمی کی طبیعت عذر کی قبولیت سے بار بار رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ بخلاف حضرت حق جل وعلی کے کہ ہر بار اس کی بارگاہ میں توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ نیز آدمی گناہگاروں کی کثرت کی وجہ سے رنجیدہ ہوتا ہے۔ اور جواب دے دیتا ہے۔ بخلاف حضرت حق جل جلالہ کے کہ گناہگار جس قدر زیادہ ہوں گے اس کی رحمت کا جوش اسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔

اور حضرت ذوالنون مصری سے لوگوں نے پوچھا کہ حقیقت توبہ کیا ہے؟ فرمایا کہ توبہ چھ چیز سے مرکب ہے۔ پہلی چیز گزشتہ گناہوں پر ندامت۔ دوسری چیز: آئندہ کیلئے گناہ ترک کرنے کا پختہ ارادہ۔ تیسری چیز: ہر فوت شدہ فریضہ ادا کرنا۔ چوتھی چیز: مخلوق کے حقوق ادا کرنا۔ خواہ وہ حقوق مالی ہوں یا جانی یا حقوق ناموسی۔ پانچویں چیز: ہر اس گوشت اور خون کو پگھلانا جو کہ مال حرام سے پیدا ہوا۔ چھٹی چیز: اپنے آپ کو طاعات کی تلخی چکھانا جس طرح کہ معصیت کی حلاوت چکھائی تھی۔

خوف اور حزن کے معنی میں فرق

تیرہویں بحث یہ ہے کہ خوف کا معنی ایسا رنج ہے جو کہ کسی تکلیف کی توقع کی وجہ سے

حاصل ہوتا ہے۔ اور حزن کا معنی وہ رنج ہے جو کہ آدمی کے نفس کو کسی محبوب کو گم کرنے یا کسی مطلب کے فوت ہو جانے سے لاحق ہوتا ہے۔ اور اس آیت میں خوف کی نفی کو حزن کی نفی سے پہلے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ خوف کی نفی کا معنی تمام آفات سے سلامتی حاصل ہونا ہے۔ اور حزن کی نفی کا معنی مراوات کو پہنچنا ہے۔ اور آفت کا زوال حصول مراد سے پہلے ہے۔

اور ہر تقدیر پر صرف اتباع ہدایت پر خوف اور حزن کی عام نفی کیسے درست ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اتباع ہدایت کے باوجود لکھی ہوئی تقدیر کی سبقت کا اور سعادت کے شقاوت میں بدل جانے کا خوف باقی ہے جب تک کہ موت قبر قبروں سے اٹھنے محشر میں حاضر ہونے اعمال ناموں کی تقسیم ہونے میزان عمل قائم ہونے اور پل صراط عبور کرنے کی مشکل منزلوں سے خیریت کے ساتھ نہ گزرے اطمینان اور امن حاصل ہونا محال ہے۔ اور اسی لئے قیامت کے دن کا خوف کافروں فاسقوں ایمان والوں بلکہ اپنے مرتبہ اور شان کے مطابق انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو بھی عام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے قول کی دلیل سے **یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملھا وتری الناس سکاری وماھم بسکاری** (الحج آیت ۲) **فکیف تتقون ان کفرتم یوما یجعل الولدان شیبا ن السماء منفطر بہ** (المزمل آیت ۱۷، ۱۸) **یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ما ذا اجبتم** (المائدہ آیت ۱۰۹) **فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین** (الاعراف آیت ۶) بلکہ اکثر علماء نے لکھا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے کے بعد بھی اہل بہشت کو اللہ تعالیٰ کے جلال و عظمت کا خوف باقی رہے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد آخرت میں خوف اور حزن کی نفی ہے۔ اور آخری دم تک ہدایت کی اتباع اس بشارت اجمالی کا سبب ہوتی ہے کہ ہر واقعہ میں ان کے ساتھ احسان کا سلوک ہوگا۔ اور وہ اپنے مقاصد اور مرادوں کو پہنچیں گے۔ چنانچہ دوسری آیت میں مذکور ہے **ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ ان لاتخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون** (حم السجدہ آیت ۳۰) اور نہ وہ اور آخرت کے موقعوں میں عام خوف کا لاحق ہونا ان خوفناک واقعات کی بنا پر ہوگا

جن کی وجہ سے اس اجمالی بشارت کی طرف توجہ نہ رہے گی اور چونکہ وہ خوف جلدی زائل اور ختم ہونے والا ہے گویا خوف ہے ہی نہیں۔ چنانچہ فرمایا لایحزنھم الفزع الاکبر وتتلقاھم الملائکۃ ھٰذا یومکم الذی کنتم توعدون (الانبیاء آیت ۱۰۳) اور خشیت الٰہی کو خوف نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی وہ غم وفکر کا سبب ہوتا ہے۔ پس اس کا بہشت میں باقی رہنا خوف کی نفی کے مخالف نہیں۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا۔ نظم: ایک بلبل خوش رنگ پھول کی پتی چونچ میں رکھتی اور اس کے باوجود زاروقطار رو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ عین وصل میں یہ رونا کس لئے ہے اس نے کہا ہمیں جلوۂ معشوق نے اسی کام پر لگا رکھا ہے۔

اور اسی لئے بعض اہل تدقیق نے کہا ہے کہ خوف کو جہاں بھی علیٰ کے لفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں وہاں رنج وضرر کے معنوں کی رعایت کرتے ہیں۔ اور ہدایت کی اتباع کرنے والوں کو اس قسم کا کوئی خوف نہیں ہوگا اگر انہیں کوئی خوف ہے۔ تو ان کے نفع کیلئے ہیں کہ ان کے درجات کی ترقی اور ان کے ثواب میں کئی گنا اضافہ کیلئے ہے۔ ولمن خاف مقام ربہ جنتان (الرحمٰن آیت ۴۶) اور اسی لئے لاخوفٌ بھم ارشاد نہ ہوا بلکہ لاخوفٌ علیھم اور اسی طرح خشیت جلال الٰہی کو بھی اس خوف میں داخل نہیں سمجھا سکتا کیونکہ رنج اور ضرر کا سبب نہیں۔ جیسا کہ باپ اور استاد اور پیر کا خوف جو کہ ادب پر ابھارنے والا ہے نہ کہ کسی نقصان کی توقع یا کسی منفعت کے فوت ہونے پر مبنی ہے۔

اور اس مقام کے مناسب وہ قاعدہ کلیہ ہے جس کی بنیاد شیخ ابوالحسن اشعری علیہ الرحمۃ نے رکھی اور اسے ہر جگہ موزوں فرمایا یعنی سعادت وشقاوت، ایمان وکفر اور ہدایت وضلالت میں اعتبار خاتمے کا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر وہ ہے جس کی موت کفر پر ہو۔ اور مومن وہ ہے جو اس جہان سے ایمان کے ساتھ جائے۔ پس اس آیت میں ہدایت کا تابع وہی ہے جس کا خاتمہ ہدایت پر ہوا نہ کہ وہ جس نے بالفعل نیک راہ اختیار کی۔ اور اس کا خاتمہ پردے میں ہے۔

متعلقات واقعہ

چودھویں بحث یہ ہے کہ حدیث پاک کے مطابق اس واقعہ کے متعلقات چند چیزیں

ہیں۔ان میں سے یہ ہے کہ پہلے حضرت حواء رضی اللہ عنہا نے شیطان سے دھوکا کھایا اور اس کے بعد ان کے مشورہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے فروگذاشت کا ارتکاب ہوا چنانچہ حاکم اور بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا اس درخت سے کھانے پر تجھے کس نے ابھارا جس سے کہ میں نے تجھے روکا تھا۔ عرض اے میرے پروردگار! میرے لئے یہ کام حواء نے خوبصورت کیا۔فرمایا کہ اس پر حوا رونے لگیں تو انہیں کہا گیا کہ تجھ پر اور تیری بیٹیوں پر رونا ہے۔

اور دارقطنی کتاب الافراد میں حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت لائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حوا کی طرف بھیجا جب حضرت حواء کو خون کا عارضہ لاحق ہوا تو آپ نے اپنے ربّ کو پکارا کہ مجھے خون آیا ہے کہ جسے پہچانتی نہیں ہوں تو انہیں ندا دی کہ میں تجھ سے اور تیری اولاد سے خون جاری کروں گا اور اسے تیرے لئے کفارہ اور خطاؤں سے پاک کرنے کا ذریعہ بناؤں گا۔

اور صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت بدبودار نہ ہوتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی اور بیہقی دلائل النبوۃ میں اور خطیب تاریخ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم روایت لائے کہ مجھے آدم علیہ السلام سے (اور وجوہ فضیلت کے علاوہ) دو خصلتوں میں فضیلت دی گئی میرا شیطان مسلمان ہو گیا۔ اور ان کا شیطان کافر۔ میری ازواج میرے دین کے معاملہ میں میری مددگار ہیں۔ جبکہ ان کی زوجہ نے خطا پر مدد کی۔

حضرت آدم علیہ السلام' حضرت حواء رضی اللہ عنہما کا زمین پر اترنا اور شیطان' سانپ اور مور کا

اور ان میں سے یہ ہے کہ اکثر روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے اترنے کی جگہ ہندوستان کی ایک زمین ہے۔ جسے وجنا کہتے ہیں۔اور حاکم اور بیہقی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے کہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے

فرمایا کہ کچھ جانتے ہو کہ سرزمین ہند دوسری زمینوں کی بہ نسبت زیادہ خوشبو والی کیوں ہے۔ اور خوشبو کی قسموں میں سے عود اخروٹ اور لونگ اس زمین کے ساتھ کیوں مخصوص ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام اس زمین میں اترے تو بہشت کے درختوں کے پتے آپ کے جسم شریف پر تھے۔ ان پتوں کو ہوا نے بکھیر دیا جس درخت پر بھی ان پتوں سے کوئی پتہ پہنچا اور اس درخت کے ساتھ لگا اچھی مہک پیدا کی۔ اور حضرت حواء اکثر روایات کے مطابق جدہ میں اتریں اور ابلیس میسان کے جنگل میں جو کہ بصرہ سے چند کوس کے فاصلے پر ہے۔ اور سانپ اس جگہ جہاں آج کل اصفہان آباد ہے جب حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کیلئے خانہ کعبہ کے حج کا حکم ہوا اور آپ حج سے فارغ ہوئے حضرت حواء سے ملاقات ہوئی۔ اور توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہوا۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو بہشت سے روئے زمین پر بھیجا گیا تو تیس قسم کے جنتی پھل ان کے ہمراہ کر دیے جو کہ زمین میں نہ تھے۔ چنانچہ ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرمائی کہ حضرت آدم علیہ السلام تیس قسم کے جنتی پھلوں سمیت اتارے گئے۔ ان پھلوں میں سے بعض وہ ہیں جن کے اندر اور باہر دونوں حصے کھائے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ داخل کھایا جاتا ہے۔ اور خارج پھینک دیا جاتا ہے۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ اس کا خارج کھایا جاتا ہے۔ اور داخل پھینک دیا جاتا ہے۔ اور بعض روایات میں ان پھلوں کی تعیین بھی آئی جن میں سے (نہایت عمدہ کھجور) عجوہ، لیموں اور کیلا بھی ہیں۔ اور نیز ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں صحیح سند کے ساتھ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام ہند میں اتارے گئے اور ان کے ساتھ ایک اہرن، سنی (گرم لوہا پکڑنے والا اوزار) اور ہتھوڑا تھا اور حواء جدہ میں اتاری گئیں۔

حجر اسود اور حد حرم

اور ابن جریج کی روایت سے وارد ہے کہ حجر اسود بھی آدم علیہ السلام کے ہمراہ بہشت

سے آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی ان کے ہمراہ بہشت سے آیا اور یہ ایک عصا تھا جو کہ بہشتی درخت آس کا تھا جس کا طول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد مبارک کے مطابق دس گز تھا اور جب حضرت آدم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کا حج ادا کیا تو حجر اسود کو جبل ابوقبیس پر رکھ دیا اور وہ پتھر تاریک راتوں میں چاند کی طرح چمکتا تھا جہاں تک اس کی شعاع پڑی وہیں تک حرم کی حد مقرر ہوئی۔

نام مصطفیٰ وجہ تسکین آدم علیہما الصلوٰۃ والسلام

اور طبرانی' ابونعیم اور ابن عساکر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے نکل کر زمین پر آئے تو آپ کو بہشت وحشت سی طاری تھی۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر بلند آواز سے اذان دی جب کلمہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پر پہنچے تو یہ نام سن کر آدم علیہ السلام کو بہت انس اور اطمینان پہنچا اور وحشت دور ہوگئی۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ ابن ابی حاتم نے روایت کی ہے کہ بہشت سے دنیا میں آنے کے وقت حضرت آدم علیہ السلام اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں زانوؤں پر رکھ کر اپنے سر کو دونوں زانوؤں کے درمیان ڈال کر شرمساروں کی طرح گردن جھکائے ہوئے تھے۔ اور شیطان نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان پنجہ کیا۔ اور انہیں اپنی کوکھ پر رکھ کر اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کر کے حیرت زدوں کی شکل میں متکبرانہ انداز میں نیچے آیا تھا۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی منصف میں حمید بن بلال سے روایت کی کہ اپنے ہاتھ کو نماز میں اپنے کھوکھ پر رکھنا اسی لئے مکروہ ہے کہ زمین پر اترنے کے وقت شیطان اسی شکل میں آیا تھا اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کی کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو بہشت سے لائے ان کے ہمراہ قسم قسم کے بیج دیئے۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام اترنے کے بعد غم و اندوہ اور فکر توبہ کی وجہ سے ان بیجوں سے غافل ہوگئے۔ ابلیس نے اس وقت فرصت پا کر ان بیجوں تک اپنا ہاتھ پہنچایا جس بیج کو اس کا ہاتھ لگا وہ نفع سے خالی ہوگا۔ اور اس میں ایک قسم کی زہر پیدا ہوگئی۔ اور جو اس کی دسترس سے محفوظ رہا اس کی منفعت برقرار ہے۔

اوران میں سے یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بہشت میں کبھی پاخانے کی حاجت نہ ہوئی تھی جب زمین پر آئے تو پہلی چیز جو کھائی مالٹے کا پھل تھا انہیں پیٹ میں حاجت براز ہوئی' نہایت حیران ہوئے۔ اور دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ اور جانتے نہ تھے کہ کیا کیا جائے۔ تاکہ یہ حاجت دور ہو حضرت جبریل علیہ السلام آئے۔ اور آپ کو قضائے حاجت کا طریقہ بتایا جب بدبو محسوس ہوئی تو آپ پر گریہ زاری غالب ہوئی۔ اور ستر دن تک اسی ماجرا پر روتے رہے۔ اسی طرح اسے ابن ابی الدنیا نے کتاب البکاء میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کیا۔ اور ابن عساکر نے جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ کے طریقہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کو پیدا فرمایا تو اس میں سونے اور چاندی کو پیدا نہ فرمایا تو جب حضرت آدم وحوا اترے تو ان کے ہمراہ سونا چاندی بھی اتارا تو ان کے بعد ان کی اولاد کے نفع کے لئے اسے زمین میں چشمے کی شکل میں جاری فرمایا۔

تمام رسل علیہم السلام کے پیشوں کا بیان

اور دیلمی مسند الفردوس میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور علیہ السلام سے روایت لائے کہ سب سے پہلے جس نے کپڑا بنا حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی۔ اور ابن عساکر نے بھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کاشتکاری کرتے تھے۔ اور اپنی روزی اسی پیشے سے کماتے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام بڑھئی تھے۔ اور حضرت ادریس درزی اور حضرت ہود اور حضرت صالح علیٰ نبینا وعلیہم السلام دونوں تجارت کرتے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی کاشتکاری کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام مال مویشی والے تھے۔ اور اپنے جانوروں کے دودھ' نسل' اون اور ریشم سے سلسلہ معاش چلاتے تھے۔ اور حضرت لوط علیہ السلام بھی کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ عرصہ بکریاں چراتے رہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام زرہیں بناتے تھے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام خواص تھے۔ اور خواص وہ ہے جو درختوں کے پتوں سے مختلف چیزیں بنے

جیسے زنبیل' چٹائی اور پنکھا اور باوجودیکہ آپ کو ساری زمین کی بادشاہی عطا فرمائی گئی تھی اپنے ہاتھ کی کمائی کے سوا نہیں کھاتے تھے۔ اور ہر مہینے نو روزے رکھتے' تین روزے مہینے کے ابتداء میں' تین درمیان میں اور تین مہینے کے آخر میں اور اس زہد کے باوجود آپ کی قوت مردمی اس قدر تھی کہ سات سو کنیز اور تین سو منکوحہ بیوی تھی جو کہ آپ کے محل میں تھی جن ہیں آپ مشرف فرماتے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سیاح تھے۔ اور کسی پیشے سے کسب معاش نہیں فرماتے تھے۔ اور نقد اور جنس سے کوئی چیز آنے والے کل کیلئے ذخیرہ نہیں فرماتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ جس نے مجھے صبح کا کھانا کھلایا ہے شام کا کھانا بھی کھلائے گا اور جو مجھے شام کا کھانا کھلائے گا صبح کا کھانا بھی کھلائے گا اور اس سب سیر و سیاحت کے باوجود ساری رات بیداری فرماتے اور روزانہ روزہ رکھتے تھے۔

اور حضور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشہ جہاد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عمر کے آخر میں آپ کا رزق آپ کے نیزے کے سایہ کے نیچے کر دیا تھا۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام مقبول التوبہ ہوئے۔ حضرت جبریل علیہ السلام آئے۔ اور آواز دی کہ اے زمین کے جانورو! اللہ تعالیٰ نے تم پر خلیفہ کو بھیجا ہے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ دریائی جانوروں نے اپنے سر اوپر کئے اور اطاعت اور فرمانبرداری کا اظہار کیا۔ اور جنگل کے سب جانور حضرت آدم علیہ السلام کے اردگرد آ کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام ہر جانور کو اپنے پاس بلاتے تھے۔ اور اس کے سر اور پشت پر ہاتھ مبارک پھیرتے تھے۔ اور جنگل کے جانوروں میں سے جو حضرت آدم علیہ السلام کے قریب آئے۔ اور آپ کا ہاتھ انہیں لگا وہ اہلی جانور ہو گئے کہ ان کی گزر بسر آدمیوں کے درمیان ہے۔ جیسے گھوڑا' اونٹ' گائے' بکری' کتا اور بلی جس نے اپنے آپ کو کھینچ کر رکھا اور حضرت آدم علیہ السلام کے قریب نہیں آئے۔ اور آپ کے دست مبارک کی برکت نہیں پائی وحشی رہے کہ بنی آدم سے نفرت کرتے ہیں۔ جیسے نیل گاؤ' گورخر اور ہرن وغیرہ

حضرت آدم علیہ السلام کی اپنی اولاد کیلئے دعا

اور ان میں سے یہ ہے کہ توبہ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں

عرض کی کہ اے رب کریم! تیرے اس بندے ابلیس اور میرے درمیان دشمنی پکی ہوگئی اگر تو میری اور میری اولاد کی مدد نہ فرمائے تو ہمیں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری اولاد میں کوئی پیدا نہ ہوگا۔ مگر میں اپنے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ اس کے ساتھ مقرر کروں گا تا کہ اسے اس دشمن کے وسوسہ سے بچائے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی بار خدایا! میں اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بدی کا بدلہ ایک بدی اور ایک نیکی کی جزا دس نیکیاں دوں گا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی بار خدایا! میں اس سے بھی زیادہ چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری اولاد کیلئے میں توبہ کا دروازہ کھلا رکھوں گا جب تک کہ ان کے جسم میں روح ہے۔ توبہ مقبول ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی اب مجھے کافی ہے۔ جب ابلیس کو اس معاملہ کا پتہ چلا تو اس نے پوری عاجزی اور زاری سے بارگاہ الوہیت میں عرض کی کہ بار خدایا! اپنے اس بندے کی جو کہ میرا دشمن ہے۔ تو نے اس قدر امداد کی اب مجھے اس کے اغوا پر کس قسم کی قدرت ہوگی۔ میری بھی مدد فرما حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اولاد آدم میں سے ہر ایک کے ساتھ تیرا بھی ایک فرزند وجود میں آئے گا جو کہ ساری عمر اسے گمراہ کرنے میں مصروف رہے گا۔ ابلیس نے عرض کی اس سے زیادہ مدد چاہتا ہوں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تجھے اور تیری اولاد کو میں نے قدرت دی کہ خون کی جگہ بنی آدم کی رگوں اور پوست میں داخل ہوں۔ اور ان کے سینوں اور دلوں میں آشیانہ بنائیں۔ ابلیس نے عرض کی کہ اس سے بھی زیادہ چاہتا ہوں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تجھے قدرت دی کہ بنی آدم میں سے ہر ایک پر اپنا لشکر سوار اور پیادے جمع کرے۔ اور ان پر ہر طرف سے تو ہجوم کرے۔ اور ان کے اموال اور اولاد میں تو شریک ہو اسی طرح اسے ابن ابی الدنیا نے مکاید الشیطان میں اور ابن المنذر نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔

چار باتوں کی حفاظت کرو

اور ان میں سے یہ ہے کہ امام احمد اور بیہقی نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے اور ابن ابی کر نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے کہ توبہ کے بعد حضرت آدم علیہا السلام کو وحی ہوئی کہ چار باتوں کی حفاظت کرو اور اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو یہ پہنچاؤ۔

ان چار میں سے ایک میرا حق آپ کے ذمہ ہے۔ دوسرا تمہارا حق میرے ذمہ، تیسرے وہ معاملہ جو میرے اور تیرے درمیان ہے۔ چوتھے وہ معاملہ جو تیرے اور مخلوق کے درمیان ہے اور میرا جو حق تیرے ذمہ ہے یہ ہے کہ تو میری عبادت کرے۔ اور کسی کو میرے ساتھ شریک نہ ٹھہرائے اور جو تیرا حق میرے ذمہ کرم پر ہے وہ یہ ہے کہ تیرے اعمال کی پوری پوری جزا تجھ تک پہنچاؤں اور کسی قسم کا ظلم اور کمی نہ کروں اور جو معاملہ میرے اور تیرے درمیان جاری ہے۔ تو تیری طرف سے مانگنا اور دعا کرنا ہے اور میری طرف سے قبول کرنا اور عطا کرنا ہے اور وہ معاملہ جو تیرے اور مخلوق کے درمیان ہے۔ تو وہ یہ ہے کہ جو چیز تو اپنے لئے پسند نہ کرے دوسروں کیلئے پسند نہ کر۔ اور جو سلوک تو چاہے کہ لوگ تجھ سے کریں تو بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کر۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ خطیب اور ابن عساکر نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے آخری عمر میں جب آپ کی اولاد چالیس ہزار آدمیوں تک پہنچ گئی خاموشی اختیار فرمائی اور کم بولنا لازم کرلیا۔ آپ کی ساری اولاد آپ کے پاس جمع ہوگئی۔ اور عرض کی کہ اے ہمارے والد بزرگوار! کیا بات ہے کہ آپ ہمارے ساتھ بات نہیں فرماتے ہم سے اگر آپ کے بارے میں کوئی کوتاہی یا گناہ صادر ہوا ہو تو ہمیں بتائیں تاکہ ہم توبہ کریں۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام بولے اور فرمایا اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک فعل کی وجہ سے بہشت سے زمین پر اتار دیا اور میری ساری عمر اسی فکر میں گزر گئی کہ کسی حیلے سے اپنے آپ کو پھر اسی مقام پر پہنچاؤں اب مجھے وحی آئی ہے کہ گفتگو کم کردے تاکہ تو میرے پڑوس میں پہنچے۔

اور ابن صلاح نے اپنی امالی میں محمد بن نصر سے روایت کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کی کہ اے رب کریم میں چاہتا تھا کہ میری عمر کے سانس سب تیری حمد اور تسبیح میں گزریں لیکن تو نے مجھے ہاتھ کی کمائی میں مصروف کردیا جو کہ میں کھیتی باڑی میں کرتا ہوں۔ پس مجھے ایسی چیز کی تعلیم فرما جو کہ مخلوق کی سب تسبیح وحمد کی جامع ہو۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی صبح اور شام کے وقت ان کلمات کو تین بار کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ

الْعَالَمِيْنَ حمدا يوافى نعمه ويكافى مزيد كرمه کیونکہ یہ کلمات حمد و تسبیح کی ساری قسموں کو شامل ہیں۔

اور ابوالشیخ نے قتادہ سے روایت کی کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ساری زندگی بارش کا پانی استعمال فرمایا۔ اور زمین کا پانی کبھی نوش نہ فرمایا۔ اور ابن ابی شیبہ نے کعب احبار سے روایت کی سب سے پہلے جس نے روپیہ اور اشرفی بنائی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور سونے اور چاندی کو چیزوں کی قیمت میں آپ نے رائج فرمایا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی وفات اور مدفن کا بیان

ابن سعد، حاکم اور دوسرے محدثین نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے انہوں نے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت نزدیک پہنچا تو آپ پر بہشتی پھل کھانے کی خواہش نے غلبہ کیا۔ اور خود کمزوری اور قوت گھٹنے سے حرکت نہیں کر سکتے تھے اپنے بیٹوں سے فرمایا جاؤ اور میرے لئے اللہ تعالیٰ سے بہشتی پھل طلب کرو اور اس وقت آدم علیہ السلام کی اولاد کی عادت یہ تھی کہ جب بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی مطلب مانگتے تھے تو کعبہ معظمہ کی سرزمین میں آتے۔ اور دعا کرتے تھے۔ اور حاجت پوری ہو جاتی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے اسی مقصد کیلئے باہر آئے۔ حضرت جبریل اور دوسرے فرشتے علیہم السلام انہیں ملے اور نکلنے کا مقصد پوچھا۔ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی فرمائش کا ماجرا بیان کیا فرشتوں نے کہا کہ واپس ہمارے ساتھ آؤ کہ ہم خود بخود تمہارا مطلب لے کر آئے ہیں جب حضرت آدم علیہ السلام کے پاس پہنچے تو حضرت حواء نے فرشتوں کو دیکھتے ہی وفات کا ڈر محسوس کیا۔ اور پے در پے حضرت آدم علیہ السلام کے قریب ہوتی گئیں حتیٰ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں قدرے تلخی سے فرمایا کہ اس وقت مجھ سے علیحدہ رہو کہ مجھے جو کچھ تکلیف پہنچی تیری وجہ سے پہنچی۔ میرے اور میرے پروردگار کے فرشتوں کے درمیان حائل نہ ہو۔ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی روح مبارک قبض کی۔ اور انہوں نے کہا کہ آدم علیہ السلام کے بیٹو! دیکھو ہم تمہارے والد بزرگوار کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اپنے فوت ہونے والوں کے ساتھ یہی سلوک تمہیں کرنا

ہوگا۔ حضرت جبریل علیہ السلام ایک مرکب خوشبوار گجہ (ایک قسم کی خوشبو ہے جو کہ صندل گلاب، مشک کافور، عنبر اور چنبیلی کے تیل ملا کر بناتے ہیں) کی مانند بہشتی حلوں کا ایک کفن اور بہشت کی بیریوں سے پتے لائے اور حضرت آدم علیہ السلام کو غسل دیا اور کفن پہنایا اور خوشبو لگائی۔ اس کے بعد انہیں اٹھا کر کعبہ شریف میں لائے۔ اور آپ پر نماز جنازہ ادا کی۔ اور مسجد خیف کے ساتھ دفن کیا۔

اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آدم علیہ السلام پر نماز پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو مسجد خیف میں نماز پڑھائی اور آپ کو قبلہ کی طرف سے اتارا اور آپ کیلئے لحد بنائی اور آپ کی قبر کوہان دار بنائی۔

جنت میں حضرت ہارون کی ریش ہوگی

اور ابن عساکر نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی کہ آدم علیہ السلام کیلئے بغلی قبر بنائی گئی اور طاق گنتی سے آپ کو غسل دیا گیا۔ اور ابن عساکر عطاء خراسانی سے لائے کہ حضرت حواء رضی اللہ عنہما نے سات دن تک حضرت آدم علیہ السلام کا سوگ کیا۔ اور روتی رہیں۔ اور ابوالشیخ' ابن عدی اور ابن عساکر جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ بہشت والوں میں سے ہر ایک کو اس کے نام کے ساتھ پکاریں گے مگر آدم علیہ السلام کو ان کی کنیت سے پکاریں گے۔ اور کہیں گے اے ابا محمد! اور بہشت میں کسی کی داڑھی اور مونچھیں نہیں ہوں گی سوائے حضرت ہارون علیہ السلام کے کہ ان کی ریش مبارک ناف تک ہوگی۔

اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کی کنیتیں نہیں ہوں گی سوائے آدم علیہ السلام کے کہ تعظیم و توقیر کے طور پر ان کی کنیت ابو محمد ہوگی۔ اور ابوالشیخ نے اسی مضمون کو بکر بن عبداللہ المزنی سے روایت کیا۔ اور ابن عساکر غالب بن عبداللہ عقیلی سے روایت لائے کہ آدم علیہ السلام کی کنیت دنیا میں ابوالبشر اور جنت میں ابو محمد ہے۔

حضرت آدم کا مزار منیٰ میں اور حواء کا جدہ میں ہے

اور ابوالشیخ نے خالد بن معدان سے روایت کی کہ حضرت آدم علیہ السلام کا اترنا ہند میں تھا اور وفات کے بعد انہیں اٹھا کر خانہ کعبہ کے متصل لائے۔ اور آپ کی اولاد سے ایک سو پچاس آدمی باری باری اٹھانے کی خدمت پر مقرر تھے۔ اور ابوالشیخ' مجاہد سے لائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مزار شریف منیٰ کی جگہ ہے مسجد خیف میں اور حضرت حواء کی قبر جدہ میں ہے۔

ابلیس ملعون کی کتاب' قرآن' رسول اور مسجد

اور ان میں سے یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو فرمایا گیا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ابلیس نے بارگاہ خداوندی میں عرض کی یا اللہ آدم کے ساتھ کرامت کا وعدہ فرمایا۔ اور اس کی اولاد کیلئے تو نے کتاب' رسول' علم' رہنے کی جگہ' کھانا پینا اور اچھی آواز عنایت فرمائی مجھے ان چیزوں میں سے تو نے کیا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری کتاب وشم ہے۔ یعنی بدن کو سوئی وغیرہ سے نیلگوں کرنا اور تیرا قرآن شعر ہے' تیرے رسول کاہن' برہمن وغیرہ ہیں تیرا علم جادو ہے۔ اور تیرا کھانا ہر وہ مردار ہے جس کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اور تیرا پینا ہر وہ شے ہے جو نشہ کردے۔ جیسے بھنگ' پوست کا پانی اور شراب۔ اور تیرا ٹھکانہ حمام ہے۔ اور تیری بات جھوٹے افسانے تیرا موذن مزامیر اور بربط اور تیری مسجد بازار اور تیری آواز گھنٹی کی آواز ہے۔ تیرے شکار کا جال عورتیں ہیں۔ ابلیس نے کہا حسبی حسبی یعنی یہ اسباب میری زندگی میں کافی ہیں۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پڑوس سے دور ہو گئے آپ کو اس قرب ومنزلت سے جدائی کی وحشت لاحق تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کعبہ کی جگہ نشان دیا کہ وہاں بیت المعمور کی طرح ایک گھر بنائیں جو کہ آسمان میں ہے۔ اور اس کے ارد گرد طواف کریں جس طرح کہ آپ نے فرشتوں کو دیکھا تھا کہ بیت المعمور کے گرد طواف

کرتے تھے۔ اور اس گھر کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ جس طرح کہ بیت المعمور کی طرف منہ کر کے فرشتے نماز ادا کرتے تھے۔ اسے طبرانی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔ اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ حضرت آدم علیہ السلام نے سرزمین ہندوستان سے چالیس حج پیدل چل کر ادا کئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت آدم علیہ السلام پر اعتراض کرنا اور ان کا جواب

اور ان میں سے یہ ہے کہ صحیحین اور دوسری صحاح ستہ میں اس واقعہ کی اصل وارد ہے۔ اور بیہقی نے اسماء وصفات میں' واحدی نے کتاب الشریعت میں اور ابوداؤد حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے اس طرح لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی یا الٰہی مجھے حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات میسر فرما تا کہ میں ان سے پوچھوں کہ انہوں نے ہمیں اور اپنے آپ کو بہشت سے نکال کر مصیبت و تکلیف کی جگہ کیوں ڈالا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے ظاہر فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کے طور پر کہا کہ آپ وہی حضرت آدم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ میں اپنی خاص روح پھونکی۔ ہر چیز کے اسماء کی آپ کو تعلیم دی۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ آپ کو سجدہ کریں۔ اور بہشت میں آپ کو سکونت عطا فرمائی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا ہاں میں وہی ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ کو کیا وجہ بنی کہ آپ نے خود کو اور ہم سب کو بہشت سے نکال کر زمین میں ڈال دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے جب یہ اعتراض سنا تو فرمایا پہلے یہ بتائیں کہیں کہ آپ کون ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں موسیٰ ہوں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا وہی موسیٰ کہ آپ سے رب تعالیٰ نے ہمکلامی فرمائی' اپنی رسالت کے ساتھ چن لیا اور آپ کو مناجات کے مرتبہ سے سرفراز فرمایا۔ اور تورات عطا فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے کہاہاں میں وہی ہوں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا۔ پس صحیح کہنا کہ میرے معرض وجود میں آنے سے کتنی مدت پہلے تورات لکھی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ کے وجود سے دو ہزار سال پہلے تورات لکھی گئی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ آیا تورات میں یہ موجود تھا کہ وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهٗ یا نہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہاہاں موجود تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا تو پھر آپ اس بات پر کیسے ملامت کرتے ہیں جو کہ میری پیدائش سے دو ہزار سال پہلے مقدر اور لکھی ہوئی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعہ کو نقل فرمانے کے بعد فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آئے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام خاموش ہو گئے۔

مذکور الصدر واقعہ میں اشکال اور اس کا حل

اور اس واقعہ میں عوام الناس کو ایک بہت بڑی دشواری پیش آئی کہ اگر اس قسم کی گفتگو صحیح ہے۔ تو لازم آتا ہے کہ ہر خطا کار اپنے نصیحت کرنے والے کو خاموش کر دے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بالکل بند ہو جائے۔ کیونکہ جو کچھ ہونا ہے اچھا ہے یا برا وہ نیکوں اور بروں کی خلقت سے پہلے ہی مقرر اور لکھا ہوا ہے۔ اور نیکی اور بدی کی تقدیر مجبوری کا باعث ہے۔ بلکہ تقدیر وقوع کے تابع ہے جو واقعہ ہونے والا تھا وہی مقدر فرمایا گیا خواہ اختیار سے ہو یا بے اختیار۔

اور اس مشکل کا حل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غرض یہ نہ تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے فعل پر انکار فرمائیں کیونکہ خطا پر انکار کرنا مکلف ہونے کے وقت ہوتا ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام اس وقت نہ مکلف تھے نہ گناہ کے مرتکب اور نہ ہی اپنے سے صادر شدہ فعل پر راضی اور نہ ہی یہ کام کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اور گناہ پر انکار کرنے کی وجوہ انہیں امور میں منحصر ہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس سوال سے غرض صرف عار دلانا تھا کہ آپ سے یہ کام کیوں صادر ہوا۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے اس عار دلانے والے سوال کو تقدیر کے حوالے سے دفع فرمایا۔ اور شریعت کا قابل عمل طریقہ یہی ہے کہ تائب شدہ کو اس سے صادر شدہ گناہ کے ساتھ عار نہیں دلانا چاہئے۔ اور اس سے گناہ کے صادر ہونے کو تقدیر

کے حوالے کر دینا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مکلف ہونے کے اوقات میں ہوتا ہے نہ کہ موت کے بعد۔ نیز عار دلانا اور سرزنش کرنا اس گناہگار کے لائق ہے جو کہ اپنے گناہ پر نادم نہ ہوا ہو۔ اور اگر طاقت پائے تو پھر اسی گناہ کا ارتکاب کرے۔ اور جب ان میں سے کچھ بھی متحقق نہیں تو عار دلانا اور سرزنش کرنا درست نہیں۔

اور ایک عارف کی زبان سے سنا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کی فروگذاشتیں اگرچہ بظاہر ذنب کے ہم رنگ ہوں۔ لیکن ان میں معنوی طور پر بے شمار حکمتیں اور اسرار چھپے ہوتے ہیں۔ پس ان ذلتوں پر عار دلانے اور سرزنش کرنے کا کام اس کا ہے جو ان حکمتوں اور اسرار سے بے خبر ہو نہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسوں کا کام۔ اس لئے حضرت آدم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے تمام مناقب کے ساتھ تعریف کر کے اس الزام کو اس پر ڈھالا کہ "کیا آپ مجھے ایسے کام پر ملامت کرتے ہیں جو کہ میری تخلیق سے پہلے مقدر ہو چکا تھا۔ پس آدم علیہ السلام کی کلام کا حاصل یہ ہے کہ آپ جیسے کامل عرفان کے مرتبہ پر فائز شخص سے بعید ہے کہ اس سراسر حکمت پر مبنی ذلت کو میری طرف منسوب کریں۔ اور حکیم کے فعل سے جو کہ اس کے ضمن میں چھپا ہوا ہے بے توجہی اختیار کریں۔ اور نہ جانیں کہ میری خلقت' زمین پر خلافت۔ اوامر و نواہی کو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکلیفی احکام کو میری اولاد پر جاری کرنے کیلئے تھے۔ اگر میں اس فعل کا مرتکب نہ ہوتا تو یہ کارخانہ کس طرح صورت پکڑتا اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے (بیت) پاکوں کے کام کو اپنے قیاس سے نہ پکڑ اگرچہ لکھنے میں شیر اور شیر کی صورت ایک ہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قسم کے مؤاخذات ہیں جو کہ ان کے کمال کے مقتضی تھے نہ کہ عرفان میں نقصان کی دلیل۔ ان میں سے وہ تین حکایات ہیں جو کہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے وقت پیش آئیں۔ جیسا کہ یہ حکایات سورۃ الکہف کے آخر میں منقول ہیں۔

بنی اسرائیل کے عہد کا بیان

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات سے۔ کفار سے قرآن پاک کا مقابلہ

طلب کرنے اور ان کے اس سے عاجز ہونے' پھر ابلیس کی حالت یاد کرانے جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کے نص صریح کے ساتھ ثابت ہونے کے باوجود اور تمام فرشتوں کے حضرت کے مقابلہ میں عاجز ہونے حقائق الٰہیہ اور کائنات کے اسماء بیان کرنے سے عاجز ہونے کے باوجود وہ مطیع اور فرمانبردار نہ ہوا اور اس نے انکار اور تکبر کیا۔ پھر اس عہد کے ذکر کرنے کے ساتھ جو کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے ان کی توبہ قبول کرنے اور انہیں زمین میں سکونت پذیر کرنے بعد ان سے لیا گیا فارغ ہوئے۔ تو بنی اسرائیل کو ان کے اسلاف کے عہد یاد کرانا کئی وجہ سے ضروری ہوا جو کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ باندھے تھے پہلی وجہ یہ کہ وہ بنی آدم کے تمام فرقوں سے انبیاء علیہم السلام کی شفاعت کی وجہ سے ممتاز تھے۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چار ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے۔ اور ان کے پیغمبروں علیہم السلام میں سے بعض بادشاہوں کی صورت میں گزرے ہیں جسے حضرت داؤد اور سلیمان علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ التسلیمات اور بعض علماء و مشائخ کی صورت میں جیسے حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام اور بعض مملکت کے وزیروں اور مشیروں کی صورت میں جیسے شمویل علیہ السلام اور بعض زاہدوں اور راہبوں کی صورت میں جیسے یونس علیہ السلام' انہیں ممکن تھا کہ لوازمات نبوت کو مختلف رنگوں میں پہچانیں اور اسے ایک وضع اور ایک شکل کے ساتھ مقید نہ سمجھیں۔ تا کہ انبیاء علیہم السلام کی حقیقت سے بے خبر لوگ ان کی گواہی کی وجہ سے پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق سمجھ کر اطاعت کریں۔ نیز ان کے پاس کتب الٰہیہ اور علوم انبیاء علیہم السلام کے بقایا سے بہت سے دلائل اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے برحق ہونے پر موجود ہیں۔ اور جس وقت مدعی اور مدعا علیہ کچہری میں حاضر ہوں۔ اور نوبت گواہی پر آپہنچے تو گواہی کا اظہار گواہوں پر لازم اور فرض ہوتا ہے۔ پس اس وقت روئے زمین پر موجود فرقوں کی نسبت سے بنی اسرائیل کے فرقوں کی حیثیت دفاتر کے منشیوں کی ہے کہ سب لوگوں کیلئے صحیح و غلط اور مناصب و خدمات کی سندوں کے اصل یا جعلی ہونے میں ان کا قول معتبر اور گواہی مقبول ہے اگر اس قسم کے لوگ ضرورت کے وقت حق کا اظہار نہ کریں تو

حق تلفی جو سارے لوگوں سے واقع ہوئی ہے کا اس وبال انہیں کی گردن پر ثابت ہوتا ہے۔ اور ان کا خاموش رہنا ناواقفوں کے ذہن کو شک میں ڈالنے کا موجب ہوتا ہے۔ اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اگر یہ شخص اس منصب کے دعویٰ میں جعلی ہونے سے اور دھوکے سے بری ہوتا تو یہ لوگ اس کے سچا ہونے کے متعلق گواہی دیتے۔

دوسری وجہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے عہد سے لے کر اب تک نوع انسان کے اگرچہ بے شمار افراد اور کثیر اشخاص منصب عزت پر فائز ہوئے۔ لیکن عنایت الٰہی نے چند بار اس نوع کو نگاہ انتخاب سے نوازا۔ پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے وقت کہ سب زمین والے شرک اور بت پرستی کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے۔ اور ان کی استعدادات کی زمین میں باطل اعتقادات نے اس قدر جڑیں پکڑ لی تھیں کہ انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی طویل دعوت سے جو کہ ہزار سال کے قریب لمبی ہو گئی تھی کوئی اصلاح قبول نہ کی۔ انتخاب الٰہی کی نظر نے ان تمام فاسد نفوس کو طوفان کی چھری کے ساتھ مکمل طور پر صفحہ وجود سے مٹا دیا اور حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کا نچوڑ باقی رکھا۔

دوسری بار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں جبکہ کواکب پرستی' صابیت اور ملاحظہ اسباب کی گرفتاری نے زمین والوں کے ذہنوں میں اس قدر رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ سبب کا لحاظ کرنے سے بالکل غافل ہو چکے تھے۔ دوسرے انتخاب کی نظر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکاروں کو جو کہ ہر باطل دین سے بیزار مخلص مسلمان تھے ممتاز فرمایا۔ اور ان کیلئے ایسے طریقے مقرر فرمائے جو کہ حقانیت کے دلائل تھے جیسے ختنہ' غسل' جنابت' جسمانی طہارت کی دوسری قسمیں' خانہ کعبہ کا حج' حیوانات کی قربانی' اولاد کے عقیقے اور دوسری ایسی رسمیں جو کہ ہر حال میں ذہن کو بدن' اموال اور اولاد کے معاملات میں ذات حق کی طرف متوجہ کرتی تھیں۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت تیسرے انتخاب کی نظر کی توجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے فرقہ بنی اسرائیل کے حال پر ہوئی۔ اور انہیں اپنے محرر مقرر فرمایا تا کہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور احکام کے محافظ ہوں۔ اور وحی لانے والے ملائکہ کو اسی

خاندان میں اترنا اور آنا جانا رہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اسی جماعت سے مبعوث ہوں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ کے وقت یہ نظر بنی اسماعیل سے قریش کے گروہ پر متوجہ ہوئی۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہی تھے۔ اور اس منصب کا منتقل ہونا بنی اسرائیل کو بہت ناگوار گزرا اور ان کے حسد کی رگ نے حرکت کی۔ پس لازم ہوا کہ پہلے بنی اسرائیل کو ان کی برائیوں اور عیبوں پر مطلع کیا جائے۔ تا کہ ان کے نزدیک اور باقی سننے والوں کے نزدیک یہ بات دلیل سے ثابت ہو جائے کہ اس فرقہ کی استعداد باطل ہو گئی تھی اور اس خدمت کی ان میں بالکل صلاحیت نہیں رہی تھی تا کہ یہ معزول ظاہر بینوں کی نظر میں ایک اٹکل اور زبردستی نہ ہو بلکہ کئی حکمتوں پر مبنی ہو۔

تیسری وجہ یہ کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ معظمہ میں تھے زیادہ تر مناظرہ اور مکالمہ قریش کے ساتھ تھا۔ کیونکہ وہاں ان کے علاوہ کوئی اور گروہ نہیں رہتا تھا اور جب مدینہ منورہ میں ہجرت فرمائی تو زیادہ تر بنی اسرائیل کی صحبت اور انہیں سے ہم کلامی رونما ہوئی۔ اور تمام عرب اس معاملہ کے منتظر تھے اس لئے کہ بنی اسرائیل کو اہل کتاب اور ان کاموں کو پہچاننے والا جانتے تھے۔ اور جب بنی اسرائیل اس پیغمبر علیہ السلام کی اطاعت سے پھر گئے تو گمان یہ ہوا کہ سب لوگوں کو ایک قسم کا شک اور شبہ پڑ جائے اس بنا پر بنی اسرائیل کی پرانی اور نئی قباحتوں کا ذکر ضروری ہوا تا کہ ان کا قول اور فعل لوگوں کی نظر میں اعتبار کے مقام سے گر جائے۔ اور استدلال کے لائق نہ رہے۔

چوتھی وجہ یہ کہ مخلوق کے تمام فرقوں میں سے بنی اسرائیل انبیاء علیہم السلام کی ولادت کی وجہ سے فخر ومباہات کرتے تھے۔ اور جو شخص بزرگوں کی نسبت کا فخر کرے اسے چاہئے کہ پہلے اپنے نفس کو سنوارے اور اپنی ظاہری باطنی خرابیوں کی اصلاح کرے تا کہ الولد سرلابیہ (بیٹا اپنے باپ کا راز ہے) کے حکم کے مطابق اس کے نسب کے صحیح اور فخر کے درست ہونے کی دلیل ہو سکے ورنہ اس کا حال اس کے دعویٰ کے خلاف ہوگا۔ اور وہ اپنی زبان سے خود ملزم ہوگا ان امور کی بنیاد پر پہلے تمام زمین والوں کو خطاب فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ اور جو نعمتیں کہ تمام بنی آدم کو عام ہیں زمین وآسمان کی خلقت سے لے کر

حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت' انہیں بہشت میں داخل کرنے اور انہیں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے تک یاد کرائیں۔ اس کے بعد اس فرقہ کی طرف توجہ فرماتے ہوئے وہ خاص نعمتیں جو کہ ان کے اسلاف پر گزری تھیں ان نعمتوں کی ناشکری اور اپنے اطوار کو بدلنے کا کام جو ان سے صادر ہوا یاد کرایا۔ چنانچہ فرمایا ہے:

اسرائیل کا معنی اور دیگر متعلقات

یَـا بَنِـیْ اِسْـرَآئِیْلَ اے یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کے بیٹو! اور اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ اور اسرا کا معنی عبرانی لغت میں بندہ ہے۔ اور ئیل بمعنی اللہ ہے۔ پس اس کلمہ کا معنی عبداللہ ہوا اور عبد بن حمید نے ابومجلز سے روایت کی کہ دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام کیلئے جو نام حضرت اسحاق علیہ السلام نے معین فرمایا یعقوب تھا۔ اس بنا پر کہ حضرت یعقوب اور حضرت عیص ایک ہی دفعہ توام یعنی جوڑے پیدا ہوئے۔ حضرت عیص پہلے ظاہر ہوئے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے بعد۔ حضرت اسحاق علیہ السلام نے ان کا نام یعقوب رکھا کیونکہ حضرت عیص کے عقب میں یعنی بعد پیدا ہوئے۔ اور عبرانی زبانی میں یعقوب کا معنی پیچھے آنے والا ہے۔ اور ان کا یہی نام جاری تھا۔ یہاں تک کہ آپ جوانی کے قریب پہنچے۔ ایک دن حضرت اسحاق علیہ السلام خلوت خانہ میں تھے۔ اور آپ نے یعقوب علیہ السلام کو خلوت خانہ کے دروازے پر بٹھا دیا تا کہ اس خاص وقت میں کوئی نامحرم بیگانہ نہ آئے۔ اور بارگاہ الوہیت میں مناجات میں تشویش نہ ڈالے اچانک درگاہ الٰہی کے مقرب فرشتوں میں سے ایک فرشتہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی زیارت کیلئے آدمی کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس نے چاہا کہ خلوت خانہ میں داخل ہو آپ اس سے اور وہ آپ سے الجھنے لگا اور آپ نے اسے اندر نہ آنے دیا یہاں تک کہ حضرت اسحاق علیہ السلام خلوت خانہ سے باہر تشریف لائے۔ اور دیکھا کہ آپ مقرب فرشتے کے ساتھ جھگڑ رہے ہیں۔ آپ نے اس فرشتے سے معذرت شروع کر دی۔ اس فرشتے نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی تحسین و آفریں کی۔ اور کہا خدمت کا حق اسی طرح بجالانا چاہیے۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام سے کہا کہ آپ کے اس صاحبزادے کا کیا نام

ہے۔ آپ نے فرمایا یعقوب۔ فرشتے نے کہا کہ ہماری طرف سے اس بیٹے کا نام اسرائیل مقرر کریں کیونکہ ہماری زبان میں اسرا برگزیدہ آدمی کو کہتے ہیں۔ اور ئیل بمعنی خدا اور آپ کا یہ بیٹا مرد خدا ہے کہ بالکل کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اس وقت سے آپ کا نام اسرائیل جاری ہو گیا۔ اسی لئے یہ نام فرشتوں کے ناموں کے مشابہہ ہے۔ جیسے جبرئیل' میکائیل۔ یا اولاد یعقوب کے بجائے اس نام سے خطاب کرنا یہ جتلانے کیلئے ہے کہ تم اس مرد خدا کے بیٹے ہو جو کہ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ تھا۔ اور باپ کے فرمان کا حق ادا کرنے میں اس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ اور کسی چیز کا لحاظ نہ کیا۔ تمہیں بھی چاہئے کہ الولد سر لابیہ کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنے اور اس کا فرمان بجالانے میں دنیا کے چلے جانے کی پرواہ نہ کرو اور مرتبہ اور ریاست کے زوال سے نہ ڈرو اور اگر اس کام میں تم کوتاہی کرو گے تو تم اپنے باپ کے طریقے کی مخالفت کرو گے۔ اور اپنے نسب کے صحیح ہونے میں خلل ڈالو گے۔

اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ قرآن پاک میں مذکور و مشہور انبیاء علیہم السلام تمام بنی اسرائیل میں سے تھے سوائے دس کے حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب' حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل' حضرت اسحاق' حضرت یعقوب اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وعلیہم وبارک وسلم اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ پیغمبروں علیہم السلام میں سے کوئی نہیں کہ جس کے دو نام قرآن پاک میں ذکر کئے گئے ہوں سوائے حضرت یعقوب اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہم السلام کے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اسرائیل بھی فرمایا ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح بھی کہا ہے انتہی۔ مگر یہ تجسس ناقص ہے۔ کیونکہ حضرت یونس کو ذوالنون بھی فرمایا ہے علیہ السلام مگر یہ کہ کہا جائے کہ ذی النون علامات والقاب کے زمرے سے ہے نام نہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے مختلف شعبوں میں ہونے کا بیان

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے مختلف شعبوں میں ہونے کا بیان یہ ہے کہ آپ کے والد بزرگوار حضرت اسحاق علیہ السلام کی شادی حضرت لوط علیہ السلام کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور اس بیوی سے ایک ہی شکم سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جب

حضرت اسحاق علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنی مسجد میں سجادہ نشین کر دیا۔ اور اپنا مال بھی دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کر دیا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت عیص کو زیادہ دوست رکھتے تھے۔ اور آپ کی زوجہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف زیادہ متوجہ تھیں۔ اپنی آخری عمر میں ایک دن حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت عیص سے فرمایا کہ میرے خاص وقت میں حاضر ہونا اور آواز کرنا تاکہ میں تیرے لئے دعا کروں آپ کی زوجہ نے اس بات کو سن لیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت عیص کا لباس پہنا کر بھیج دیا اور کہا کہ اپنی آواز کو عیص کی آواز میں بدل کر کہنا کہ میں حاضر ہوں میرے لئے دعا فرمائیں جس کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرت اسحابق علیہ السلام کو عمر کے آخری حصہ میں نظر کی کمزوری لاحق ہو گئی تھی جب حضرت یعقوب علیہ السلام اس شکل اور لباس میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے پاس گئے تو آپ نے ان کیلئے دعا فرمائی اور دعا کا مضمون یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ تیری اولاد میں نبوت کو جاری رکھے۔ کچھ دیر بعد حضرت عیص آئے۔ اور دعا طلب کی۔ حضرت اسحاق علیہ السلام نے فرمایا کہ اس خاص وقت میں تم آئے تھے میں نے دعا کر دی۔ حضرت عیص نے کہا مجھے کوئی خبر نہیں۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام آ کر ان کی دعا کی برکت لے گئے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت عیص کیلئے ایک دوسری دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کو تیسری نسل میں سے کر دے۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی وفات اور یعقوب علیہ السلام کے حالات اور اولاد

اور جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی وفات قریب پہنچی تو آپ نے دونوں صاحبزادوں کو وصیتیں فرمائیں لیکن مسجد اور سجادہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے حوالے فرمایا۔ اس وجہ سے حضرت عیص کے دل میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق رنج پیدا ہو گیا۔ اور اسحاق علیہ السلام کے وصال کے بعد تمام مال میں حضرت عیص متصرف ہوئے۔ اور لوگ حضرت عیص کی طرح رجوع کرنے لگے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس مال و دولت نہ رہی۔ آپ کی والدہ نے حالات اس طور پر دیکھے تو فرمایا کہ یہاں رہنا سہنا

تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ میرے بھائی لایان کے پاس چلے جاؤ۔ اس کی لڑکیاں ہیں۔ اور مالدار آدمی ہے۔ اپنی صاحبزادیوں سے ایک کے ساتھ تمہاری شادی کر دے گا اور معاش کی طرف سے تم فارغ البال ہو جاؤ گے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام لایان کے پاس پہنچے تو وہ ان کے آنے سے بہت خوش ہوئے۔ اور آپ سے آپ کی والدہ اور بھائی کے متعلق پوچھا۔ آپ نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ لایان نے کہا کہ بھائی کی بدسلوکی کی وجہ سے کوئی غم نہ کر تو میرا بیٹا ہے۔ اور اپنے گھر کے تمام کام انہیں کے سپرد کر دیئے اور اپنی بڑی صاحبزادی کے ساتھ شادی کر دی جن سے آپ کے چار بیٹے پیدا ہوئے روبیل' شمعون' لاوی اور یہودا اس کے بعد وہ دختر فوت ہو گئی۔ لایان نے دوسری صاحبزادی کی آپ سے شادی کر دی۔ اس سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اور فوت ہو گئی۔ لایان نے تیسری دختر کی شادی آپ سے کر دی۔ اور اس سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی اس نے بھی وفات پائی۔ لایان نے اپنی چوتھی دختر جن کا نام راحیل تھا اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی والدہ تھیں کی شادی آپ سے کر دی۔ اس وقت حضرت یعقوب آپ کی عمر چالیس سال کو پہنچ گئی اور آپ پر وحی آئی کہ ہم نے تجھے رسول بنایا آپ کنعان کی طرف جائیں۔ اور وہاں کے لوگوں کو اپنے آباؤ اجداد کے دین کی دعوت دیں۔ آپ نے یہ ماجرا لایان سے کہا۔ لایان سجدہ شکر بجا لائے۔ اور کہا کہ اگرچہ آپ کی جدائی اور میری بیٹی کی جدائی مجھ پر بہت ناگوار ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا میری رضا سے پہلے ہے۔ اب آپ جو کچھ چاہیں میرے مال سے لے لیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے مال کی حاجت نہیں۔ لیکن میرے قبیلے اور اولاد کو میرے ہمراہ رخصت فرمائیں۔ لایان نے اپنی صاحبزادی کو بیٹوں سمیت رخصت کیا۔ اور پانسو بکری' پانسو گائے' پانسو اونٹ' پانسو گھوڑے' پانسو خچر اور خدمت اور جانوروں کی نگہبانی کیلئے بے شمار غلام اور بہت سی نقدی اور پوشاکیں آپ کو عطا کیں۔ جب آپ کنعان کی طرف چلے اور عیص کو خبر پہنچی پہلے تو اس نے بہت جوش و خروش کیا۔ اور مقابلہ اور جنگ کرنے کیلئے اٹھا۔ بات آخر حسن سلوک پر انجام پذیر ہوئی۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے شائستگی کے ساتھ ملاقات کی۔ اور پورے ادب

کے ساتھ دعا کے طالب ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ساتھ مجھ پر بزرگی دی ہے آپ دعا کریں کہ میری نسل سے بھی کوئی پیغمبر پیدا ہو۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہاری پشت سے ایوب پیغمبر علیہ السلام پیدا ہوں گے۔ اور نیک بخت بادشاہ ذوالقرنین جو کہ مشرق و مغرب کا مالک ہوگا۔ اس کے بعد حضرت عیص اور حضرت یعقوب علیہ السلام باہم رخصت ہوئے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان شہر کا قصد فرمایا۔ اور کنعان میں راحیل سے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام دو سال کے تھے کہ راحیل فوت ہوگئیں۔ لایان نے یہ ماجرا سنا تو پانچویں دختر جو کہ سب سے چھوٹی تھی کافی جہیز کے ساتھ آپ کیلئے بھیج دی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی اسی نے پرورش کی۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے مجموعی طور پر باراں بیٹے ہیں۔ اور ہر بیٹے سے کافی نسل پیدا ہوئی۔ اور بنی اسرائیل سب کے سب باراں قبیلے ہیں۔ اور اس خطاب میں ان سب کو شریک کر کے فرمایا ہے کہ اے اولاد یعقوب علیہ السلام! اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ ایک لحہ بھی میری یاد سے نہ رہو۔ جیسا کہ امت مرحومہ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰت والتسلیمات کو ہم نے فرمایا یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا (الاحزاب آیت ۴۱) فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (البقرۃ آیت ۱۵۲) اور اگر تمہاری استعداد اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہے کہ تم بغیر واسطہ کے مجھے یاد کر سکو تو اس قدر تو کرو۔

اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام فرمائی۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عام نعمتیں جن میں یہ اور دوسرے لوگ شریک ہیں دل میں اتنا اثر پیدا نہیں کرتیں اور شرکاء کے غیر معیاری ہونے کی وجہ سے نظر سے گر جاتی ہیں۔ اور ہلکی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے مقام شکر میں خاص نعمت کا لحاظ کرنے کا پتہ دیا۔ اور اگر چہ لفظ نعمت مفرد ہے۔ لیکن نعمت کی جنس کو شامل ہے۔ اور اس جنس کی تفصیل اس سورت میں اور دوسری سورتوں میں بیان ہوگی۔

ان میں سے فرعونیوں کے ہاتھ سے نجات ہے۔ اور ان میں سے ان کی خاطر دریا کو پھاڑنا۔ میدان تیہ میں ان کیلئے بادل کا سائبان پیدا کرنا۔ من اور سلویٰ اتارنا۔ ایک پتھر

سے باراں چشمے جاری کرنا۔ پے در پے اس جماعت میں پیغمبروں علیہم السلام کو مبعوث فرمانا اور ان کی۔ اور ان کے خاندان کی شان میں کتابیں اتارنا۔ ہر وقت دشمنوں سے حفاظت کرنا۔ ان کی کوتاہیوں پر انہیں مسلسل تنبیہہ کرتے رہنا۔ اور انہیں غفلت میں نہ چھوڑنا' پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی ہدایت کیلئے بھیجنا اور یہ نعمتیں ان عمدہ نعمتوں میں سے ہیں جو کہ اس گروہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور بنی آدم کے فرقوں میں سے کسی کو بھی اس قسم کی عام عادات کے خلاف نعمتیں اور اس قسم کی تنبیہیں' نصیحتیں اور تربیتیں بارگاہ خداوندی سے نہیں دی گئیں۔ گویا ان لوگوں کو تمام لوگوں سے مکمل امتیاز حاصل ہوا اور اگرچہ ان نعمتوں میں سے اکثر ان کے اسلاف اور آباؤ اجداد پر تھیں۔ لیکن جو نعمت باپوں پر ہو وہ بیٹوں کے حق میں بطریق اولیٰ نعمت ہو گی کیونکہ اگر یہ نعمتیں نہ ہوتیں تو ان کی نسل جاری نہ رہتی اور بیٹے وجود میں نہ آتے۔ نیز بیٹوں کو اس قسم کے باپوں کی طرف منسوب ہونے پر عظیم فخر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے عمدہ نعمتوں کے ساتھ خاص کیا ہو۔ نیز جب بیٹوں کو معلوم ہو کہ ہمارے باپوں کو یہ نعمتیں حکم خداوندی کی اطاعت' مشقت پر صبر اور کفر و انکار سے منہ پھیرنے کی وجہ سے حاصل ہوئیں۔ تو یقیناً وہ اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ میں رغبت کرتے ہیں۔ اور یہ بات پکی ہے کہ ہر بیٹا اپنے باپ کے طریقے کی پیروی پر جبلی طور پر رغبت رکھتا ہے۔ پس ان کا اپنے اسلاف کی نعمتوں کو یاد کرنا اس قسم کی نعمتوں کی طمع عطا کرتا ہے۔ اور یہ طمع اس کے فرمان کی مخالفت اور اس کے عہد کو توڑنے سے روکنے والی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ الانسان عبید الاحسان انسان احسان کا بندہ ہے۔

نعمتیں یاد کرانے کے فوائد

اور ان نعمتوں کو یاد کرانے میں کئی اور فائدے بھی منظور ہیں۔ ان میں ایک فائدہ یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی زبان پر ان نعمتوں کی تفصیل ان کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہو گی کہ مطالعہ کتاب اور اہل کتاب سے میل جول کے بغیر ان واقعات کو بیان فرماتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ نعمتیں جس قدر زیادہ ہوں گی اسی قدر منعم کے حکم کی نافرمانی زیادہ ڈر اور خوف پیدا کرتی ہے۔ اور مخالفت کی قباحت شدید معلوم ہوتی ہے کم از کم اپنے منعم کی

مخالفت کے اظہار سے شرم کرنا ہر عقلمند کی جبلت ہے۔ اور یہ تمام فوائد مدعا میں مدد کرتے ہیں جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اثبات اور بنی اسرائیل کے فرقہ کی اصلاح ہے۔

نیز یہ سب نعمتیں کرامت اور بزرگیوں کا سبب ہے۔ جیسا کہ فرشتوں کے سجدہ کرنے اور بہشت کی سکونت اختیار کرنے سے حضرت آدم علیہ السلام کی بزرگی ظاہر ہوئی۔ اور جب یہ بزرگی ایک ادنیٰ سی فروگذاشت جو کہ ممنوع درخت کا پھل کھانے میں تھی خلل میں پڑگئی تو نعمتوں کی ناشکری کی صورت میں ان بزرگیوں کو زائل سمجھنا چاہئے۔ اور قطع نظر اس سے کہ نعمتوں کا یاد کرنا مخالفت چھوڑنے کا سبب ہوتا ہے۔ ہم نے حق کے ظاہر کرنے پر تم سے ایک عہد لے رکھا ہے۔ اور جس نے کسی سے کوئی عہد باندھا ہو اگر چہ وہ منعم نہ ہو۔ اور اس سے کوئی نعمت نہ پہنچی ہو اس کے عہد کو پورا کرنا بنی آدم کے تمام فرقوں کے نزدیک واجب ہے۔ پس تمہیں چاہئے کہ اگر تم ہماری نعمتیں یاد کرنے سے غافل ہو جاؤ تو ہمارے اس عہد کو یاد کرو۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اور میرے عہد کو پورا کرو جو میں نے تم سے لیا ہے۔ کیونکہ ہمارا وہ عہد پختگی اور یقین میں حضرت آدم علیہ السلام کے عہد سے کم نہیں جو کہ بہشت میں ٹھہرانے کے وقت ان سے لیا گیا کہ ممنوع درخت کے میوے سے پرہیز کریں۔ اور اس عہد سے بھی کم نہیں جو کہ ان سے اور ان کی اولاد سے قبولیت توبہ اور زمین میں سکونت کے بعد لیا گیا کہ جب بھی کوئی یقینی ہدایت میری طرف سے آئے تو اس ہدایت کی پیروی لازم جانیں اس لئے کہ اگر تم میرے عہد کو پورا کرو گے۔

اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں بھی اس عہد کو پورا کروں گا جو کہ تم سے کیا ہے کہ خوف اور حزن کو تم سے دور کروں اور تمہارے گناہوں کو بخش دوں اور تمہاری نیکیوں کو کئی گنا بڑھا دوں اور تمہاری سخت تکالیف کو تم سے اٹھا دوں اور تمہیں اس بہشت میں واپسی نصیب کروں جو کہ تمہارے باپ کا مسکن تھا اور ایک فروگذاشت کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

بنی اسرائیل کے عہد کی تفصیل

اور اس عہد کی تفصیل جو کہ بنی اسرائیل کے ساتھ طے پایا یا سورت مائدہ میں مذکور ہے اس آیت میں ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منھم اثنی عشر

نقیباً سے لے کر اس لفظ تک ولادخلنکم جنات تجری من تحتھا الانھار (آیت ۱۲) اور سورت اعراف میں بھی ان آیات میں فساکتبھا للذین یتقون سے اس آیت تک الذین یتبعون الرسول النبی الامی آخر آیت تک (آیت ۱۵۶-۱۵۷) اور اس احتمال کا مقام بھی ہے کہ اس عہد سے مراد وہی عہد ہو جو کہ اترتے وقت آدم علیہ السلام سے لیا گیا فاما یاتینکم منی ھدی یا وہ عہد جو کہ تمام سابق انبیاء علیہم السلام سے لاحقین کی تائید و امداد کرنے کیلئے لیا گیا۔ جیسا کہ سورت آل عمران میں مذکور ہے واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتاب وحکمۃ الخ (آیت ۸۱) یا وہ عہد جو کہ تمام علماء سے لیا گیا۔ چنانچہ اسی سورت آل عمران میں مذکور ہے۔ واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتو الکتاب لتبیننہٗ للناس ولا تکتمونہ (آیت ۱۸۷) کیونکہ جو عہد عام سے لیا گیا ہو خاص پر لازم ہوتا ہے۔ اور جو عہد پیغمبر علیہ السلام سے لیا گیا ہو ان کی امت پر لازم ہوتا ہے۔ پس بنی اسرائیل کے ذمہ پر اللہ تعالیٰ کے چار عہد تھے جن کا پورا کرنا واجب تھا۔

اول وہ عہد جو بالخصوص ان سے لیا گیا ہے۔ اور اگرچہ وہ عہد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بالخصوص واقع نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا مضمون عام اور تمام رسل علیہم السلام پر ایمان لانے' ان کی تائید و تصدیق کرنے' نماز قائم کرنے' زکوٰۃ دینے اور مالی اخراجات کو شامل ہے۔ لیکن اور مدعا حاصل ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام بھی رسل علیہم السلام کے زمرہ میں داخل ہیں۔ اور آپ انہیں اعمال کا حکم دیتے ہیں۔ پس آپ پر ایمان لانا اور آپ کی تقویت و تائید اس عہد کی بدولت بنی اسرائیل کے ذمہ واجب ہے۔ اور اس عہد کا سورت مائدہ کے اول میں ہے۔ (یعنی آیت ۱۲ میں)

دوسرا عہد وہ جو کہ خاص رسول نبی اُمی کی اتباع پر لیا گیا۔ اور وہ سورت اعراف (آیت ۱۵۶' ۱۵۷) میں مذکور ہے۔

تیسرا عہد وہ جو تمام سابق انبیاء علیہم السلام سے آنے والے انبیاء علیہم السلام کی امداد اور تصدیق کرنے کیلئے لیا ہے۔ اور چونکہ بنی اسرائیل کی جماعت میں بے شمار انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے آپ کو ان تمام انبیاء علیہم السلام کی امت میں شمار

کرتے ہیں۔ پس وہ عہد تکرار اور کثرت کے ساتھ انہیں پورا کرنا لازم ہوا۔ اور اس عہد کا ذکر سورت آل عمران کے وسط (آیت ۸۱) میں ہے۔

چوتھا عہد وہ جو کہ بالعموم آدم علیہ السلام کی اولاد سے لیا گیا۔ جیسا کہ یہاں مذکور ہوا یا تمام علماء سے لیا گیا۔ جیسا کہ سورت آل عمران کے آخر (آیت ۱۸۷) میں مذکور ہے۔ یہ عہد بھی بنی اسرائیل کے فرقہ پر پورا کرنا لازم ہے۔ کیونکہ اپنے آپ کو آدم علیہ السلام کی اولاد اور علماء کے گروہ میں سے سمجھتے ہیں۔ پس یہاں بنی اسرائیل سے یہ چار قسم کے عہد طلب کئے گئے ہیں۔ پہلے اس مناسبت سے کہ عہد کو پورا کرنا انسانی جبلت کا تقاضا ہے۔ اور اگر وہ اس امر میں کوتاہی کریں گے تو دائرہ انسانیت سے باہر آ جائیں گے۔ دوسرے اس طریقے سے کہ ہر ہر عہد کے مقابلہ میں میں نے بھی ایک عہد کیا ہے اگر تمہیں میری طرف سے ان موعود چیزوں کی کوئی طمع ثابت ہے۔ تو ان موعودات کو حاصل کرنے کا راستہ عہد کو پورا کرنا ہے۔ پس گویا یوں ارشاد ہوا کہ اگر جواں مردی اور بات پالنے کے طریقے سے عہد کو پورا نہ کرو تو سوداگری کے طریقہ اور دستور کو تو نہ چھوڑو کہ اس طرف سے کچھ دینا اور اس طرف سے اس کا دس گنا لینا ہے۔ اور اگر تمہارے خیال میں یہ بات گزرے کہ منافع حاصل کرنا اگرچہ وہ کتنے زیادہ بھی ہوں اس وقت پسندیدہ کام ہے کہ کسی نقصان کا خوف نہ ہو۔ اور ان عہدوں کو پورے کرنے میں کئی نقصان لاحق ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہمارے مرتبہ اور ریاست کا درہم برہم ہونا ہے ان میں سے نذر و نیاز' فتوح اور ہدیوں کا ختم ہونا ہے جو کہ ہمارے ہم مذہب لوگ ہمیں دیتے ہیں۔ اور ان میں رشوت اور کارسازی کے دروازے کا بند ہونا ہے جو کہ تورات و انجیل میں سے احکام حاصل کرتے وقت ہمیں پہنچتی ہے۔ اور ان دونوں کتابوں کے منسوخ ہونے کی صورت میں ہم سے کوئی بھی وہ احکام نہیں پوچھے گا۔

اور ان میں سے ہماری قوم' قبائل اور رشتے داروں کا ہم سے ناراض ہونا' بائیکاٹ کرنا اور اس باہمی تعاون اور امداد کا برباد ہونا ہے جو کہ قومیت اور رشتے داری کی وجہ سے ہمیں حاصل ہے۔ علی ہذا القیاس۔ پس ان عہدوں کو پورا کرنے میں اگرچہ منفعت بھی ہو ہم ان بڑے نقصانات سے ڈرتے ہیں۔ اور عقل مند کا کام یہی ہے کہ جس چیز میں نفع و نقصان کی

دونوں صورتیں ہوں اس سے پرہیز کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ جس طرح عہد کو پورا کرنے میں تم ان قلیل اور فانی نقصانات کا اندیشہ کرتے ہو تو وفا چھوڑنے میں ان بڑے نقصانات کا اندیشہ کرو جو کہ ان نقصانات سے ہزاروں مرتبہ زیادہ سخت اور ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ پس ان دونوں کے نقصانات کو برابر مت کرو۔ کیونکہ بے وفائی کی صورت میں ہم تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ اور ہماری ناراضگی دنیوی وبال بھی لاتی ہے۔ اور اخروی مصیبت بھی۔ پس ان دو قسم کے نقصانات کو ایک دوسرے کے برابر نہ کرو کیونکہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بلکہ دنیوی نقصانات سے مت ڈرو کہ میری رضا ان کے بدلے میں ہو سکتی ہے۔

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ اور میری ناراضگی سے ضرور ڈرو۔ کیونکہ وہ تمام دنیوی منافع اس کا عوض نہیں ہو سکتے جس طرح کہ کہا گیا ہے (بیت) ہر چیز کیلئے جب تو اسے چھوڑے عوض ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو اگر چھوڑ دے تو اس کا کوئی عوض نہیں۔

یہاں جاننا چاہئے کہ لغت عرب میں رہبت کا معنی ہے کسی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی سے ڈرنا۔ اور ڈرنا یا تو اس کے عتاب و عذاب سے ہے۔ اور یہ اہل ظاہر کا حصہ ہے یا اس کے جلال سے ڈرنا ہے۔ اور یہ اہل دل کے لائق ہے۔ اور پہلا خوف زائل ہو سکتا ہے۔ جبکہ دوسرا خوف زائل نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لئے وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ فرمایا نہ کہ ومن عقابی فارھبوا

نیز جاننا چاہئے کہ اہل کتاب کو جو کہ پہلے سے ہی ریاست اور مرکزیت کا شوق رکھتے تھے۔ اور لوگوں سے نذر اور ہدیے پڑھنے پڑھانے کے عنوان سے لیتے تھے وہ دین چھوڑنا بڑا دشوار تھا اور اس مشقت پر صبر کرنا اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنا جو کہ ان سے رونما ہو عند اللہ ان کے ثواب کی زیادتی کا موجب ہے۔ اسی لئے سورت قصص میں اہل کتاب کے مومنوں کے بارے میں ارشاد ہوا اولئك یوتون اجرھم مرتین بما صبروا (آیت ۵۴)

تین آدمیوں کے ثواب کا بیان

اور صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت کے ساتھ وارد ہے کہ حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دوہرا ثواب عطا ہوگا۔ ایک وہ جو اہل کتاب میں سے اسلام سے مشرف ہوا دوسرا وہ جس نے اپنی مدخولہ کنیز کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا۔ تیسرا وہ غلام جو کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی بھی بجالائے اور اپنے مالک کی خدمت میں بھی کوتاہی نہ کرے۔

پس بنی اسرائیلیوں کو اس پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی میں جس طرح مشقت زیادہ ہوگی اسی طرح ثواب کی امید بھی زیادہ رکھنی چاہئے ہم بیشتر عنایت وہم بیشتر عنا یعنی عنایت بھی زیادہ مشقت بھی زیادہ۔ مشقت کو نظر میں لانا اور اونچے منافع اور عظیم درجات سے جی چرانا عزم والوں اور عالی ہمت لوگوں کا شیوہ نہیں۔ جس طرح کہ کہنے والے نے کہا ہے کہ بلند مرتبوں کے مقابلہ میں ہمارے نفس ہم پر ہلکے ہیں۔ کیونکہ جس نے خوبصورت خاتون سے خطبہ کیا ہو اسے حق مہر زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر میں تم سے عہد نہ لیتا کہ اس پیغمبر علیہ السلام پر ایمان لاؤ۔ اور اس کتاب کو صحیح جانو پھر بھی تمہارے ذمہ واجب تھا کہ تم اس کتاب پر ایمان لائے کیونکہ جو چیز حق کے مطابق ہو وہ بالکل حق ہے۔ اور عقلمند کا کام نہیں کہ کسی چیز کو حق جانے اور پھر اس کی موافقت سے انکار کرے کیونکہ اس صورت میں حق کا انکار لازم آتا ہے۔ پس تم اس پیغمبر علیہ السلام کو برحق جانو۔

وَآمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے نازل فرمایا۔ اور تمہیں یقین سے معلوم ہو چکا کہ یہ میرا نازل کیا ہوا ہے۔ کیونکہ معجز ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سراسر ہدایت ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس کے موافق ہے جو تمہارے پاس ہے۔ تورات، انجیل، زبور اور پہلے انبیاء علیہم السلام کے صحائف سے۔ ہر باب میں اعتقاد، ذات، صفات، احوال ملائکہ، اخبار انبیاء علیہم السلام، ذکر رشوت ودوزخ، توحید وعبادت کے امر اور کبائر کی نہی میں موافق ہے۔ اور جس چیز میں تم اسے اپنی کتابوں کے خلاف جانتے ہو یعنی تورات وانجیل کے بعض احکام کا نسخ۔ پس اگر غور کرو تو وہ بھی موافقت کی دلیل اور تصدیق کا گواہ ہے۔ کیونکہ اس

کتاب میں جگہ جگہ مذکور ہے کہ دین موسیٰ اور دین عیسیٰ علیٰ نبینا علیہما السلام حق ہے۔ اور تورات وانجیل کے احکام اپنے وقت میں حق تھے۔ پس قرآن پاک پر ایمان لانا تورات و انجیل کے منسوخ احکام پر بھی ایمان لانے کی تاکید کرنے والا ہے۔ نیز ان کتابوں میں اس پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود اور اس کتاب کے نزول کی بشارت موجود ہے۔ اور مذکور ہے کہ اس پیغمبر علیہ السلام کے تشریف لانے اور اس کتاب کے نازل ہونے کی وجہ سے تم سے مشقت والی ذمہ داریاں اٹھ جائیں گی۔ پس اگر یہ پیغمبر اور یہ کتاب ان احکام کو منسوخ نہ کریں تو وعدہ الٰہی کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔ پس نسخ کی وجہ سے ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اور یہی نکتہ سمجھانے کیلئے صریحانہ فرمایا کہ آمنوا بالقرآن و بھذا الکتاب بلکہ کنایہ کی راہ اختیار فرمائی کیونکہ کنایہ صریح سے زیادہ موثر بھی ہے۔ اور اس کنایہ سے وجوب ایمان کی علت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اور اگر تمہیں اس قرآن اور اس پیغمبر پر ایمان لانے میں باوجودیکہ اس کے وجوب پر عقلی دلیل قائم اور عہد لینا موجود ہے کوئی شک شبہ باقی ہے۔ تو ایسا نہ کرو کہ چھوٹتے ہی انکار وتکذیب سے پیش آؤ بلکہ اپنی کتابوں کی طرف رجوع کرو اور اس قرآن اور اس پیغمبر علیہ السلام کے احوال کو اس کے ساتھ مطابقت دو جو کہ ان کتابوں میں مذکور اور لکھا ہوا ہے عقل والوں کی شان یہی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ اور دیدہ دانستہ اس قرآن کی حق پوشی کرنے والے پہلے نہ بنو۔ کیونکہ اہل کتاب کے دوسرے فرقے تمہارے پیچھے چل کر انکار وتکذیب اختیار کریں گے۔ اور ان کا وبال تمہاری گردن پر پڑے گا۔ اس وقت تک جو مشرکین مکہ اور قریش نے اس پیغمبر علیہ السلام اور اس قرآن کا انکار اور تکذیب کی ہے۔ اپنی جہالت اور بے خبری کی وجہ سے ہے انہوں نے دیدہ دانستہ حق پوشی نہیں کی ہے۔ اور جہالت اور نادانی کی وجہ سے وہ اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی ان کی اقتداء کرے یا ان کی پیروی کرے۔ بخلاف تمہارے کہ اس پیغمبر علیہ السلام اور اس قرآن کے احوال سے واقف ہونے کے باوجود چشم پوشی کر کے حق چھپاؤ گے۔ پس کفر کی حقیقت جو کہ حق چھپانا ہے پہلے تمہیں سے ظاہر ہوگا اگرچہ حکمی کفر دوسروں نے تم سے پہلے بھی کیا ہوگا۔ نیز اہل مکہ کا کفر اس قرآن پاک کے ساتھ مخصوص نہ تھا

بلکہ توحید، محشر، تمام پیغمبروں علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کی تمام کتابوں کے منکر تھے۔ اور تم اپنے گمان میں ان سب چیزوں کا یقین کرتے اور معتقد ہوتے ہوئے خاص اسی قرآن پاک کے منکر ہوتے ہو۔ پس تم خاص قرآن پاک کے منکروں میں سے پہلا فرقہ ہو گے۔ اور یہ معنی بہت دور ہے۔ کیونکہ اس قرآن مجید میں توحید، نبوت، معاد، حسن عبادت اور قبح معصیت سے جو کچھ مذکور ہے ان سب پر یقین کرتے ہوئے انکار کے ساتھ پیش آتے ہو۔ اور یہ تعصب کی دلیل ہے۔ اور مشرکین مکہ اور قریش چونکہ ان سب چیزوں کے منکر تھے اگر قرآن پاک میں ان کا ذکر سن کر یقین نہ کریں۔ اور انکار کے ساتھ پیش آئیں تو اتنا بعید نہیں ہے۔ کیونکہ مضامین کتاب کا انکار اس کتاب کے انکار کو لازم کرتا ہے۔ جبکہ تمام مضامین کتاب کی تصدیق پھر اس کتاب کا انکار تعصب اور عناد کا سچا گواہ ہے۔

اور اگر وہ کہیں کہ اگرچہ یہ کتاب تورات اور انجیل کے وعدہ کے مطابق نازل ہوئی ہے۔ اور تورات وانجیل کہ وہ آیات جن میں اس کتاب کا وعدہ ہے ہمارے پاس موجود ہیں۔ لیکن اگر ہم ان آیات پر عمل کریں تو ہماری ریاست اور مرتبہ سب کا سب ختم ہو جائے گا بلکہ ہماری معاش کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ پس ضرورت اور عمومی آزمائش کی وجہ سے ہم سے ان آیات پر عمل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حرج ذمہ داری کو گرا دیتا ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ تم دنیوی نقصان سے زیادہ ڈرتے ہو۔ اور میری ناراضگی سے نہیں ڈرتے ہو۔ اور دنیا کی منفعت کو میری آیات پر عمل کرنے کی منفعت پر ترجیح دیتے ہو۔ اور یہ بات انتہائی بری ہے۔ اور تورات وانجیل میں اس کی مذمت وارد ہے۔ پس اگر تورات وانجیل پر ایمان رکھتے ہو تو اس کام سے دست بردار ہو جاؤ۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اور میری آیات کے عوض دنیوی قلیل قیمت مت خریدو کیونکہ ان آیات کے ثواب کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس کے باوجود فانی ہے۔ اور وہ باقی ہیں۔ اور کوئی عقلمند قلیل کو کثیر پر اور فانی کو باقی پر ترجیح نہیں دیتا۔

وَاِيَّایَ فَاتَّقُوْنِ اور میری ناراضگی سے چاہئے کہ بچو۔ نہ کہ مرتبہ اور ریاست کے چلے جانے سے کیونکہ اس کا عوض میری خوشنودی کی وجہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور میری

خوشنودی کا عوض مرتبہ اور ریاست سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ قیمت کو خریدنے کا کیا معنی؟ حالانکہ عرف میں اس طرح رواج ہے کہ قیمت دیتے ہیں۔ اور سامان خریدتے ہیں نہ یہ کہ سامان دیں اور قیمت کو خریدیں۔ تو اگر انہوں نے آیات کو سامان قرار دیا ہوگا تو کہنا چاہئے تھا کہ ولا تبیعوا آیاتی بثمن قلیل یعنی میری آیات کو تھوڑی قیمت کے بدلے فروخت مت کرو۔ اور اگر انہوں نے آیات کو قیمت قرار دیا ہوگا تو کہنا چاہئے تھا کہ ولا تشتروا بایاتی متاعا قلیلا یعنی میری آیات دے کر متاع قلیل کو مت خریدو یہ ترکیب جو یہاں واقع ہوتی ان دونوں ترکیبوں سے جدا ہے اس کی وجہ کیا ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی کیلئے اصل مقصود بالذات آخرت کی منفعتوں کو حاصل کرنا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کی فرمانبرداری کی وجہ سے میسر آتا ہے۔ پس حقیقت میں اس معاملہ میں مبیع یعنی فروخت کی گئی چیز وہی ہے۔ اور اہل کتاب کو جو رشوتیں' تحفے' ہدیے' مقرر حصے کھیتیاں پھل امداد و نصرت۔ اور دوستی اور رشتہ داری کے نفعے ان اخروی منافع کے عوض ملتے تھے سب دنیا کی جنس سے تھا جو کہ مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ آخرت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ جس طرح کہ کہتے ہیں الدنیا مزرعة الأخرة دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ پس حقیقت میں دنیا اور اس میں جو کچھ ہے وہ نقدیوں کے قائم مقام ہیں جو کہ نفع بخش سامان کی قیمت ہوسکتی ہیں۔ اور خود نافع نہیں ہیں جب اہل کتاب نے اخروی منافع کو برباد کر دیا۔ اور ان فانی منفعتوں کو جو کہ مقصود بالذات نہیں ہیں حاصل کیا گویا انہوں نے معاملہ الٹا کر دیا جو چیز دینے کی تھی لے لی اور جو لینے کی تھی وہ دے دی۔ پس ان کے اس معاملہ کو الٹ کرنے اور ان کی غلط فہمی کی تعبیر اسی ترکیب سے مناسب معلوم ہوئی کہ ولا تشتروا بایاتی ثمنا قلیلا گویا اشارہ فرمایا ہے کہ میری آیات اس قبیل سے نہ تھیں کہ انہیں کسی چیز کے حاصل کرنے کا وسیلہ بناؤ بلکہ وہ تو مقصود بالذات تھیں۔ اور اگر ان کے عوض کوئی ایسی چیز لیتے جو کہ باقی رہنے والے ذخیرہ کے قابل ہوتی تو پھر بھی معاملہ کی

صورت درست ہوتی۔ لیکن تم نے اس کے عوض اس چیز کو لیا ہے جو کہ فانی اور نہ باقی رہنے والی ہے جو کہ قیمت کا حکم رکھتی ہے۔ اور ادنیٰ ہے لینے کی نہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں (بیت) لوگ دنیا میں چار چیزوں کی حرص کرتے ہیں' کھانا' پینا' پہننا' نکاح کرنا اور اگر تو غور کرے تو سب کا انجام نجاست' پیشاب' پھینکا ہوا اور رسوا کی گئی چیز ہے۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اگرچہ یہ آیت بنی اسرائیل کو نصیحت ہے۔ لیکن حقیقت میں اس امت کے چند گروہوں کی ملامت ہے جو کہ آیات الٰہی کے عوض قلیل قیمت لیتے ہیں۔ اور اس نعمت کو برباد کرتے ہیں چنانچہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت اور اس کی مانند دوسری آیتوں کی تفسیر میں فرمایا کہ بنی اسرائیل چلے گئے اور یہ آیت تمہارے سوا کوئی نہیں سنتا۔

بداطوار علماء' راشی قاضی' بے خوف مفتیوں' ظالم بادشاہوں' بے انصاف حاکم' دنیا کے طالب اساتذہ اور بے حد طمع کرنے والے واعظوں کی مذمت کا بیان

پہلا گروہ بداطوار علماء ہیں جو کہ دنیا داروں اور ظالموں سے میل جول رکھتے ہیں۔ اور ان کی لذتوں اور شہوتوں اور ان کے مظالم کو صحیح کرنے کیلئے عجیب غریب روایات نکالتے ہیں۔ اور کئی حیلے ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ رشوت خور ججوں اور بے خوف مفتیوں کا ہے جو کہ رشوت کیلئے حکم شرع کو بدل دیتے ہیں۔ اور مدعی کو مدعا علیہ اور اس کا عکس قرار دیتے ہیں۔ تیسرا گروہ ظالم بادشاہوں۔ اور بے انصاف افسروں کا ہے جو کہ مظلوموں کی مدد نہیں کرتے۔ اور اپنے کارگزاروں' منشیوں کے حالات کا جائزہ نہیں لیتے۔ چوتھا گروہ وزیروں اور دفتروں کے سیکرٹریوں کا ہے جو کہ رعایا سے مال حاصل کرنے اور مزارعوں سے خراج کھینچنے میں دل میں آخرت کا خوف نہیں لاتے۔ پانچواں گروہ دنیا طلب معلموں اور لالچی واعظوں کا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعلیم اور نصیحت کی تبلیغ کیلئے دنیوی سامان مانگتے ہیں۔ اور منفعت کی امید ہونے پر تو سائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ناامیدی کی صورت میں سختی اور بدخلقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

بچوں کو پڑھانے پر اجرت لینے کے جواز کا بیان

لیکن بچوں کو پڑھانے والے جو کہ اس مقصد کیلئے نوکر ہوتے ہیں اس زمرے میں داخل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تعلیم کے عوض کچھ نہیں لیتے بلکہ ان کی خوراک ان کی محنت کی اجرت ہے جو کہ صبح سے شام تک اپنے گھر سے جدا رہ کر اور معاش کی کمائی سے معطل ہو کر معذور بچوں کی چرواہے کی طرح جو کہ ادھر ادھر منتشر بکریوں کو جمع کرتا ہے حفاظت نگاہبانی کرتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی صرف قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم پر بغیر مکان و زمان کے تعین کے مزدوری مانگیں تو اسی گروہ میں شمار ہوتا ہے۔

امامت اور اذان پر اجرت لینے کا بیان

اور علماء کو امامت' اذان اور خطبہ پر اجرت لینے میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے اس بات پر نظر کرتے ہوئے کہ عبادات ہیں۔ اور عبادت پر اجرت لینا ان عبادتوں کے ثواب کو باطل کرنے والا ہے جائز قرار نہیں دیا اور ایک جماعت نے اس پر نظر کرتے ہوئے کہ اجرت ان عبادتوں کی ذات پر نہیں۔ بلکہ ان عبادات کے خاص مکان یا خاص وقت میں ادا کرنے پر ہے۔ اور یہ خصوصیت عبادت میں داخل نہیں ہے جائز قرار دیا ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں آئمہ' خطباء اور موذن صرف رضائے خداوندی کیلئے ان کاموں میں مشغول ہوتے تھے جیسے قاضی' مفتی' محتسب' خراج عشر اور زکوۃ وصول کرنے والے بھی اسی خالص نیت کے ساتھ یہ کام کرتے تھے۔ اور جب خلفائے راشدین اور عادل سلاطین نے دیکھا کہ ان لوگوں نے ان عبادات کی ادائیگی میں اپنے آپ کو مشغول کر دیا ہے۔ تو ان کی معاش کیلئے مسلمانوں کے مال سے ایک امداد مقرر کر دی' اجرت کے طور پر نہیں۔ بلکہ امداد کرنے کے طریقے سے' رفتہ رفتہ یہ طریقے معاش کا ذریعہ ہو گئے۔ اور مزدوری قرار پائی اور اس زمانے میں معاش کی اس وجہ کا حال مشکوک بلکہ حرمت کے قریب ہے حتی المقدور بچنا لازم ہو۔

تعویذ اور دم پر اجرت کے جواز کا بیان

ایک اور مسئلہ باقی رہ گیا۔ اور وہ تعویذ اور قرآن کے دم پر اجرت لینا ہے۔ اور وہ

اجماع اور نص کے ساتھ جائز ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ میں جو کہ صحیحین اور معتبر کتابوں میں موجود ہیں اس کا جواز آیا ہے۔ اور محقق علماء نے ایک قاعدہ مقرر کیا ہے جو کہ بہت نفع بخش ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جو چیز کسی شخص کے حق میں عبادت ہو خواہ فرض عین ہو خواہ فرض کفایہ خواہ سنت موکدہ' اس پر اجرت لینا جائز نہیں۔ جیسے تعلیم قرآن وحدیث وفقہ' نماز' روزہ' تلاوت' ذکر اور تسبیح اور جو کسی وجہ سے بھی عبادت نہیں صرف مباح ہے اس پر اجرت لینا جائز ہے جیسا قرآن پاک پڑھ کر دم کرنا یا تعویذ لکھنا' وغیر ذالک اور وہ عبادت جو مدت کے معین ہونے یا مکان کے مخصوص ہونے کی وجہ سے مباح ہو جاتی ہے ان پر بھی اجرت لینا جائز ہے۔ جیسے کسی کے بچے کو صبح سے شام تک اس کے گھر میں قرآن پاک کی تعلیم دینا کہ عبادت نہیں ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ جس طرح عبادات اور طاعات پر اجرت لینا جائز نہیں اسی طرح گناہوں کو چھوڑنے اور محرمات سے بچنے پر بھی اجرت لینا جائز نہیں۔ اور منصب کی حفاظت اجرت کے حکم میں ہے۔ دو تین عالم دیکھے گئے کہ قضا اور فتویٰ دینے کے شغل میں مصروفیت کے وقت مزامیر اور باجے سننے سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ اور جب وہ اس خدمت سے معزول ہو جاتے تو مافات کا تدارک اچھے طریقے سے کرتے تھے۔

چند بحثیں

اس مقام پر چند بحثیں باقی رہ گئیں جن کے مفسرین درپے ہوئے ہیں۔ پہلی بحث یہ کہ بنی اسرائیل کو فرمایا ہے کہ اس کتاب کے کافر اول نہ بنو۔ حالانکہ بنی اسرائیل کا پہلا کافر ہونا ممکن نہیں تھا۔ اور منع کرنے کو فعل کا ممکن ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ آدمی کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آسمان پر پرواز مت کرو کیونکہ بنی اسرائیل سے پہلے مشرکین مکہ اور قریش نے دس سال تک کفر کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو انواع و اقسام کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس کا جواب عین تفسیر میں گزرا کہ کافر سے مراد دیدہ دانستہ حق پوشی ہے۔ اور یہ معنی اہل کتاب کے غیر میں حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اور اہل کتاب میں سے اس دین کی دعوت پہلے اس فرقہ بنی اسرائیل کو پہنچی جو کہ اس کلام سے مخاطب ہیں۔ اور دوسرے مفسرین

نے یوں کہا ہے کہ یہاں لفظ مثل محذوف ہے۔ یعنی لاتکونوا مثل اوّل کافر بہ اور حاصل کلام یہ کہ تم اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت اور اس قرآن کی حقانیت جاننے کے باوجود کفار مکہ کی طرح نہ ہو جاؤ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس عبارت میں من اہل کتاب مضمر ہے۔ یعنی وَلَا تَكُونُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ کیونکہ بنی اسرائیل نے دوسرے اہل کتاب سے اس قرآن پاک کے ساتھ کفر کرنے میں پہل کی۔ اور بعض نے کہا کہ بہ کی ضمیر بما معکم کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ بما انزلت کی طرف یعنی تم وہ پہلے لوگ نہ بنو جنہوں نے اپنی کتاب سے کفر کیا کیونکہ تمہارا اس قرآن کے ساتھ کفر کرنا تمہاری اپنی کتاب کے ساتھ کفر کا موجب ہے۔ اور ابھی تک جہان میں کوئی نہیں گزرا جو کہ اپنی کتاب کے ساتھ کفر کرے۔ پس اگر تم یہ کام کرو گے تو پہلے کافر ہو گے۔

اور بعض نے کہا کہ اول کافر سے مراد یہ ہے کہ اس قرآن کو صرف سن کر ہی کفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے حال میں غور و فکر کرے۔ اور اپنی عقل سے سوچے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ لاتکونوا اوّل کافر بہ کے مفہوم مخالف کے طریقے سے سمجھا جاتا ہے کہ انہیں کفر جائز ہے۔ لیکن پہلا کافر نہیں ہونا چاہئے۔ اور اسی طرح لاتشتروا بآیاتی ثمنا قلیلاً بھی اسی طریقے سے دلالت کرتا ہے کہ اگر ثمن کثیر ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ مفہوم مخالف کا اعتبار اس وقت ہونا چاہئے کہ صریح نص اس کے خلاف وارد نہ ہو۔ اور یہاں آمنو بما انزلت اور دوسری بے شمار آیات حرمت کفر پر دلالت کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں مفہوم مخالف کی دلالت بھی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ جیسا کہ لاتاکلوا الربوا اضعافا مضاعفة اور رفع السموت بغیر عمد ترونها میں مفسرین نے کہا ہے۔

تیسری بحث یہ ہے کہ پہلی آیت کو فارھبون کے ساتھ اور دوسری کو فاتقون کے ساتھ ختم فرمایا۔ حالانکہ رہبت اور اتقاء کا معنی ڈر اور پرہیز ہے دونوں میں سے ایک لفظ کو دونوں آیات میں سے ایک آیت سے مخصوص کرنے میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ پہلی آیت میں ابھی بنی اسرائیل صریح ایمان کے ساتھ مخاطب نہیں ہوئے تھے۔ پس گویا ابھی اپنی یہودیت پر باقی ہیں۔ اور خدا سے ڈرنے کو یہودیت کی اصطلاح میں رہبت اور رہبانیت کہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے کو ان کی اصطلاح میں راہب اور رہبان کہتے ہیں۔ پس آیت کے آخر میں ان کے اصطلاحی لفظ کے ساتھ خطاب مناسب ہوا اور جب دوسری آیت میں انہیں صریح ایمان کا حکم دیا گیا۔ اور ایمان والوں کے عرف میں اس قسم کے آدمی کو جو خدا سے ڈرے متقی کہتے ہیں۔ اور دین میں پرہیز اور احتیاط کو تقویٰ کہتے ہیں لہٰذا اس آیت میں لفظ تقویٰ سے خطاب زیادہ مناسب ہوا تاکہ اس بات کا شعور ہو کہ جب کوئی آدمی ایک دین اور مذہب کو چھوڑ دے اور دوسرے دین و مذہب میں داخل ہو تو اسے چاہئے کہ اس دین اور مذہب کے مروجہ الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرے۔ اور اختیار کئے ہوئے دین کے الفاظ کام میں لائے تاکہ کوئی شک وشبہ واقع نہ ہو۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اگرچہ رہبت اور اتقاء دونوں پرہیز اور احتراز کے معنی میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ لیکن رہبت زیادہ تر وہاں استعمال ہوتا ہے جو جائز الوقوع ہو۔ اور اتقاء وہاں جس کا وقوع یقینی ہو۔ پس پہلی آیت میں انہیں اس کتاب پر ایمان لانے کا حکم نہیں فرمایا تھا اور ان کے ذہن میں کفر پر عذاب الٰہی کا واقع ہونا جائز تھا اور دوسری آیت میں کہ انہیں قرآن مجید پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ اور قرآن پاک میں وعدہ کیا گیا ہے کہ کافروں کو یقیناً عذاب ہوگا۔ اور وہ جواز یقین کے ساتھ بدل گیا۔ اور انہیں اتقاء کا حکم دیا گیا۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ یہاں تک بنی اسرائیل کو اعتقادات میں اپنی تکمیل کا حکم دیا گیا۔ اور دو طریقوں سے راہ ہدایت کا نشان دیا گیا ایک عہد کو پورا کرنا اور دوسرا دلیل کی اتباع کرنا اب انہیں فرمایا ہے کہ جس طرح تم پر واجب ہے کہ اپنے آپ کو گمراہی سے بچاؤ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ۔ اور اپنی کتابوں کی ان آیات پر جو کہ اس پیغمبر علیہ السلام اور اس قرآن کی شان میں تمہارے پاس موجود ہیں مرتبہ اور ریاست کے زائل ہونے کو دیکھ کر عمل سے جی نہ چراؤ اسی طرح تمہارے ذمہ واجب ہے کہ دوسروں کو اغوا اور گمراہ نہ کرو اور اغوا کرنے

کے دو طریقے ہیں۔ بکھیرنے اور تقسیم کرنے کے طریقے سے کیونکہ اگر اس غیر نے ہدایت کی دلیلوں میں سے کسی دلیل کو سنا ہوگا تو اس کے گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس دلیل میں شبہ ڈالیں تاکہ اس غیر کے نزدیک حق اور باطل مشتبہ ہو جائیں۔ اور اسے ذہنی تشویش پیدا ہو جائے۔ اور اگر اس غیر نے دلیل ہدایت کو نہیں سنا ہوگا۔ اور محض بے خبر رہا ہو تو اس کے گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے ہدایت کے دلائل کو چھپا دیں اور اسے دلیل تک پہنچنے نہ دیں اور ان دونوں طریقوں سے منع کرنے کیلئے فرمایا ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا اور اپنے عوام پر مشتبہ نہ کرو اَلْحَقَّ حق کے معنی کو جو کہ لغوی دلالت کے ذریعے اور تورات' انجیل اور دوسری کتب الٰہیہ کی آیات سے سیاق و سباق کی مدد سے سمجھتے ہیں۔ اور اسے سمجھنے سے اس پیغمبر علیہ السلام کی نبوت کی صداقت اور اس کتاب کے نزول کا برحق ہونا ان کے ذہن میں جگہ پکڑتا ہے۔ بِالْبَاطِلِ یعنی اپنی باطل تاویل کے ساتھ کہ اضمار یا غیر حقیقی معنی پر محمول کرنے یا سیاق و سباق کے خلاف کرنے کی حاجت ہو۔

ان فرقوں کا بیان جو کہ نص اور حدیث کے معنوں میں تحریف کرتے ہیں

جس طرح اس امت کے گمراہ فرقے جیسے خارجی' رافضی' معتزلی اور قدری قرآن پاک کی بابت کرتے ہیں۔ اور حق کو باطل کے ساتھ مشتبہ کرنے کی۔ اور صورتیں بھی ہیں جو کہ سب کی سب اس نہی اور منع میں داخل ہیں۔

ان میں سے یہ ہیں کہ کسی واقعہ کی روایت میں کوئی لفظ اپنی طرف سے زیادہ کریں جس طرح کہ شیعوں نے کیا ہے کہ حدیث **جهز و اجیش اسامة** کے ساتھ **لعن الله من تخلف عنها** کو بڑھا دیا ہے۔ اور حدیث **من کنت مولاه اللهم وال من والاه** دعاء **من عاداه** میں لفظ **وانصر من نصره واخذل من خذله** بڑھایا۔

اور ان میں یہ ہے کہ ایک لفظ کو قریب المخرج لفظ کے ساتھ بدل دیں۔ جیسا کہ ناصبیوں اور خارجیوں نے حدیث **انت منی بمنزله هارون من موسیٰ** میں لفظ ہارون کو قارون کے ساتھ بدل دیا ہے۔

اور ان میں یہ ہے کہ حدیث یا قرآن پاک میں کوئی لفظ مبہم واقع ہوا ہو۔ اس مبہم لفظ

کو کسی دلیل کے بغیر اپنی خواہش کے ساتھ معین کر دیں۔ جیسا کہ فرقہ شیعہ نے حدیث قرطاس میں جو کہ قالوا اھجرا ستفھموہ وارد ہے قال عمر روایت کر دیا ہے۔ اور ناصبیوں خارجیوں نے حدیث علی رضی اللہ عنہ میں فان آل ابی فلاں لیسوا لی باولیاء انما اولیائی المتقون میں لفظ ابی طالب روایت کر دیا ہے۔ اور رافضیوں نے حدیث ما اظن فلانا و فلانا یعرفان من امرنا شیئا میں ما اظن ابابکر و عمر روایت کر دیا ہے۔ اور حضرت امیر المومنین مرتضی علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے وہ تمام کلمات جو کہ مخالف قریشیوں کے بارے میں تھے جو کہ جنگ جمل اور صفین کا باعث بنے تھے خلفائے ثلاثہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم پر ڈھال دیئے ہیں۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ اشارہ کسی چیز کا واقع ہوا ہو۔ اور اس اشارے کو دوسری چیز پر چسپاں کر دیں جس طرح کہ رافضیوں نے اس حدیث پاک الا ان انقنة ھھنا من حیث یطلع قرنا الشیطان کہ اشارہ زمین مشرق کی طرف فرمایا تھا ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ پاک پر محمول کیا جو کہ مشرق کی جانب تھا۔

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ اور حق کو مت چھپاؤ اس طریقے سے کہ تورات اور انجیل کی نصوص جو کہ کتب الٰہیہ میں موجود ہیں۔ اور اس پیغمبر علیہ السلام اور اس قرآن مجید کے برحق ہونے پر ناطق ہیں۔ عوام سے پوشیدہ رکھو اور انہیں نہ سنواؤ۔ اگر تلاوت کے وقت ان نصوص پر گزرو تو آہستہ پڑھ جاؤ اور اگر کتاب دکھانے کے وقت وہ صفحہ جو کہ ان نصوص پر مشتملہ سے نمودار ہو جائے تو اس پر ہاتھ رکھ دو جس طرح کہ یہودیوں نے آیت رجم میں یہی عمل کیا تھا اور اگر تم سے کوئی پوچھے کہ تم نے تورات یا انجیل میں کوئی آیت اس کتاب اور اس پیغمبر علیہ السلام کی شان میں دیکھی یا سنی ہے۔ تو کہہ دو کہ ہم نے دیکھی نہ سنی۔ یا ہمیں یاد نہیں۔ جس طرح کہ روافض نہج البلاغۃ کی نصوص کو جو کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی مدح میں ان کے نزدیک متواتر ہے اپنے عوام سے چھپاتے ہیں۔

اور حق کو چھپانے کی ایک اور صورت بھی ہے کہ معین کو مبہم کر دیں جس طرح کہ نہج البلاغۃ کے جامع سید رضی نے اللہ بلاد عمر کو اللہ بلاد فلاں کر کے نقل کیا ہے حاصل کلام یہ کہ

علماء کے ذمہ واجب ہے کہ کسی وجہ سے بھی اغوا و اضلال کو اپنی طرف راہ نہ دیں جس طرح کہ ان کے ذمہ واجب ہے کہ وہ خود راستہ پانے والے اور ہدایت پانے والے ہوں تو اے بنی اسرائیل تمہیں بھی لازم ہے کہ اغوا کے ان دو طریقوں سے پرہیز کرو۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ حالانکہ تم جانتے ہو کہ حق حق ہے۔ اور باطل باطل۔ حق کو چھپانا نہیں چاہئے۔ اور باطل کو حق کے رنگ میں ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ قید اس لئے بڑھائی ہے کہ کبھی حق کو باطل کے ساتھ مشتبہ کرنا اور حق کو چھپانا غلط فہمی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ جسے اہل اصول کے عرف میں خطا اجتہادی کا نام دیتے ہیں۔ اور وہ چھپانا یا مشتبہ کرنا اس شدید عتاب کا مقام نہیں کہ کفر تک پہنچے بلکہ اس کی ایک تفصیل ہے اگر اس خطا والے نے حق کی تلاش اور اسباب ہدایت فراہم کرنے میں پوری کوشش کی۔ اور اس کا ذہن خالص حق تک نہیں پہنچا معذور ہے۔ بلکہ اجر پانے والا ہے۔ اور اگر اس نے حق کی دریافت میں مقدور بھر کوشش نہیں کی۔ اور سرسری غور پر قناعت کر کے خطا کی تو لازماً اس پر عتاب اور ملامت ہے۔ لیکن اس کے باوجود کفر تک نوبت نہیں پہنچتی بخلاف حق پوشی اور مشتبہ کرنے کے جو کہ دیدہ دانستہ واقع ہو۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ تم اس فعل کی قباحت کو جانتے ہو۔ اور اگرچہ حق چھپانا اور مشتبہ کرنا اس کی قباحت کو نہ جاننے کے باوجود بھی حرام ہے۔ لیکن جاننے کے باوجود زیادہ قبیح ہو جاتا ہے۔ جیسے زہر کو جان بوجھ کر کھانا۔ پس یہ قید ان کے فعل کی زیادہ قباحت کو بیان کرنے کیلئے ہے۔

اور یہاں جاننا چاہئے کہ اکثر عوام سمجھتے ہیں کہ علم دین کو حاصل کرنا اس خرابی کے خوف کی وجہ سے مضر ہے۔ اور جہالت میں رہنا اچھا ہے۔ کیونکہ وجوب اور حرمت کے بارے میں احکام شرعیہ کا علم رکھنے والے عالم کی طرف سے ان احکام کی مخالفت اس مخالفت کی بہ نسبت زیادہ قبیح ہے جو جاہل کرتے ہیں۔ پس یہ علم حاصل کرنے میں اپنے اوپر یہ وبال لازم کرنا ہے۔ اور اس علم کو حاصل کرنے کو چھوڑنے سے اس شدید وبال سے پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اپنے اس اعتقاد کی تائید کرنے والی ابوالدرداء اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث لاتے ہیں جو کہ مصنف ابن شیبہ اور امام احمد کی کتاب الزہد میں وارد ہے کہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کیلئے ایک بار ہلاکت ہے جو نہیں جانتا اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے علم دیتا اور جو جانتا ہے۔ اور عمل نہیں کرتا اس کیلئے سات مرتبہ ہلاکت ہے۔ اور اس شبہ کا رفع یہ ہے کہ درحقیقت جہالت کا وبال' علم بے عمل کے وبال سے زیادہ ہے۔ کیونکہ جہالت میں دو فرض کام ترک ہوئے ایک علم دوسرا عمل اور علم بے عمل میں ایک فرض ترک ہوا جو کہ عمل ہے۔ پس جو مواخذہ دو فرضوں کے چھوڑنے پر متوقع ہے وہ اس مواخذہ سے زیادہ شدید اور قوی ہے جو کہ ایک کی ترک پر متوقع ہے۔ ہاں علم کے باوجود ترک عمل عقل کی نظر میں بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگوں کے نزدیک جاہل معذور ہوتا ہے۔ لیکن وہاں جہاں کہ اس علم کو حاصل کرنا ضروری نہ ہو لیکن اگر اس علم کو حاصل کرنا ضروری ہو تو لوگوں کے نزدیک بھی وہ جاہل زیادہ طعن و ملامت کا مستحق ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ایک شخص اپنے باپ کو نہ پہچانے اور اس کے ساتھ غلاموں والا معاملہ کرے۔ اور اپنی ماں کو نہ پہچانے اور اس کے ساتھ کنیزوں والا معاملہ کرے۔

اور وہ جو حدیث پاک میں جاہل کے حق میں ایک بار دیل وارد ہوئی۔ اور عالم بے عمل کے حق میں سات بار تو یہ جاہل کے عذاب میں تخفیف پر دلالت نہیں کرتا بلکہ بے عمل عالم پر عتاب اور ملامت کی کثرت پر کہ اسے ہر فعل میں ملامت متوجہ ہوتی ہے۔ اور جاہل پر وہی ایک ملامت علم حاصل کرنے کو چھوڑنے پر متوجہ ہوتی ہے اور بس۔ کافر جو کہ دین کے انکار کی وجہ سے نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج اور دوسرے واجبات کے مواخذہ سے چھوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ جس عذاب کا کفر پر وعدہ کیا گیا ہے وہ اس عذاب سے ہزاروں مرتبہ زیادہ سخت ہے جو کہ واجبات کی ترک اور محرمات پر ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھنا چاہئے کہ جاہل کی ایک دیل عالم بے عمل کی ہزار دیل سے زیادہ سخت ہے۔ اور ایک خوش طبع نے عوام کی یہ مثال ایک شخص سے سن کر جواب میں کہا کہ یہ بھی علم کی برکت ہے کہ جاہل کے وبال کو عالم بے عمل کے وبال سے کمتر اس حدیث کی وجہ سے سمجھ کر اس کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو۔ پس اس شبہ کے ساتھ علم کی فضیلت کا انکار اس کی فضیلت کا عین اقرار ہے۔ اس لئے کہ اگر اس مسئلہ یا اس حدیث کا علم حاصل نہ ہوتا تو یہ شبہ کیسے دل میں راہ پاتا اور اس حیلہ سے عذاب میں تخفیف

کرنا کیسے معلوم ہوتا۔

اور جب بنی اسرائیل کو عقائد صحیح کرنے اور گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے سے باز رہنے کا حکم دیا اب بیان فرمایا ہے کہ اگر تم نے اس کتاب اور اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی۔ اور حق کو مشتبہ کرنے اور اس کے چھپانے سے بھی تم باز رہے۔ تو تمہاری نجات کیلئے صرف اسی قدر کافی نہ ہوگا جب تک کہ اس کتاب اور پیغمبر علیہ السلام کے احکام کو تسلیم نہ کرو اور اپنے آپ کو ان کی جماعت میں داخل نہ کرو کیونکہ منسوخ دین کے ساتھ عمل اگرچہ کسی تبدیلی کے بغیر ہو۔ اور اس میں حق پوشی نہ ہو جائز نہیں۔ بلکہ تم پر لازم ہے کہ اصول شرائع میں اس کتاب اور اس رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرو

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور نماز برپا کرو اور زکوٰۃ دو' کتاب اور اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے تقاضا کے مطابق بلکہ دین کے فضائل اور مستحبات میں بھی اس کتاب اور اسی رسول علیہ السلام کی پیروی کرو۔ کیونکہ بعض فضائل اور مستحباب ایسے ہوتے ہیں جو کہ دین کی علامت بن جاتے ہیں۔ اور انہیں اپنانا اس دین کے قبول ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ جیسے نماز میں جماعت' اسی لئے نماز تنہا نہ گزارو۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ اور دوسرے نمازیوں کے ہمراہ نماز باجماعت ادا کرو۔ کیونکہ اس شریعت میں باجماعت نماز کو تنہا کی نماز سے ۲۷ درجے ثواب کی زیادتی ہے۔ اور باجماعت نماز اس دین کی مخصوص علامت ہے۔ اور یہاں نماز کی رکوع کے ساتھ اس لئے تعبیر فرمائی ہے کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہ تھا اور رکوع اس امت کا خاصہ ہے۔ پس گویا یوں ارشاد ہوا کہ نماز کو مسلمانوں کے طریقے سے رکوع کے ساتھ ادا کرو اور رکوع کو خوبی کے ساتھ اس حد تک ادا کرو کہ یوں معلوم ہو کہ نماز کے تمام افعال سے مقصود بالذات رکوع ہے۔ تاکہ تمہارا دین اسلام قبول کرنا یقینی ہو جائے۔

اور اس آیت سے اکثر شافعی حضرات نے دلیل لی ہے کہ کافروں کیلئے جس طرح حالت کفر میں ایمان لانے کا مکلف ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح عبادات جیسے نماز' روزہ اور زکوٰۃ کا مکلف ہونا بھی متحقق ہے۔ اور احناف جواب دیتے ہیں کہ یہ خطاب ایمان کے

خطاب کے بعد ہے گویا یوں فرمایا ہے کہ پہلے ایمان لاؤ اس کے بعد نماز گزارو اور زکوٰۃ دو لیکن حرف واؤ جو کہ مطلق جمع کیلئے ہے اس ترتیب اور ایمان و اعمال کے ایک دوسرے کے پیچھے کرنے پر دلالت نہیں کرتی اور تحقیق یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک کفار کو ایمان کے خطاب کے ساتھ ملا کر عبادت کے خطاب کا کوئی ڈر نہیں۔ کیونکہ خطاب ایمان اور عبادت کے مجموعے کا ہے صرف عبادت کا نہیں۔ اور بعض احناف نے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ آتُوا الزَّکٰوۃَ کے لفظ کو نماز اور زکوٰۃ کے امر کو قبول کرنے اور ان کی فرضیت کا عقیدہ کرنے پر محمول کیا ہے۔ لیکن یہ معنی درست نہیں ہوتا کیونکہ نماز اور زکوٰۃ کو قبول کرنا اور ان کی فرضیت کا اعتقاد آمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کے مضمون میں داخل ہے تکرار کی حاجت نہیں۔

اور علمائے ظاہر میں سے بعض اس آیت کے مقتضیٰ کی وجہ سے اس طرف گئے ہیں کہ نماز تنہا گزارنا جائز نہیں نماز میں جماعت کا طلب کرنا فرض ہے۔ اور اسی لئے علماء میں سے بعض ان کے اس استدلال کو باطل کرنے کیلئے کہتے ہیں کہ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کی قید جماعت پر دلالت کیلئے نہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہمراہ تم بھی انہیں کے طریقے سے نماز گزارو جو کہ رکوع پر مشتمل ہے نہ یہ کہ تکبیر تحریمہ اور ادا میں بھی موافقت کرو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ مع مسلمانوں کے ساتھ موافقت کے وجوب پر دلالت کرتا ہے خواہ نماز کے ارکان اور ہیئت میں ہو خواہ ادا اور تحریمہ میں لیکن تحقیق یہ ہے کہ ہر امر وجوب کیلئے نہیں۔ پس لفظ ارکعوا اسی قدر پر دلالت کرتا ہے کہ جماعت تم سے مطلوب ہے گو واجب نہ ہو خصوصاً جب کوئی اور دلیل عدم وجوب پر دلالت کرے تو امر کو وجوب پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور وہ دلیل یہ ہے کہ جماعت پر قادر ہونا دوسرے سے متعلق ہے۔ اور قدرت بالغیر قدرت نہیں۔ پس نماز میں بے قدرت تکلیف نہیں ہوتی تو اگر جماعت فرض ہو تو بے قدرت تکلیف لازم آتی ہے۔

اور وہ جو بعض کم نگاہوں نے اس دلیل میں نقض و قدح کے ساتھ اختلاف کیا ہے کہ نماز جمعہ میں جماعت اجماع کے ساتھ فرض ہے اگر جماعت پر قدرت غیر کے ساتھ متعلق ہے۔ اور قدرت بالغیر حقیقت میں قدرت نہیں ہے۔ تو نماز جمعہ میں تکلیف بغیر قدرت کے ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جمعہ کی فرضیت جماعت میسر آنے کی صورت میں ہے۔ اور

جماعت منعقد نہ ہونے کی صورت میں جمعہ فرض نہیں ہوتا اور جماعت کے حاضر ہونے کے بعد امام کو امامت پر اور مقتدیوں کو اقتداء پر بنفس خود قدرت حاصل ہے۔ پس تکلیف بغیر قدرت کے متحقق نہ ہوئی اسی لئے نابینے سے جو کہ کسی ہاتھ پکڑنے والے کے بغیر مسجد تک نہیں پہنچ سکتا جمعہ ساقط ہے۔ کیونکہ اس کی قدرت غیر کے ساتھ متعلق ہے بنفس خود نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ہر کسی کے پنجگانہ نماز میں جماعت سنت موکدہ ہے کہ کسی عذر کے بغیر چھوڑی نہیں جاسکتی جیسے بیماری، سفر، بارش، کیچڑ اور سخت ٹھنڈی اور تیز ہوا کیونکہ یہ سنت دین کی علامات سے ہے۔ جیسے اذان اور جو سنت کہ اس قسم کی ہو اسے کبھی بھی بالکل ترک نہیں کرنا چاہئے ورنہ دوسرے دینوں سے اس دین کے امتیاز کو نقصان پہنچے گا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور جب بنی اسرائیل کو بلکہ اکثر علماء ظاہر کو اس مقام پر شبہ طاری ہوتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ جب ہم دین کی تعلیم اور احکام الٰہی میں کوتاہی نہ کریں۔ اور حق پوشی نہ کریں تو ہمیں اس کی حاجت نہیں کہ خود بھی ان احکام کے مطابق عمل کریں کیونکہ ہمارے فرمان اور تعلیم کی وجہ سے بہت سے لوگ ان احکام پر عمل کرتے ہیں۔ اور یہ تمام اعمال ہمارے اعمال نامے میں لکھے جاتے ہیں الدال علی الخیر کفاعلہ کے مطابق کہ جو خیر پر دلالت کرنے والا ہو وہ ایسا ہی ہے۔ جیسے اس نے خود عمل خیر کو اپنایا مثلاً جتنے نمازی ہماری تعلیم کی وجہ سے نماز گزارتے ہیں گویا ہماری نماز ہے۔ اور اسی طرح روزہ، زکوٰۃ، تلاوت اور ذکر ان کی اس غلط فہمی کا منشا یہ ہے کہ اعمال شرعی کو مالی امداد اور جانی خدمت پر قیاس کرتے ہیں جب کوئی کسی کے فرمان پر ایک شخص کی مالی امداد یا بدنی خدمت کرے اس شخص کے نزدیک یہ امداد اور یہ خدمت کو حکم دینے والے کی امداد اور خدمت ہوتی ہے۔ اسی لئے شکر گزار ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تو نے یہ کام کیا۔ اور تیرے طفیل اس کا نفع مجھے پہنچا۔ حالانکہ احکام شرعیہ کا مقدمہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ شرعی تکلیفات کی مثال طبی دواؤں اور طبی پرہیز کی مانند ہے جب تک کہ مریض آدمی خود اس دوا کا استعمال اور اس پرہیز کو اختیار نہ کرے اسے کوئی فائدہ مستحق نہیں ہوگا۔ اور جسمانی صحت حاصل نہیں ہوتی اگرچہ اس شخص کے فرمان پر ہزاروں

لوگوں نے اس دوا اور اس پرہیز کو استعمال کیا ہو مثلاً جو طبیب تنقیہ اور اسہال کا محتاج ہے۔ اسے دوسرے مریضوں کے تنقیہ اور اسہال سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اخلاط کی وجہ سے معدے کی برائی ہرگز دور نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس شبہ کے ازالہ اور اس غلط فہمی کے رد کیلئے بطریق عتاب فرمایا۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کیا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو جیسے نماز کی ادائیگی' زکوٰۃ دینا' عہد کو پورا کرنا اور حق کا اظہار کرنا وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ اور اپنے نفسوں کو فراموش کر دیتے ہو تو انہیں نیکی پر نہیں ابھارتے ہو۔ اور اپنے نفسوں کی اصلاح نہیں کرتے ہو۔ اور اپنے نفسوں کے احوال کی خبر گیری سے غافل ہوتے ہو۔ جیسا کہ کسی بھولی ہوئی چیز سے غافل ہوتے ہو۔

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ حالانکہ تم کتاب الٰہی کی ہمیشہ تلاوت کرتے اور دوسرے لوگ تم سے کتاب سن کر اس کے مضمون پر عمل کرتے ہیں۔ پس تمہارا حق یہ ہے کہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کے مضمون پر عمل کی کوشش کرو۔ نیز کتاب الٰہی میں تم جگہ جگہ پڑھتے ہو کہ جو حکم الٰہی کے خلاف عمل کرے۔ اور اس کا قول اس کے عمل کے خلاف ہو تو وہ وبال اور عذاب کا مستحق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بھی اس معنی کو تین مقامات پر ارشاد فرمایا ہے اول اس آیت میں دوسرا آیت لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف آیت ۲) میں اور تیسری آیت وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (ھود آیت ۸۸) اور عقل مند سے یہ امر بعید ہے کہ اپنے غیر کے حال کی اصلاح میں کوشش کرے۔ اور اپنے نفس کی ہلاکت سے چشم پوشی کرے۔ اور ہمیشہ کلام الٰہی کی تلاوت کرے۔ اور اس کے مطابق بالکل عمل نہ کرے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم نہیں سمجھتے ہو اپنی کتاب کے معنی کو۔ اپنے اس کام کی قباحت کے ساتھ۔ حالانکہ عقل صریح اس کام کی قباحت پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مقصود یہ ہے کہ دوسرے اپنی مصلحت کو جانیں اور اپنے نقصان سے پرہیز کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے نفس کی مصلحت کو سمجھنا اور اپنے آپ سے نقصان کو دور کرنا دوسروں کی مصلحتوں کو حاصل کرنے اور ان کے نقصان کو دور کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ تو

جو دوسروں کو نصیحت دے اور خود نصیحت قبول نہ کرے وہ ایسی چیز کا مرتکب ہے کہ اسے عقل صحیح قبول نہیں کرتی۔ نیز اس قسم کی نصیحت کرنا دوسروں کو گناہوں پر دلیر کرنا ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس واعظ کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اصل ہوتی اور اس کے یہ ڈراوے اور تاکیدیں صحیح ہوتے تو خود ان کی مخالفت کیوں کرتا۔ تو معلوم ہوا کہ اس کی یہ نصیحت سب بے اصل ہے۔ اور یہ شبہ انہیں احکام دین کو ہلکا سمجھنے اور گناہوں پر جرأت کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اور وہ پند ونصیحت کی غرض کے منافی ہے۔ اور عقل والے کبھی ایسا کام نہیں کرتے کہ عین اس کام کے دوران اس کام کی غرض مجروح ہو۔

نیز اس قسم کا واعظ جس کا عمل اس کے قول کے مخالف ہو اس کا کلام بے تاثیر ہوتا ہے۔ اور اس کی گفتگو مفید نہیں ہوتی۔ اور لوگ اس کی بات کو مقبول نہیں سمجھتے تو لوگوں کو نصیحت کرنے میں اس کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ اور کیا نہ کیا برابر ہو جاتا ہے۔

واعظ بے عمل اور نہی عن المنکر

یہاں جاننا چاہئے کہ بعض ظاہر بینوں نے اس آیت اور دوسری آیت جو کہ سورت صف میں واقع ہے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ سے دلیل پکڑی ہے کہ عاصی کو جائز نہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ آدمی دو چیزوں کے ساتھ مامور ہے خود بھی گناہ چھوڑے اور دوسروں کو بھی اس سے باز رکھے۔ اور اگر خود گناہ ترک نہ کرے تو دوسروں کو اس سے باز رکھنے سے تو نہ ہٹے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کو چھوڑنا دوسرے حکم کی ذمہ داری گرانے کا سبب نہیں ہوتا اور اس آیت میں جو عتاب اور مذمت وارد ہے بے عمل واعظ کو وعظ سے روکنے کیلئے نہیں۔ بلکہ اپنے نفس کے تزکیہ اور اس کی تکمیل پر تاکید کیلئے ہے۔ پہلے اصول کا مقرر قاعدہ ہے یہ کہ جب دو چیزوں کے مجموعے کی طرف انکار متوجہ ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا انکار سمجھنا خطا ہے اس قاعدہ کی بنیاد پر اس آیت میں بھی امر اور نسیان کے مجموعے پر انکار ہے۔ اگرچہ یہ انکار اپنے آپ کو بھولنے کی وجہ سے ہے ہاں قیامت کے دن بلکہ دنیا میں اس قسم کے بے عمل عالم کی ذلت اور رسوائی بہت ہوگی۔ اور اس کی توقع ہے۔

واعظ بے عمل کے عذاب کے بیان میں

چنانچہ حدیث معراج میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے جو کہ تمام صحاح ستہ میں موجود ہے وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نے شب معراج ایک جماعت کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹ رہے ہیں۔ اور جب وہ کاٹنے سے فارغ ہوتے ہیں تو ان کے ہونٹ پھر درست ہو جاتے ہیں۔ میں حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ آپ کی امت کے خطیب ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔ اور صحیحین میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لا کر آتش دوزخ میں ڈال دیں گے۔ اور اس کی انتڑیاں باہر آپڑیں گی اور وہ ان انتڑیوں کو کھینچ کر چکر لگائے گا جس طرح چکی چلانے والا گدھا چکی کے اردگرد چکر لگاتا ہے۔ دوزخی اس کے نزدیک آئیں گے۔ اور کہیں گے کہ اے فلاں! تجھے کیا بلا پڑی تو وہ تھا کہ ہمیں نیک کاموں کا کہتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا وہ کہے گا کہ میں تمہیں حکم دیتا تھا اور خود نہیں کرتا تھا اور تمہیں منع کرتا تھا اور خود وہ کام کرتا تھا۔

اور خطیب اور ابن النجار حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے کہ قیامت کے دن جنتیوں کی ایک جماعت دوزخیوں پر جھانکے گی اور یہ لوگ کہیں گے کہ اے فلاں اور فلاں تمہیں کیا ہوا کہ دوزخ میں گر پڑے۔ حالانکہ ہم تمہاری تعلیم کی وجہ سے بہشت میں آئے۔ وہ لوگ جواب میں کہیں گے کہ ہم تمہیں تعلیم دیتے تھے۔ اور خود عمل نہیں کرتے تھے۔ اور طبرانی' خطیب اور ابن ابی شیبہ' جندب بن عبداللہ بجلی' ابو بریدہ اسلمی اور سلیک عطفانی سے اسانید صحیحہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ بے عمل عالم چراغ کے دھاگے کی طرح ہے خود جلتا ہے۔ اور دوسروں کو روشنی بخشتا ہے۔

اور چونکہ عہد پورا کرنا' حق کا اظہار کرنا' مانوس دین کو چھوڑنا۔ نئے دین کی اتباع کرنا' ہمیشگی اور جماعت کی رعایت کے ساتھ نماز ادا کرنا اور خوش دلی سے زکوٰۃ دینا نفس پر بہت

ناگوار اور بھاری ہے۔ اس لئے فرمایا ہے کہ اگر تم سے یہ کام نہ ہو سکے۔ اور ان چیزوں کی مشقت تمہیں ان پر عمل سے روکے جو دوسروں سے کہتے ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ ان دو دواؤں کو کام میں لاؤ۔

وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اور ان مشکل کاموں پر صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔

صبر کی قسموں کا بیان

صبر کی تین قسمیں ہیں اول طاعت کی مشقت پر صبر کرنا۔ جیسے نماز کیلئے نیند سے اٹھنا' سردی کے وقت غسل اور وضو کرنا' موسم گرما میں اور تاریکی میں مسجد کو جانا علی ہذا القیاس' دوسری قسم گناہ کی لذت سے صبر کرنا جو کہ بے اختیار طبیعت کو مرغوب ہوتی ہے۔

تیسری قسم مصیبت پر صبر کرنا کہ جزع وفزع' شکایت' مخالف شرع حرکات سے اپنے آپ کو باز رکھنا۔ اور جب آدمی نے ان تین حالتوں میں اپنے نفس کو صبر کا عادی کرلیا تو یقین ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے نفس کا مالک ہوگیا۔ اور اس کا نفس مغلوب اور عقل غالب ہوگئی۔ اور یہ ساری چیزیں اس پر آسان ہوگئیں۔ پس ملکہ صبر کی تعلیم نفس کیلئے پرہیز کی ورزش کی طرح ہے جو کہ حفاظت صحت کا سرمایہ اور مرض سے پناہ کا باعث ہے۔ اسی لئے حدیث پاک میں وارد ہے کہ ایمان دو حصے ہیں نصف صبر میں اور نصف شکر میں۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا۔ گویا اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ ایمان بمنزلہ صحت کے ہے۔ اور صحت دو چیز سے حاصل ہوتی ہے پرہیز اور دوا' پرہیز صبر ہے۔ اور دوا شکر اور جہاں پرہیز نہ ہو دوا کوئی فائدہ نہیں دیتی اور پرہیز دوا کے بغیر بھی فائدہ دیتی ہے۔ حضرت امیر المومنین مرتضی علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے صبر کو ایمان کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ نے کتاب الایمان میں اور بیہقی نے ان سے روایت کی ہے الصبر من الایمان بمنزلہ الراس من الجسد از اقطع الراس انتن مافی الجسد ولا ایمان لمن لا صبر لہ یعنی صبر ایمان کیلئے ایسا ہے جیسا جسم میں سر' جب سر کاٹ دیا جائے تو سارا جسم متعفن ہو جاتا ہے۔ اور جسے صبر نہیں اس کا

ایمان نہیں۔

اور اسی لئے حدیث پاک میں عبید بن عمیر لیثی کی روایت سے حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے مطابق وارد ہے کہ ایک دن ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر اور سخاوت۔ نیز صحاح ستہ میں مروی ہے کہ کسی کو صبر سے زیادہ وسیع عطیہ خیر نہیں دیا گیا۔ اور ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر سے باہر تشریف لائے۔ اور اپنے دوستوں سے فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ بغیر سیکھنے کے علم عطا فرمائے۔ اور ہدایت کے بغیر راہ پانے والا کر دے۔ اور تم سے کوئی چاہتا ہے کہ اس سے نابینائی کو دور فرمائے۔ اور اسے بینا کر دے۔ صحابہ کرام نے عرض کی کہ ہم میں ہر ایک یہی مطلب رکھتا ہے۔ فرمایا: جو دنیا سے بے رغبتی اختیار کرے۔ اور اپنی حرص کی رسی کم کر دے اللہ تعالیٰ اسے بغیر پڑھے ایک علم عطا فرماتا ہے۔ اور بغیر ہدایت کے ایک رشد عطا فرماتا ہے۔ جانو اور آگاہ رہو کہ میرے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کی بادشاہی قتل اور تکبر کے بغیر درست نہ ہوگی۔ ان کی دولت بخل اور ظلم کے بغیر برقرار نہ رہے گی اور ان کی محبت دین میں سستی اور ان کی خواہش نفس کی پیروی کے بغیر حاصل نہ ہوگی۔ پس تم سے جو اس وقت کو پائے اور اپنی فقیری پر صبر کرے۔ اور ان کی دولت سے اپنے آپ کو باز رکھے۔ اور ان کی ناراضگی پر صبر کرے۔ اور ان کی محبت سے دست بردار ہو جائے۔ اور اپنی ذلت پر صبر کرے۔ اور عزت کو ترک کر دے۔ اور ان امور میں اس کی غرض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے بغیر کوئی دوسری چیز نہ ہو اللہ تعالیٰ اسے پچاس ولیوں کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ اور حکیم ترمذی نوادر الاصول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے ہیں کہ میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے چند نفع بخش چیزوں کی تعلیم دوں میں نے عرض کی جی ہاں آپ نے فرمایا: علم لازم کرو کیونکہ علم مومن کا دوست خیر خواہ ہے۔ اور بردباری بمنزلہ اس کے وزیر کے ہے۔ اور عقل بمنزلہ رہبر کے ہے۔ نرم خوئی بمنزلہ بھائی کے

ہے۔ جو کہ ہر وقت اس کے کام آتی ہے۔ اور صبر اس کے لشکر کا سالار اعظم ہے کہ کوئی مہم اس کی مدد کے بغیر فتح نہیں ہو سکتی۔

اور بیہقی نے اشعث بن سلامہ سے روایت کی کہ انہوں نے ابو حاصرہ اسدی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص کو جو کہ ہمیشہ مجلس پاک میں حاضر ہوتے تھے چند روز نہ دیکھا۔ اس کے متعلق تجسس کیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ اس نے فلاں پہاڑ میں خلوت اختیار کر لی ہے۔ اور عبادت میں مشغول ہے۔ فرمایا اسے میرے پاس لاؤ۔ جب وہ خدمت عالیہ میں پہنچے تو فرمایا تجھے کیا ہوا کہ تو نے پہاڑ میں تنہائی اختیار کر لی اور مسلمانوں کی صحبت سے کنارہ کر لیا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے لوگوں کی صحبت عبادت خداوندی میں تشویش دیتی ہے۔ فرمایا کہ آدمی کا مسلمانوں کی صحبت میں اپنی ناپسند چیزوں پر صبر کرنا اس عبادت سے بہتر ہے جو کہ ساٹھ سال تک خلوت میں کرے۔

اور بخاری کتاب الادب میں، ترمذی اور ابن ماجہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے ہیں کہ وہ مسلمان جو کہ لوگوں کے ساتھ مل کر رہے۔ اور ان کی طرف سے تکلیف پر صبر کرے اس مسلمان سے بہتر ہے جو کہ ان کی تکلیف پر صبر نہ کرے ان کی صحبت چھوڑ دے۔

نماز کے ساتھ مدد مانگنے کا بیان

رہ گئی نماز تو اس کے ساتھ استعانت کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ جو کہ عوام کا حصہ ہے یہ ہے کہ جب کوئی مقصد پیش آئے جس کا چارہ معلوم نہ ہو۔ اور اسے پورا نہ کر سکیں تو اس مطلب کے حصول کیلئے مسجد میں جائیں۔ اور دوگانہ ادا کریں۔ اور دعا میں مشغول ہوں۔ اور اس طریقے کو ترمذی اور دیگر صحاح نے اس طرح روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف یا بنی آدم میں سے کسی کی طرف کوئی حاجت ہو تو وہ وضو کرے۔ پھر دو رکعت ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ کی ثنا کرے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھے۔ پھر کہے **لا الٰہ الا اللّٰہ الحلیم الکریم سبحان اللّٰہ ربّ العرش**

العظیم اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اسئلك موجبات رحمتك و عزائم مغفرتك والغنیمة من كل بر دالسلامة من كل اثم لا تدع لی دنیا الاغفرته ولا هما الا فرجة ولا حاجته هی لك رضا الا قضیتها یا ارحم الراحمین

اور استعانت کے اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو دنیوی حاجتوں میں سے کوئی حاجت اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ اور اس کے اسباب کو حاصل کرنے میں مصروف نہیں کرتی۔ اور اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی۔ بلکہ دینوی حوائج کا پیش آنا اس کے حق میں نماز کا وقت آنے کا حکم حاصل کرے۔ اور اس کی نظر اسباب سے منقطع ہو کر صرف سبب الاسباب کے ساتھ متعلق ہو جاتی ہے۔ اور جب تمام اسباب اس کی قدرت کے قبضہ میں ہیں۔ اور اس کے تصرف کے ساتھ فراہم ہو جاتے ہیں۔ اور منتشر ہو جاتے ہیں تو اسباب جمع کرنے کی مشقت سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اسباب کی خصوصیتیں جو کہ زیادہ تر باہمی حسد اور بغض' امید کی طوالت' اور ان لوگوں کی پاسداری کا موجب ہوتی ہیں کہ جن کی طرف سے ان اسباب کے حصول کی توقع ہوتی ہے نظر سے گر جاتی ہیں۔ اور اسباب کا حاصل نہ ہونا اور مرتبہ اور ریاست کا زوال عقل کے نزدیک ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور انہیں چھوڑنا دشوار نہیں ہوتا۔

طریقۂ قلندریہ

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نماز سے استعانت میں مطلب ملحوظ نہیں ہوتا بلکہ نفس کو پوری طاقت کے ساتھ حضرت حق جل وعلا کے دربار کبریائی کی طرف کھینچنا ہے۔ کیونکہ دنیوی حاجات زیادہ تر روح کے خواہشات یا خواہشات کے اسباب کی طرف اترنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ جب اسے اس جہان سے عالم بالا کی طرف کھینچا جائے۔ اور بارگاہ خداوندی کے مکالمہ اور مناجات کی لذت میں استغراق اور انوار جلال و جمال کی حاضری رونما ہو تو وہ اس جہان کے امور اور کیا ہونا چاہئے کیا نہیں ہونا چاہئے سے غافل اور بے خبر ہو جاتا ہے۔ جس طرح کہ زخمی یا جس کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو کہ زخم کے سینے یا شکستہ ہڈی کو باندھنے کے وقت کوئی نشہ آور چیز کھلا دیتے ہیں۔ تا کہ زخم اور ہڈی ٹوٹنے کے درد سے بے خبر ہو جائے اسی طرح یہاں جب حوائج دنیا نفس کو اپنی کھینچا تانی میں ڈال دیں تو چاہئے کہ اسے محبوب حقیقی کے حسن

میں مشغول کر دیں تا کہ اس جمال کے مشاہدہ کی لذت سے اپنے آپ کو اور جو ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے کو بھول جائے۔ اور اس لذت کی وجہ سے جو اسے حاصل ہوئی ناپسند چیزیں اس کی نظر میں ہلکی معلوم ہوں۔ اور یہ طریقہ اکثر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول شریف تھا کہ بہ نفس نفیس اسی طریقے پر عمل فرماتے تھے۔ اور اسی طریقے کو قلندریہ کہتے ہیں کہ امو دنیا سے بے توجہی اور اس کی ترک کیلئے باوجود اس کے دھوکا کے اس سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ خوف دلانے' ڈرانے' حسن آخرت اور اس کی بقا اور دنیا کی قباحت اور اس کی فنا سمجھانے کا راستہ دشوار ہے کہ ہر کسی کو سہولت کے ساتھ میسر نہیں آتا اور شیطان شبہات اور وسوسے ڈال کر اکثر لوگوں کو اکثر اوقات میں اس راہ پر چلنے سے روک دیتا ہے۔ جس طرح کہ کہنے والے نے کہا ہے (بیت) صنمارہ قلندر سزد اربمن نمائی' کہ دراز دور دیدم راہ ورسم پارسائی کہ قلندر کا طریقہ اگر تو مجھے دکھائے تو موزوں ہے۔ کیونکہ پارسائی کے راہ ورسم بہت دور دراز ہیں۔ پس یہ نماز اسم ذات کے ساتھ نفی واثبات کے شغل کا حکم رکھتی ہے جو کہ شوق کو ابھارنے اور خطرات اور وسوسوں کو دور کرنے کیلئے تریاق مجرب ہے۔

امام احمد اور ابوداؤد نے حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی امر کی وجہ سے پریشان ہوتے تو نماز کی طرف پناہ لیتے۔ اور نسائی' ابن حبان حبیب رومی کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام جب کسی وجہ سے گھبراتے تھے تو نماز کی طرف پناہ لیتے تھے۔ اور ابن عساکر اور ابن ابی الدنیا حضرت ابو درداء کی روایت سے لائے ہیں کہ جب رات کو آندھی آتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے پناہ مسجد ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ہوا رک جاتی اور جب آسمان میں سورج گرہن یا چاند گرہن کا واقعہ رونما ہوتا تو آپ نماز میں مصروف ہو جاتے یہاں تک کہ وہ کھل جاتا۔

اور محب الدین طبری حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آشیانہ پاک میں فقر (اختیاری) کی کیفیت ہوتی اور رات کو کوئی چیز نہ کھاتے اور بھوک غلبہ کرتی تو بار بار مسجد میں تشریف لے جاتے اور

نماز میں مشغول ہوتے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ان کا ایک بیٹا قریب الرگ ہو گیا آپ کو اطلاع دی گئی۔ اتنا سنتے ہی نماز میں مشغول ہو گئے۔ اور نماز میں اس قدر مستغرق ہوئے۔ اور نماز لمبی کی کہ انہیں کوئی خبر نہ ہوئی یہاں تک کہ لوگ بیٹے کو دفن کر کے آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا کہ مجھ پر اس بیٹے کی محبت غالب تھی اس کی مصیبت پر صبر نہیں کر سکتا تھا تو مجبوراً اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نماز کی پناہ لی اور بے خبر ہو گیا گویا آپ نے اشارہ فرمایا کہ اس آیت میں ذکر کے اعتبار سے نماز کو صبر کے بعد رکھنا ترقی کیلئے ہے۔ یعنی جب صبر سے کام نہ چلے تو نماز میں استغراق کے ساتھ پناہ لینی چاہئے جو کہ عقل اور وہم کے وسوسوں سے بے خبر کر دیتی ہے۔ اور روح کو حاضری کی لذتوں سے یہاں تک پر کر دیتی ہے کہ اس میں کسی وسوسہ اور خیال کی گنجائش نہیں رہتی اور اسی لئے پہلے طریقے یعنی نماز سے استعانت کو عوام کیلئے چاند سورج کے گرہن اور قحط کی شدت کے وقت نماز استسقاء کی صورت میں نشان دیا اور اس دوسرے طریقے کو اپنے لئے اور اپنی امت کے کاملین کیلئے مخصوص فرمایا چنانچہ فرمایا:

وَاِنَّهَا اور تحقیق وہ نماز جو کہ دل کی حاضری اور ظاہری باطنی شرائط کے اجتماع کے ساتھ ہو۔ اور مرتبہ اور حکومت' عورت' اولاد اور مال دنیا کی محبت کو دل سے دور کر دے لَكَبِيرَةٌ البتہ شان اور بوجھل ہے ہر کسی سے ممکن نہیں اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ مگر اس جماعت پر جو کہ خشوع اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور ان کا نفس اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے سکون پاتا ہے۔ کیونکہ وہ نماز ان کے حق میں آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا فرمایا کرتے تھے وقرة عينى فى الصلوة جیسے ہی وہ لوگ نماز میں گئے انہیں مشاہدۂ حق میسر ہوا اور اس مشاہدہ کی لذت میں انہوں نے ہر چیز کو فراموش کر دیا۔ اور مدت دراز تک اس لذت کا اثر ان کے نفوس میں باقی رہتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض اس مرتبہ تک پہنچیں کہ انہیں عین مشاہدہ میسر ہو تو کم از کم اس جماعت میں سے ہوتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ جو کہ نماز میں مشغولی کے وقت خیال کرتے

ہیں کہ وہ نماز میں اپنے پروردگار سے ملاقات کرتے ہیں۔ پس وہ انہیں دیکھتا ہے گو وہ اسے نہ دیکھیں اس شخص کی طرح جو کسی بادشاہ کے دربار میں اس طرح حاضر ہو کہ بادشاہ اسے دیکھے اور وہ بادشاہ کو نہ دیکھے کہ اسے کچھ تو حاضری کی لذت ضرور حاصل ہو گی۔ اور یہ بھی خیال کرتے ہیں۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہ وہ نماز میں اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ اور جب کسی کو کسی شخص کی طرف رجوع منظور ہو تو لازماً وہ ان مشقتوں کو جو کہ حقیر چیزوں میں رونما ہوتی ہیں نظر انداز کر دے گا۔ اور گزشتہ خواہشات کو پھینک دے گا جس طرح کہ کہنے والے نے کہا ہے کہ (بیت) ہرآنکہ عشق یکے دردلش گرفت قرار روا بود کہ تحمل کند جفاء ہزار یعنی جس کے دل میں کسی ایک کا عشق قرار پکڑے جائز ہے کہ وہ ہزار کا ظلم برداشت کرے۔

حدیث صحیح میں جو کہ صحیحین میں مروی ہے مذکور ہے کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھتا ہے۔ اور اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ یعنی عبادت کو اچھی طرح ادا کرنے کا معنی یہ ہے کہ تو عین عبادت میں یوں خیال کرے کہ میں اپنے معبود کو دیکھ رہا ہوں۔ تو اگر یہ مقام تجھے میسر نہیں تو اتنی بات تو مقرر ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اور حاضری میں اتنی قدر بھی کافی ہے۔ اور یہ لذت بخشتی ہے۔

اور جب یہاں تک بنی اسرائیل کو ایمان اور تقویٰ حاصل کرنے کے طریقے کا نشان دیا کہ وہ صبر' مناجات حق میں استغراق اور اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ حاضر اور جلوہ گر ہونا ہے۔ اور یہ راستہ بہت دشوار گزار اور بوجھل ہے لہٰذا بیان فرمایا ہے کہ اگر اس راہ پر چلنا تمہیں ممکن نہ ہو تو ایک دوسری راہ کا تمہیں نشان دیتا ہوں جو کہ پہلی راہ کی نسبت آسان ہے۔ اور وہ راہ شکر ہے۔ کیونکہ حقیقت شکر' منعم حقیقی کی نعمتوں کا ملاحظہ کرنا ہے۔ اور نعمتوں کا ملاحظہ کرنا منعم کے ساتھ بے حد محبت کا موجب ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے جبلت القلوب علی حب من احسن الیها دلوں کی جبلت میں احسان کرنے والوں کی محبت رکھی گئی ہے۔ اور محبت کا کامل ہونا ایسی لذت بخشتا ہے جو کہ دوسری پسندیدہ چیزوں کی

لذتوں سے زیادہ کامل اور زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اوران لذات کے مقابلہ میں ساری لذتیں حقیر ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ پھر خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

يَا بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اے یعقوب علیہ السلام کی اولاد میری اس نعمت کو یاد کرو جو کہ میں نے تم پر انعام فرمائی۔ پس تمہارا حق یہ ہے کہ اس نعمت کے شکریہ میں اس نعمت کے معیار کے مطابق نیک اعمال کرو۔ اور اگر دوسری نعمتوں کے ملاحظہ سے عاجز آ جاؤ تو وہ نعمت جو کہ ان تمام نعمتوں کی جامع ہے اس کا لحاظ کرو۔ اور وہ یہ ہے کہ میں نے تمہیں بنی آدم کے تمام گروہوں سے ممتاز اور خاص کیا ہے۔

وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی کیونکہ میں نے تمہارے گروہ میں چار ہزار پیغمبر علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ اور تورات' زبور' انجیل اور دوسرے صحائف تمہاری لغت میں تمہارے ہاتھوں میں اتارے اور عدل کرنے والے بادشاہ اور باعمل علماء تم میں پیدا فرمائے۔ پس تم بنی آدم کے تمام گروہوں میں سے اس شرف کے ساتھ ممتاز ہوئے ہو کہ مهبط وحی الٰھی آسمانی کتابوں کا مخزن۔ احکام شرعیہ کے اسرار جاننے والے اور انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کے عادات واطوار سے واقف اس وقت تک تمہارے سوا اور کوئی گروہ نہیں۔ اور یہ فضیلت تمہیں اس وقت تک موجود سارے جہانوں پر حاصل ہے۔ پس تمہارا حق یہ ہے کہ اس وقت جو کہ نئی کتاب کے نزول اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کا وقت ہے بھی تمام خلائق سے اس دین کی پہلی امداد اور اس کتاب اور اس رسول علیہ السلام کے حکم کی تعمیل میں جلدی کر کے افضل ہو جاؤ تا کہ اس وقت کے تمام جہانوں پر بھی تمہاری فضیلت کی صورت حاصل ہو جائے۔ اور تم اس مرتبہ اور منصب سے جو کہ کارخانہ شریعت کے دفتری کا منصب ہے معزول نہ ہو۔

ظاہر بیں مفسرین اس لفظ کے مضمون میں جو کہ بنی اسرائیل کے تمام جہانوں سے افضل ہونے کا فائدہ دیتا ہے تردد کرتے ہیں۔ حالانکہ تردد کی کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ جب سے بنی اسرائیل کا فرقہ وجود میں آیا ہے اس وقت سے لے کر اس کتاب کے وقت تک کوئی فرقہ

ان فضائل میں ان کا شریک نہیں ہوا ہے ہاں اس کے بعد کہ بنی اسرائیل نے اس رسول علیہ السلام کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ اور اس کتاب پر انہیں ایمان میسر نہ آیا اس منصب سے گر گئے اور عام لوگوں کی طرح ہو گئے۔ اور یہ وقت مضمون کلام سے خارج ہے اس وقت بنی اسرائیل کی تمام جہانوں پر فضیلت اس لفظ سے نہیں سمجھی جاتی تا کہ اشکال کی جگہ ہو۔ اور بنی اسرائیل کے فرقہ کی مجموعی فضیلت پہلے ذکر کئے گئے فضائل میں سب فرقوں پر قطعی ہے۔ اگرچہ اس فرقہ کے بعض نالائقوں نے اپنے نفس کی شامت کی وجہ سے اس فضیلت کو برباد کر دیا۔ اور اسفل سافلین تک پہنچ گئے۔ جیسے قارون اور سامری کیونکہ اس فرقہ کی فضیلت کیلئے یہ درکار نہیں کہ اس کا ہر ہر فرد دوسروں سے افضل ہو۔ جیسا کہ ہماری امت میں سے فرقہ سادات کی فضیلت اس بات کی متقاضی نہیں کہ اس فرقہ سادات کا ہر ہر فرد اپنے ماسوا سے افضل ہو اس قسم کے مقامات پر اس گروہ کی مجموعی صورت پر نظر ہوتی ہے نہ کہ ہر ہر فرد پر۔

اور اگر بنی اسرائیل کہیں کہ ہمارے پہلے لوگ ان نعمتوں کا پورے طور پر شکر ادا کر کے اس مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اب جو بھی ان کی اولاد سے ہوگا ان کا متوسل ہوگا اسے باز پرس کا خوف نہیں ہے ان کی شفاعت اسے چھڑانے میں کافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت ہمارے پہلوں کے شامل حال رہی ہماری نجات میں کام آئے گی کہ ہم ان کا نام لیتے ہیں۔ اور ان کی نسل میں سے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس خیال سے دھوکا مت کھاؤ اور قیامت کے دن کو دنیا پر قیاس مت کرو۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا اور اس دن سے ڈرو کہ **لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ** کوئی نفس ادا نہیں کرے گا اگرچہ وہ شکر کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں اسے پورا قرب حاصل ہو **عَنْ نَّفْسٍ** کسی نفس کی طرف سے اگرچہ اس کا حقیقی بیٹا ہو یا اس نے ساری عمر اس کا نام لیا ہو۔ اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کیا ہو جبکہ اس نے شکر چھوڑ کر کفر کیا ہو **شَيْئًا** کسی چیز کو حقوق شکر سے جو کہ اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔ کیونکہ اس وقت اپنا شکر کسی کو دینا ممکن نہ ہوگا۔

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اور اس شکر گزار مقرب بارگاہ سے کوئی شفاعت اس کوتاہی

کرنے والے کے حق میں جس نے شکر چھوڑ کر کفر اختیار کیا قبول نہیں کی جائے گی۔

وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ اور اس شکر گزار سے فدیہ یا سپرداری نہیں لی جائے گی جو کہ اس نفس کافر کے عوض دے گا اگر بالفرض اس سے ہو سکے وَّلَاھُمْ یُنْصَرُوْنَ اور نہ ہی شکر میں ان کوتاہی کرنے والوں کا کوئی مددگار ہوگا جو کہ طاقت اور غلبہ کے ساتھ ان سے عذاب کو روک سکے۔ اور دنیا میں عذاب کو دفع کرنے کا طریقہ انہیں چار چیزوں میں منحصر ہے یا قہر اور غلبہ کے ساتھ اور اسے نصرت کہتے ہیں یا قہر وغلبہ کے بغیر اور وہ دو قسم ہے یا کوئی چیز دیئے بغیر چھڑا لیں اور وہ شفاعت ہے یا کوئی چیز دے کر اور وہ بھی دو قسم پر ہے یا ایسی چیز دینا ہے جو کہ اس کے ذمہ بعینہٖ واجب تھی جیسے فرض' تاوان اور تاوان کا مال یا اس کے عوض میں دینا ہے۔ جیسے فدیہ' گروی اور یرغمال کہتے ہیں۔ اور جب خلاصی کے یہ چاروں راستے قیامت میں نہیں ہوں گے تو اس دن غیر پر کسی وجہ سے بھی اعتماد نہ رہا۔

یہاں جاننا چاہئے کہ معتزلہ اس آیت سے شفاعت کی نفی کی دلیل پکڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ قیامت کے دن شفاعت نہیں ہو گی۔ لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ اس آیت میں شفاعت کی نفی اس سے ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کا کبھی شکر ادا نہ کیا ہو۔ اور وہ کافر کے سوا کوئی اور نہیں۔ اور کافر کے حق میں شفاعت بالا جماع مقبول نہیں۔ یہ کوئی بحث اور جھگڑے کا مقام نہیں۔

چند جواب طلب سوالات

پہلا سوال یہ ہے کہ شفاعت اور فدیہ کی نفی میں ضمیر کے ساتھ تاکید نہیں فرمائی ہے۔ اور نصرت کی نفی میں لفظ ہم کے ساتھ تاکید ارشاد فرمائی۔ اسلوب کی اس تبدیلی میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے مقامات میں ضمیر لانا حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسا کہ ماانا قلت کی بحث میں قرار دیا گیا ہے۔ پس کلام کا معنی یہ ہوا کہ مدد نہ دینا کافروں اور حق شکر میں کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ایمان والوں کی اس دن مدد ہو گی کیونکہ ان کے دشمنوں سے ان کا بدلہ ضرور لیں گے۔ جس طرح کہ دوسری آیات میں اس کی تصریح ہے انا لننصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد

(المؤمن آیت ۵۱) و حقًا علینا نصر المؤمنین (الروم آیت ۴۷) بخلاف بغیر حکم کے شفاعت قبول کرنے اور فدیہ اور یرغمال لینے کے کہ مومن و کافر اور نیک اور بد سب اس کی نفی میں شریک ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت میں قبول شفاعت کو فدیہ لینے سے پہلے بیان فرمایا جبکہ ایک دوسری آیت میں جو کہ اس پارہ کے آخر میں واقع ہے بالعکس ارشاد ہوا کلام کے اس فن میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بلا میں گرفتار ہوتا ہے۔ تو اس کے عزیز اسے چھڑانے کی فکر میں ہو جاتے ہیں۔ ان کی کوشش کی صورت اسی ترتیب سے ہوتی ہے کہ پہلے وہ اس کے ذمہ واجب حق کی ادائیگی میں کوشش کرتے ہیں۔ اور جب اس تدبیر سے عاجز ہو جاتے ہیں تو سفارش اور وسیلہ سے اس بلا کو دور کرتے ہیں۔ اور جب اس سے بھی عاجز ہو جائیں تو کوئی یرغمال یا فدیہ دیتے ہیں۔ اور جب اس سے بھی عاجز آ جائیں تو بھائیوں اور مددگاروں کو جمع کر کے جھگڑا اور لڑائی کرتے ہیں۔ پس اس آیت میں اسی ترتیب کی موافقت منظور ہوئی کیونکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔

اور جب بعض لوگوں کے دل میں مال کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اتنے عالی نفس نہیں ہوتے۔ اور سفارشیوں کا احسان اٹھانے سے جو عار لاحق ہوتی ہے مالی خرچ کرنے کے مقابلہ یں ان پر اتنی دشوار نہیں ہوتی۔ پہلے وہ سفارش اور وسیلہ کا سہارا لیتے ہیں اس کے بعد جب دیکھتے ہیں کہ اس حیلے سے کام نہیں چلا تو فدیہ اور جسمانی یرغمال دیتے ہیں۔ اسی لئے دوسری آیت میں ترتیب کو بدل دیا گیا۔ تا کہ دونوں فریقوں کے حال کا اشارہ ہو لیکن اکثر رونما ہونے کی وجہ سے اس ترتیب کو مقدم فرمایا۔ اور دوسری ترتیب کو موخر فرمایا کیونکہ یہ نادر الوقوع اور پست ہمت لوگوں کا کام ہے۔ پہلے لانے کے لائق نہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ نفی شفاعت اور فدیہ و یرغمال کی نفی کے مقام میں ضمیر مفرد پر اکتفا فرمایا۔ اور نفی نصرت کے مقام پر جمع کی ضمیر لائی گئی اور یوں نہ فرمایا و لاھی تنصر او لا ینصر احد احدا اس کا جواب یہ ہے کہ نصرت کے لئے اجتماع لازم ہے کہ تنہا ایک آدمی کسی کی مدد نہیں کر سکتا اور جب دوسرے لوگ بھی کوتاہی کرنے والے کے ساتھ اس کی مدد کو

جمع ہو جائیں تو ہر ایک ہر ایک کو مدد دیتا ہے۔ پس ناصر بھی متعدد ہوئے۔ اور منصور بھی متعدد ہوئے۔ اس نکتہ کیلئے ضمیر کو بھی جمع لایا گیا گویا ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تمام گناہگار مجموعی طور پر چاہیں کہ کوئی ان کی امداد کرے۔ اور اس صورت میں ان کی امداد قبولیت کے زیادہ قریب ہو گی کہ وہ خود بھی کثیر تعداد میں ہیں مقابلہ کی طاقت رکھتے ہیں تھوڑی سی امداد کی وجہ سے وہ منصور ہو سکتے ہیں کوئی بھی اسے قبول نہیں کرے گا چہ جائیکہ وہ اکیلا امداد چاہے کہ اسے امداد دینا بہت مشکل ہے۔

شفاعت کا بیان

چوتھا سوال یہ ہے کہ یہ آیت ظاہر کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نفس عن نفس شیئا کے عموم کے پیش نظر کسی کو شفاعت کا منصب نہیں کہ عموم تین مرتبوں میں واقع ہوا۔ ایک شفاعت کرنے والے نفس میں' دوسرا جس کی شفاعت کی جائے۔ اور تیسرا اس کام میں کہ جس میں شفاعت واقع ہو۔ یعنی شیئاً ۔ اور یہ مسئلے شفاعت کے نکرہ ہونے سے نکلتا ہے۔ حالانکہ اہل شریعت کا اس امر پر اجماع ہے کہ شفاعت ضرور واقع ہوگی۔ معتزلہ صرف کبیرہ گناہ کرنے والے کے سوا شفاعت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اہل سنت کبیرہ گناہ والوں کیلئے شفاعت جائز قرار دیتے ہیں ہاں کافر کو کوئی بھی شفاعت کے قابل نہیں جانتا ہم کہتے ہیں کہ بے شمار آیات واحادیث شفاعت کے وقوع پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اس آیت کی تخصیص ضروری ہے۔ سنت کافر کے ساتھ تخصیص کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اس دن شفاعت قبول نہیں ہوگی اس دلیل سے بے شمار آیات میں شفاعت کی نفی کو اسی قید کے ساتھ مقید قرار دیا گیا۔ **یومئذ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمن و رضی له قولا** (طٰہٰ آیت ۱۰۹) **من ذالذی یشفع عنده الا باذنه** (آیۃ الکرسی) **ما للظلمین من حمیم و لا شفیع یطاع** (المومن آیت ۱۸) **و لا تنفع الشفاعة عندهٗ الا لمن اذن له** (سبا آیت ۲۳) اور متواتر احادیث نے بیان کیا کہ کافر کے سوا تمام گناہگاروں کے حق میں شفاعت کا حکم ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ شفاعت سے مطلقاً محروم کفار ہیں۔ اور بس۔ اور اس مقام کے مناسب بھی اسی شفاعت کی نفی ہے۔

کیونکہ یہ کلام اہل کتاب اور ان کے ہم مشرب لوگوں جو کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی اولاد اور بزرگان دین کے متوسلین میں سے اپنے آپ کو قیامت کی پکڑ اور باز پرس سے محفوظ جانتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ کفر اور دیگر قباحتوں کے باوجود ہمارے بزرگ ہمیں اخروی عذاب سے چھڑا لیں گے کہ غلط خیال کے رد میں ہے۔ اور اس خیال کے رد کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شفاعت جس کی امید کی وجہ سے تم دھوکا کھاتے ہو اس روز واقع نہیں ہوگی کیونکہ ہر شفاعت کرنے والے کی شفاعت اس دن حکم الٰہی پر موقوف ہوگی جب شفاعت حکم الٰہی پر موقوف ہوئی تو اعتماد کی جگہ نہ رہی کیونکہ اس شفیع کا توسل اس شفاعت کو حاصل کرنے میں کفایت نہیں کرے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم درکار ہے۔ اور وہ خطرے میں ہے ہو یا نہ ہو تم صرف کسی کامل سے توسل پر ناز نہ کرو کہ یہ توسل مستقل سبب نہیں ہے۔

اور اسی لئے بعض مفسرین نے **لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ** میں **مِنْهَا** کی ضمیر کو قصوروار کے نفس کی طرف لوٹایا ہے۔ اور اسے نفی کی گئی شفاعت کی قید قرار دیا یعنی وہ شفاعت قبول نہیں ہوگی جو کہ اس قصوروار اور اس کی فریاد زاری اور ضعیفی کے توسل کے ساتھ وہم میں آتی ہے۔ اور اس صورت میں اگلی اور پچھلی ضمیروں کا انتشار بھی نہیں رہتا اور مطلق شفاعت کی نفی بھی لازم نہیں آتی۔

شفاعت کے بارے میں اہل سنت کا روشن مذہب

اور اگر شفاعت کی حقیقت کی گہرائی میں اتر کر غور کریں تو اہل سنت کا مذہب روشن آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے نفس کامل کا کمال وسعت پیدا کرے۔ اور اپنے پیروکار ناقص نفسوں کو پکڑے اور ان کا نقصان اس کے کمال کے ضمن میں آ جائے۔ پس اس شفاعت کا مدار دو چیزوں پر ہے پہلی چیز نفس کاملہ کے کمال کی وسعت جس کا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بے پناہ عنایت کی وجہ سے واسطہ کوشش اور تلاش کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ عمل اور کوشش کی انتہا اپنے کمال کو حاصل کرنا اور اس کمال کا اپنے پیروکاروں کا اس طرح احاطہ کرنا ہے کہ ان کے نقصانات کو چھپا دے اور کمال کی صورت میں ظاہر کرے۔ اور اس عطا شدہ فراخی اور احاطہ کو شریعت میں

اذن اور حکم کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ دوسری چیز نفس ناقصہ کا اہل کمال کے پیروکاروں میں سے ہونا جو کہ ایمان اور صحیح عقائد کے بغیر محال ہے۔ اور اس آخری امر کو شریعت میں اس عبارت کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے کہ کافر اور منافق کی شفاعت نہیں ہے۔ جس طرح کہ آیت ماکان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی (التوبہ آیت ۱۱۳) اور ولا تصل علی احد منهم مات ابدا ولا تقم علی قبره انهم کفروا بالله ورسوله (التوبہ آیت ۸۴) میں تصریح کی گئی ہے۔

اور جو کچھ محقق فلسفیوں نے شفاعت کے معنوں کی تحقیق میں کہا ہے وہ بھی اسی تقریر کی تائید کرنے والا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ حضرت واجب الوجود کا فیض عام ہے جو کمی ہے وہ قبول کرنے والے کی طرف سے ہے۔ اور جائز ہے کہ افراد میں سے کسی فرد کو اللہ تعالیٰ کے دربار سے یہ فیض بلا واسطہ حاصل کرنے کی قابلیت نہ ہو وہ کسی دوسرے قابلیت والے سے یہ فیض قبول کر سکتا ہے۔ پس وہ قابلیت والا اس فرد اور اللہ تعالیٰ کی عام الفیض ذات کے درمیان واسطہ کی صورت میں واقع ہو جس طرح کہ آفتاب صرف اسی کو روشن کرتا ہے جو اس کے سامنے آئے۔ اور آفتاب کے اس فیض کیلئے سامنے آنا شرط ہے۔ اور بعض چیزیں جو کہ بلا واسطہ سورج کے سامنے نہیں ہو سکتیں جیسے گھر کی چھت وہ اس فیض کو حاصل کرنے سے محروم ہیں۔ لیکن جب پانی سے بھرا ہوا طشت دھوپ میں رکھیں تو اس صاف پانی سے سورج کی شعاع چھت کی طرف عکس ڈالتی ہے۔ اور اسے روشن کرتی ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام کی ارواح صاف پانی کی طرح جود الٰہی کا وسیلہ واقع ہوئی ہیں۔ جس طرح صاف پانی نے سورج کی شعاع کو چھت تک پہنچا دیا اسی طرح یہ ارواح مقدسہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو عام مومنوں تک پہنچاتی ہیں ہاں نور کو قبول کرنے کی استعداد شرط ہے یہاں تک کہ اگر چھت قبول کرنے کی مطلقاً استعداد نہیں رکھتی تو پانی کے واسطہ سے بھی روشنی قبول نہیں کرے گی جس طرح کہ کافر جو کہ استعداد کے ضائع ہونے کی وجہ سے مطلقاً بے نصیب ہو گیا۔ نیز اگر چہ چھت سورج کے سامنے آنے سے محروم ہے۔ لیکن صاف پانی کے سامنے آنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اور اسی صلاحیت کی وجہ سے منور اور روشن ہو گئی۔ اور جو شخص انبیاء

علیہم السلام پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس چھت کی طرح ہے۔ جسے صاف پانی کے سامنے آنا بھی نصیب نہیں اسے صاف پانی کے واسطہ سے روشن ہونے کی توقع خام خیالی ہے۔

مختصر یہ کہ بنی اسرائیل کو اس قسم کے خیال خام سے جو کہ وہ کہتے تھے مایوس کر کے نعمتوں کے شکر کی تاکید کیلئے اپنی وہ نعمتیں یاد کرائی جارہی ہیں جو کہ ان کے اسلاف پر انعام ہوئی تھیں۔ اور فرمایا ہے کہ تم ہماری نعمتوں میں سے ان نعمتوں کو یاد کرو کہ قیامت کے دن کا نمونہ تھا اور زندوں مردوں میں سے تمہاری فریاد کو کوئی نہیں پہنچتا تھا اور کسی طرح کی امداد سے بھی تمہیں اس مصیبت کے پنجے سے چھڑا نہیں سکتا تھا۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ اور یاد کرو کہ ہم نے تمہیں اپنی قوت کے ساتھ خلاصی دی اور نجات عطا فرمائی نہ کہ تمہارے آباؤ واجداد اور تمہارے دوستوں یاروں میں سے کسی اور نے اور کمال قوت کا پتہ دینے کیلئے ضمیر جمع جو کہ متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اختیار فرمائی ورنہ یا بنی اسرائیل سے لے کر یہاں تک متکلم واحد کا صیغہ مستعمل ہوا ہے۔ تا کہ شکر اور اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ آیات پر ایمان لانے میں باری تعالیٰ کی توحید کا پتہ چلے۔

مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ فرعون کے پیروکاروں کے ہاتھ سے جو کثرت میں لاتعداد تھے۔ اور یہاں اس کے پیروکاروں کا ذکر۔ حالانکہ بدسلوکی کی جڑ اور دراصل خود فرعون تھا اس اشارہ کیلئے ہے کہ جب کوئی حاکم کسی گروہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے جبکہ اس کے پیروکار، وزیر اور امیر دلی طور پر اس گروہ کے خیر خواہ ہوں تو مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس حاکم کا ارادہ پیروکاروں کی امداد اور شرکت کے بغیر اتنا پورا نہیں ہوتا اور یہاں فرعون کے پیروکار فرعون سے بھی زیادہ اس گروہ کی دشمنی پر کمربستہ تھے۔ اور سب کے سب لڑائی پر آمادہ تھے۔

يَسُوْمُوْنَكُمْ تمہیں پہنچاتے تھے سُوْٓءَ الْعَذَابِ سخت ترین عذاب اس طرح کہ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کثرت سے ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو

فرعون کے عذاب کا بیان جو کہ بنی اسرائیل پر مقرر تھا

اور یہ سب سے زیادہ سخت عذاب ہے۔ کیونکہ بیٹوں کو ہلاک کرنا کسی گروہ کی نسل کو

مٹانے کا موجب ہے۔ نیز جب مرد نہیں رہیں گے تو عورتوں کی زندگی بہت رنج والم میں ہو گی۔ کیونکہ کمائی اور روزی کی تلاش مردوں کا ذمہ ہے۔ نیز اولاد کو قتل کرنا اس کے بعد کہ اس کے حمل اور رحم میں آنے میں سخت زحمت اور محنت اور طویل تکلیف اٹھائی ہو۔ اور شکم سے باہر آنے پر اس سے نفع پہنچنے کی قوی امید حاصل ہوئی روح کو سخت اذیت پہنچانے کا موجب ہوتا ہے۔ نیز بشری جبلت کے اعتبار سے بیٹے کی جنس بیٹی کی جنس سے زیادہ پیاری اور مرغوب ہوتی ہے یہاں تک کہ عربوں نے کہا ہے۔ (بیت) سرور ان مالهما ثالث حیوة البنین وموت البنات دو خوشیاں ہیں جن کی تیسری نہیں' بیٹوں کی زندگی اور بیٹیوں کی موت۔ پس بیٹوں کو ذبح کرنا عقلی صدمہ بھی تھا اور طبعی رنج بھی۔ اور دونوں صدمے شدت میں کمال کو پہنچے ہوئے۔ اور کاش کہ فرعون کے پیروکار لڑکوں لڑکیوں ساری اولاد کو قتل کر دیتے تا کہ بعض وجہوں سے یہ مصیبت ہلکی ہو جاتی لیکن وہ صرف بیٹوں کو قتل کرتے تھے۔

وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری لڑکیوں کو۔ اور اگرچہ پیدائش کی ابتداء میں لڑکیاں پیاری اور مرغوب ہوتی ہیں۔ اور حرکتوں اور دل فریب باتوں کے ساتھ تمہیں فریفتہ کرتی تھیں۔ لیکن جوانی کے بعد بالغ عورتیں ہو جاتی تھیں۔ اور مردوں کے بغیر عورتوں کا باقی رہنا۔ اور ان کی طرف سے سوچوں کا ہجوم' محنت اور خرچوں کے اعتبار سے بھی اور اس اعتبار سے بھی کہ دشمنوں کی بیویاں بنیں گی اور انتہائی ذلت اور عار لاحق ہو گی بہت غم اور ملال کا باعث ہوں گی اور اسی نکتہ کو ظاہر کرنے کیلئے وَيَسْتَحْيُوْنَ بَنَاتِكُمْ نہ فرمایا۔ اور یذبحون رجالکم نہ فرمایا۔ اور اس مقام کی تفصیل یہ ہے کہ کامل مشقت اور رنج بیٹوں کی بچپن میں ہلاکت میں ہوتا ہے۔ کہ ابھی کسی نافرمانی کی جڑ نہیں بنے ہیں۔ اور ان سے نفع کی امید تمام وجوہ کے ساتھ برقرار ہے۔ اور ان کی حرکات کی طرف طبیعت کا میلان اوج کمال پر ہے۔ اور بیٹیوں کی زندگی میں کامل مشقت اور رنج ان کے بلوغ کا وقت ہے کہ ان کی حرکات کی طرف میلان طبعی نہ رہا۔ اور ذلت اور عار کے اسباب ان کے باقی رہنے میں ہر طرف سے ہجوم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس اگر یذبحون رجالکم د

یستحیون نساء کم یا یذبحون ابناء کم ویستحیون بناتکم فرمایا جاتا تو عذاب کی یہ شدت نہ سمجھی جاتی۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ اس سورت میں یذبحون داو کے بغیر واقع ہوا ہے۔ اور سورت اعراف میں بھی یُقَتِّلُوْنَ (آیت ۱۴۱) اسی سورت کی مانند داؤ کے بغیر واقع ہے۔ اور سورت ابراہیم میں وَیُذَبِّحُوْنَ (آیت ۶) داؤ کے ساتھ آیا اس کی وجہ کیا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں اور اعراف میں یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کی تفسیر ابناء کے قتل اور ذبح اور اس کے بعد سے فرمائی ہے۔ پس داؤ کی حاجت نہیں۔ بلکہ داؤ کا وجود مخل ہے۔ کیونکہ تفسیر اور مفسر دونوں ایک چیز ہیں۔ ان میں کوئی مغایرت نہیں۔ تا کہ حرف واؤ کی گنجائش ہو۔ جبکہ سورۂ ابراہیم میں یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے دوسری سخت تکلیفیں مراد لی گئی ہیں جو کہ فرعونی بنی اسرائیل کے فرقہ کو دیتے تھے۔ ان میں سے یہ کہ اس فرقے کے قوت والوں کو فرعون کے باغات اور اس کے محلات کی تعمیر کیلئے پہاڑ سے پتھر اٹھالانے پر مقرر کیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ہاتھ اور گردنوں میں ناسور پیدا ہو گئے تھے۔ اور ان کی کمریں زخمی تھیں۔ اور ان کے کمزوروں کو چھوٹے پتھر اٹھانے اور گارا بنانے کیلئے مقرر کیا ہوا تھا اور ان میں ایک جماعت کو اینٹیں بنانے اور انہیں آوہ میں پکانے کا کام سپرد تھا اور ایک جماعت کو بڑھیوں اور لوہاروں کے کام اور راہوں۔ اور گھروں کی صفائی کیلئے مقرر کر رکھا تھا اور ان میں سے جو زیادہ کمزور ہوتے۔ اور کسی طرح کارآمد نہ ہوتے ان پر ٹیکس مقرر کیا ہوا تھا جو کہ سال کے سال اور مہینے کے مہینے ادا کرتے اور بنی اسرائیل کی عورتوں کو بے گار کے طور پر سوت کاتنے اور کپڑا بننے اور بعض کو دوسرے رذیل اور ناپاک کاموں پر مقرر کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے مرد اور عورتیں اس سخت صورتحال میں موت کی آرزو کرتے تھے۔ اور اپنی زندگی سے بیزار ہو چکے تھے۔

اور ظاہر ہے کہ بیٹوں کو قتل کرنا ان چیزوں کے سوا ایک دوسری چیز ہے۔ اس لئے مغایرت کیلئے دونوں جملوں کے مضمون کے درمیان حرف داؤ کو لانا ضروری ہوا جو کہ اس پر

دلالت کرتی ہے۔باقی رہا یہ کہ یہاں يُذَبِّحُونَ کے جملہ کو يَسُومُونَكُمْ کی تفسیر کیوں گردانا ہے۔اور سورت ابراہیم میں دوسری مصیبت کیوں شمار کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت اور سورت اعراف میں یہ دونوں جملے کلام الٰہی میں سے واقع ہوئے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کو اپنی کامل مہربانی اور رحمت جو کہ اپنے بندوں کے حال پر ہے منظور نہ ہوا کہ ان کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا شمار کرے کیونکہ بلا کا یاد کرنا بھی عذاب کی ایک قسم ہے۔اور سورت ابراہیم میں یہ دونوں جملے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کلام سے واقع ہوئے ہیں۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم تھا کہ بنی اسرائیل کو تمام محنتیں اور مشقتیں یاد کرائیں وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ۔نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کلام اپنے ہم عصروں کے ساتھ تھا جو کہ تمام محنتوں اور مشقتوں سے واقف تھے۔اور یہ خطاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے زمانے کے بنی اسرائیل سے تھا جنہوں نے یہ مصیبتیں ہرگز دیکھیں نہ چکھیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر ان مشقتوں اور تکلیفوں سے واقفیت بھی نہیں رکھتے تھے مگر اس مشقت سے کہ ان کا قتل ہو۔کیونکہ اس تکلیف کا حال ان میں تواتر کے ساتھ رائج اور مشہور تھا تو لازماً یہاں صرف اسی مشقت کا بیان منظور ہوا اور حقیقت یہی سب سے بڑی مشقت اور بڑی مصیبت تھی۔چنانچہ فرمایا ہے۔

وَفِىْ ذٰلِكُمْ اور ان مذکورہ تکلیفوں میں جو کہ بیٹوں کو قتل کرنا اور لڑکیوں کو باقی رکھنا ہے۔

بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑا امتحان تھا۔ کیونکہ دشمن کو یہاں تک مسلط کر دینا کہ عزیز ترین جانوں کو برباد کر دے کمال ذات و رسوائی اور رنج و غم کا باعث ہے۔اور یہ سب اس لئے تھا کہ اس قدر بڑی بلا سے خلاصی دینا تمہاری نظر میں عظمت پیدا کرے۔اور اس نعمت کی قدر کو جانو۔نیز سمجھو کہ جو کوئی بلائے سخت پر صبر کرے جزائے عظیم کا مستحق ہو جاتا ہے۔خصوصاً دار الجزاء میں۔نیز تم جانو کہ دنیا کی سختیوں میں ذات حق عزوعلا کے بغیر کوئی کام نہیں آتا۔کیونکہ اس وقت زندوں اور مردوں میں سے کوئی بھی تمہاری فریاد کو نہ پہنچا۔اور نہ ہی تمہیں فرعون اور فرعونیوں کے ہاتھ سے طاقت اور غلبہ کے ساتھ چھڑایا اور تمہارے عوض کے طور پر کسی دوسرے فرقہ کو لا کر دیا۔اور نہ ہی تمہاری محنتیں اور مشقتیں اپنے اوپر لیں تو جب دنیا میں جو کہ باہمی تعاون اور امداد کا وقت ہے کوئی

تمہارے کام نہ آیا تو آخرت میں جو نفسی نفسی کا وقت ہے تمہیں کسی اور سے امداد اور اعانت کی توقع خام خیال ہے۔

فرعون اور فرعونیوں کی بنی اسرائیل کے ساتھ دشمنی کی وجہ کا بیان

اور فرعون اور فرعونیوں کی بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کی وجہ یہ تھی کہ جب فرعون کو جس کا نام ولید بن مصعب تھا۔ اور اسے اس کے چہرہ کے چمکنے کی وجہ سے قابوس کا لقب دیتے تھے۔ کیونکہ قابوس چمکتی چنگاری کو کہتے ہیں۔ اور اس وجہ نے کہ وجہ سے کہ ملک مصر کا بادشاہ تھا اور اسے فرعون کہتے تھے۔ کیونکہ فرعون قبطیوں کی لغت میں بادشاہ کو کہتے ہیں۔ جس طرح لغت عرب میں سلطان۔ لغت فارسی میں شاہ' لغت ہندی میں راجہ مصر کی بادشاہی میسر آئی اور اسے قدرت اور مرتبہ کے اسباب ہر طرف سے مہیا ہو گئے تو اس نے اپنی طرف سے قانون بنایا کہ مملکت مصر کے تمام شاہی کارندوں اور ارکان سلطنت' وزراء اور امراء سے لے کر چھوٹی رعایا تک کو اس بات کا پابند کرے کہ وہ اسے سجدہ کریں۔ چنانچہ جس نے سب سے پہلے اسے سجدہ کیا ہامان تھا اس کے بعد دوسرے امراء اور ارکان سلطنت نے سجدہ کیا۔ اور جو لوگ اس کے پایہ تخت سے دور تھے ان کیلئے اپنی ہم شکل مورتیاں سونے سے بنا کر ہاتھی دانت' آبنوس اور چاندی کے تختوں پر نصب کر کے اور ان تختوں کے ارد گرد سونے کے تنے والے درخت جن کے پتے زمرد کے تھے بنائے۔ اور ان درختوں کی ہر شاخ پر چاندی کے جانور بنائے۔ اور ان جانوروں کی چونچ نفیس جواہر سے درست کی۔ اور ہر جانور میں ایسا معمہ رکھا تھا کہ جب خادم اس تخت کو حرکت دیں تو ان جانوروں کے پیٹ سے ایک آواز آئے کہ اے مصر والو! فرعون تمہارا خدا ہے اسے سجدہ کرو۔ اور قصبوں اور بستیوں والے اس آواز کو سنتے ہی سجدہ میں گر جاتے تھے۔ اور جب تمام مصری فرعون پرستی میں گرفتار ہو گئے تو بنی اسرائیلیوں نے ان کی موافقت نہ کی۔ اور سجدہ نہ کیا فرعون نے ان کے سرداروں کو اپنے دربار میں بلا کر ڈانٹ کر کہا تم مجھے سجدہ نہیں کرتے ہو۔ اور میری مورتیوں کو بھی نہیں پوجتے ہو معلوم ہوتا کہ تمہاری زندگی تم پر بوجھ ہے۔ اگر تم نے مجھے اور میری مورتیوں کو سجدہ نہ کیا میں تمہیں مختلف قسم کے عذاب دوں گا یہ کہہ کر جلادوں کو عذاب دینے کے اسباب

سمیت اپنے پاس طلب کیا۔ اور بنی اسرائیل کو ڈرایا۔ بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے فرقہ سے کہا کہ فرعون کا عذاب ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے گا جبکہ عذاب خداوندی ہمیشہ کیلئے ہے بہتر یہی ہے کہ فرعون کے عذاب پر صبر کرو اور اسے سجدہ نہ کرو بنی اسرائیل کی ساری جماعت نے اسی عزم پر پختگی کرے فرعون کو کھل کر کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ جائز نہیں ہم تجھے ہرگز سجدہ نہیں کریں گے جو چاہے کرلے فرعون نے تانبے اور لوہے کی دیگیں طلب کیں اور ان میں زیتون کا تیل اور گندھک ڈال کر آگ پر رکھ کر انہیں گرم کرایا جب وہ دیگیں گرم ہوگئیں اور زیتون کا تیل اور گندھک جوش کرنے لگی تو بنی اسرائیل کو اس میں ڈالتا تھا اور وہ جل جاتے تھے۔ اور بنی اسرائیل نے فرعون کو قطعاً سجدہ نہ کیا۔ اور صبر کیا۔ اور کہا کہ پروردگار وہی خدا تعالیٰ ہے جو کہ حضرت ابراہیم اسحاق اور یعقوب علیٰ نبینا و علیہم السلام کا پروردگار ہے ہم اپنے اسی پروردگار پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی کثیر جماعت کو جلا دیا گیا۔

ہامان جو کہ فرعون کا وزیر تھا سفارش کیلئے کھڑا ہوا اور کہا کہ بادشاہ انہیں مہلت دے تا کہ کچھ سوچ سمجھ کر وہ بادشاہ کا حکم قبول کرلیں۔ فرعون بنی اسرائیلیوں کو جلانے سے رک گیا لیکن اس فرقہ پر وہی پہلے لکھی گئی بیگاریں مقرر کردیں۔ یہاں تک کہ فرعون نے متواتر تین راتیں وحشتناک اور ڈراؤنی خوابیں دیکھیں۔ کہتے کہ اس کی خواب میں ایک آگ نظر آئی جو کہ مصر کا سارا شہر اور قبطیوں کا ملک جلا کر آرہی ہے۔ اور جب بنی اسرائیل کے محلے سے گزرتی ہے۔ تو کسی کو نہیں جلاتی اور بنی اسرائیل کے محلہ سے ایک بہت بڑا اژدھا فرعون پر جھپٹا جس نے اسے تخت کے اوپر سے الٹا گرا دیا۔ صبح کو اٹھ کر اس نے تعبیر کہنے والوں اور نجومیوں کو جمع کر کے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ سب نے کہا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو کہ تیری بادشاہی کے زوال کا باعث ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا بیان

فرعون نے جب یہ تعبیر سنی تو شہر کے کوتوال کو بلا کر حکم دیا کہ ایک ہزار پیادہ بنی اسرائیل کے محلہ میں مقرر کرے۔ اور ان کے ہمراہ ایک ہزار دائی مقرر کرے تا کہ وہ بنی

اسرائیل کے گھروں میں تلاش کریں۔اور جس گھر میں لڑکا پیدا ہوا سے قتل کر دیں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیں۔فرعون کے حکم کے مطابق دو سال تک بنی اسرائیل پر اسی قسم کا ظلم جاری رہا۔ جب تیسرا سال ہوا تو عمران جو کہ بنی لادی کے سرداروں میں سے ایک تھے۔ اور لادی حضرت یعقوب علیہ السلام کا بڑا بیٹا ہے کی بیوی عانذ نامی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں اور فرعون کی مقرر کردہ دائیاں ان کے گھر میں اور پیادے دروازے پر تحقیق و تلاش کیلئے ہر روز آتے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا وقت قریب ہو گیا تو فرعون کی دائیوں میں سے ایک دائی نے احتیاطاً ان کے گھر میں رات بسر کرنی شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اچانک رات کے وقت پیدا ہوئے۔ جیسے ہی آپ جلوہ افروز ہوئے۔اور آپ کے چہرہ مبارک پر دائی کی نظر پڑی تو اس کے دل میں آپ کی محبت نے بے اختیار غلبہ کیا اگرچہ اس نے چاہا کہ نصیب دشمناں انہیں قتل ر دے لیکن اس طرح ہرگز ممکن نہ ہو سکا۔ آخر اسی نے آپ کی والدہ محترمہ سے کہا کہ میرے ہاتھ بیٹے کو قتل کرنے کیلئے کام نہیں کرتے کیا تدبیر کی جائے؟ آپ کی والدہ نے فرمایا کہ ہمارے پڑوس میں ایک شخص نے بکری ذبح کی ہے اس بکری کے گوشت کا ایک ٹکڑا لا کر ایک دیگ میں ڈال کر پیادوں کو دکھا کہ یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔اور اسے دبانے کیلئے جنگل جا رہی ہوں صبح جس وقت پیادے تحقیق کیلئے آئے دائی باہر آئی اور انہیں سربستہ دیگ دکھائی کہ یہ یہاں لڑکا پیدا ہوا تھا میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔اور جنگل کو جا رہی ہوں چونکہ پیادے دائیوں پر پورا اعتماد کرتے تھے انہوں نے زیادہ تحقیق نہ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام گھر میں رہے۔لیکن تعبیر کہنے والوں اور نجومیوں نے جمع ہو کر فرعون کو خبر پہنچائی کہ وہ لڑکا جس کا وعدہ تھا وجود میں آ چکا ہے۔اور اس کا ستارہ طلوع ہو چکا۔خبردار رہنا چاہئے۔اور تحقیق کی جانی چاہئے فرعون نے کوتوال کو پابند کیا۔اور اس نے پیادوں پر بہت تشدد کیا پیادوں نے کہا کہ ہم نے ایک گھر میں زیادہ تحقیق نہیں کی صرف دایہ کے کہنے پر اعتماد کر لیا اگر آپ کہیں تو گھر کے اندر جا کر پوری تحقیق کریں۔اور دائیوں پر اعتماد نہ کریں کوتوال نے کہا جلدی جاؤ اور بغیر پردہ کرائے اندر جاؤ تا کہ اگر انہوں نے کسی لڑکے کو چھپا

رکھا ہوگا تو ظاہر ہو جائے پیادے بغیر خبر دیئے عمران کے گھر میں آ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بڑی ہمشیرہ جن کا نام حضرت مریم ہے کی گود میں تھے۔ آپ کی ہمشیرہ نے جب دیکھا کہ پیادے شور کرتے ہوئے گھر میں گھس آئے تو آپ کو تنور میں ڈال دیا اور اس وقت تنور میں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اپنی طرف سے سوچا یہ کہ اگر یہ لڑکا ظاہر ہو گیا ہم تمام گھر والے قتل کر دیئے جائیں گے۔ اور یہ لڑکا بھی اور اگر اس تنور میں ڈال دوں تو اس کی جان چلی جائے گی۔ لیکن تمام گھر والوں کی جان محفوظ رہے گی۔ پیادوں نے تمام گھر کی پوری تلاشی لی کہیں بھی بیٹے کا نشان نظر نہ آیا اور اس بنا پر کہ تنور سے شعلے اٹھ رہے تھے اس کی تلاشی نہ لی اور باہر نکل کر چلے گئے۔

تنور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ نے جو کہ اس واقعہ کی وجہ سے سہمی ہوئی بیہوش تھیں افاقہ ہونے پر اپنی بیٹی سے حال کی تحقیق کی کہ تو نے بچے کو کہاں پھینکا؟ اس نے کہا کہ گھبرا کر میں نے اسے تنور میں ڈال دیا۔ آپ کی والدہ محترمہ بہت غمگین ہو کر تنور پر آئیں دیکھا کہ تنور شعلے مار رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے ناامید ہو گئیں اچانک آپ نے تنور کے اندر سے آواز دی کہ اے والدہ محترمہ غم نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو مجھ پر ٹھنڈا کر دیا ہے۔ جس طرح کہ میرے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اسے سرد کیا۔ آپ کی والدہ محترمہ حیران ہو گئیں اور کہا کہ اب کس تدبیر کے ساتھ میں تجھے تنور سے نکالوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاتھ لمبا کیجئے اور مجھے تنور سے نکال لیں کہ یہ آگ آپ کے ہاتھ کو بھی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اور اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک ۴۰ دن کی ہو چکی تھی۔ آپ کی والدہ نے آپ کو تنور سے نکالنے کے بعد اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا کہ یہ فرزند اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائب میں سے ہے۔ لیکن آخر بچہ ہے۔ آواز سے روئے گا اور فرعون کے پیادے جو کہ گھر گھر تلاشی لے رہے ہیں اس کی آواز کو سن لیں گے اور ہمیں اور اسے مار ڈالیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اس بچے کو صندوقچہ میں ڈال کر دریائے نیل میں بہا دیں تاکہ دیہات میں سے کسی گاؤں میں کسی کے

ہاتھ لگ جائے۔ اور بچ جائے۔ اور ہم بھی فرعون کے خوف سے نجات پائیں۔ تمام گھر والوں کے مشورہ سے یہی قرار پایا اور ایک بڑھئی کو جس کا نام سانوم یا حانوم تھا چوری چھپے بلایا کہ ہمیں ایک صندوقچہ اس قدر طول و عرض کا بنادے اور اس صندوق کی تختیوں کو اس طرح ملا کر جوڑ کہ پانی اندر نہ جاسکے اس بڑھئی نے کہا کہ یہ صندوقچہ تمہیں کس لئے مطلوب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی زبان سے نکلا کہ ہمارے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اسے دریائے نیل میں بہادیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ بادشاہ کو پتہ چل جائے۔ اور ہمیں قتل کردے۔ اس بڑھئی نے کہا کہ بہت خوب میں تمہارا راز دار ہوں تمہیں ایسا صندوقچہ بنا کر دیتا ہوں جب گھر پہنچا تو اس نے سنا کہ فرعون کا منادی آواز دے رہا تھا کہ جو کوئی ہمیں بنی اسرائیل میں ان دنوں پیدا ہونے والے بچے کا پتہ دے تو ہم اسے اس اس طرح نوازیں گے۔ بڑھئی کی طمع کی دیگ جوش میں آئی اور اس نے چاہا کہ کوتوال کے سامنے یہ ماجرا ظاہر کردے۔ جیسے ہی گھر کے دروازے سے پاؤں باہر رکھا اندھا ہو گیا۔ اور اس کے دونوں پاؤں ٹخنوں تک زمین میں دھنس گئے اور غیب سے ایک آواز سنی کہ اگر تو نے یہ راز کسی سے کہا تو ہم تجھے اسی وقت زمین میں غرق کردیں گے۔ بڑھئی نے خالص توبہ کی۔ اور نابینائی اور دھنسنے سے نجات پا کر اپنے گھر میں آیا اور راتوں رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے فرمان کے مطابق صندوقچہ بنا کر اور اس میں آسمان کی طرف کھولنے کا ایک دریچہ رکھ کر راتوں رات حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی والدہ کے پاس پہنچا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اجرت کے طور پر اسے بھاری رقم ادا کی۔ اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے کہا کہ میں دل و جان سے اس بچے کا مرید اور معتقد ہوں۔ میں ان کے کام کی مزدوری ہرگز ہرگز نہیں لوں گا۔ مگر اتنا کیجئے کہ مجھے اس فرزند کی زیارت سے مشرف فرمائیں حضرت کی والدہ محترمہ نے اسے آپ کی زیارت کرائی اس نے اپنی دونوں آنکھیں آپ کے قدموں پر ملیں اور واپس ہوا پہلا شخص جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا وہ بڑھئی تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے دن بھر توقف کیا۔ جب دوسری رات آئی حضرت موسیٰ کو غسل دیا' خوشبو لگائی' نئے کپڑے پہنائے اور آپ کو صندوقچہ میں رکھ کر

روتے ہوئے۔ اور غم کرتے ہوئے دریائے نیل کے کنارے لائیں۔ اچانک ابلیس لعین بہت بڑے سیاہ اژدھا کی صورت میں ظاہر ہوا اور کہنے لگا کہ اگر تو نے اسے دریا میں ڈالا تو میں اسے ایک لقمے سے ہضم کرلوں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ نہایت عقلمند تھیں جان لیا کہ یہ اژدھا جانور ہوتا تو بولنے کی یہ صلاحیت کہاں سے پاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ہے اس کی طرف توجہ نہ فرمائی اور آپ کو دریا میں ڈال دیا اور روتے ہوئے پریشان حالت میں گھر کو لوٹیں۔ حضرت کی ہمشیرہ سے فرمایا کہ اگر تو میری زندگی چاہتی ہے۔ تو اس صندوقچہ کے پیچھے پیچھے جا اور دیکھ کہ کہاں جاتا ہے اگر شہر کے سامنے سے گزر گیا تو ہمیں دلجمعی نصیب ہوگی۔ اور اگر شہر کے لوگوں میں سے کسی نے دیکھ کر اسے پکڑ لیا تو یقیناً وہ بادشاہ کے پاس لے جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن صندوقچہ کے ہمراہ دریا کے کنارے کنارے جارہی تھیں۔ اور بیگانوں کی طرح دور سے دیکھتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے بنی اسرائیل کے ۱۲ ہزار بچے قتل ہوچکے تھے۔ اور نوے ہزار حمل اس خوف کی وجہ سے بنی اسرائیل کی عورتوں نے گرا دیئے تھے کہ کہیں بیٹا ہوا اور فرعونی اسے قتل کردیں۔ اور فرعون بدبخت کی یہ ساری تدبیریں تقدیر الٰہی کے مقابلہ میں کارگر نہ ہوئیں۔ قصہ مختصر وہ صندوقچہ دریائے نیل سے اس نہر میں داخل ہوگیا جسے فرعون دریائے نیل سے کھود کر اپنے باغ میں جس کا نام عین الشمس تھا لے گیا تھا صندوقچہ فرعون کے باغ کے درمیان پہنچ گیا۔ فرعون اس وقت باغ کی سیر میں مصروف تھا اور فرعون کی بیٹی اور دوسرے اہل محل اس کے ہمراہ تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک صندوقچہ پانی کے ساتھ باغ میں آیا ہے۔ تو دوڑے اور اس صندوقچے کو اٹھا کر فرعون کے سامنے لے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے جب دیکھا کہ صندوقچہ نہر کے پانی کے ہمراہ باغ میں آگیا ہے۔ دوڑ کر گئیں اور اپنی والدہ کو خبر دی۔ آپ کی والدہ محترمہ اس وقت بہت بے قرار ہوئیں اور قریب تھا کہ بے اختیار ہوکر گریہ زاری کرتے ہوئے گھر سے باہر آئیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ کوئی فکر نہ کر اور ہماری قدرت کا تماشا دیکھ کہ ہم کس تدبیر سے اسے تمہارے پاس پہنچاتے ہیں۔ آخر ہم

اسے اولوالعزم پیغمبروں علیہ السلام میں سے کریں گے۔

قصہ مختصر جب فرعون نے دیکھا کہ ایک نومولود بچہ صندوقچہ میں رکھا ہوا ہے۔ تو اس نے اپنے وزیر ہامان کو بلایا اور کہا کہ یہ وہی بچہ ہے جس سے ہمیں نجومی ڈراتے ہیں۔ میرا نصیب دیکھ کر بچہ کس طرح خود بخود میرے پاس آ گیا۔ اب اسے (معاذ اللہ) قتل کر دو۔ فرعون کی بیوی جس کا نام آسیہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جمال جہاں آراء کو دیکھتے ہی فریفتہ ہوگئی۔ اور اس نے کہا کہ اس بے گناہ کو بدگمانی کی وجہ سے مت قتل کرو زندہ رہنے دو۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے کام آئے ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں کہ ہمارے ہاں بیٹا نہیں ہے۔ فرعون اپنی بیوی کے اصرار کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے باز رہا اور فرعون کی بیوی نے آپ کو اپنا بیٹا بنالیا اور حکم دیا کہ اس بچے کیلئے دائیوں کو لایا جائے جو دایہ بھی لائی گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کا دودھ نہیں لیتے تھے حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے جو کہ آپ کے حالات کا پتہ کرنے کیلئے بار بار فرعون کے دروازے پر آتی تھیں یہ ماجرا سن کر کہا کہ میں ایک دائی کا پتہ دیتی ہوں جو کہ بچوں کی پرورش میں بے مثل ہے غالب گمان ہے کہ یہ بچہ اس کا دودھ لے لے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلا کر لے گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ محترمہ کا دودھ نوش فرمایا۔ فرعون نے رائج الوقت ایک اشرفی یومیہ مقرر کر دی کہ اس بچے کو یہی دایہ دودھ دیتی رہے گی۔

عبادت پر مزدوری لینے کا جواز

حدیث شریف میں وارد ہے کہ میری امت کے غازیوں کی مثال جو کہ بادشاہ وزیر اور حاکم سے ماہانہ اور سالانہ تنخواہ لیتے ہیں۔ اور اسباب جہاد مہیا کرنے میں خرچ کرتے ہیں۔ اور ان کی نیت خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرح ہے جو کہ فرعون سے یومیہ خرچ لیتی تھیں۔ اور اپنے بیٹے کو دودھ پلاتی تھیں۔ اور اس حدیث پاک میں فقہ کے اصول کلیہ میں سے ایک عظیم قانون کا اشارہ ہے۔ یعنی عبادت پر اجرت لینا اس صورت میں جائز ہے کہ نیت خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو۔ اور اجرت کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو۔ اس عبادت کو اپنے کرنے کا کام سمجھے اگر اسے کوئی مزدوری دے یا نہ دے اور اگر

دنیوی پیشوں اور مزدوریوں کی طرح اس عبادت کو اجرت لینے پر معلق کر دے کہ لوگ اجرت دیں تو بجا لائے ورنہ چھوڑ دے تو وہ صرف مزدور ہے اس کا ثواب میں کوئی حصہ نہیں۔ بلکہ عذاب کا خطرہ ہے کہ اس نے دین کے کام کو دنیا کیلئے کیا۔ اور آخرت کو ادنیٰ سی چیز کے عوض فروخت کر دیا اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ۔

دورانِ تربیت فرعون کی مرمت

قصہ مختصر آسیہ زوجہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے سونے کی تختیوں کا پنگھوڑا تیار کیا۔ اور آپ کو پوری عزت واحترام کے ساتھ رکھا اور دو سال کی مدت تک آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو فرعون کے گھر میں دودھ دیا اور جب دو سال کے بعد دودھ سے جدا ہوئے تو آسیہ نے ایک خچر کا بوجھ سونا اور چند اونٹ قیمتی تحائف اور سامان سے لدے ہوئے دے کر آپ کی والدہ محترمہ کو رخصت کیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے پاس رکھ کر تربیت شروع کر دی۔ جب حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام تین سال کے ہو گئے ایک دن فرعون آپ کو اپنی گود میں لے کر کھیل رہا تھا کہ اچانک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکی داڑھی کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور فرعون کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ فرعون جھنجھلایا اور آسیہ سے کہنے لگا کہ میں نے نہ کہا تھا کہ یہ بچہ وہی میرا دشمن ہے جس سے میں ڈرتا تھا اور تو نے مجھے اسے قتل کرنے نہ دیا اب بھی اس سے دست بردار ہو جاؤ۔ آسیہ نے کہا تو کس خیال میں ہے۔ بچوں سے اس قسم کی حرکتیں بہت سی ہو جاتی ہیں ان کی حرکات کو دشمنی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ فرعون نے کہا کہ اس بچے کو دوسروں پر قیاس نہ کرے۔ قیافہ کے ساتھ میں اس بچے میں بالغوں سے زیادہ تمیز اور عقل پاتا ہوں۔ اور اس نے میرے ساتھ یہ حرکت جان بوجھ کر کی ہے۔ آسیہ نے کہا کہ اس عمر میں تمیز اور عقل کہاں سے آئی دیکھ میں اس کا امتحان لیتی ہوں۔ اس نے حکم دیا سونے کا ایک خوانچہ آگ سے اور دوسرا چاندی کا خوانچہ مروارید اور یاقوت سے پر لایا گیا اس کے بعد اس نے کہا کہ ان دونوں خوانچوں میں سے جو تجھے پسند ہے اٹھا لے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مروارید اور یاقوت والے خوانچہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ حضرت جبریل علیہ السلام پہنچے اور آپ کا ہاتھ آگ والے خوانچے کی طرف کر

دیا۔ اور ایک چنگاری وہاں سے اٹھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منہ مبارک تک پہنچا دی یہاں تک کہ اس نے آپ کی زبان مبارک پر اثر کیا۔ اور اسی وقت سے آپ کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔

سال بہ سال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال وواقعات اور آسیہ کی تاویلات

آسیہ نے فرعون سے کہا کہ تو نے اس بچے کی عقل دیکھی؟ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آٹھ برس کے ہوئے ایک دن فرعون کے پاس بیٹھے تھے۔ اچانک فرعون نے مرغے لڑانے والے سے کہا کہ ہمارے لڑائی والے مرغوں کو چھوڑ دے پہلے ایک مرغا باہر آیا اور اس نے دونوں پر ہلا کر ایک آواز نکالی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تو نے سچ کہا۔ فرعون نے پوچھا کہ اس نے کیا کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس نے ان لفظوں کے ساتھ اپنے پروردگار کی تسبیح کی کہ "پاک ہے وہ خدا جس نے چرواہے کے بیٹے کو اس مدت دراز تک دولت اور عزت سے نوازا اور اسے قسم قسم کی نعمتیں عطا فرمائیں۔ حالانکہ وہ ہر نعمت کے مقابلہ میں ناشکری کرتا ہے۔" فرعون نے کہا اے موسیٰ! مرغے کو اس قسم کی باتوں سے کیا تعلق؟ تو اپنی طرف سے ایسی باتیں بنا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرغے کو آواز دی کہ اوپر آ اور ایسی زبان میں بات کر جو کہ خاص اور عام سب سمجھیں۔ مرغا سامنے آیا اور اس نے فصیح زبان میں اس بات کی وضاحت کی۔ فرعون کا چہرہ بدل گیا۔ اور بہت ڈرا۔ اس کے وزیر ہامان نے جو کہ اس وقت حاضر تھا عرض کی کہ اس مرغے پر جادو چل گیا ہے اس کو ذبح کرنے کا فرمان دینا چاہئے جب اسے ذبح کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے پھر اس میں روح لوٹا دی اور وہ ہوا میں اڑ کر لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ۹ برس کے ہوئے تو ایک دن فرعون نے آپ کو از رہ لطف اپنے تخت پر بٹھایا اور تمام امراء اور وزراء اس کے تخت کے ارد گرد کھڑے تھے۔ فرعون نے اپنی عادت کے مطابق کہ سر میں غرور و تکبر رکھتا تھا کفریہ کلمات بکنے شروع کر دیئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غصے میں آ کر اس کے تخت سے نیچے اتر آئے۔ فرعون نے کہا کہ کہاں جاتے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پاؤں مبارک سے اس کے تخت کو ایک

ٹھوکر ماری کہ اس کے تخت کے دو پائے ٹوٹ گئے' تخت ٹیڑھا ہو گیا۔ اور فرعون تخت سے گر گیا۔ اور اس کی ناک سے بہت سا خون بہہ نکلا۔ درباریوں میں شور و غوغا مچ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی سے بھاگ کر آسیہ کے پاس آ گئے اور انہیں اس واقعہ کی اطلاع دی۔ فرعون جب محل کے اندر آیا تو اس نے دیکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام آسیہ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرعون نے آسیہ پر برسنا شروع کر دیا کہ تو نے مجھے اس بچے کو قتل کرنے نہ دیا اب یہ بچہ بہت شوخیاں کرتا ہے۔ آسیہ نے کہا کہ بچپنے میں بچے جو شوخیاں ماں باپ کے ساتھ کرتے ہیں وہ شکایت کے لائق نہیں ہیں بلکہ اس امر کی دلیل ہیں کہ تمیز و عقل کی عمر کو پہنچنے کے بعد یہ سب شوخی اور قوت اپنے ماں باپ کے دشمنوں پر کرے گا۔ اور تمام وزراء اور ارکان سلطنت اس بچے کے دبدبہ کے خوف سے تیرے سامنے سرافگندہ رہیں گے۔ اس کے بعد دستر خوان چنا گیا۔ اور شاہی کھانا حاضر کیا گیا۔ اور فرعون کھانا کھا رہا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی کھانا کھا رہے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ فرعون کیلئے تنور میں سالم بکری کا بچہ بھون کر لایا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بکرے سے فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھڑا ہو جا وہ بکرا اٹھا اور بھاگنے لگا۔ فرعون بہت متعجب ہوا۔ آسیہ نے کہا کہ یہ سب چیزیں تیری بادشاہی اور حکومت کی بقا کیلئے کام آئیں گی۔ اس بچے کو غنیمت سمجھ اس کے بعد فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ادب سے پیش آتا تھا۔ اور آپ کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا تھا۔

زمین پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تصرف

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ۲۳ برس کے ہو گئے۔ ایک دن آپ نیل کے کنارے وضو کر کے نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک فرعون کے خاص آدمیوں میں سے ایک شخص وہاں سے گزرا۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی عبادت آپ کس کیلئے کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنے آقا و مالک کیلئے اس نے کہا کہ تمہیں کوئی آقا اور مالک نہیں چاہئے۔ اپنے باپ کی عبادت کرو جو کہ فرعون ہے۔ یہی کافی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تجھ پر اور فرعون پر خدا تعالیٰ کی لعنت۔ اس نے کہا میں فرعون کو اس ماجرا سے خبردار کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے زمین اسے پکڑ لے۔ زمین اسے زانو تک نیچے لے گئی اور اسے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ اس نے مغلظ قسم اٹھائی کہ میں فرعون کو اس ماجرا کی ہرگز خبر نہیں کروں گا۔ اس کے بعد زمین سے نجات پا کر چلا گیا لیکن آپ کی نماز اور عبادت کا واقعہ فرعون کے خاص درباریوں میں مشہور ہو گیا۔ چلتے چلتے یہ خبر فرعون تک پہنچ گئی۔ فرعون نے کہا کہ جب موسیٰ نماز اور عبادت میں مشغول ہو تو مجھے خبر کرنا۔ فرعون کے خواص میں سے ایک شخص اس وقت کا منتظر رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نماز شروع فرمادی ہے۔ تو جا کر فرعون کو خبر کر دی۔ فرعون خود آیا اور کھڑا رہا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نماز سے فارغ ہوئے۔ فرعون نے پوچھا اے موسیٰ! یہ کس کی عبادت تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنے اسی آقا کی جو مجھے کھلاتا' پلاتا' پہناتا اور پرورش فرماتا ہے۔ فرعون نے کہا کہ تو نے ٹھیک کہا میں ہی ہوں جس نے یہ کام کئے ہیں۔ اور کرتا ہوں۔

سلسلۂ رشد و ہدایت کا آغاز

حاصل کلام یہ کہ اس عمر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پرانی عمر کے لوگوں کو اپنے پاس بلاتے تھے۔ اور ان سے مجلس کرتے اور ان کے ساتھ محبت اور پیار کرتے۔ اور یہ امر فرعون پر بہت ناگوار گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن آپ نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو اپنی مجلس میں جمع فرما کر پوچھا کہ تم کب سے فرعون کے عذاب میں گرفتار ہوئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم مدت دراز سے اسی عذاب میں گرفتار ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے۔ تمہیں چاہئے کہ تم اپنے اوپر ایک نذر لازم کرو کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سزا کو تم میں سے اٹھا لے تو اسے ادا کرو۔ سب نے کہا کہ ہم روزہ' نماز اور مساکین کو بہت کھانا کھلائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے اوپر ایک چیز کو قبول کر لو جو کہ ان سب سے کفایت کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنے پروردگار کی اطاعت کرو اور اس کی نافرمانی اختیار نہ کرنا۔ سب نے کہا کہ ہم نے جان و دل کے ساتھ قبول کیا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ پہلے زمانہ میں

بت پرستوں کی ایک جماعت کو اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ نوازا اور انہوں نے اس پیغمبر علیہ السلام کی قدر نہ جانی اور اس کیلئے ایندھن کے گٹھے جمع کر کے انہوں نے آگ جلائی اور اس پیغمبر علیہ السلام کو اس آگ میں ڈال دیا اور اس آگ نے انہیں کوئی تکلیف نہ دی۔ یہ قصہ کس طرح ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ پیغمبر علیہ السلام خود ہمارے اور آپ کے جد امجد تھے۔ حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ پس اپنے جد امجد کے طریقے پر رہو۔ اور فرعون اور فرعونیوں کے تکلیف دینے سے مت ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے شر کو تم سے دور کر دے گا۔

مدین کو روانگی اور دورانِ سفر حفاظت کا عظیم اہتمام

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ۳۰ سال کے ہوئے۔ ایک دن ایک راستہ سے گزر رہے تھے کہ اچانک فرعون کے پیادوں میں سے ایک پیادا جو کہ فرعون کا ناظم مطبخ تھا ایندھن کا گٹھا ایک بنی اسرائیل کے سر پر رکھ کر اسے کہہ رہا تھا کہ اس گٹھے کو بادشاہ کے مطبخ میں پہنچا دے۔ اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو فریاد کرنا شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے جتنا بھی ظلم سے روکا وہ باز نہ آیا۔ ناچار آپ نے اسکی پیشانی پر مکہ مارا وہ پیادا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور وہ اسرائیلی نجات پا کر اپنے گھر کو چلا گیا۔ اور یہ خبر فرعون کو پہنچی۔ اس نے کہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ موسیٰ نے اسرائیلی کی حمایت میں قبطی کو قتل نہیں کیا ہوگا۔ دوسرے دن پھر اسی قسم کا اتفاق ہوا کہ اس اسرائیلی پر ایک اور قبطی ظلم کر رہا تھا۔ اس نے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے اس اسرائیلی کو ڈانٹ ڈپٹ فرمائی کہ ایک بار تو نے مجھے ابھارا یہاں تک کہ میں نے قبطی کو مار دیا اور آج پھر مجھے ابھارتا ہے اس کے بعد آپ نے چاہا کہ اس قبطی کو دفع کریں۔ اسرائیلی نے سمجھا کہ آپ مجھے مارتے ہیں۔ اس نے بلند آواز سے کہا کہ اے موسیٰ آج آپ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ جبکہ گزشتہ روز آپ نے ایک اور آدمی کو مار دیا تھا۔ بازار کے سب لوگوں نے فرعون کے سامنے گواہی دی کہ قبطی کا قاتل موسیٰ ہے۔ اور قبطی سرداروں نے فرعون سے درخواست کی موسیٰ کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ تاکہ ہم اسے قبطی کے بدلے قتل کریں۔ فرعون حضرت

موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے حکم سے توقف کرتا تھا کہ حزقیل نامی قبطی جو کہ ایمان سے مشرف ہو چکا تھا اور اس کا حال سورت حم المومن میں انشاء اللہ تعالیٰ ذکر کیا جائے گا اس مجلس سے بھاگ کر آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی کہ قبطی امیر اور رئیس آپ کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ آپ کیلئے یہی بہتر ہے کہ آپ چند دنوں کیلئے اس شہر سے باہر تشریف لے جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خبر سنتے ہی سفر خرچ اور سواری کے بغیر ہی مدین کی راہ لی۔ راستے میں ایک چرواہے سے ملاقات ہوئی۔ اپنی نفیس پوشاک جو کہ زیب تن فرمائے ہوئے تھے اس چرواہے کو دے دی اور اس کا ادنیٰ جبہ اور گودڑی خود پہن کر روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ سات روز میں آپ مدین پہنچے۔ دوران سفر ہر روز دو شیر آپ کے ہمراہ ہوتے تھے جو کہ راستے پر دلالت کرتے تھے۔ اور رات کے وقت درندوں اور کیڑوں مکوڑوں سے آپ کی حفاظت کرتے تھے۔ اس کے بعد کہ آپ مدین پہنچے حضرت شعیب علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گھر میں سکونت اختیار فرمائی اور ان کی صاحبزادی سے نکاح فرمایا۔ جیسا کہ سورت قصص میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں دس سال گزارنے کے بعد پھر مصر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور راستہ میں نبوت ورسالت سے مشرف ہوئے۔ اور مصر میں چالیس سال تک فرعون اور فرعونیوں کے ساتھ مقابلہ اور جھگڑا کیا۔ اور قاہر معجزات دکھانے میں مصروف رہے۔ جیسا کہ سورہ اعراف میں مذکور ہے۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون' فرعونیوں اور قبطیوں کے ایمان لانے سے ناامید ہو گئے تو بارگاہ خداوندی میں عرض کی کہ اے مولیٰ کریم! مجھے کوئی تدبیر اور حیلہ سکھا کہ بنی اسرائیل کو قبطوں کے ہاتھ سے چھڑا لوں تا کہ وہ کسی خوف و ہراس کے بغیر تیری عبادت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی فرمائی کہ اب تدبیر یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو جمع کر کے راتوں رات کوچ کر جائیں۔ اور اگر فرعون تمہارے پیچھے آئے گا تو اسے میں ہلاک کر دوں گا۔ آپ نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو یہ تدبیر بیان فرمائی۔ انہوں نے اپنی ساری جماعت کو جو کہ شہر میں منتشر تھی آگاہ کر دیا۔ اور بنی اسرائیل میں سے جو کوئی بھی قبطیوں کے ہاں نوکری

یا منہ بولا بیٹا ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے تعلق رکھتا تھا سب کو اٹھا کر ایک جگہ جمع فرمایا۔ فرعون کو اس اجتماع سے وہم سا ہوا پوچھا کہ یہ حرکت کیوں کر رہے ہیں۔ بنی اسرائیل کے سرداروں نے کہا کہ عاشورا کے دن جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ولادت کا دن اور متبرک ہے ہماری عید ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب ایک جگہ جمع ہو کر شہر سے باہر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اور اپنی عید کی رسمیں بجالائیں۔

مصر سے روانگی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے تابوت شریف کا واقعہ

فرعون نے اجازت دے دی۔ بنی اسرائیلی عوام نے زیب و زینت کے حوالے سے قبطیوں سے بہت سے زیورات اور پوشاکیں عاریتاً حاصل کیں اور عید کے بہانے سے شہر کے باہر قناتیں اور خیمے لے آئے یہاں تک کہ پچھلی رات تک جب سب جمع ہو گئے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے ان سے کوچ کرایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیچھے اور ہارون علیہ السلام آگے چل رہے تھے یہاں تک کہ جنگل میں داخل ہو گئے۔ اور راستہ گم ہو گیا جس قدر بھی دائیں بائیں جاتے تھے راستے کا نشان نہیں ملتا تھا۔ بنی اسرائیل کا ہجوم چھ لاکھ ستر ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے عمر رسیدہ لوگوں کو بلایا اور پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ راستہ ہر وقت چلتا ہے۔ اور تم بارہا یہاں سے گزرے ہو۔ انہوں نے عرض کی کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے وصال کا وقت قریب ہوا تو آپ نے وصیت فرمائی اور اپنی اور اپنے بھائیوں کی اولاد سے عہد و پیمان لیا کہ جب بھی تم مصر سے باہر جاؤ میرا تابوت ساتھ لے کر جانا اور مجھے میرے آباؤ اجداد کے قبرستان میں پہنچا دینا۔ حالانکہ ہم مصر سے باہر آ گئے ہیں۔ اور ہم نے تابوت نہیں اٹھایا ہے۔ ہمیں غیبی طور پر بند کر دیا گیا ہے کہ راہ معلوم نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ کی قبر مبارک کہاں ہے۔ تاکہ ہم ان کا تابوت نکالیں اور ساتھ لے چلیں بنی اسرائیل کے عمر رسیدہ لوگوں نے کہا کہ ان کے مزار شریف کی جگہ ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن ان کی یہ وصیت ہمیں اپنے آباؤ اجداد کے ذریعے یاد ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھے اور بنی اسرائیل کے لشکر میں منادی فرمائی کہ جسے حضرت یوسف علیہ السلام

کی قبر شریف کی جگہ کا علم ہوا سے خدا تعالیٰ کی قسم کہ وہ میرے پاس آئے۔ اور مجھے خبر دے کسی نے بھی اقرار نہ کیا۔ مگر ایک بہت ہی بوڑھی عورت نے کہا کہ میں ان کے مزار شریف کی جگہ پہنچاتی ہوں۔ لیکن مجھے خدا تعالیٰ کے نام کا عہد دیں کہ اگر میں ان کے مزار شریف کی نشانی بتادوں تو جو میں چاہوں مجھے مل جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توقف فرمایا۔ وحی آئی کہ آپ عہد دے دیں اور جو کچھ وہ چاہے اس کے حوالے کر دیں۔ بڑھیا نے کہا کہ میرا دو چیزوں کا مطالبہ ہے ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں۔ دنیا کا مطالبہ یہ ہے کہ میں بہت ہی بوڑھی ہوں چلنے کی طاقت نہیں رکھتی مجھے سواری پر بٹھالیں اور اپنے ہمراہ لے چلیں اور اخروی مطالبہ یہ ہے کہ بہشت میں آپ کے ساتھ آپ کے درجہ میں رہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں چیزیں قبول فرمالیں اس کے بعد بڑھیا نے نشان بتایا کہ آپ کا مزار شریف فلاں جگہ عین نیل کے پانی کے اندر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے اور آپ کا صندوق جو کہ سنگ مرمر کا تھا نکال لائے۔ اور اسے خود اٹھا کر لشکر کے آگے آگے جارہے تھے۔ اور ان پر راستہ ظاہر ہو گیا۔ اسی اثنا میں فجر طلوع ہو چکی تھی۔

فرعون کے جاسوسوں نے اسے خبر پہنچائی کہ بنی اسرائیل اس مقام سے کہ جہاں عید کیلئے جمع ہوئے تھے راتوں رات کوچ کر کے چلے گئے۔ فرعون کے غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے چوبداروں کو شہر کے اردگرد قصبوں اور بستیوں میں بھیجا تا کہ اچھے گھوڑ سوار حاضر ہو جائیں۔ اور خود اپنی فوجوں کے ساتھ سوار ہو کر اسی وقت پیچھا کیا۔ اور اس کے ہمراہ بہت بڑا ہجوم تھا۔

فرعون کے لشکر کی مقدار اور بحیرہ قلزم کی جغرافیائی حدود

کہتے ہیں کہ ستر ہزار ابلق سوار اس کی فوج کا اگلا دستہ تھا اور ایک لاکھ سوار تیر انداز اسی قدر نیزہ باز اور اسی قدر گرز بردار اس کی رکاب میں چل رہے تھے۔ قصہ مختصر بنی اسرائیل پوری جلدی سے روانہ ہوئے۔ اور پے درپے دوڑتے ہوئے دریائے قلزم کے کنارے پہنچ گئے اور قلزم ایک شہر کا نام ہے جو کہ اس دریا کے کنارے واقع ہے۔ اور اس شہر کے ساتھ یہ دریا پہنچتا ہے۔ اس لئے اس دریا کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں ورنہ اصل میں یہ دریا

بحر محیط کی خلیجوں میں سے ایک خلیج ہے۔ جو کہ حبش اور عرب کے شہروں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ اور اسے خلیج احمر کہتے ہیں۔ جس طرح کہ دوسری خلیج کو جو کہ فارس اور عرب کے درمیان سے گزرتی ہے خلیج اخضر کہتے ہیں۔ اور اس خلیج احمر کا جنوب سے شمال کی طرف طول چار سو ساٹھ فرسنگ ہے۔ اور اس کا عرض شروع میں ساٹھ فرسنگ کی قدر ہے۔ اور جب انتہا کے قریب پہنچتی ہے۔ تو اس کا عرض کم ہو جاتا ہے۔ فسطاط مصر سے جو کہ وہاں کا دارالخلافہ ہے اس خلیج کی سمت تک خشکی میں تین دنوں کی مسافت ہے اور نیل مصر کے شہر سے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اور شہر نیل کے مشرق کی طرف ہے۔ اور اس خلیج کے مغربی بازو پر بربر کے اکثر شہر واقع ہیں۔ اور کچھ شہر حبش کے ہیں۔ اور اس خلیج کے مشرقی بازو پر اکثر عرب کے ساحلی علاقے واقع ہیں۔ ان میں سے فرضہ ہے جو کہ مدینہ منورہ کا ساحل ہے۔ اور مصر اور حبشہ کے قافلے حجاز کو جاتے ہوئے بندرگاہ سے گزرتے ہیں پھر یمن کے ساحلی علاقے جدہ سے لے کر عدن تک اسی خلیج کے مشرقی کنارے پر ہیں۔ اور اس خلیج کے درمیان مصر سے متعلق بعض شہر بھی آباد ہیں۔ ان علاقوں میں سے دمیاط ہے جو کہ مصر کا جیل خانہ ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں گوالیار کا قلعہ مصر سے کشتی کے ذریعے وہاں غلہ لے جاتے ہیں۔ اور اس کے قلعہ کے محافظ حاکم مصر کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور قلزم کا شہر جہاں یہ دریا ختم ہوتا ہے اس کا طول ۶۴ درجے ہے۔ اور اس کا عرض ۳۰، ۲۹ درجے ہے۔

جب بنی اسرائیل اس دریا کے کنارے پہنچے اور پانی کے متلاطم موجوں اور کثرت کو دیکھا تو حیران رہ گئے کہ اتنی کشتیاں ایک دم کب میسر آسکتی ہیں کہ ہم جلدی سے اس دریا سے گزر جائیں۔ اسی اثنا میں سورج چڑھ آیا اور دن روشن ہو گیا۔ پیچھے سے گھوڑوں کی آوازیں سنائی دیں جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ فرعون اپنے تمام لشکر سمیت پیچھا کرنے کیلئے پہنچ گیا۔ اور اس کے لشکر کا اگلا حصہ نمودار ہوا۔ بنی اسرائیل حواس باختہ ہو گئے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور کہنے لگے کہ اب آپ کے وہ وعدے کہاں ہیں؟ یہ دیکھئے فرعون ہمارے پیچھے آ گیا۔ اور بہت بڑا دریا ہمارے سامنے ہے۔ نہ ہم میں طاقت ہے کہ فرعون کا مقابلہ کریں اور نہ اس کی طاقت کہ دریا سے خلاصی پائیں۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مایوس نہ ہو اللہ تعالیٰ کی امداد میرے ساتھ ہے وہ خود میری مشکل کشائی فرمائے گا۔ اسی اثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ اپنے عصا کو دریا پر ماریں اور کہیں کہ پھٹ جا اور ہمیں راہ دے۔ حضرت موسیٰ نے ایک بار عصا مارا اور کہا۔ دریا اپنے حال پر رہا۔ پھر حکم آیا کہ دریا کو اس کی کنیت سے یاد کریں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوسری مرتبہ عصا مارا اور فرمایا کہ اے ابو خالد پھٹ جا۔ خدا تعالیٰ کے حکم سے دریا پھٹ گیا۔ اور اس میں باران خشک راستے پیدا ہو گئے۔

عبور قلزم کی کیفیت

حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن ہوا اور سورج کو دریا پر مسلط فرما دیا۔ ہوا زلزلے کی طرح پانی کے اندر سے آئی اور دریا کو جدا جدا کر کے کھڑا کر دیا۔ اور سورج نے دریا کی زمین کو خشک کر دیا تا کہ بنی اسرائیل آسانی سے گزر جائیں اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: کہ دریا میں آ جاؤ اور گزر جاؤ۔ وہ اعتقاد کی کمزوری کی وجہ سے جرأت نہیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہمیں اس حالت پر کیا اعتبار کہ ہمارے گزرنے تک کھڑا رہے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم راستہ میں ہوں۔ اور دریا باہم مل جائے۔ اور ہمیں غرق کر دے۔ حضرت یوشع علیہ السلام پہلے اپنے گھوڑے کو اس میں لے آئے اس کے بعد ہارون علیہ السلام اندر آئے۔ اور روانہ ہوئے جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ یہ لوگ گزر کر جا رہے ہیں مجبوراً دریا میں آ گئے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے ہر قبیلہ بارہ راستوں میں سے داخل ہو گئے یہاں تک کہ سب سے آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے قبیلے کو لے کر دریا میں داخل ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبیلے نے عرض کی کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہمیں کیا معلوم کہ دوسرے قبیلوں پر کیا گزری؟ آپ چونکہ ہمارے ساتھ ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنے متعلق اطمینان ہے۔ البتہ ہم اپنے بھائیوں کے متعلق خطرہ ہے کہ کہیں ان پر پانی بہہ نکلا ہو۔ حضرت موسیٰ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کی بار خدایا! اس قوم کی بد خلقی پر میری مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے سخت ہوا کو حکم دیا جس نے پانی کی دیواروں میں جالی دار روشن دان بنا دیئے ہر فرقہ دور سے دوسروں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ گزرے جا رہے

ہیں یہاں تک کہ سلامتی کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔

اسی دوران فرعون اپنے لشکریوں سمیت دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ دریا پھٹا ہوا ہے۔ اور پہاڑوں کی طرح جگہ جگہ پانی کی دیواریں کھڑی ہیں' حیران ہو گیا۔ اور اپنے لشکریوں سے کہنے لگا کہ یہ میرا نصیب ہے کہ میرے لئے دریا چیرا گیا ہے۔ تاکہ میں اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کو خود پکڑوں اور زندہ میرے ہاتھ آئیں اگر غرق ہو جاتے تو میرے کام معطل ہو جاتے لیکن اس کے دل میں خوف و ہراس تھا کہ دریا کا پھٹنا اعتماد کی جگہ نہیں ہو سکتا ہے کہ عبور کرنے کے دوران پھر مل جائے۔ اور غرق کر دے۔ اور ہامان جو کہ اس کا وزیر تھا وہ بھی اسے دریا میں داخل ہونے سے روکتا تھا اور وہ عرض کر رہا تھا کہ جلدی نہیں کرنی چاہئے ہم کشتیاں جمع کرتے ہیں۔ اور سہولت کے ساتھ عبور کر کے انہیں جہاں بھی ہوں پکڑ لیں گے اسی حالت میں حضرت جبریل امین علیہ السلام گھوڑی پر سوار ہو کر فرعون کے گھوڑے کے آگے جو کہ مست تھا ظاہر ہوئے۔ اور آپ نے اس گھوڑی کو دریا میں اتار دیا فرعون کا گھوڑا' گھوڑی کی بو سے بے اختیار ہو کر دریا میں داخل ہو گیا۔ اور جب لشکریوں نے دیکھا کہ بادشاہ خود دریا میں اتر گیا تو ہر طرف سے ہجوم کر کے دریا میں آ گئے اور اسے عبور کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ فرعون اور لشکریوں کا اگلا دستہ کنارے کے قریب پہنچ گیا اس وقت دریا کو حکم ہوا کہ جلد مل جا ایک دم اچانک دریا میں طغیانی آئی اور سب کے سب پانی میں غرق ہو گئے۔ اور بنی اسرائیل اس سارے ماجرے کا دوسرے کنارے پر کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ اور جہاں بنی اسرائیل کی گزرگاہ اور فرعون کی ہلاکت گاہ تھی اس دریا کا عرض بہت قلیل ہو گیا۔ اور اس کا عرض چار فرسنگ کی قدر ہے جو کہ آدھے دن میں عبور کیا جا سکتا تھا اور یہ واقعہ عاشورا کے دن رونما ہوا چنانچہ صحیح حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کیلئے دریا عاشورا کے دن چیرا گیا۔ اور صحیحین میں حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ دنوں میں سے ایک دن میں یہودی روزہ رکھتے تھے آپ نے فرمایا کیا وجہ ہے

کہ آج تم نے روزہ رکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آج عاشورا کا دن ہے اس دن حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دن کا شکرانے کے طور پر روزہ رکھتے تھے ہم بھی ان کی اقتداء میں روزہ رکھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتداء کے ان کی نسبت زیادہ مستحق ہیں۔ آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن آخری عمر میں فرماتے تھے کہ اگر میں آئندہ سال تک حیات ظاہری میں رہا تو عاشورا کے روزہ کے ساتھ نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھوں گا تاکہ یہودیوں کی مشابہت لازم نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ دریا کو پھاڑنے کا واقعہ جو کہ ایک عظیم خلاف عادت امر تھا نعمت در نعمت کے طور پر بنی اسرائیل کو یاد کراتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا اور یاد کرو نعمت کی قدر جاننے کیلئے فرعون سے نجات کو خصوصاً دوسرے واقعہ کو جو کہ فرعون سے نجات کے علاوہ گویا ایک مستقل دوسری نعمت تھی اس وقت کو جبکہ ہم نے پھاڑا بِکُمُ تمہارے دریا کے کنارے پہنچنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دربار میں تمہاری بے چینی کی وجہ سے کیونکہ حقیقت میں دریا کو پھاڑنے کا باعث یہی تھا۔ کیونکہ عصا مارنا سبب کے آلہ ہونے کے طور پر قریب ہوا۔

اَلْبَحْرَ دریائے قلزم کو اور لغت عرب میں بحر دریائے شور اور اس کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں۔ اور میٹھے پانی اور نہروں کیلئے اگر کسی جگہ لفظ بحر استعمال ہوا تو مجازی طور پر ہے۔ انہیں انہار کہتے ہیں بحر نہیں کہتے اور ہم نے اس نعمت میں اسی قدر اکتفا نہیں فرمایا کہ دریا پھاڑنے کا خلاف عادت کام تمہیں دکھائیں بلکہ ہم نے نعمت کو پورا فرمایا۔

فَاَنْجَیْنٰکُمْ ۔ پس ہم نے تمہیں نجات دی اور دریا کے پانی کو بھی ہم نے اسی پھٹی ہوئی شکل میں محفوظ رکھا۔ اور ہم نے اس پر ہوا کو مسلط کر دیا تاکہ اسے باہم ملنے نہ دے۔ یہاں تک کہ تم سب سلامتی کے ساتھ کنارے پر پہنچ گئے اور غرق ہونے کے خوف سے بچ گئے اور اس ضمن میں تمہیں ایک اور نجات حاصل ہوئی ہر اس شبہ سے جو کہ صانع حکیم مختار کے وجود کے بارے میں ہوتا ہے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے متعلق رونما

ہوتا ہے پھر ہم نے اسی قدر پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ہم نے تمہیں اس ہلاکت گاہ سے نجات دی اور تمہارے دشمن کو تمہارے سامنے اسی ہلاکت گاہ میں ہلاک کیا۔

وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اور ہم نے فرعون کے پیروکاروں کو غرق کردیا تاکہ تمہیں خوشی پر خوشی بڑھے۔ اور اس سے خوف کا کوئی اثر تمہارے دل میں باقی نہ رہے۔ اور اپنے پرانے مسکن کو جو کہ مصر ہے چھوڑنے کا غم وفکر تمہارے دل کے اردگرد نہ رہے۔ اور یہ نعمتیں ہم نے اس طرح ڈالیں کہ تمہیں کوئی شک وشبہ اور خبر کے سچے جھوٹے ہونے کا احتمال تمہارے دل میں نہ گزرے اسی لئے ان سب چیزوں کو ہم نے تمہارے سامنے کیا۔

وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ اور تم دیکھ رہے تھے۔ پس اس قسم کی عظیم نعمتوں کا شکر بھی عظیم چاہئے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم اپنے مالک کی عبادت کے دریا میں داخل ہو جاؤ اور اس کے دشمنوں کو جو کہ نفس' شیطان اور خلق اور دنیا کی محبت ہے اسی گہرے دریا میں تزکیہ' تصفیہ اور علائق دنیوی کو قطع کرنے کے ساتھ غرق کردو۔

سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا جو کہ مفسرین کے دل میں کھٹکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وَاِذۡ اَنۡجَیۡنَاکُمۡ مِنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ کا مضمون اور وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِکُمُ الۡبَحۡرَ کا مفہوم ایک چیز ہے۔ اور اس کا ماحصل فرعون سے نجات ہے اس ایک مضمون کو دو نعمتیں کیوں قرار دیا اور دو آیتوں میں کیوں ذکر فرمایا؟ اس سوال کا جواب دوران تفسیر اشارۃً مذکور ہو چکا کہ فرعون سے نجات دینا مختلف رنگ رکھتا تھا خصوصاً دریا کا پھاڑنا جو کہ خلاف عادت عظیم کام ہے ایک دوسری نعمت ہے۔ مثلاً ایک شخص کو اللہ تعالیٰ رزق وافر پہنچائے اور احتیاج وفقر کو اس سے دور کردے اگر احسان جتلانے کے مقام پر فرمائے کہ میری اس نعمت کو یاد کر جو کہ میں نے تجھے دی جبکہ میں نے تجھے رزق دیا اور فقر واحتیاج سے نجات دی تو یہ ایک مکمل کلام ہے۔ پھر اگر رزق پہنچانا اس کی طرف سے دست غیب کے طریقے سے ہو بغیر کسی مخلوق کے احسان اور بغیر کوئی تکلیف ومشقت اٹھانے کے اسے دوسری نعمت قرار دے کر فرمایا کہ تجھ پر میری اس نعمت کو یاد کر جبکہ میں نے تجھ پر غیب سے بغیر کسی مخلوق کے احسان اور بغیر کسی

تکلیف و مشقت کا بوجھ ڈالنے کے رزق جاری کیا۔ یہ فی نفسہ ایک مستقل اور مکمل دوسرا کلام ہے ان دونوں کلاموں میں سے ہر ایک کو جدا جدا کلام قرار دینا نعمتوں کی گنتی کے مقام پر مناسب اور لائق ہے۔

اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ پہلی آیت میں فرعون کی گرفت اور غلبے سے نجات دینے کی نعمت مذکور ہے جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں صرف بعثت اور تشریف آوری کی وجہ سے پوری ہوئی۔ کیونکہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد اس کی ان تکلیفوں اور محکومیوں سے بچ گئے بلکہ اس کے مقابل ہو گئے۔ اور دوسری آیت میں ایک اور نعمت ہے کہ مصر سے نکلنے کے وقت دریائے شور عبور کر کے فرعون کے غلبے سے بچ گئے۔ اور اس کے اور اس کے لشکریوں کے غرق ہونے کی وجہ سے ان کے دلوں سے مستقبل کا خطرہ بھی زائل ہو گیا۔ اور ہر طرح سے ان کو قلبی اطمینان حاصل ہو گیا۔

مزدور بنی اسرائیلی عورت کی مزدوری فرعون کی داڑھی کے مروارید

حکایت کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں سے ایک عورت پانی لینے پچھلی رات کے وقت دریا پر گئی اپنا گھڑا بھر رہی تھی کہ فرعون کی داڑھی جو کہ موتیوں اور مروارید سے مرصع تھی اس کے ہاتھ لگی اس نے اس کے بال جڑ سے اکھاڑ لئے اور موتیوں کو اس کی داڑھی سے نکال لیا اتفاقاً یہی عورت فرعون کے محل میں مزدوری کیلئے اینٹیں لے جاتی تھی اور اس نے مزدوری نہ پائی تھی۔ غیب سے آواز آئی کہ اپنا اجر لے لے۔ یہ آواز اس کے کان میں پڑی۔ وہ لوگوں میں آئی اور یہ واقعہ بیان کیا۔ اور انہیں فرعون کی داڑھی، موتی اور مروارید دکھائے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ظلم کا انجام تباہی اور مظلوم کا انجام رہائی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بارگاہِ خداوندی سے کتاب لینے کیلئے جانا اور سامری کا قصہ

جب بنی اسرائیل فرعون اور فرعونیوں کے خوف سے بالکل مطمئن ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یاد دلایا کہ تم نے ایک نذر مانی تھی کہ اگر حق تعالیٰ تمہیں فرعون اور

فرعونیوں سے خلاصی عطا فرمائے تو ہم اس کی اطاعت میں کوشش کریں گے۔ اب وہ نذر پوری کرو۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم جان و دل کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ احکام یعنی اوامر و نواہی پر اطلاع نہیں۔ تا کہ ہم اس کی اطاعت کی راہ میں قدم رکھیں۔ چاہئے کہ آپ خدا تعالیٰ کے ہاں سے کوئی کتاب لائیں تا کہ ہم ان کے مطابق اطاعت کی راہ پر چلیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مقصد بارگاہ خداوندی میں عرض کیا حکم آیا کہ آپ کوہ طور پر حاضر ہوں جو کہ آپ کی رسالت کی عطا کا مقام ہے۔ اور ایک مہینہ تک جو کہ تیس دن کی مدت ہے روزہ رکھیں اور اعتکاف کریں۔ اس کے بعد تمہیں اوامر و نواہی کی جامع ایک کتاب عطا کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس ارشاد کے مطابق بنی اسرائیل کو چھوڑ کر اور حضرت ہارون علیہ السلام کو ان پر خلیفہ مقرر کر کے کوہ طور کی طرف جلد روانہ ہوئے۔ اور جسم اور لباس کو صاف کر کے اس پہاڑ میں معتکف ہو گئے۔ اور آپ کے اعتکاف کی ابتداء ذوالقعد کی پہلی تاریخ کو تھی جب آپ کا اعتکاف پورا ہو گیا۔ اور ایک دن باقی رہ گیا تو آپ کو روزہ اور کم کھانے کی وجہ سے اپنے منہ کی بو بدلی ہوئی لگی۔ آپ نے مسواک استعمال فرمائی۔ غیب کی طرف سے حکم آیا کہ ہمارے نزدیک یہ بدلی ہوئی بو کستوری کی مہک سے زیادہ بہتر تھی۔ آپ نے اسے زائل کیوں کر دیا اب اس کے عوض اور دس راتیں مزید اعتکاف کیجئے۔ ذوالحجہ کی دس تاریخ کو جو کہ عید قربانی کا دن ہے آپ کو کتاب دوں گا اور کلام فرماؤں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس راتوں کے اعتکاف کی نیت کی۔ اور وہاں ٹھہرے رہے۔

لیکن آپ کے آنے کے بعد بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا حادثہ رونما ہوا اور اس کا سبب یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے لشکر میں ایک شخص تھا جس کا نام موسیٰ بن ظفر قبیلہ سامرہ سے تھا جو کہ زرگری اور ڈھانچے بنانے میں بڑا استاد اور ماہر تھا۔ جس دن فرعون غرق ہوا اور حضرت جبریل علیہ السلام گھوڑی پر سوار ہو کر دریا کے کنارے گشت کر رہے تھے اس نے دیکھا تھا کہ جہاں اس گھوڑی کے سم کا نقش لگتا تھا وہ جگہ سرسبز ہو جاتی تھی۔ اس نے جان لیا کہ اس گھوڑی کے سم کے نقش میں زندگی کا اثر ہے۔ اسی بنا پر اس نے گھوڑی کے پاؤں کے نیچے کی کچھ مٹی

اٹھا کر بطور تبرک احتیاط کے ساتھ اپنے پاس رکھ لی تھی اور جب بنی اسرائیل دریائے شور عبور کر کے صحرا میں آئے تو ان کا گزر ایسی قوم پر ہوا جو کہ گائے کی پوجا کرتی تھی۔ اور وہ گائے کی مورتیاں پیتل وغیرہ سے بنا کر پوجتے تھے۔ بنی اسرائیل کو یہ مورتیوں کی پوجا بہت اچھی لگی تھی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے بھی ہمارے پروردگار کی صورت بنا کر دیجئے تا کہ اس کی عبادت کا حق اچھے طریقے سے بجا لائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس سوال پر ڈانٹ ڈپٹ فرمائی تھی۔ لیکن سامری نے معلوم کر لیا تھا کہ اس جماعت کو صورت پرستی طبعی طور پر پسند ہے اس وقت جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے بنی اسرائیل کے سردار حضرت ہارون علیہ السلام کی خدمت میں حاضر آئے۔ اور عرض کی کہ مصر سے نکلنے کے وقت ہم نے قبطیوں سے بہت ساز اور عاریۃً لیا تھا اس بہانے سے کہ ہم عید میں زیب و زینت کریں گے اب اس زیور کے متعلق کیا حکم ہے؟ حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سب زیور کو ایک گڑھے میں ڈال کر آگ دو اور جو جل جائے جل جائے۔ اور اس کی راکھ جو باقی رہے زمین میں دبا دو کیونکہ کافروں کا مال ہے۔

ایک فقہی اشکال اور اس کا جواب

جاننا چاہئے کہ اس مقام پر بعض کمزور ذہن فقہاء ایک دشواری وارد کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل مصر کے شہر میں پناہ گزین تھے۔ اور قبطیوں سے پناہ لیتے تھے۔ پناہ گزینوں کو حربیوں کا مال لینا جائز نہیں۔ اور اگر بنی اسرائیل نے معصیت کے ساتھ یہ کام کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام بھی اس ماجرا پر مطلع ہو چکے تھے تو انہوں نے اس حرکت سے انہیں منع کیوں نہ فرمایا؟ اس دشواری کا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا مصر کے شہر میں پناہ گزین ہونا تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ قیدی تھے۔ اور انہیں زور تعدی کے ساتھ فرعون نے وہاں سے نکلنے سے روک رکھا تھا اور وہ ہر روز قبطیوں کا ظلم سہتے تھے۔ اور ان سے رنج اور دکھ برداشت کرتے تھے۔ اور قیدیوں کو جائز ہے کہ حربیوں کا مال جس طرح ہاتھ لگے خواہ گدائی سے خواہ چوری کر کے لے جائیں۔ اور اگر بالفرض پناہ گزین

بھی تھے تب بھی ان کا زیور اور مال لے جانے کی ضرورت رکھتے تھے۔ کیونکہ اگر بھاگنے کے وقت عاریت واپس کرنے میں مشغول ہوتے تو گرفتار ہو جاتے۔

قصہ مختصر سامری نے بنی اسرائیل کو کہا کہ یہ سب زیور میرے حوالے کر دو کہ میں اس سے ایک عجیب طلسم بناؤں گا جو کہ موسیٰ کے عصا سے بہتر ہوگا۔ اور اس کے بعد تمہیں موسیٰ کے ساتھ ہمسری اور برابری حاصل ہو جائے گی۔ اور موسیٰ کو تم پہ کوئی فخر اور فضیلت نہیں رہے گی۔ بنی اسرائیل نے وہ سب زیور اس کے حوالہ کر دیا۔ سامری نے سونے کو جدا اور جواہر د یواقیت کو جدا کر دیا۔ سونے سے بہت خوبصورت بچھڑا بنایا۔ اور جواہرات اور یواقیت کو کان' آنکھ' ہاتھ کے جوڑ' زانو اور قدم کی جگہ قرینے کے ساتھ نصب کیا۔ اور اس کے پیٹ کو کھوکھلا رکھا اور اس خالی جگہ میں وہ مٹی ڈال دی جو کہ اٹھائی تھی۔ بچھڑا اس مٹی کے اثر سے ہلنے لگا اور گائیوں کی طرح آواز کرنے لگا۔ سامری نے کہا کہ دیکھو تمہارا پروردگار اس بچھڑے کی صورت میں ظہور کر کے تمہارے خیموں میں آ گیا ہے۔ اور موسیٰ اس کی تلاش میں پہاڑوں پر بھاگے پھرتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے کہا تو نے سچ کہا ہے تیس دن گزر گئے ہیں جو کہ موسیٰ کے واپس آنے کی مدت تھی اور موسیٰ واپس نہیں آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خدا کو وہاں نہیں پایا۔ بنی اسرائیل میں سے آٹھ ہزار کے قریب لوگوں نے سامری کے گمراہ کرنے سے اس بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اور مشہور مثال کی طرح کہ جو کام آدمی کرتا ہے بندر بھی کرتا ہے۔ اس بچھڑے کے اردگرد معتکف ہو گئے۔ اور سامری نے اس بچھڑے کے اوپر بہت خیمہ کھڑا کر دیا۔ اور وہاں پر تکلف فرش اور کپڑے ڈال دیئے اور اس خیمے کے اردگرد نقارہ بجانا شروع کر دیا۔ اور اس غیر ذی عقل بچھڑے کے سامنے گانا بجانا شروع کر دیا۔ اور مرد اور عورتیں تماشا کیلئے دوڑے اور شیطان کا بازار گرم ہو گیا۔

اور وہاں موسیٰ علیہ السلام کو ذوالحجہ کے دسویں دن چاشت کے وقت زبرجد کی بارہ تختیاں عطا ہوئیں جن پر تورات منقش تھی اور ان کے لئے نصیحت اور حکم پر مشتمل کلام تھا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ تیری قوم نے تیرے بعد نعمت کی عجیب ناشکری کی ہے۔ اور انہیں جو فرعون کہتا تھا کہ مجھے سجدہ کرو انہوں نے اس سے بدتر کام سامری کے اغوا کرنے کی وجہ

سے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ کیونکہ اقتدار والے بادشاہ کی تعظیم جو کہ نفع و نقصان کا مالک ہوتا ہے کچھ نہ کچھ معقول ہونے کی وجہ رکھتی ہے۔ عقل سے خالی بچھڑا جو کہ بے وقوفی اور حماقت میں ضرب المثل ہے کسی طرح بھی لائق تعظیم نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس خبر وحشت اثر کو سنتے ہی بے اختیار لشکر کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے تو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ سختی سے پیش آئے کہ آپ نے اس بری حرکت کو کیسے برداشت کیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا میں نے بارہا انہیں اس برے کام سے روکا تھا لیکن انہوں نے کہا: لن نبرح علیه عاکفین حتّٰی یرجع الینا موسٰی (طٰہٰ آیت ۹۱) ہم اس بچھڑے پر اپنا اعتکاف ہرگز ختم نہ کریں گے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس آ جائیں۔ اور اس کام کی اچھائی یا برائی ہمارے سامنے ظاہر فرمائیں اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بچھڑے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اسے آگ میں جلایا اور اس کی راکھ کو دریا میں اڑا دیا اور بچھڑا پوجنے والے چوری چھپے جاتے تھے۔ اور اس پانی کو بطور تبرک لاتے تھے۔ اور پیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ اس بچھڑے کے بارے میں بنی اسرائیل تین گروہوں میں بٹ گئے ایک گروہ وہ تھا جنہوں نے سامری کے گمراہ کرنے کی وجہ سے فریفتہ ہو کر اس کی پوجا کی۔ دوسرا گروہ وہ تھا جنہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ مل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ڈیوٹی ادا کی۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو کہ خاموش اور متوقف رہا نہ یہ کام کرتے تھے۔ اور نہ ہی انکار کرتے تھے۔ پہلا اور تیسرا گروہ دونوں زیر عتاب آ گئے اور دوسرا گروہ بچ گیا۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم نعمت کو کہ باوجود اس قدر گستاخی کے کہ اس سے کم تر گستاخی کی وجہ سے فرعونیوں کو ان کے سامنے غرق کیا تھا انہیں اس سے معافی دے کر یاد کراتا ہے۔

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسٰى اور اس وقت کو یاد دلاؤ جبکہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وعدہ فرمایا۔ اور اگرچہ مواعدت کا لفظ دونوں طرف سے وعدہ کے صادر ہونے کو چاہتا ہے۔ لیکن یہاں اسافرت اور عاقبت اللص کے طریقے پر مشارکت کے معنی سے خالی ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ وعدہ دونوں طرف سے محقق تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف

سے پورے اعتکاف کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دینے کا وعدہ اور وہ وعدہ اس مدت پر موقوف تھا اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً یعنی چالیس رات۔ اور اکثر روایات میں وارد ہے کہ تیس راتیں ماہ ذوالعقد کی تھیں۔ اور دس ذوالحجہ کی پہلی راتیں اور دسواں دن کتاب دینے کا وقت تھا اسی لئے اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نہیں فرمایا ورنہ دسواں دن بھی اعتکاف اور روزے کے دنوں میں داخل ہوتا اور وہ حلال نہیں ہے۔

اور بعض محققین نے کہا ہے کہ چونکہ رات عبادت اور تنہائی کا وقت ہے۔ اور ریاضت کرنے والے زیادہ تر اسی وقت اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس بنا پر راتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ فرمایا۔ نیز عربوں کے مہینے چاند کی سیر اور گردش پر مقرر ہیں۔ اور اس کی ابتداء پہلی رات کے چاند سے کرتے ہیں۔ اور یہ معنی رات کے ساتھ خاص ہے۔

لفظ موسیٰ کی تحقیق کا بیان

اور موسیٰ اصل لغت میں عبرانی کا لفظ ہے جو کہ معرب ہوا ہے۔ یعنی وہاں سے اسے عربی میں لایا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی اصلی میشا بمعنی آب یعنی پانی اور شا بمعنی درخت ہے چونکہ آپ کو فرعون نے نہر میں درختوں کے نیچے پایا تھا اس لئے یہ نام آپ کیلئے مقرر کر دیا۔ عربوں کی زبان میں یا واؤ سے اور ش س سے بدل گیا۔

عبادت کیلئے چالیس کے عدد کی تحقیق کا بیان

اور ۴۰ کے عدد کا بہت سی جگہوں پر اعتبار ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص چالیس دن اللہ تعالیٰ کیلئے خاص کرے تو حکمت کے سوتے اس کے دل سے اس کی زبان پر بہہ نکلتے ہیں۔ نیز آیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی خاک شریف کو چالیس دن تک خمیر کیا گیا۔ نیز آدم کا بچہ مدت کی اسی مقدار میں ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتا ہے۔ چالیس دن تک نطفہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے چالیس دن تک جما ہوا خون اور اگلے چالیس دن تک گوشت کا ٹکڑا اس کے بعد روح الٰہی پھونکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہیں سے تمام صوفیہ نے ریاضت و خلوت کیلئے چلہ مقرر کیا ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

قصہ سے معلوم ہوا کہ اس مدت تک ریاضت کرنا ایک حال سے دوسرے اعلیٰ حال تک ترقی کرنے کا سبب ہے۔

ایک تناقض کا جواب

ہم یہاں آ گئے کہ اس آیت میں چالیس راتوں کا وعدہ مذکور ہے جبکہ سورت اعراف (آیت ۱۴۲) میں تیس رات کا۔ بظاہر تناقض معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اجمالی طور پر اصل مدت اور زیادتی کو ملا کر آپ کی پوری مدت خلوت کو بیان فرمایا گیا۔ جبکہ سورت اعراف میں تفصیلی طور پر اصل وعدہ کو جو کہ ۳۰ راتیں تھیں۔ اور پھر دس روز کی مدت جسے بے وقت مسواک استعمال کرنے کی وجہ سے بڑھایا گیا تھا جدا جدا بیان کیا گیا۔ پس کوئی تناقض نہیں ہے۔ کیونکہ اجمال اور تفصیل میں کوئی مخالفت نہیں ہوتی مثلاً جس شخص نے کسی سے چالیس درم قرض لئے ہوں وہ کہے کہ میں چالیس درم کا مقروض ہوں ایک صحیح اجمال ہے۔ اور اگر کہے کہ میں نے اس سے تیس درم فلاں مقصد کیلئے اور دس درم فلاں مقصد کیلئے لئے ہیں تو ایک درست تفصیل ہے۔ خصوصاً سورت اعراف کی آیت میں اس تفصیل کا میزانیہ بھی مذکور ہے فتم میقات ربه اربعین لیلة

سوال اور جواب

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ ترکیب نحوی میں اربعین لیلة کیا مقام رکھتا ہے مفعول ہو نہیں سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ تھا کتاب دینا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے پورا اعتکاف کرنا۔ اور ظرف بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ وعدہ دونوں طرف سے چالیس راتوں میں نہ تھا اس کا جواب یہ ہے کہ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ایک محذوف مفعول کا ظرف ہے۔ یعنی واعدنا موسٰی معاملة عند انقضاء اربعین لیلة۔ ہاں لفظ انقضاء کو بھی محاورت کے مجاز کی وجہ سے لفظوں میں گرا دیا اور اربعین لیلة کو اس کی جگہ فرمایا۔ جیسا کہ عرف میں کہتے ہیں کہ آج چالیس دن ہیں کہ فلاں آیا ہے۔ یعنی چالیس روز گزر گئے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نسب کا بیان

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب یہ ہے کہ آپ ابن عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اور لاوی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے ہیں۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے فرقہ میں سے حقیقی سرداری بھی حاصل تھی کیونکہ ابوالعزم پیغمبر تھے۔ اور عرفی سرداری بھی کیونکہ عام عرف میں سرداری سب سے بڑے لڑکے اور اس کی نسل کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کتاب لینے کیلئے بنی اسرائیل کی طرف سے بارگاہ خداوندی میں گئے تھے۔ پس ہر کسی کو چاہئے تھا کہ حضرت کی انتظار کرتا اور دوسری راہ اختیار کرنے سے پرہیز کرتا اور اے بنی اسرائیل! تمہارے اسلاف نے ادنیٰ لوگوں کے اس معمول کی مخالفت کی کہ جب بھی کسی فرقے کے سرداروں میں سے کوئی سردار کسی حاکم یا بادشاہ کے پاس کسی مطلب کی درخواست کیلئے جاتا ہے دوسرے اس سردار کے جانے کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور ہرگز اس کی مخالفت اور اختلاف نہیں کرتے۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے جانے اور چالیس دن کی مدت مقرر کرنے کے بعد تم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے غیر حاضر ہونے کے وقت بچھڑا اپنایا۔ کیونکہ جب تک موسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان تھے تمہیں فرعون اور ہامان کی پوجا سے روکتے تھے۔ حالانکہ فرعون اور ہامان ظاہری اقتدار والے اور کسی قدر نفع وضرر کے مالک تھے تمہیں بے جان بے عقل بچھڑے کی پوجا سے کس قسم کی ممانعت نہ فرماتے۔ اور ثم کا لفظ اصل میں زمانے کی تراخی یعنی تاخیر کیلئے ہے۔ یہاں ماقبل کے مضمون سے مابعد کے مضمون کے بہت بعید ہونے کیلئے استعمال ہوا گویا کسی وجہ سے مناسبت نہ تھی کہ تم اپنے سردار کو ہماری بارگاہ میں ایک مطلب پیش کرنے اور ایک غرض کی درخواست کیلئے بھیج دو اور خود اپنے سردار کی غیر حاضری میں ہماری مرضی کے خلاف عمل کرو بلکہ ہمارے ایک مخالف کو اپنی طرف سے کھڑا کر دو۔ اور اتخاذ اخذ سے باب افتعال ہے۔ ہمزہ کی تلیین اور اسے تا کے ساتھ بدلنے کے بعد تا کو تا میں مدغم کر دیا۔ اور چونکہ اس لفظ کا استعمال افتعال کے

صیغے پر بہت واقع ہوا ہے۔اور عربوں کو وہم ہوا کہ شاید تا اصلی ہو تخذ یتخذ سے لی گئی
اسی بنا پر تخذ یتخذ کو بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔اور عربوں کے نزدیک اتخاذ کے فعل
نے افعال قلوب کا حکم حاصل کر لیا ہے کہ مبتداء اور خبر پر داخل ہوتا ہے۔اور دونوں کو
مفعولیت کے ساتھ نصب دیتا ہے۔اگر اس استعمال پر یہاں نظر کریں تو دوسرا مفعول
محذوف مانیں گے یعنی ثم اتخذتم العجل الها اور ارباب معانی نے اس ناپاک امر
کی صراحت کی قباحت کو اس حذف کی وجہ قرار دیا ہے ورنہ ہم اتخاذ کو بنانے کے معنوں میں
مقرر کرتے۔اور اس صورت میں ایک مفعول جو کہ موجود ہے کافی ہے۔

اور وہ جو بعض اہل معانی کے دل میں خیال گزرا ہے کہ بچھڑا بنانا محل انکار نہ تھا۔نیز
بچھڑا بنانا تنہا سامری کا کام تھا اور تمام بنی اسرائیل اس میں شریک نہ تھے۔بخلاف بچھڑے
کو معبود پکڑنے کے کہ اس میں ہر ایک شریک تھا۔پس اس کا جواب یہ ہے کہ انکار کا محل عین
بچھڑا بنانا تھا۔جیسا کہ لام عہد سے سمجھا جاتا ہے۔اور معین بچھڑا وہ تھا جس کی پوجا کی گئی
علاوہ ازیں تصویریں بنانا بھی محرمات میں سے ہے۔اور مال حرام سے نفع لینا جس طرح
سے ہو بھی محرمات میں سے ہے۔پس صرف بچھڑا بنانا بھی محل انکار ہو سکتا ہے۔اور اگرچہ
بچھڑے کا ڈھانچہ سامری نے بنایا تھا لیکن امداد و اعانت اور زرد جواہرات پر اسے قبضہ
دینے کی وجہ سے ہی اس کا یہ کام پورا ہوا تھا اور اس امداد و اعانت سب کے سب شریک تھے۔

اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ
اس بچھڑے کا نام بہوت تھا۔ظاہراً انہوں نے اس نام میں بھی شرک کی بو رکھی تھی۔اسی لئے
حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ کاش تم بچھڑے صرف کھیل تماشا کیلئے بناتے اور بچوں کی گڑیوں اور
مورتیوں کی طرح ذلیل و حقیر سمجھتے لیکن تم نے بچھڑے کی اس مورتی کو معبود بنالیا۔

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ حالانکہ تم بہت ظلم کر رہے تھے۔کیونکہ تم نے عبادت کو جو کہ انتہائی
تعظیم سے عبارت ہے۔اور علیم و حکیم کا خاص حق ہے۔بچھڑے کے بارے میں جو کہ بیل کا
بچہ جائز قرار دے دیا۔اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سے حماقت اور بے سمجھی
میں بیل کی مثال دی جاتی ہے۔اور بیل کا بچہ بیل سے کمتر ہے۔اور اس بچے کی صورت اپنے

صورت والے سے کم ہے۔ پس تم نے خدا تعالیٰ کی مخلوقات میں سے حقیر ترین شے کو خدا تعالیٰ کا حق دے دیا۔ پس تمہارا ظلم فرعونیوں کے ظلم سے کئی درجے زیادہ شدید اور ناپاک ہے۔ خصوصاً اس طرح کہ تم سے یہ ظلم ایمان اور ناقص معرفت کے بعد ظاہر ہوا۔ جبکہ فرعونیوں سے حالت کفر اور جہالت میں ظاہر ہوا۔

اہل تحقیق نے کہا ہے کہ ہر قوم کا ایک بچھڑا ہے جس کی پوجا میں وہ مصروف ہیں اگرچہ ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان اور دیندار سمجھیں چنانچہ حدیث پاک میں بھی اس معنی کا اشارہ آیا ہے جہاں فرمایا ہے تعس عبد الدینار عبد الدراھم و عبد الخمیصۃ ان اعطی رضی وان لم یعط سخط یعنی وہ شخص بدحال ہے جو کہ اشرفی کا بندہ یا روپیہ کا بندہ یا شال اور زینت والے کپڑوں کا بندہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ چیزیں عطا ہوں تو خوش رہتا ہے ورنہ ناخوش رہتا ہے۔ اور شکایت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

یہاں جاننا چاہئے کہ علماء کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ بنی اسرائیل ان غالب معجزات اور ظاہر خوارق کے مشاہدہ کے باوجود جو کہ صانع قادر مختار پر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی صداقت پر دلالت کے بارے میں الحاد اضطراری کے قریب پہنچ گئے تھے سامری کے مکر و فریب پر کیسے فریفتہ ہو گئے۔ اور اس کے اغوا کے جال میں گرفتار ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ سامری نے شبہات ڈال کر بنی اسرائیل کے دلوں میں یوں نقش کر دیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان عجیب معجزات پر طلسمات اور جادو کے ذریعے قدرت حاصل ہوئی ہے۔ پس تمہیں بھی چاہئے کہ کوئی طلسم اور جادو انکے طلسم اور جادو کی طرح کا بناؤ تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے برابر ہو جاؤ اور جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ اکثر جاہل بنی اسرائیل حلولی مذہب کے تھے۔ اور ذات حق کا بعض جسموں میں سما جانا جائز قرار دیتے تھے۔ سامری نے اس طرح انہیں دھوکا دیا کہ تمہارا پروردگار اس بچھڑے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اس بچھڑے کی آواز اور حرکت کو اس دعویٰ کی دلیل اور گواہ بنایا جس طرح کہ ہندو جہاں بھی کسی عجیب امر کا مشاہدہ کرتے ہیں اسی جگہ اپنے خالق کے سما جانے کا اعتقاد کر کے پوجا اور انتہائی تعظیم سے پیش آتے ہیں۔ اور کافی آیات اور

احادیث اسی قول پر دلالت کرتی ہیں۔اور پہلے قول کے منافی ہیں۔ان میں سے ایک یہ کہ سامری نے کہاھٰذا الھکم والہ موسٰی فنسی اوران میں سے ان کا عبادت اور تعظیم کے ساتھ اس بچھڑے کے اردگرد اعتکاف کرنا کیونکہ طلسمات اور جادو کے ساتھ اس قسم کا معاملہ نہیں کیا جاتا علاوہ ازیں اور بھی دلائل ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ بنی اسرائیل کا یہ فعل شنیع جو کہ کفر کی سب سے قبیح قسم ہے چاہتا تھا کہ انہیں فی الفور نیست و نابود کر دیں اور توبہ کی فرصت نہ دیں اور عذر و معذرت کی گنجائش نہ چھوڑیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی اور رحمت کے ساتھ جو کہ اصل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ تھی اور بالتبع تمام بنی اسرائیل کو پہنچتی تھی انہیں دنیوی مواخذہ نہ فرمایا۔اور ہلاک نہ کیا چنانچہ فرمایا ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ پھر ہم نے تمہیں معاف فرمادیا اور تمہیں فی الفور نسل ختم کرنے والے عذاب کے ساتھ ہلاک نہ کیا۔جس طرح کہ فرعونیوں کو اس سے کمتر گناہ کی وجہ سے ہم نے ہلاک کر دیا تھامِنْ بَعْدِ ذَالِكَ بچھڑا بنانے اور اس بے جان مورتی کی پوجا کے بعد جو کہ تم سے ایمان اور معجزات اور عظیم نشانیاں دیکھنے کے بعد رونما ہوئی۔اور جرم ہونے میں بے انتہا شدید تھی۔لہٰذا اس قابل ہوئی کہ اسے اشارہ بعید کے صیغے سے اشارہ کیا جائے لیکن یہ سب کچھ اس بنا پر تھا کہ

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ شاید تم زمانہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشقتیں برداشت کرنا گوارا کرو۔اس لئے کہ ابھی تمہارے فرقہ کی استعداد باطل ہونے تک نہیں پہنچی تھی۔تم سے توقع تھی کہ نیک اور صالح وجود میں آئیں اور وہ معرفت و عبادت کے کام میں لگ جائیں۔بخلاف فرعونیوں کے کہ ان کی استعداد مکمل طور پر زائل ہو چکی تھی اور ان میں سے کوئی بھی معرفت اور عبادت کی امانت اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا۔اور لعل اگرچہ لغت عرب میں امیدواری کیلئے ہے۔لیکن کلام الٰہی میں زیادہ تر یقین کے مقا[م] استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس کے بعد بنی اسرائیل علوم الٰہیہ کے خزانے ا[و]ر اس کے اسرار کے حامل ہو گئے۔اور ان میں ہزاروں انبیاء علیہم السلام

شہداء اور صالحین پیدا ہوئے۔ اور راہب اور احبار کام میں لگ گئے اور اللہ تعالیٰ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

مشکل سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک بہت مشکل سوال ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بچھڑے کی پوجا بلاشبہ کفر تھی۔ بلکہ کفر کی سب سے قبیح قسم اور کفر معانی کے لائق نہیں ہے۔ اور توبہ کے بغیر بخشا نہیں جاتا اور اگر کوئی لفظ جو کہ توبہ پر دلالت کرنے والا ہو ہم یہاں مقدر مانتے ہیں جس طرح کہ جمہور مفسرین نے کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ کلام کی تقدیر یہ ہے ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ حين تبتم لعلكم تشكرون نعمة العفو یعنی پھر ہم نے تمہیں معاف فرما دیا جب تم نے توبہ کی تا کہ تم معاف کرنے کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

تو لازم آتا ہے کہ اس آیت کا مضمون اور اس آیت کا مضمون فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ایک چیز ہو۔ اور آیت فتاب عليكم کے مضمون کو اس آیت کے مضمون کے بعد ذکر کرنا بے فائدہ تکرار ہو گا کیونکہ یہ مقام نعمتوں کی گنتی کا مقام ہے۔ اور اس آیت میں سوائے قبولیت توبہ کے کوئی نعمت مذکور نہیں۔

اور اس مشکل کا جواب دوران تفسیر اشارۃً مذکور ہو چکا کہ معاف کرنے سے مراد دنیا میں جلد آنے والے عذاب میں گرفتار کرنے کو ترک کرنا ہے نہ کہ آخرت کی پکڑ کو ترک کرنا اور یہ معنی کفر کیلئے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ امت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوات والتحیات سب اس نعمت میں شریک تھے۔ اور آنے والی آیت میں بنی اسرائیل کی توبہ کا ذکر ہے۔ اور اس توبہ کی تعلیم کا طریقہ جو کہ اس جرم کے آثار کو بالکل ختم کر دے۔ اور اس کے نقصان سے دنیا اور آخرت میں بے خوف کر دے تو یہ کہاں اور وہ کہاں۔ پھر فرماتا ہے کہ اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی تعلیم کیلئے ہم نے تمہیں ایک نعمت عطا فرمائی جو کہ عظیم اور بہت بڑی ہے۔ اور تمہارے اس قبیح جرم کی وجہ سے ہم نے وہ نعمت تم سے واپس نہ لی۔ پس اس نعمت عظمیٰ کو یاد کرو۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی اور وہ تورات مقدس ہے جو کہ شکر گزاری کے قواعد کی جامع ہے۔ تا کہ شکر گزار نے

والے اس کے قواعد کے مطابق ذمہ داری پوری کریں۔ اور حق شکر ادا کریں۔

وَالْفُرْقَانَ اور ہم نے موسیٰ کو وہ چیز بھی عطا فرمائی جو کہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فرق کا باعث ہو۔ اور وہ شعائر دین اور احکام شرع ہیں کہ انہیں اپنانے سے موافق و مخالف کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں آدمی دین میں داخل ہو گیا۔ اور فلاں آدمی دین سے باہر نکل گیا۔ جیسے ہفتہ کے دن کی تعظیم اور اس دن روزہ رکھنا اور اس دن دنیوی کاموں سے فارغ رہنا۔ اور دین یہودیت کی دوسری رسمیں اور عیدیں اور گوشت چھوڑنا' اونٹ کا دودھ اور گوشت ترک کرنا اور ختنہ' ذبح اور قربانی اور ان چیزوں کی مانند دین اسلام میں (اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے) اذان' نماز' جمعہ' جماعات' عیدین اور ختنہ۔

اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ فرقان سے بھی وہی تورات مراد ہے۔ اور عطف صفت کے جدا ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ ذات ایک ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں کہ رأیت الغیث واللث یعنی رایت الرجل الذی ھو جواد کالغیث و شجاع کا الیث یعنی میں نے بارش اور شیر دیکھا یعنی میں نے ایسا آدمی دیکھا جو کہ بارش کی طرح سخی اور شیر کی طرح بہادر ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فرقان سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں جو کہ کافر و مومن کے درمیان فرق کر دیتے تھے (وباللہ التوفیق: یعنی جو معجزات دیکھ کر اور انہیں کمالات نبوت سمجھ کر مان لیتے تھے وہ ایمان والے اور جو یہ کمالات کر دیکھ کر بھی نہ مانے تو وہ کافر۔ پتہ چلا کہ کمالات نبوت مفید ایمان ہیں۔ اور ان سے منہ پھیرنا عین کفر اعاذ اللہ تعالیٰ۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ) اور ہر صورت میں کتاب اور فرقان دینا جس معنی میں بھی ہو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو درکار نہ تھا وہ تو صرف اس لئے تھا۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ شاید کہ تم راہ پاؤ۔ شکر گزاری کے قانون کے مطابق اور یہ تم پر ایک اور نعمت ہوئی۔ اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی الٰھی انعمت علی النعم السوابغ وامرتنی بشکرھا وانما شکری ایاك نعمة منك فقال اللہ تعالیٰ یا موسیٰ حسبی من عبدی اذ یعلم ان مابه من نعمة فھی منی اے میرے اللہ تو نے مجھ پر وسیع نعمتیں انعام فرمائیں اور مجھے ان کے شکر کا حکم دیا اور

میرا شکر کرنا بھی تو تیری طرف سے نعمت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! مجھے میرے بندے کی طرف سے یہی کافی ہے کہ وہ یہ جان لے کہ اس کے پاس جو بھی نعمت ہے میری طرف سے ہے۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام نے اس مضمون کو اسی طرح بیان فرمایا ہے سبحان من جعل اعتراف العبد بالعجز عن شکرہ شکرہ کما جعل اعترافہ بالعجز عن معرفۃ معرفۃ پاک ہے وہ ذات جس نے اس کے شکر سے بندے کے اعتراف عجز کو اپنا شکر قرار دیا۔ جس طرح اس کی معرفت سے بندے کے اعتراف عجز کو اپنی معرفت قرار دیا اور یہ دونوں حدیثیں تفسیر معالم التنزیل میں اسی آیت کے تحت مذکور ہیں۔ اور اس کتاب اور اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فارق عظیم کی ہدایت میں سے ایک ہدایت بچھڑا پوجنے کے جرم سے توبہ تھی۔ جو کہ قتل نفس کی صورت مقرر کی گئی۔ پس اس عمدہ ہدایت کو یاد کرو۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا۔ مزید شفقت اور غم خواری کے طریقے سے جو کہ آدمی کو اپنی قوم سے ہوتی ہے۔ اور ان کی بیماریوں کے علاج کو اپنی بیماری کے علاج کی طرح سمجھتا ہے۔ اور اگر وہ اپنی اندرونی بیماری سے بے خبر ہوں تو لطف و عنایت کے ساتھ انہیں اس مرض پر خبردار رکرتا ہے۔

يٰقَوْمِ اے میری قوم! قومیت کی شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں تمہاری اندرونی مرض اور اس مرض کے علاج سے آگاہ کروں۔ پس سنو اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ تحقیق تم نے اپنی جانوں پر بچھڑا بنا کر ظلم کیا ہے۔ اس لئے کہ سامری نے جب تمہارے سامنے قبطیوں کے سونے سے بچھڑا بنایا۔ اور تم نے زرد جواہرات سے اس کی مدد کی۔ اور آواز نکالنے اور اس میں زندگی کے آثار کے ظہور کیلئے وہ مٹی جو کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے سم کے نیچے سے زندہ کرنے کی خاصیت پر مشتمل سمجھ کر اٹھائی تھی اور اس میں ڈالی تھی دیدہ دانستہ اسے معبود بنانا اور اس میں معبود کے حلول کا عقیدہ کرنا گویا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ ہم نے اپنے معبود میں حیات ڈالی۔ اور اگرچہ اس بچھڑے کا آواز نکالنا ایک عجیب خلاف عادت کام تھا لیکن جب عادت کے خلاف کوئی عجیب کام اسباب کے ہاتھ لگنے، کسی

کی کاریگری کے معاملہ اور عمل سے صورت پکڑے تو اسے ایک غیبی امر سمجھنا عقل سلیم کے تقاضا کے خلاف ہے۔ اسی لئے جادوگروں' نظر بندوں' مداریوں اور بیہودوں کے عجیب کام کی عقل مندوں کی نظر میں کوئی وقعت اور قدر نہیں ہوتی اس قسم کی گھڑی اور بنائی گئی چیز کو الوہیت سے کیا مناسبت اور معبودیت سے کیا تعلق؟ جو کہ فرعون اور ہامان سے بدرجہا نیچے اور مرتبہ الوہیت سے زیادہ بعید ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ کیا کرنا چاہئے تا کہ یہ اس ظلم کی سزا سے بچ جائیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا

فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ . پس توبہ کرو تمہارے ڈھانچے بنانے والے کی طرف متوجہ ہو کر۔ جو کہ حضرت حق جل شانہ ہے۔ تا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری جانوں کو اس ظلم کی نجاست سے پاک کر دے کیونکہ اس ظلم نے تمہاری جانوں میں رسوخ حاصل کر لیا ہے۔ اور اس بچھڑے کی محبت کی زیادتی کی وجہ سے تمہاری جانیں آفت رسیدہ ہیں۔ اور باری اصل میں قلم تراشنے والے کو کہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے یہاں اس اسم کو اختیار کرنا اسی لئے ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے قالب تراش یعنی ڈھانچہ بنانے والا ہونے کے مقابلہ اپنے آپ کو خدا کا قالب تراش بنا لیا تھا۔ اور الٰی بارئکم کا لفظ بڑھانا یہ بتانے کیلئے ہے کہ یہ توبہ ریا کے طریقے سے نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ وہی ہے جو کہ دل کی گہرائی سے ہو۔ اور اگر توبہ کا اظہار صرف زبان سے کیا جائے تو وہ بندوں کی طرف توبہ ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ . پس اپنے آپ کو قتل کرو۔ اور اپنے آپ خود کو قتل کے لئے پیش کرو اور اپنی جانوں کو اپنے جسموں سے جدا کرو۔ تا کہ اس جرم کا کفارہ ہو سکے کیونکہ تم نے جھوٹ موٹ جان کر اپنے گھڑے ہوئے جسم میں ڈالا اور اسے معبود بنا لیا۔ علمائے کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جسم کو قتل میں دینا ان کی عین توبہ تھی یا کہ توبہ کا بقیہ۔ جس طرح کہ شریعت میں جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے حق میں ہے کہ اس کی توبہ مقبول نہیں مگر اس طرح کہ اپنے آپ کو مقتول کے وارثوں کے ہاتھوں میں سپرد کر دے تا کہ اگر وہ

چاہیں تو بخش دیں اور اگر چاہیں تو قتل کر دیں۔

اور اس طرح اپنے آپ کو ہلاکت کے مقام میں ڈالنا اگر چہ ظاہری عقل کے اعتبار سے بہت قبیح اور برا لگتا ہے۔ لیکن

ذَالِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ یعنی یہ عظیم کام تمہارے لئے تمہارے قالب تراش کے نزدیک بہتر ہے۔ کیونکہ یہ کام اس کے ساتھ تمہاری کامل محبت پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی راہ میں تم نے اپنی جان خرچ کر دی۔ نیز اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اس کی قالب تراشی کو تم تسلیم کرتے ہو۔ اور اس کے جان پیدا کرنے کی بھی تصدیق کرتے ہو اس کے حکم سے اس کی امانت تم نے اسے واپس کر دی۔ اور اس محبت اور اطاعت کی وجہ سے تم آخرت کے دائمی عذاب سے بچ گئے اور دنیا کی تکلیف اگر چہ زیادہ سخت ہوتی ہے۔ لیکن آخرت کے عذاب کے مقابلے میں ہلکی ہے۔ بلکہ ختم ہونے والے کو نہ ختم ہونے والے سے کوئی نسبت نہیں۔ اور موت لازماً آنے والی ہے۔ پس قتل کی شدت برداشت کرنے میں کوئی تکلیف متصور نہیں سوائے تقدیم و تاخیر کے اور اس کا بھی وہم ہے۔ اور بس اس لئے کہ جس طرح موت مقدر ہے موت کا وقت بھی مقدر ہے حقیقت میں کوئی۔ پس و پیش نہیں۔

بنی اسرائیل کی توبہ کے لئے قتل کی کیفیت

اور جب بنی اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے توبہ کا طریقہ سن کر قبول کر لیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پختہ عہد و پیمان لیا کہ بچھڑا پوجنے والے اپنے گھروں سے ہتھیار اور خود اور زرہ کے بغیر باہر آ کر زانوں ٹیک کر بیٹھ جائیں۔ اور اپنی پشتوں کو اپنے زانوؤں سے باندھ لیں اور اپنے سروں کو زانوؤں پر رکھیں اور تلوار کا زخم سر پر لیں۔ زانو بند نہ کھولیں۔ جسم نہ ہلائیں۔ ہاتھ پاؤں کے ساتھ مدافعت نہ کریں۔ اور جس نے ان چیزوں میں سے کسی چیز سے منہ پھیرا اس کی توبہ قبول نہیں ہے اس کے بعد دوسرے دن جب صبح ہوئی حضرت ہارون علیہ السلام کو ان بارہ ہزار بنی اسرائیلیوں سمیت فرمایا جنہوں نے بچھڑا نہیں پوجا تھا اور اس قبیح فعل کے انکار میں حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھی رہے تھے کہ ننگی تلواریں ہاتھوں میں لے کر جاؤ اور انہیں قتل کرنا شروع کر دو۔ اور خود ایک اونچی جگہ پر

کھڑے ہو کر فرما رہے تھے اے گروہ بنی اسرائیل تحقیق تمہارے بھائی تلواریں کھینچے ہوئے تمہارے پاس آئے ہیں تمہیں قتل کرنا چاہتے ہیں تو اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔

اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے بنی اسرائیل کے تین گروہوں میں سے دو کو یہ حکم ہوا تھا کہ ایک دوسرے سے کھینچا تانی کریں جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی انہیں حکم تھا کہ قتل ہوں۔ اور جنہوں نے نہ بچھڑا پوجا اور نہ ہی اس پر انکار کیا انہیں حکم تھا کہ قتل کریں۔ تا کہ انکار کا چھوڑنا جو ان سے واقع ہوا اس سے توبہ حاصل ہو جائے۔ اور جنہوں نے بچھڑا نہیں پوجا تھا اور اس برے فعل پر انکار بھی کرتے تھے اس توبہ میں شریک نہ ہوئے کیونکہ وہ اس جرم کی توبہ کے محتاج نہ تھے۔

اور روایات میں واقع ہوا کہ جب قتل کرنے والوں نے دیکھا کہ جس گروہ کو ہم قتل کرنے کے درپے ہیں۔ ان میں سے بعض ہمارے بھائی' بیٹے' بھتیجے' بھانجے' دوسرے رشتہ دار اور دوست ہیں تو قتل کرنے میں۔ پس و پیش کرتے تھے۔ اور جبلی شفقت کی وجہ سے ان کے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا سیاہ دھواں بھیجا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور جبلی رحمت انہیں مانع نہ ہوئی یہاں تک کہ صبح سے لے کر شام تک ۷۰ ہزار آدمی قتل ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل کی عورتیں اور بچے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضور فریاد لے کر آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عاجزی کے ساتھ ننگے سر دعا مانگی حکم ہوا کہ مقتولوں اور غیر مقتولوں سب کی توبہ قبول ہوئی جو قتل ہوا مرتبہ شہادت پا گیا۔ اور جو زندہ بچ گیا گناہ کی نجاست سے پاک ہو گیا۔

یہاں جاننا چاہئے کہ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا لفظ بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود قتل کریں۔ جیسا کہ بعض مفسرین اس آیت کے ظاہر کی طرف گئے ہیں۔ لیکن اس واقعہ کی سب روایات اس ظاہر کے خلاف ہیں۔ پس یہاں کلام کی حقیقت مراد نہیں ہے یا اسناد مجازی پر محمول ہے کہ قتل کی نسبت ممکن سب کی طرف فرمائی ہے یا اَنْفُسَكُمْ سے مراد اپنے ہم جنس مراد ہیں۔ اور اس لفظ کا اس مجاز پر محمول کرنا روایات کی دلالت سے مقرر ہے۔ بہر حال بنی اسرائیل اس مشکل توبہ کو بجا لائے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَتَابَ عَلَيْكُمْ یعنی جب تم نے یہ کام کر لیا تو تمہاری توبہ قبول ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ

نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اگرچہ تمہارا گناہ فرعونیوں کے گناہ سے زیادہ سخت تھا اس لئے کہ تم نے ایمان کے بعد کفر کیا تھا۔

اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ تحقیق اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمانے میں مبالغہ فرماتا ہے یہاں تک کہ اس غیر موزوں عمل پر جبکہ اس سے کم تر پر فرعونیوں کو سزا دی تھی بھی توبہ قبول فرمائی اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر بندہ کسی گناہ سے سچے دل سے توبہ اور ندامت کرتا ہے حق تعالیٰ اسے قبول فرمالیتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک دن میں ستر مرتبہ اس گناہ کا ارتکاب کرے۔ یہ سب اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ الرَّحِیْمُ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے کہ ایک گھڑی کی تکلیف برداشت کرنے پر ابدی عزت عنایت فرما دیتا ہے۔

اور بنی اسرائیل کی یہ توبہ ایک عمدہ ہدایت تھی جو کہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہوئی۔ اور ان کے پرانے لوگوں نے باوجودیکہ اس میں بہت مشقت تھی اسے پوری خوشدلی سے قبول کیا۔ جبکہ بنی اسرائیل کا وہ گروہ جو کہ اس کلام کا مخاطب ہے۔ اور حضور علیہ السلام کے ہمعصر صرف زبان سے بھی توبہ نہیں کرتے۔ اور اس شریعت کی آسان عبادات کو کثرت فضائل کے باوجود قبول نہیں کرتے۔ اور یہ بھی کفران نعمت کے سبب سے ہے۔ اور اس آیت میں تمام امت کو خبردار کرنا مراد ہے۔ تا کہ وہ توبہ اور ندامت سے جی نہ چرائیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت نے اس توبہ میں باوجود انتہائی مشقت کے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ اور انکار نہ کیا۔ اور تم سے کہ ہم نے سوائے ندامت کے کچھ نہیں مانگا توبہ سے فارغ رہنا بہت بعید ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قاہر آیات کو دیکھنے اور ان متواتر سزاؤں کو چکھنے کے باوجود حق شکر ادا نہ کیا۔ بلکہ پھر اپنی انہیں بے ادبیوں اور سختیوں کے بھنور میں پھنس گئے اور ان میں سے سب سے زیادہ سخت بے ادبی یہ تھی کہ انہوں نے کبھی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت اور ان کے فرقان پر جو کہ ان کے پاس پہنچا تھا اکتفا نہ کیا یہاں تک کہ انہوں نے چاہا کہ ہم ان تمام احکام کو بغیر واسطہ کے جناب الٰہی سے سنیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم فرداً فرداً سب یہ چاہتے ہو یا تم میں سے بعض نیک لوگ اگر اپنے کان کی وساطت کے بغیر سن کر آئیں تو یقین کر لو گے؟ انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے صالحین کی

کثیر جماعت جن کی خبر تواتر کی حد کو پہنچ جائے۔ اور عقل کے نزدیک ان کا جھوٹ پر اجتماع محال ہو۔ اور اسے بلا واسطہ دربار خداوندی سے سن کر آئیں تو ہم لازماً یقین کر لیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنے قابل اعتبار اور قابل اعتماد لوگوں کی جماعت چن کر میرے ہمراہ کر دو۔ انہوں نے اس کام کیلئے اپنے صالحین میں سے ستر برگزیدہ لوگوں کو چن کر پیش کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ تم سب غسل کرو اور اپنے تمام گناہوں سے انہیں توبہ کرو کہ آئندہ کیلئے نصیحت ہو جائے۔ اور تین دن روزہ رکھو اور تسبیح و تہلیل میں مشغول رہو۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق عمل کیا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں ہمراہ لے کر کوہ طور کی طرف روانہ ہوئے۔ اور دربار خداوندی میں عرض کی۔ بار خدایا بندوں میں سے یہ نیک گروہ تیرا کلام سننے کے شوق سے آئے ہیں۔ ان سے کلام فرما۔ اللہ تعالیٰ نے عرض قبول فرمائی اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے نزدیک پہنچے نور کا ایک ستون سفید پتلے ٹھنڈے بادل کی شکل میں ظاہر ہوا اور آہستہ آہستہ وسیع اور فراخ ہوتا گیا۔ اور اس نے تمام پہاڑ کو گھیرے میں لے لیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس نور میں چھپ گئے اور آپ نے بنی اسرائیل کی جماعت کو پہاڑ کے نیچے کھڑا کر دیا۔ اور فرمایا ہاں اب کلام الٰہی سنو۔ وہ اپنے کانوں سے بلا شبہ سن رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہو رہا تھا اور امر اور نہی آ رہے تھے۔ انہوں نے فریاد کی کہ اے موسیٰ علیہ السلام! یہ سب خطاب آپ سے ہے ہمیں بھی اس عزت سے کوئی حصہ ملے۔ اچانک نور کی ایک چمک ان کی طرف جلوہ فرما ہوئی۔ اور یہ کلام نور کی اس چمک سے ان کے کانوں میں پہنچا۔ انی انا اللہ لا الہ الا انا ذوبکتہ اخرجتکم من ارض مصر فاعبدون ولا تعبدوا غیری یعنی تحقیق میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ مکہ والا میں نے تمہیں مصر سے نکالا۔ پس میری عبادت کرو۔ اور میرے غیر کی پوجا مت کرو۔ اس کے بعد وہ کلام منقطع ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس نور میں چھپے رہے جب وہ نور کا بادل کھل گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام باہر آئے اس مذکور جماعت سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام تم نے سنا؟ اور اس کے احکام سمجھ گئے؟ انہوں نے ایک فضول شبہ سے دلیل لی اور کہا کہ ہم کس طرح جانیں کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کا کلام تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی شیطان یا جن

نے اس بادل میں آواز دی ہو۔ پس یہ عقیدہ کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کی کلام ہے ہمیں چاہئے کہ صرف آپ کی تقلید اور آپ کے کہنے پر رکھیں اور اگر ہم آپ کے کہنے پر یقین کرتے تو شروع ہی سے یقین کر لیتے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی صورت دکھا اور ہم اس صورت سے آواز سنیں اور یقین کریں کہ یہ آواز کسی شیطان یا جن کی آواز نہیں ہے۔ پس یہ بے ادبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بچھڑے کی پوجا سے زیادہ واقع ہوئی۔ اور اس بے ادبی کی وجہ سے تمہارے اسلاف ایسی سزا کے مستحق ہو گئے جو کہ قتل سے بھی زیادہ ہو۔ اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے تمہارے اس جرم سے بھی درگزر فرمائی اور نازل ہونے والے عذاب کو پہنچنے اور لاحق ہونے کے بعد اٹھالیا اور اسی قصہ کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يَا مُوْسٰى اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ تم نے کہا اے موسیٰ علیہ السلام

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ ہم آپ کے کہے پر ہرگز یقین نہیں کریں گے کہ جو کچھ ہم سنتے ہیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً یہاں تک کہ ہم خدا کو صورت و شکل میں دیکھیں۔ جس طرح کہ بلند آواز کو کانوں سے سنتے ہیں نہ کہ جیسے درویش اور عارف لوگ شہود و مشاہدہ میں پاتے اور دیکھتے ہیں کہ ہم اسے خیال کی کاریگری سمجھتے ہیں۔ اور اس پر ہمیں کوئی اعتماد نہیں۔ اور نہ اس طرح کہ جیسے آخرت میں وعدہ کیا گیا ہے کہ کیفیت کے بغیر دیدار میسر ہوگا اس لئے کہ وہ بلا کیف دیدار ہماری ناقص عقلوں کے مطابق دیدار نہیں۔ دیدار وہی ہے کہ عیاں طور پر جہتوں میں محدود صورت اور شکل میں ہو جس طرح کہ جہری آواز قوت سامعہ پر ظاہر ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس بے ادبی کی وجہ سے تمہارے اسلاف پر دو وجہ سے غضب فرمایا پہلی وجہ یہ کہ انہوں نے کہا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے کہے پر یقین نہیں کریں گے۔ حالانکہ معجزات کے ساتھ تصدیق کئے گئے رسول علیہ السلام کا یقین نہ کرنا کفر کی جڑ ہے خصوصاً حاضری اور کلام سننے کے مقام پر۔ دوسری وجہ یہ کہ حتی نری اللہ اور جھرۃ کہا اگر یوں کہتے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی زیارت کی آرزو رکھتے ہیں ہمیں اپنا دیدار کرائے تو محل غضب نہ ہوتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت دنیا میں محال نہیں۔ اور اس کی طلب پر غضب

اور عتاب نہیں اس کا جواب اسی قدر تھا کہ تم اس نعمت کے قابل نہیں ہو۔ اور آخرت میں جب آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک ہو گے تو دیکھ لو گے۔ کیونکہ آخرت میں دیدار عام مومنین کا حصہ ہے۔ اور دنیا میں دیدار خاصان درگاہ خداوندی بلکہ اخص الخواص سے مخصوص ہے۔ جیسے حضور پیغمبر آخرالزمان علیہ الف الف صلوۃ والف الف سلام لیکن انہوں نے دنیا میں شکل وصورت دیکھنے کی درخواست کی۔ اور اسی وجہ سے محل غضب ہوئے۔

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ پس تمہیں صاعقہ نے پکڑ لیا اور وہ ایسی آگ ہے جو کہ آسمان کی طرف سے آتی ہے۔ اور غالب طور پر وہ بادل میں ہوتی ہے۔ اور جب وہ نور کی کودنے والی بجلی جو کہ اس سفید بادل میں چمکتی تھی غضب کے ساتھ ان پر گری اور ان کے بدنوں کے مساموں سے ان کے بدن میں داخل ہو گئی۔ اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو اس نے صاعقہ کے ساتھ پوری مناسبت اور مشابہت پیدا کر لی اسی جہت سے اسے صاعقہ فرمایا گیا۔

اور بعض مفسرین نے صاعقہ کو صعق کی مصدر قرار دیا ہے۔ جیسے کاذبہ عافیہ اور بیہوشی اور غشی کے معنوں میں لیا ہے۔ لیکن صحیح روایات میں ثابت ہے کہ نور کی وہی کودنے والی بجلی ان پر پڑی اور انہیں بے حس وحرکت کر دیا تو اگر صاعقہ بے ہوشی اور غشی بھی ہو تو اسی کودنے والی نورانی بجلی کا اثر تھا جو کہ صاعقہ آسمانی کے ساتھ مشابہت رکھتی تھی۔ بلکہ آسمانی بجلی سے زیادہ قوی اور سخت تھی کیونکہ گرنے والی متعارف بجلی ایک ہی دفعہ اتنی کثیر جماعت کو موت کے گھاٹ نہیں اتارتی غالباً دو یا تین آدمیوں کو قتل کرتی ہے۔ نیز اس بجلی سے بھاگ کر چھت اور سائے کے نیچے یا مضبوط مکان کے اندر جانا ممکن ہے۔ جبکہ اس کودنے والی برق سے جس کی حرکت اختیاری تھی نہ کہ طبعی تمہیں بھاگنا ممکن نہ ہوا چنانچہ اس نے تمہیں پکڑ لیا۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اور تم اس صاعقہ کا آنا اور اپنی جماعت کے بعض لوگوں کا اس کی وجہ سے ہلاک ہونا دیکھ رہے تھے۔ اور تم اس سے ہرگز فرار نہ ہو سکے۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس واقعہ کو یوں دیکھا تو بارگاہ الٰہی میں عاجزی اور زاری شروع کر دی۔ اور عرض کی بارخدایا میں بنی اسرائیل کے پاس کس منہ سے جاؤں گا کیونکہ میں ان کے بڑوں اور صالحین کو گواہ بنانے کیلئے لایا تھا وہ سب ہلاک ہو گئے بلکہ اس کے بعد بنی اسرائیل مجھے جھوٹا کہیں گے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا بہتان باندھتا تھا [illegible]

جماعت کو حیلے اور مکر کے ساتھ ہلاک کر کے آ گیا۔ تا کہ اپنا جھوٹ ظاہر ہونے کی وجہ سے شرمندہ نہ ہو۔ پس ان سے رونما ہونے والی گستاخیوں کے باوجود انہیں معاف فرما اور انہیں نئے سرے سے زندہ فرما۔ پس ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی۔

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ پھر ہم نے تمہیں زندہ فرمایا مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ تمہاری حقیقی موت کے بعد جو کہ غشی اور سکتہ کے قبیل سے نہ تھی۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ شاید کہ تم آئندہ اس درگزر اور موت کے بعد زندہ کرنے کی نعمت کا شکریہ ادا کرو اور یہ نجات دینا اس سابقہ نجات سے زیادہ بڑی نعمت ہے جو کہ فرعونیوں کے ہاتھ سے اور بچھڑا پوجنے کے جرم اور سزا سے واقع ہوئی تھی۔

علمائے تفسیر کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ بچھڑا پوجنے سے پہلے وقوع میں آیا یا اس کے بعد۔ ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ گوسالہ پرستی سے پہلے تھا۔ اس دلیل سے جو کہ سورہ نسا میں واقع ہے یسئلك اهل الكتاب ان تنزل عليهم كتابًا من السمآء فقد سئلوا موسىٰ اكبر من ذلك فقالوا ارنا الله جهرة فاخذتهم الصاعقه بظلهم ثم اتخذوا العجل من بعد ما جاء تهم البينات (آیت ۱۵۳) اور اکثر مفسرین اور اہل قصص نے کہا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی کے بعد کا ہے۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جماعت کو گوسالہ پرستی کا عذر پیش کرنے کیلئے کوہ طور پر لے گئے تھے۔ وہ گناہ سے بھی بدتر عذر عمل میں لائے۔ ان کی دلیل اس سورت اور سورۃ اعراف اور دیگر سورتوں میں اس قصہ کا بیان ہے۔ کیونکہ واقعات کے ذکر کی ترتیب میں غالب طور پر ان کے وقوع زمانی کی ترتیب رکھی گئی ہے۔ اور سورت نساء میں ثم بیان کی ترتیب کا فائدہ دینے اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی دینے کیلئے۔ جیسا کہ شاعر کے قول میں ان من ساد ثم ساد ابوه ثم قد ساد قبل ذالك جده مستعمل ہوا اور کلام الٰہی میں بھی بہت رائج ہے۔

اور یہاں جاننا چاہئے کہ آخرت میں یا دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے منکر اس آیت سے دلیل لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہوتی تو اس کا سوال اتنے غضب کا موجب نہ ہوتا لیکن دوران تفسیر معلوم ہو چکا کہ غضب کا موجب دو چیزیں تھیں

اول لَنْ نُؤْمِنَ لَکَ کے الفاظ جو کہ صریح کفر ہے۔ اور دوسری جہرۃ کی قید جو کہ محض سرکشی اور بے ادبی ہے۔ اور صرف رؤیت کا سوال محل غضب نہیں کہ ان منکرین کا دلیل لینا درست ہو۔ بلکہ جب دوسری بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے رؤیت طلب کرنے کے لئے عرض کی ربّ ارنی انظر الیك ان کے جواب میں سوائے دنیوی بنیاد کے اس کو برداشت کرنے سے عاجز ہونے کے کچھ بھی ارشاد نہ فرمایا۔ اور یہی فرمایا: لن ترانی ولکن انظر الی اتجبل فان استقر مکانه فسوف ترانی

قصہ مختصر بنی اسرائیل نے اس نعمت کو دیکھنے کے باوجود شکر گزاری نہ کی جس طرح کہ انہوں نے دوسری نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کریمانہ ان کی امداد اور انہیں نجات دینے سے حضرت موسیٰ اور ہارون علیٰ نبینا وعلیہما السلام کی وجہ سے دست بردار نہ ہوئی۔ بلکہ ان تمام ناشکریوں کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی عنایات ان پر وارد ہوتی ہیں۔ خصوصاً جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سب امور سے فارغ ہو کر بنی اسرائیل کے لشکر میں پہنچے اور انہیں حکم الٰہی پہنچایا کہ تمہیں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سرزمین شام کو جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا مدفن ہے۔ اور بیت المقدس بھی وہاں واقع ہے عمالقہ کے جابروں سے چھڑاؤ اور ان کے ساتھ جہاد کرو اور اسی سرزمین میں وطن بناؤ اور مصر کو چھوڑ دو۔ اور اس حکم میں راز یہ تھا کہ بنی اسرائیل جب تک مصر میں تھے فرعون اور فرعونیوں کی زندگی کو باغات' گلزاروں' کھیتیوں' وافر خزانوں' جاری نہروں' عورتوں اور گویوں کے ساتھ ناز و نعمت میں دیکھتے تھے۔ اور جب فرعون اور فرعونی ہلاک ہو گئے۔ اور انہیں اس ملک پر مکمل قبضہ حاصل ہو گیا اس بات کا گمان تھا کہ یہ بھی اس سرزمین عیش میں عیش اور آسودگی کی طرف مائل ہو کر اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے خلاف جہاد اور لڑائی اور ریاضات وعبادات سے جی چرائیں گے۔ اور کاہلی کا شکار ہو جائیں ۔ر خاص و عام کے نزدیک یہ بات ظاہر ہو جائے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علی نبینا علیہما السلام فرعون کے ساتھ جو پرخاش رکھتے تھے اس سے یہ منظور نہ تھا کہ اس کے ملک پر خود قابض ہو جائیں۔ اور دنیوی مرتبہ اور عزت حاصل کریں جس طرح کہ فرعون کو بھی خیال دامنگیر ہو چکا تھا اور بار بار کہتا تھا ان هذان لساحران یریدان ان یخرجاکم من ارضکم بسحرهما (طٰہٰ

آیت ۶۳) اور کہتا تھا کہ ان هذا لساحر علیم یرید ان یخرجکم من ارضکم بسحرہ (الشعراء، آیت ۳۵) پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ انہیں فرعون کے ملک اور مال سے کسی طرح کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور ان کی دنیا اور متاع دنیا سے بے رغبتی ظاہر ہو جائے۔ اور ان کے بعد ان کے خلفاء کو بھی یہی مقصد منظور ہو اور لوگ انہیں دنیا طلب کرنے والوں کی طرح حیلہ باز خیال نہ کریں۔ اور عام بنی اسرائیل چونکہ دنیا کی محبت میں غرق تھے۔ اور زمین مصر سے باہر آنا جو کہ ایک لقمہ تر تھا ان پر بہت ناگوار اور بھاری معلوم ہوتا تھا پہلے تو انہوں نے اس حکم کو ہٹانے کی کوشش کی دوسرے جب چارو ناچار مجبور ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ہمراہ روانہ ہوئے تو راستہ میں جہاں بھی ان پر سختی اور دشواری پیش آتی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکایت اور زبان درازی کے ساتھ تنگ کرتے تھے۔

ان میں سے یہ کہ جب بے سایہ اور سبزہ سے خالی جنگل میں پڑے تو سورج کی گرمی سے شکایت شروع کر دی۔ اور چونکہ غلہ اور کھانے کی چیزیں ہمراہ نہ تھیں تو بھوک سے بے تاب ہو گئے۔ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان دونوں تکلیفوں سے نجات عطا فرمائی اور عجیب خوارق رونما ہوئے چنانچہ انہیں نعمتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ اور ہم نے سائبان بنا دیا تم پر سفید پتلے ٹھنڈے بادل کو۔ سورج کی گرمی سے بچانے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے جبکہ تم نے ان کے سامنے گرمی کی شکایت کی۔ اور یہ نعمت گزشتہ نعمتوں کی نسبت زیادہ عمدہ تھی کیونکہ یہ نعمت حالت غضب میں معرض وجود میں آئی کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کے حکم کو جو کہ عمالقہ سے جنگ اور لڑائی کی بابت تھا ٹالنے کی وجہ اس کے غضب کا مورد بن گئے تھے تو یہ انتقام اور سزا کا مقام تھا۔ اس مقام پر یہ نعمت عطا فرمانا بہت زیادہ شکر کرنے کا متقاضی تھا۔

غمام کی حقیقت

اور وہ جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ بادل معروف بادل کی جنس سے نہ تھا بلکہ اس بادل سے زیادہ ٹھنڈا اور زیادہ پاکیزہ تھا اور یہ وہی بادل ہے جس میں بدر کے دن ملائکہ اترے تھے۔ اور وہ جو مجاہد سے منقول ہے کہ یہ وہ بادل ہے جس

میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جلوہ فرما ہوگا۔ اور معروف بادل نہیں۔ پس اس کا معنی یہ ہے کہ بادل کا ہونا دو طریقوں سے ہے۔ پہلا مشہور طبعی طریقہ کہ بخارات' غبار' دھواں اور ان کا کثیف ہونا بادل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور دوسرا طریقہ غیر طبعی خلاف عادت کہ عالم مثال سے عالم شہادت میں کسی پر حکم کے اترنے سے فرشتوں کی خدمت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور وہ بادل جو کہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل کا سائبان تھا دوسری قسم سے تھا نہ کہ پہلی قسم سے۔ اور مراد یہ نہیں کہ وہ بادل بعینہٖ قیامت کے دن کا بادل تھا! • زبدر کا بادل اور اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

اور مفسرین اور اہل قصص نے لکھا کہ بادل کو سایہ بان بنانے کے ساتھ اس سفر اور پریشانی میں ان پر دیگر نعمتیں بھی اتاری گئیں۔ ان میں یہ کہ رات کے وقت نور کا ایک ستون ان کے لشکر میں کھڑا ہو جاتا تھا جس کی روشنی میں وہ کام کاج کرتے اور آمد و رفت کرتے اور ان میں سے یہ کہ ان کے کپڑے پرانے نہیں ہوتے تھے۔ اور میل نہیں لگتی تھی اور ان میں سے یہ کہ ان کے بال اور ناخن لمبے نہیں ہوتے تھے کہ انہیں کاٹنے یا مونڈنے کی ضرورت پیش آئے۔ اور ان میں سے یہ کہ اس سفر کے دوران جو بچہ پیدا ہوتا تھا اس کے جسم پر آدمی کے ناخن کی طرح کپڑا بھی پیدا ہوتا اور اس بچے کے طول و عرض کے مطابق طول و عرض پکڑتا تھا گویا ناخن اور بال کا مادہ اس طرف چلتا تھا۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ اور ہم نے تم پر آسمان کی طرف سے 'من' اتارا۔ تمہیں بھوک کی تکلیف سے نجات دینے کے لئے جو کہ صبح صادق کے طلوع سے لے کر طلوع آفتاب تک برف کی طرح برستا تھا۔ اور لشکر کے لوگ اسے چادروں اور کپڑوں پر لیتے تھے۔ اور چن لیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہر آدمی کیلئے ایک صاع کی مقدار جمع ہوتا تھا جو کہ اس ملک کے چار سیر ہوتے ہیں۔ اور سارا دن اسے چینی اور شکر کی طرح کھاتے تھے۔ چھ دن تک مسلسل برستا تھا بلکہ جمع کرنے کے دن اتنا برستا کہ ہر آدمی کو دو دن کیلئے کافی ہوتا۔ اور ہفتہ کے دن بالکل نہیں برستا تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لشکریوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جمعۃ المبارک کے دن دوگنا برسے گا تاکہ ہفتہ کے دن کیلئے بھی ذخیرہ کرلو۔ کیونکہ ہفتہ کے دن نہیں برسے گا اور ایک دن سے زیادہ ذخیرہ نہ کرنا۔

من کی حقیقت اور خصوصیت

محقق حکماء کے نزدیک من کی حقیقت یہ ہے کہ بخار اور دھواں جب زمین سے جدا جدا آسمان کی طرف جاتے ہیں تو بادل' برق' رعد' صواعق' شہاب اور دمدار ستارے وجود میں آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل اپنے مقام پر کی گئی ہے۔ اور سورت فاتحہ کی تفسیر میں بھی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کی تفسیر میں اس کا کچھ تعارف گزرا ہے۔ اور جب بخارات اور دھواں باہم مرکب ہو کر زمین سے آسمان کی طرف جاتے ہیں تو اگر دھواں لطیف ہو۔ اور رطوبت غالب ہو جائے۔ اور حرارت اعتدال کے ساتھ عمل کرے تو اس میں ایک حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور برف کی طرح منعکس ہو کر گرتے ہیں۔ اور اسے ترنجبین کہتے ہیں (ایک دوا جو قدرتی شکر ہے اور شبنم کی طرح گرتی ہے) اور اگر خشکی غالب آجائے۔ اور حرارت اعتدال کے ساتھ عمل کرے اسے خشک انجبین کہتے ہیں۔ اور اگر رطوبت اور یبوست دونوں معتدل ہوں۔ اور حرارت کا عمل بھی اعتدال سے ہو تو اسے شیر خشک اور شیر خشت کہتے ہیں۔ اور اگر بخارات اور دھواں دونوں لطیف الجوہر ہوں۔ اور معتدل حرارت ان میں اثر کرے تو اسے من کہتے ہیں۔ اور اگر حرارت مغلوب یا معدوم ہو اسے طلول فاسدہ یعنی معروف شبنم کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا بالفعل کوئی ذائقہ نہیں۔

اطباء کی اصطلاح میں من کو اس سے عام معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر وہ شبنم جو کسی درخت یا پتھر پر پڑے اور اس کا کچھ ذائقہ اور مزاج ہو تو اسے من میں داخل جانتے ہیں۔ جیسے ترنجبین' شیر خشت' گزانگبین اور بیدانگبین وغیرہ۔ اور من جس کی حقیقت ذکر کی گئی اس کی خصوصیت یہ ہے کہ پہلے درجہ میں گرم ہے۔ اور رطوبت اور یبوست میں معتدل ہے۔ سینہ کیلئے اچھی ہے۔ اور پھیپھڑے کی رطوبت کو زائل کرتی ہے۔ اور اس کی سختی کو نرم کرتی ہے کھانسی کو جو کہ رطوبت سے ہو زائل کرتی ہے۔ اور معدہ کی سستی میں مفید ہے۔ اور طبیعت میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ اور صفرا کو فائدہ پہنچاتی ہے جب پئیں اور جب پیٹ پر لیپ کریں۔ اور اس جہت سے اکثر سفر کرنے والوں کیلئے بہت مفید ہے جو کہ مختلف قسم کے پانی پیتے ہیں۔ اور جب چھوٹی مقدار کے برابر اس سے نسوار لیں تو دماغ کو پاک کرے۔

اور غلیظ ہواؤں کو اس سے خارج کرے اسی وجہ سے وسوسہ والوں' مالیخولیا والوں اور وہموں کیلئے مفید ہے۔ اور اسی نکتہ کیلئے اس قسم کی چیز کو بنی اسرائیل پر اتارنا منظور ہوا تا کہ ان کے دماغ صاف ہو جائیں۔ اور لغو وہمی شبہات ان کے دماغ میں جگہ نہ پکڑیں۔

اور عرف میں من کو اس سے عام معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ پس جو چیز کہ تکلیف اور مشقت کے بغیر میسر آئے۔ اور اسے کاشت کرنے' کاٹنے' پانی دینے' گاہنے' پکانے اور گوندھنے کی مشقت نہ ہو اسے من کہتے ہیں۔ کیونکہ هو ما من الله تعالٰی به علی عباده وہ ان نعمتوں سے ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا۔ اور اسی معنی میں وہ حدیث پاک ہے جو صحیحین اور حدیث پاک کی دوسری معتبر کتابوں میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ الکماة من المن وماء ها شفاء للعین یعنی کھمبی من سے ہے۔ اور اس کا پانی آنکھوں کیلئے شفا ہے اسے بنات الرعد کہتے ہیں۔ اور ہندی میں کھمبی یہ بھی من کی جنس سے ہے۔ یعنی بنی بنائی تمہارے لئے مہیا کی گئی بغیر اس کے کہ تم نے اسے کاشت کیا ہو یا پرورش کیا ہو۔ اور من کا یہ معنی کئی چیزوں کو شامل ہے۔ جیسے جنگلی بیر اور خود اگنے والا غلہ جیسے چینا وغیرہ اور حدیث سے مراد یہ نہیں کہ کھمبی وغیرہ بنی اسرائیل کے من کی جنس سے ہیں۔ کیونکہ صحیح روایات میں ثابت ہے کہ بنی اسرائیل کا من وہی حقیقی من تھا۔ جیسا کہ تورات وغیرہ کے ترجموں میں اس کی شکل اور چہرے کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس شکایت لائے کہ ہر روز اس میٹھی چیز کو کھا کھا کر ہمارا ذائقہ خراب ہو گیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ ذائقہ بدلیں۔ اللہ تعالیٰ کے دربار سے نمکین چیز طلب کرنا چاہئے بلکہ بعض ان کے بعض شوخ طبعوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہمیں اس کی حلاوت نے مار دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر بارگاہ خداوندی میں دعا کی حق تعالیٰ نے قبول فرمائی چنانچہ اس نعمت کی طرف اشارہ فرمایا۔

حقیقت سلویٰ اور اس کے خواص کا بیان

وَالسَّلْوٰی اور ہم نے تم پر سلویٰ بھی اتارا۔ اور سلویٰ ایک جانور کا نام ہے۔ جسے حباری کے وزن پر سمانی بھی کہتے ہیں۔ اور اس جانور کا زیادہ تر مسکن مصر اور حبشہ کے

اطراف میں دریائے شور کے ساحلی علاقے ہیں۔ اور اس جانور کو اتارنے کا طریقہ یہ تھا کہ جب دن کا آخری حصہ ہوتا تو جنوب کی ہوا مسلط کی جاتی جو کہ ان جانوروں کو دریا کے کنارے سے چلا کر گروہ در گروہ بنی اسرائیل کے لشکر میں ڈال دیتی اور بنی اسرائیل اس جانور کو ہاتھ' چادر اور لکڑی وغیرہ سے شکار کر کے ذبح کرتے تھے۔ اور ہر شخص اپنے اور اپنے اہل وعیال کی کفایت کے مطابق لے لیتا۔ اور ذخیرہ کا حکم نہ تھا سوائے جمعہ کے دن کے کہ ہفتہ کیلئے ذخیرہ کر لیتے اور ہفتہ کے دن اس جانور کا آنا بھی رک جاتا اور بنی اسرائیل کے بعض لالچیوں نے ہفتہ کے علاوہ گوشت کا ذخیرہ کر لیا وہ گوشت بدبودار اور خراب ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت سے پہلے ذخیرہ کرنے سے گوشت بدبودار اور خراب نہیں ہوتا تھا اس وقت سے یہ سلسلہ جاری ہوا چنانچہ حدیث شریف میں اس معنی کا اشارہ واقع ہوا جہاں فرمایا ہے **لولا حواء لم تخن انثی زوجها الدهر و لولا بنی اسرائیل لم یخنز اللحم** اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت کبھی بھی اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ اور اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی خراب نہ ہوتا۔

اور اہل طب نے سمانی کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ ایک جانور ہے جو کہ دریا سے اٹھتا ہے۔ اور اسے قتیل الرعد بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ جب رعد کی آواز سنتا ہے۔ تو مر جاتا ہے۔ اور یہ اس کے دل کے بہت کمزور ہونے کی وجہ سے ہے کہ سخت آواز سننے کا متحمل نہیں۔ اور اس جانور کے پتے کو چاٹ کر استعمال کرنا مرگی کیلئے بہت مفید ہے۔ اور اس کے خون کو کان میں ٹپکانا کان کے درد کو دور کر دیتا ہے۔ نیز لکھا ہے کہ جب اس جانور کو کھائیں اور ہمیشگی کریں تو سخت دل کو نرم کر دیتا ہے۔ اور اسی نکتہ کیلئے اس جانور کو اتارنا اور اس کا گوشت بنی اسرائیل کو کھلانا منظور ہوا تا کہ من کے کھانے سے ان کے اعتقادات پاک ہوں۔ اور اس جانور کا گوشت کھانے سے ان کے دل نرم ہو جائیں۔ اور ان کے اخلاق اور اعمال درست ہو جائیں اس جانور کی بیٹھ ہو بہو چڑیا کی بیٹھ کی طرح ہوتی ہے۔ اور اس کی شکل اور جسم چھوٹے مرغ کے قریب ہوتا ہے۔ اور مزاج میں اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ اور گرمی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور اچھا کیموس (غذا کی صورت جو جگر میں پکنے سے اختیار کرتی ہے) پیدا کرتا ہے اس کا ذائقہ اچھا ہوتا ہے' صحت مندوں اور بیماری سے نئے نئے اٹھنے والوں کو اچھی غذا

دیتا ہے۔ اور اس کا گوشت گردے اور مثانے کی پتھری نکال دیتا ہے۔ اور شیرازی زبان میں اس جانور کو آروہی کہتے ہیں۔

اور عجیب بات یہ کہ اس عمدہ نعمت پر ہم نے بنی اسرائیل سے کوئی بھاری شکر طلب نہیں کیا۔ اور اس کے عوض ہم نے ناگوار تکلیف نہیں دی جس طرح کہ ہم نے گوسالہ پرستی کے جرم سے نجات کی نعمت میں نفس کو قتل کرنا طلب کیا تھا یا جس طرح ارنا اللہ جہرۃ کے بے ادبی پر مبنی سوال پر ہم نے صاعقہ کے ساتھ تنبیہ کی تھی۔ بلکہ ہم نے انہیں فرمایا کہ اس نعمت کا شکر یہ بھی ہے کہ

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ان پاکیزہ چیزں سے کھاؤ جن کی ہم نے تمہیں روزی عطا فرمائی اور صرف کھانے پر اکتفا کرو۔ پس اس کا ذخیرہ نہ کرنا اور اسے بدلنے کا مطالبہ بھی نہ کرنا۔ کیونکہ شکر کے خلاف ہے۔ لیکن بنی اسرائیل یہ شکر اگرچہ بہت آسان تھا بجا نہ لائے۔ اور ذخیرہ کیا یہاں کہ گوشت سڑ گیا۔ اور اس گوشت کی بدبو کی وجہ سے لشکریوں کے دماغ پریشان ہو گئے۔ اور انہوں نے اس کا تبادلہ بھی کیا۔ اور انہوں نے کہا ہم سے ایک ہی قسم کی آسمانی خوراک پر صبر نہیں ہو سکتا ہمارے لئے زمینی خوراک، مسور، ترکاریاں، گندم، ککڑی، پیاز اور لہسن وغیرہ مانگنی چاہئے۔ اور اس ناشکری کی وجہ سے عصیان اور نافرمانی میں پڑ گئے اور اپنے آپ کو تکلیف اور مشقت میں ڈال لیا۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا اور انہوں نے اس کفران نعمت کی وجہ سے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ اگرچہ انہوں نے ہمارے فیض کے دروازے کو بند کر دیا۔ اور شان رزاقی کو جو کہ اسباب کے واسطہ کے بغیر جلوہ گر ہوئی چھپا دیا لیکن ہماری بے انتہا شانوں میں سے ایک شان کا چھپانا ہمارے عظمت اور جلال میں کمی نہیں کرتا۔

وَلٰـكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو اس عظیم فیض کی قابلیت سے محروم رکھتے تھے۔ جیسا کہ اس زمانے میں افضل المرسلین علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی بعثت کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ اور اس بہت بڑے انعام کے شکر کے طور پر وہ اعمال بجا نہیں لاتے جو کہ بہت آسان اور ہلکے ہیں۔ اور اس فیض عام کو قبول کرنے سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔

دو جواب طلب سوالات

یہاں دو جواب طلب سوالات باقی رہ گئے پہلا سوال یہ ہے کہ گزشتہ واقعات میں سے ہر واقعہ اذ کے کلمہ سے شروع کیا گیا تھا جبکہ یہ واقعہ جس کی ابتداء وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ہے کلمہ اذ کے ساتھ شروع کیوں نہ فرمایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ وَظَلَّلْنَا معطوف ہے بَعَثْنَاكُمْ پر جس پر ثم داخل کیا گیا۔ اور صاعقہ سے نجات دینے کی نعمت کا بقایا ہے۔ یعنی رویت کے سوال میں تم سے صادر ہونے والی سخت بے ادبی کے باوجود ہم نے تم سے عذاب اٹھا لیا اور بادل کا ایک سائبان تمہارے لئے مقرر فرمایا۔ اور تمہارے لئے آسمان سے کھانا اتارا تا کہ تم کلی طور پر غضب کے آثار سے نجات پاؤ۔ اس شخص کی طرح کہ جسے جیل سے باہر لائیں۔ پھر اسے حمام میں بھیجیں۔ اور اس کی رہائش گاہ کیلئے ایک حویلی مقرر کریں۔ اور اسے ایک خلعت پہنائیں۔ اور کھانے سے پر خوانچہ اس کیلئے مقرر کریں۔ کہ یہ سب ایک نعمت ہے جیل سے باہر لانے کی نعمت کا بقیہ۔ اسی لئے کلمہ اذ یہاں نہ لایا گیا۔ اور اگر بادل کا سائبان ایک علیحدہ مستقل نعمت ہوتی تو لازماً اسے کلمہ اذ سے شروع فرمایا جاتا۔ نیز تظلیل غمام اور انزال من وسلویٰ اگر چہ عمدہ نعمتیں ہیں۔ لیکن بے آب وگیاہ جنگل کے سفر کی فرع ہیں جو کہ دربار خداوندی سے ان پر لازم ہوا تھا۔ پس اگر ان چیزوں کو مستقل نعمتیں بیان کیا جاتا تو ممکن تھا کہ بنی اسرائیل کہتے کہ یہ نعمتیں ہمیں اس لئے درکار ہوئیں کہ تیرے فرمان پر ہم بے آب وگیاہ جنگل میں پریشان ہوئے۔ اور ہم نے کوئی رہائش گاہ اور کھانے پینے کی شے نہ پائی اگر یہ تکلیف ہمارے سر پر نہ ہوتی ہم ان چیزوں کے محتاج کیوں ہوتے۔ فرعون کے بوستان اور باغات ہمارے لئے سایہ کرنے کیلئے کیا کم تھے۔ اور مصر کی کھیتیوں اور پھلوں کی لذت میں کیا کمی تھی۔ بخلاف پانی طلب کرنے کے کہ آگے چل کر اسے نعمت مستقلہ کے طور پر بیان فرمایا کیونکہ تورات کے ترجموں کے مطابق وہ واقعہ شام کے سفر کی تکلیف سے پہلے رونما ہوا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس سورت میں (آیت ۵۷) اور سورت اعراف (آیت ۱۶۰) اور سورت روم (آیت ۹) میں اس عبادت کو اسی طریقے لایا گیا یعنی لفظ اَنْفُسَهُمْ سے پہلے

لفظ کانوا زیادہ لایا گیا۔ جبکہ سورت آل عمران میں وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (آیت ۱۱۷) لفظ کانوا کے بغیر ارشاد ہوا۔ انداز کی یہ تبدیلی کس نکتہ پر مبنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان سورتوں میں گزرے ہوئے لوگوں کی خبر دی گئی ہے جو کہ ختم ہو گئے۔ اور چلے گئے جبکہ سورۃ آل عمران میں کسی کے حال سے خبر نہیں دی گئی بلکہ مثال بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ حال ہو یا مستقبل ہو۔ کانوا جو کہ گزرنے اور ختم ہونے پر دلالت کرتا ہے وہاں حذف فرما دیا گیا۔

یہاں جاننا چاہئے کہ بنی اسرائیل پر نعمتوں کی گنتی کے آغاز سے لے کر اس مذکورہ نعمت تک جو کہ بادل کا سایہ کرنا' من وسلویٰ کا اتارنا ہے وہ نعمتیں ذکر فرمائی گئیں جن پر شکر عظیم طلب کیا گیا۔ مثلاً فرعون سے نجات۔ اور دریائے شور کو پھاڑنے پر تورات کے اوامر ونواہی کی اطاعت طلب کی گئی۔ کتاب وفرقان کی نعمت دینے پر ان کے احکام سے وابستگی چاہی گئی۔ اور گوسالہ پرستی اور اللہ تعالیٰ کو عیاناً دیکھنے کے بے ادبی پر مبنی سوال کے عذاب سے نجات کی نعمت پر عمالقہ کے ساتھ جہاد اور ان کے ہاتھوں سے بیت المقدس اور سرزمین شام کو آزاد کرانا مقرر ہوا۔ جس کا معنی نفس کو قتل کرنا اور اسے ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ اور یہ سب چیزیں مشکل اور بھاری ہیں ان کی طبیعت ان سے جی چراتی ہے۔ بخلاف اس نعمت کے کہ اس پر بہت آسان سا شکر چاہا گیا تھا یعنی ذخیرہ ترک کرنا اور تبدیلی کا مطالبہ ترک کرنا۔ اور ان سے یہ بھی نہ ہو سکا اور اس پر قائم نہ رہ سکے۔ اب اشارہ ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کے شکر میں تبدیلی کا مطالبہ چھوڑنا بھی کچھ مشقت رکھتا تھا۔ کیونکہ انسانی طبیعت ایک قسم کے کھانے پر ہمیشگی سے ملال پکڑتی ہے۔ اور نفرت کرتی ہے۔ تمہارے اسلاف نے ایک اور نعمت کی ناشکری کی ہے جس میں کوئی ملال اور مشقت نہ تھی۔ اور ایک سجدہ کرنے اور ایک کلمہ کو زبان پر لانے سے زیادہ اس کا شکر مقرر نہ فرمایا تھا اس نعمت اور اس نعمت کے شکر کو یاد کرو۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ہم نے تمہارے اسلاف سے فرمایا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ جبکہ تم من وسلویٰ کھانے' سایہ ابر اور جنگل میں گھومنے کے سفر کے بعد عاجز آ گئے تھے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ کونسی بستی تھی۔ بہت صحیح یہ ہے کہ اریحا تھی اور یہ بستی عمالقہ کا مسکن تھا اور اس کے مضافات کے قریب بنی اسرائیل کا لشکر

پہنچنے کی وجہ سے اس بستی میں رہنے والے اسے خالی کر کے چلے گئے تھے۔ اور اس بستی میں غلہ اور پھل وافر مقدار میں تھے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ بستی بیت المقدس تھی مگر یہ قول صحیح نہیں۔ کیونکہ اہل قصص کے اجماع کے مطابق بنی اسرائیل کا بیت المقدس میں داخلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نہیں ہوا ہے۔ اور شبہ کا منشا یہ ہے کہ باب حطہ بیت المقدس کے دروازوں میں سے ایک مشہور دروازہ ہے۔ اور ابھی تک آباد اور زیارت گاہ ہے۔ اور جو کوئی اپنے گناہوں کے استغفار کیلئے اس مسجد شریف میں آتا ہے اسی دروازہ سے اندر آتا ہے۔ اور اس جگہ کے مجاوروں کی زبان پر عام ہے کہ اس دروازہ سے داخل ہونا گناہ سے پاک ہونے کا سبب ہے۔ حالانکہ یہ دروازہ بیت المقدس کی اس تعمیر کے بعد بنا جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد مبارک میں ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مسجد بیت المقدس تھی نہ یہ دروازہ ہاں اس دروازے کو حضرت سلیمان اور ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے وحی یا کشف کی بنیاد پر اس بستی کے دروازے سے مشابہت دے کر باب حطہ کا لقب دے دیا ہوگا کہ خاصیت میں مذکورہ بستی کے باب حطہ سے مناسبت رکھتا ہوگا۔

قصہ مختصر بنی اسرائیل کو سفر اور آسمانی خوراک کے ملال کو دور کرنے کیلئے حکم ہوا کہ اس بستی میں جا کر تھکاوٹ دور کریں۔ اور فرمایا فَكُلُوْا مِنْهَا تو اس بستی کے غلے، پھل اور لذت کی چیزیں کھاؤ۔ حَيْثُ شِئْتُمْ جہاں چاہو خواہ اس بستی میں خواہ اپنے لشکر میں لا کر۔ اور حَيْثُ شِئْتُمْ کا لفظ بڑھانا اسی لئے ہے۔ تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اس بستی کے غلے اور پھل اس بستی میں کھانا درست ہیں۔ اور اگر پھر لشکر کو لوٹیں تو اس آسمانی خوراک کے سوا کچھ حلال نہ ہوگا اور کھانا بھی کسی مقرر کردہ مقدار کے ساتھ نہیں۔ جس طرح کہ مجبور کو صرف کچھ جان بچانے کی حد سے آگے نہیں گزرنا چاہئے بلکہ رَغَدًا یعنی فراخی اور وسعت کے ساتھ سیر ہو کر کھانا لیکن اس نعمت سے مستفید ہونے سے پہلے ایک شکر بھی بجا لاؤ۔

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اور اس بستی کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ اور یہ بدنی شکر ہے وَقُوْلُوْا اور زبان سے کہو تاکہ توبہ اور زبانی شکر بھی ادا ہو جائے کہ ہمارا مطلب حِطَّةٌ گناہوں کا گرنا ہے۔ اور جب یہ دونوں عمل بدنی اور زبانی ندامت قلبی

کے ساتھ جو کہ تم رکھتے ہو جمع ہوں گے تو تمہاری توبہ صحیح اور مقبول ہوگی۔ پس نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ہم تمہارے گناہ ضرور بخش دیں گے۔ اور گناہوں کے میل سے تمہیں پاک کر دیں گے۔ اور اس دروازے کو ہم تمہارے حق میں کعبہ کا حکم دے دیں گے کہ اس کے طواف اور اس کی طرف سجدہ گناہوں کو گرا دیتا ہے۔ اور صرف تمہارے گناہ گاروں اور معصیت اور برائی والوں کی بخشش پر ہی اکتفا نہ ہوگا۔

وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ اور البتہ تمہارے نیک لوگوں کو جو کہ گناہوں سے پاک تھے ان دونوں عملوں کی وجہ سے مزید ثواب اور نوازشات عطا فرمائیں گے۔ کیونکہ گناہوں کو مٹانے والے اعمال جب گناہ نہ پائیں تو درجات کی بلندی کا سبب ہوتے ہیں۔

توبہ کرنے کا بیان

جاننا چاہئے کہ اس آیت سے چند فائدے نکلتے ہیں پہلا یہ کہ توبہ میں زبان سے استغفار کرنا اور بدن سے نماز اور سجدہ بجالانا توبہ کو پورا کرنے والا ہے۔ اور اگرچہ حقیقت توبہ جو کہ ماضی پر ندامت' حال میں گناہ کو چھوڑنا اور مستقبل میں گناہ کو چھوڑنے کا پختہ عزم اور اس پوری نفرت کرنا ہے۔ سب دل سے متعلق ہے۔ لیکن جب دل کی صفت قوت پکڑتی ہے۔ تو اعضاء اور زبان پر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی اسی لئے حدیث پاک میں توبہ کے وقت صلوٰۃ توبہ اور استغفار کے صیغوں کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی گناہ میں مشہور ہو جائے اور لوگ اس کے گناہ پر اطلاع پالیں تو وہ اعلانیہ توبہ کرے۔ اور لوگوں کو اپنی توبہ کی اطلاع دے۔ اور زبانی استغفار کرنے' عادل اور ذمہ دار لوگوں کو گواہ بنانے اور خیرات اور نماز ادا کرنے کا اہتمام کرے۔ نہ اس وجہ سے کہ ان چیزوں کے سوا توبہ پوری نہیں ہوتی اس لئے کہ گونگے۔ اور لنگڑے لولے کی توبہ بھی مقبول ہے۔ اگرچہ زبان اور اعضاء کی حرکت دینے پر قادر نہیں۔ بلکہ لوگوں کو اپنی توبہ پر اطلاع دینے کیلئے تا کہ وہ جانیں کہ گناہ سے رک گیا ہے۔ اور دین کی سیدھی راہ پر چل نکلا ہے۔ اور تا کہ اس سے تہمت زائل ہو جائے۔ اور لوگ اس کے متعلق بدگمانی اور غیبت سے باز رہیں۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی باطل مذہب کے ساتھ متہم ہوا ہو پھر اسے حق واضح ہو جائے تو اسے لازم ہے کہ انہیں وجوہ کیلئے دوسرے لوگوں کو جو اسے اس باطل مذہب کے ساتھ پہچانتے تھے اپنے رجوع سے آگاہ کرے۔

اہل بیت نبوی میں بیعت کا فائدہ

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ بعض متبرک مقامات جو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور رحمت کا مورد ہوئے ہیں یا اہل صلاح وتقویٰ کے بعض قدیم خاندان ایک خصوصیت پیدا کرتے ہیں کہ ان میں توبہ کرنا اور اطاعت بجالانا جلدی قبولیت اور اچھے نتائج کا موجب ہوتا ہے۔اور اسی مقام سے وہ ہے جس کی ابن مردویہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حکایت کی کہ ہم ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ رات کے وقت کسی غزوہ یا سفر میں جارہے تھے جب پچھلی رات ہوئی تو ہم ایک پہاڑ کے پشتہ میں گزرے جسے دارالحنظل کہتے تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:مامثل ھٰذہ الثنیۃ الاکمثل الباب الذی قال اللہ لبنی اسرائیل ادخلوا الباب سجدا وقولوا حطۃٌ نغفرلکم خطایاکم یعنی اس گھاٹی کی مثال اس دروازے کی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور حطہ کہو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔

اور ابوبکر ابن ابی شیبہ صحیح روایت کے ساتھ حضرت مرتضی علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے لائے کہ انما مثلنا فی ھذہ الامۃ کسفینۃ نوح وکباب حطۃ فی بنی اسرائیل یعنی اہل بیت نبوی کے ائمہ جو کہ خاندان نبوت کے منتظم اور ولایت ومعرفت کے اسرار کے حامل ہیں کی مثال اس امت میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اور بنی اسرائیل میں باب حطہ کی مثال ہے۔کیونکہ نفس وشیطان کے طوفان سے نجات اور اولیاء اللہ کے سلسلوں میں داخل ہونے کی وجہ سے توبہ کی تصحیح اور گناہوں کی تکفر اس امت میں انہیں بزرگوں کے دامن سے وابستہ ہے۔جیسا کہ اس زمانے میں ظاہر اور واضح ہے کہ راہ خدا کے سلوک کے سلسلے اور بیعت' توبہ اور انابت اسی خاندان تک پہنچتی ہے۔

قصہ مختصر بنی اسرائیل سہولت کے باوجود اس نعمت کے شکر کی ذمہ داری سے بھی عہد

برآ نہ ہو سکے۔ بلکہ ان میں سے ایک جماعت نے بہت بے ادبی کی۔ اور توبہ واستغفار کی بجائے تمسخر اور مذاق کے ساتھ پیش آئے چنانچہ فرمایا ہے

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا تو بدل دیا ان لوگوں نے جو ان میں سے ظالم تھے استغفار کو تمسخر کے ساتھ جب انہوں نے کہا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ وہ کلام جو کہ کلی طور پر مغایرت رکھتا تھا اس سے جو انہیں کہا گیا۔

اس لئے کہ انہیں جو کہا گیا تھا اس کا مقصد گناہوں کی بخشش مانگنا اور استغفار کرنا تھا اور انہوں نے جو کچھ کہا تو جیہ وارتکاب کے بعد طلب دینا اور غلوں اور اجناس خوردنی کی رغبت دل میں چھپانا تھا یا صرف تمسخر اور مذاق۔ اور اے کاش صرف لفظ کی تبدیلی کرتے اور حطہ کے بجائے تب علینا یا اغفر لنا یا اعف عنا کہتے۔ ان امور میں لفظ کے بدلنے میں کوئی ڈر نہیں۔ لیکن انہوں نے معنوی تضاد استعمال کیا۔ اور پوری مخالفت اختیار کی۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ حطہ کی بجائے حطی سمہا تا کہا کہ ان کی زبان اس کا معنی حطہ حمراء یعنی سرخ گندم تھا لیکن صحیحین اور دوسری صحاح ستہ میں ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیل لبنی اسرائیل ادخلوا الباب سجدا وقولوا حطۃ فدخلوا یزھون علی استاھھم وھم یقولون حنطۃ فی شعیرۃ بنی اسرائیل کو کہا گیا کہ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور حطہ کہو تو وہ بیٹھ کر گھسٹتے گھسٹتے داخل ہوئے۔ اور وہ کہہ رہے تھے جو میں گندم، جو میں گندم۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اس آیت سے بعض شافعی علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نماز کی تکبیر تحریمہ لفظ اللہ اکبر کے سوا سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰہُ اَعْظَمُ وَاَجَلُّ اور اس کی مثل الفاظ کے ساتھ جائز نہیں۔ اور بعض اہل ظواہر نے کہا ہے کہ کسی ذکر کے لفظ کو جو کسی خاص مقام کیلئے وارد ہے تبدیل کرنا درست نہیں یا یہ کہ اس کے لفظ کو تبدیل کرنے سے فساد کا حکم کرتے ہیں۔ اور اس تبدیلی کو طعن اور انتہائی مذمت کا موجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن تفسیر میں معلوم ہوا کہ ایک کلام کی دوسرے کلام سے مغایرت کا دارومدار عرف میں مضمون کی مغایرت پر ہے نہ کہ لفظی مغایرت پر۔ پس اگر صرف لفظی تبدیلی واقع ہوئی۔ اور معنی میں اتفاق واتحاد

ہو یا ایک دوسرے کے قریب تو محل طعن اور مقام عتاب معلوم نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اس سورت میں وَاِذْ قُلْنَا فرمایا ہے۔ اور سورت اعراف میں وَاِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا (آیت ۱۶۱) اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں يَا بَنِي اِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کی ابتداء سے افعال کو ضمیر متکلم کا اضافہ کر کے لائے ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے اس جگہ بھی مناسب ہوا کہ اس قول کو اگرچہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے تھا اپنی طرف نسبت فرمائیں۔ تاکہ بنی اسرائیلوں کی انتہائی بے ادبی ظاہر ہو جائے کہ ہماری گفتگو کے ساتھ تمسخر سے پیش آئے۔ اور اس کا مزا چکھا۔ اور سورۃ اعراف میں کلام اس لئے چلائی گئی کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے دو گروہ تھے۔ امہ یہدن بالحق وبہ یعدلون ۔ ایک گروہ جو کہ حق کے ساتھ ہدایت دیتے اور اسی کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ اور گمراہ ظالم گروہ اور اسی مناسبت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باکرامت زمانے میں ان کے اختلاف کو یاد فرمایا ان میں سے گھاٹ اور پتھر سے جاری ہونے والے چشموں میں ان کا جدا جدا ہونا ہے۔ جو کہ ان کے مختلف ہونے پر دلالت کرتا تھا اور ان میں سے مذکورہ بستی میں داخلے کے وقت انکے حال کا اختلاف ہے کہ بعض نے فرمان کے مطابق عمل کیا۔ اور بعض نے سخت بے ادبی اختیار کی۔ اور اس غرض میں اللہ تعالیٰ کا بلاواسطہ فرمانا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہنا برابر تھا اس کے باوجود قرائن کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا کون ہے۔ اور کس کے فرمان پر کہا۔ پس ابہام اٹھ گیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس سورت میں اُدْخُلُوْا فرمایا ۔ اور سورۃ اعراف میں اسکنوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں اس آیت کے لانے کا مقصد ان کے من و سلویٰ کھانے اور اس نعمت کو اجناس خوردنی اور غلوں کے ساتھ بدلنے کا ذکر ہے۔ پس یہاں مقصود بالذات یہ بیان کرنا ہے کہ ہم نے انہیں اس بستی کے غلے کھانے کی اجازت دے دی اور داخل ہونا اس مقصود بالذات کا موقوف علیہ اور وسیلہ ہے۔ اور کسی چیز کی اجازت دینا

اس کی بھی اجازت ہے جس ہو وہ چیز موقوف ہے۔ تو داخل ہونے کا ذکر بھی ضروری ہوا۔ جبکہ سورۃ اعراف میں سفر و حضر میں ان کا جدا جدا ہونا اور علیحدہ علیحدہ ہونا مذکور ہے۔ پس سفر میں پانی پینے میں علیحدگی اختیار کی۔ اور گھر میں سکونت اور اس کے طریقے میں اختلاف کیا۔ نیز اس سورت میں بستی کی سکونت کو بھی مقصود بالذات بیان فرمایا گیا کیونکہ جس طرح وہ من وسلویٰ کھانے سے ملال کا اظہار کرتے تھے خیمہ اور کھلی جگہ کی سکونت سے بھی عاجز آچکے تھے۔ اور چونکے داخل ہونا سکونت سے پہلے ہے۔ اس لئے سورت بقرہ میں جو کہ سورت اعراف سے پہلے ہے داخل ہونے کا ذکر فرمایا۔ اور سورت اعراف میں سکونت کا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہاں فکلوا فا کے ساتھ لائے جبکہ سورت اعراف میں وکلوا واوٗ کے ساتھ یہ فرق کس بنیاد پر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ دخول ذکر فرمایا ہے۔ اور بستی میں داخل ہونا مقصود بالذات نہیں ہوتا مقصود بالذات دوسری چیز ہوتی ہے جو کہ داخل ہونے پر مرتب ہوتی ہے۔ اور مرتب ہونے والی وہ چیز دانے اور غلے کھانا تھا۔ پس ایسے لفظ کو لانا ضروری ہوا جو کہ ترتیب کا پتہ دے اور سورۂ اعراف چونکہ لفظ اسکنوا لایا گیا۔ اور بستی کی سکونت مقصود بالذات ہوتی ہے بغیر اس کے کہ کسی چیز کا وسیلہ ہو۔ پس مناسب ہوا کہ دانوں اور غلوں کا کھانا وہاں ترتیب سے خالی عطف کے طریقے سے بیان فرمایا جائے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ یہاں رغدا کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔ اور اعراف میں اس لفظ کو گرا دیا گیا اس کا جواب یہ ہے اس سورت میں مقصود بالذات دانوں اور غلوں کے کھانے کا جواز اور اس میں وسعت دینا ہے۔ تو لفظ رغدا سے تاکید مناسب ہوئی۔ جبکہ اعراف میں مقصود بالذات سکونت ہے۔ اور کھانا اس بنا پر کہ سکونت اسے لازم کرتی ہے بھی مباح ہوا اور ضروری شے کا اندازہ ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ نیز پھلوں سے معمور باغ میں داخل ہونا ان پھلوں سے سیر ہونے کو لازم نہیں کرتا کیونکہ کھانے پینے کا مقام اس باغ کے علاوہ ہوتا ہے۔ اور کسی مقام میں سکونت اختیار کرنا اس مقام کی خوراک سے سیر ہونے کو لازم ہے۔ کیونکہ مسکن کے سوا کھانے پینے کیلئے کوئی دوسرا مکان نہیں ہوتا۔ پس دخول اور سکونت کے لفظوں کا فرق جو کہ دونوں سورتوں میں واقع ہوا اس لفظ کے ذکر اور حذف کرنے کا متقاضی ہوا۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ یہاں خطایا کم فرمایا۔ اور اعراف میں بعض قراٗتوں کے مطابق خطیئاتکم ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خطایا کم جمع کثرت ہے۔ اور خطیئات جو کہ جمع سالم ہے جمع قلت کے صیغوں سے ہے چونکہ اس سورت میں قول کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اور اَرْحَمُ الرَّاحِمِینَ اور اکرم الاکرمین کی بارگاہ پاک کے لائق یہ ہے کہ ایک سجدہ اور دعا کے ساتھ بے شمار گناہوں کو بخش دے اور کثرت پر دلالت کرنے والا لفظ لانا مناسب ہوا۔ اور اعراف میں قول کی نسبت اپنی طرف نہیں فرمائی اس لئے کثرت پر دلالت کرنے والے لفظ کو ذکر کرنا ضروری نہ تھا اور یہاں سے اس جگہ لفظ رغداً کے ذکر اور وہاں اس کے حذف کیلئے ایک اور نکتہ واضح ہوا۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ اس سورت میں دروازے میں داخل ہونے کو حطہ کہنے سے پہلے رکھا گیا۔ جبکہ اعراف میں اسکے برعکس۔ یہ اسلوب کی تبدیلی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مخاطبین دو قسم کے تھے گناہگار اور نیکوکار' نیکوکار کے لائق ہے کہ عبادت اور طاعت کو پہلے کرے۔ اور کوتاہیوں سے توبہ اور معافی طلب کرنا اس کے بعد بجالائے۔ تاکہ نفس کی پستی ہو اور تکبر اور خود بینی کا ازالہ۔ جبکہ گناہگار کیلئے لائق بلکہ واجب ہے کہ پہلے صدق دل سے توبہ نصوح کرے اس کے بعد اطاعت اور عاجزی میں قدم رکھے۔ تاکہ وہ طاعت اور عاجزی مقبول ہو جائے۔ اور سورۂ اعراف میں جو کچھ گناہگاروں کے لائق تھا اس کی رعایت کی گئی۔ کیونکہ اس سورت میں زیادہ تر گزشتہ امتوں کے گناہگاروں کا ذکر ہے۔ جبکہ اس سورت میں وہ ترتیب جو کہ نیک بختوں اور نیکوکاروں کے حال کے لائق تھی پیش نظر رکھی گئی۔ کیونکہ اس سورت میں زیادہ تر پرہیزگاروں اور نیک بختوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ نیز اس سورت میں چونکہ داخل ہونے کا ذکر پہلے ہوا۔ پس مناسب ہوا کہ پہلے داخل ہونے کی کیفیت کو بیان کیا جائے۔ اور اس سورت میں سکونت کا ذکر ہے داخل ہونے کی کیفیت کو اس سے اتنا تعلق نہیں۔

ساتواں سوال یہ ہے کہ اس سورت میں وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ لفظ واؤ کی زیادتی کے ساتھ آیا جبکہ سورت اعراف میں سَنَزِيدُ واؤ کے حذف کے ساتھ۔ فرق کس وجہ سے

ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں چونکہ دروازے میں داخل ہونا جو کہ طاعت و عبادت کے قبیل سے تھا پہلے ذکر ہوا اور حطہ کہنا جو کہ توبہ و استغفار کے باب سے اس کے ساتھ ہوا۔ دونوں فعلوں نے یک جان ہو کر پہلے خطائیں زائل کرنے میں اثر کیا۔ پھر نیکوں کے درجات بلند کرنے میں۔ جیسا کہ دوائیاں اور تنقیہ استعمال کرنے کا قاعدہ ہے۔ بخلاف اعراف کے کہ جب حطہ کہنا جو کہ توبہ و استغفار کے قبیلے سے ہے پہلے ہوا اس نے صرف مرض گناہ زائل کرنے میں اثر کیا۔ اور اس کے بعد دروازے کا داخلہ آیا اور وہ عبادت کے قبیلے سے ہے۔ درجات بلند کرنے اور ثواب و عزت زیادہ کرنے میں مفید ہوا۔ پس دونوں جزائیں دونوں فعلوں پر منقسم ہو گئیں حرف واؤ کی گنجائش نہ رہی اور یہاں ایک اور لفظی نکتہ بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وَاِذْ قُلْنَا جو متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور وسنزید جو کہ وہی صیغہ ہے کے بیان میں لفظی اتصال متحقق ہے۔ پس عطف کو مناسبت حاصل ہو گئی۔ بخلاف اعراف کے کہ وہاں واذ قیل واقع ہے سنزید کو اس پر عطف کرنا مناسب نہ تھا۔ اور یہ نکتہ اس پر مبنی ہے کہ سنزید' نغفر لکم خطایاکم پر معطوف نہ ہو۔ چنانچہ واقع میں اس طرح ہے ورنہ نزد کہا جاتا اور اسے مجزوم لاتے جو کہ امر کا جواب ہوتا۔

آٹھواں سوال یہ ہے کہ اعراف میں فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ لفظ منہم کی زیادتی کے ساتھ فرمایا جبکہ یہاں اس لفظ کو حذف فرما دیا اس اسلوب میں تبدیلی کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اعراف میں پہلے گزرا ہے کہ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ وہاں اگر تخصیص کے بغیر سب کو ظالم کہتے تو اس کلام کے منافی ہوتا اور اس سورت میں ماقبل میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں گزری اس لئے لفظ منہم کی حاجت نہ تھی۔

ناانواں سوال یہ ہے کہ اس سورت میں فَاَنْزَلْنَا واقع ہوا جبکہ اعراف میں فَاَرْسَلْنَا یہ فرق کس وجہ سے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں شروع سے انزال کتاب کا ذکر ہے۔ اور یہاں تک اکثر لفظ انزال استعمال ہوا۔ جیسا کہ یہیں قریب ہی وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى گزرا ہے۔ اس عذاب کو بھی بطور مذاق اس وادی سے قرار دیا ہے گویا مہمانی کے دسترخوان سے تشبیہ دے کر اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اور سورت

اعراف میں شروع سے لفظ ارسال مذکور ہے۔ آیت فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ میں۔ گزشتہ اقوام کے واقعات میں اور فرعون کے قصے میں۔ پس لفظ ارسال جو کہ مسلط کرنے پر دلالت کرتا ہے مناسب ہوا۔ نیز لفظ انزال عذاب کے پیدا ہونے کی ابتداء پر دلالت کرتا ہے۔ اور لفظ ارسال ان پر عذاب کے مسلط ہونے اور کلی طور پر ان کی جڑ کاٹنے پر دلالت کرتا ہے۔ پس اس سورت میں جو کہ اعراف سے پہلے ہے عذاب کے نزول کی ابتداء کا ذکر مناسب ہوا اور سورۃ اعراف میں کام کی انتہاء کا ذکر ہے۔

دسواں سوال یہ ہے کہ یہاں بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ذکر فرمایا۔ اور اعراف میں يَفْسُقُوْنَ کے بجائے يَظْلِمُوْنَ ارشاد ہوا۔ اس فرق کا نکتہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ فعل اپنے حق میں ظلم تھا کہ اس کی وجہ سے غضب الٰہی کے مقام میں داخل ہوتے تھے۔ اور دین خداوندی کی نسبت سے فسق تھا۔ دونوں سورتوں میں اس فعل کی دونوں بری صفتوں کو یاد فرمایا البتہ اس سورت میں فسق کے ذکر کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اپنے حق میں ان کا ظلم قریب ہی اس سورت میں گزرا آیت وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ اگر یہاں بھی لفظ ذکر کیا جاتا تو تکرار کا وہم ہوتا بخلاف اعراف کے کہ وہاں ان کا ظلم کی وصف کے ساتھ ذکر پہلے نہیں گزرا۔ اس لئے اس معنی کا فائدہ دینا مناسب ہوا۔ قصہ مختصر بنی اسرائیل کو اس تمسخر اور مذاق پر آنکھ دکھانا لازم تھا اس لئے ہم نے ان سے درگزر نہ فرمایا بلکہ انہیں بے ادبی کی سزا چکھائی۔

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ پس ہم نے ان لوگوں پر اتارا جنہوں نے یہ بے ادبی کی تھی اور تمسخر اور مذاق کیا۔ نہ کہ دوسروں پر جو کہ بے گناہ تھے رِجْزًا سخت عذاب مِنَ السَّمَآءِ آسمان سے۔ جو کہ مکانات میں سب سے بڑا اور اونچا ہے۔ اور من اور سلویٰ بھی انہیں وہیں سے عنایت ہوتا تھا بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ اس وجہ سے کہ انہوں نے فسق کی عادت بنالی تھی۔ اور اس کے خوگر ہو گئے تھے جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے دین سے نکل جانا ہے۔

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ وہ عذاب طاعون تھا۔ اور اس طاعون کی وجہ سے بنی

اسرائیل میں سے چوبیس ہزار آدمی ایک دن میں مر گئے۔ اور اس عذاب کا آسمان سے اترنا اس طرح تھا کہ ایک زہریلی ہوا آسمان کی طرف سے آئی جس نے ان کے مساموں میں داخل ہو کر روح کے مزاج کو خراب کر دیا۔ اور خون کو زہریلی کیفیت میں ڈھال کر ان کی جڑوں اور بدن کی نرم جگہوں کی طرف دھکیل دیا۔ حتیٰ کہ طاعون ظاہر ہو گیا۔ اور اس کے زہریلے اثر سے جو کہ دل تک پہنچا ہلاک ہو گئے۔

طاعون اور وباء سے بھاگنے کی ممانعت کا بیان

اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح ستہ میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ طاعون عذاب ہے۔ اور اس عذاب کا بقیہ ہے جس کے ساتھ پہلوں کو عذاب دیا گیا۔ تو جب کسی شہر یا ملک میں واقع ہو جبکہ تم وہاں ہو تو اس شہر اور ملک سے فرار نہ کرو اور اگر سنو کہ کسی شہر یا ملک میں واقع ہے۔ تو اس شہر اور ملک میں داخل نہ ہو۔ کیونکہ پہلی صورت میں قضائے الٰہی سے فرار اور توکل وتسلیم کے مخالف ہے۔ اور دوسری شکل میں عذاب الٰہی پر جرأت اور اس کے غضب کی طرف قدم اٹھانا ہے۔ نیز صحیح حدیث شریف میں وارد ہوا کہ جب کسی جگہ وبا پڑ جائے۔ اور اس جگہ کے لوگ فرار نہ کریں۔ اور صبر کریں۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس صبر پر اجر کی توقع کریں اللہ تعالیٰ انہیں شہیدوں کے مرتبہ تک پہنچا دیتا ہے۔ اگرچہ وہ سلامت رہیں۔

ایک اشکال کا جواب

اور یہاں اکثر ظاہر بینوں کے دلوں میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قحط اور دیگر بلاؤں سے بھاگنا بلاشبہ شریعت میں جائز ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے **الفرار مما لا یطاق من سنن المرسلین** جس کے تحمل کی تاب نہیں اس سے فرار رسل علیہم السلام کی سنتوں میں سے ہے۔ اور طاعون کی وبا سے جو کہ سب سے شدید بلا ہے فرار شریعت میں کیوں منع قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دو جہتیں ہیں۔ ایک یہ کہ طاعون کی وباء کی صورت میں اکثر شہر والے خصوصاً اقارب۔ کنبے، دوست اور جان پہچان والے لوگ بیمار ہوتے ہیں

اگر لوگوں کو فرار کے جائز ہونے کا حکم ہوتا تو ان بیماروں کی خبر گیری کون کرتا۔ سب لوگ اپنی جان کے خطرہ سے جو کہ بہت پیاری ہے بھاگ کر چلے جاتے اور بیمار بے اجل مرتے۔ یعنی بہت تنگی اٹھاتے۔ پس اس وقت بیماروں کی خدمت' ان کے دلوں کو اور عاجزوں اور معذوروں کے دلوں کو جو کہ بھاگنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے تسکین دینے کے عمل نے جہاد کا حکم پیدا کیا۔ اور اس مکان میں صبر کرنا جہاد کی صف میں صبر کرنے کی طرح اجر وثواب کا موجب ہے۔ بخلاف قحط اور دشمن کے خوف کے کہ بھاگنے کی یہ رکاوٹ وہاں متحقق نہیں ہے۔ بلکہ فقیر اور غریب اس وقت سب سے پہلے بھاگنے کی پیش قدمی کرتے ہیں یا وہ اس سے مستغنی ہوتے ہیں۔ کیونکہ مال نہیں رکھتے کہ کوئی ان کے پیچھے پڑ جائے۔

دوسری جہت یہ ہے کہ طاعون اور وباء جنوں کی ناپاک روحوں کے اثر سے ہوتے ہیں۔ جو کہ ایک دم بنی آدم کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو تکلیف دینے کیلئے پھیل کر اس قسم کی تکلیف پہنچاتے ہیں۔ پس ان کے مقابلہ سے بھاگنا ان سے ڈرنے کی دلیل ہے۔ اور صبر واستقامت ان کی ذلت اور ان کے تکبر کو توڑنے کا موجب ہے۔ پس اس جہت سے بھی جہاد اور لڑائی کی صف میں صبر کا حکم پیدا کیا۔ اور حدیث شریف میں اس معنی کا اشارہ ہے جہاں طاعون کے بارے میں فرمایا ہے: فانہا جزا اعدائکم من الجن۔

اور جب بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچنے والی نعمتوں کی گنتی سے جو کہ کفران اور ناشکری کا سبب ہوتی تھیں فراغت ہوئی۔ اب ایک اور نعمت کو یاد فرمایا ہے جو کہ اگرچہ ناشکری اور فسق کا موجب تو نہ ہوئی لیکن تفریق' اختلاف اور جانب داری کا موجب ہوئی۔ جو کہ فساد اور مذاہب اور مشارب میں اختلاف کی جڑ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب دوران سفر پانی نہ پایا اور پیاس لگی اور اس بات کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں شکایت کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں ان کی پیاس دور کرنے کیلئے دعا کی چنانچہ فرمایا ہے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا استسقاء کی۔ اور پینے کیلئے پانی مانگا۔ لِقَوْمِهٖ اپنی قوم کیلئے جو کہ بنی اسرائیل تھی نہ کہ تمام

جہان کیلئے اس لئے کہ پانی پینے کے محتاج اور پیاس میں گرفتار صرف آپ کی قوم تھی۔ اور اس تخصیص میں اس بات کا اشارہ ہوا کہ انہیں پانی دینے کا طریقہ پتھر سے چشمے جاری کرنا کیوں قرار دیا گیا؟ آسمان سے بارش کیوں نازل نہ ہوئی؟۔ جیسا کہ پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے پیغمبروں علیہم السلام کے استسقاء میں ہوا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام پانی تمام جہان کیلئے مانگا تھا۔ پس آسمان سے بارش کا پانی جو کہ عام پانی ہوتا ہے عطا فرمایا گیا۔ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خاص اپنی قوم کیلئے مانگا۔ پس پتھر سے جاری ہونے والا خاص پانی دیا گیا۔

استسقاء تمام پیغمبروں علیٰ نبینا وعلیہم السلام کی سنت موکدہ ہے

اور استسقاء سب پیغمبروں علیٰ نبینا علیہم السلام کی سنت موکدہ ہے جو کہ پانی کے قحط کے وقت خدا تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ اور اس کی حقیقت استغفار' توبہ اور عاجزی ومحتاجی کا اظہار ہے۔ اور اس کا مسنون طریقہ کتب فقہ' مذکور اور لکھا ہوا ہے۔ پس ہم نے حضرت موسیٰ کی دعا قبول فرمائی۔

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرِ

پس ہم نے موسیٰ کو فرمایا کہ اپنے عصا کو پتھر پر ماریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا بیان

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بہشت کے درخت آس کا تھا اس کا طول آدمی کے دس ہاتھ کی قدر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر تھا۔ اس کی دو شاخیں تھیں۔ اور دونوں شاخیں دو مشعلوں کی طرح تاریکی اور رات کے وقت چمکتی تھیں دراصل یہ عصا حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے۔ اور وراثت کے طریقے سے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آپ کے بیٹے مدین کو ملا اور ان سے چند واسطوں کے ساتھ حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا اور حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔

اور اس میں اختلاف ہے کہ پتھر سے مراد غیر معین پتھر ہے؟۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام جس پتھر کو چاہتے تھے عصا کے ساتھ مارتے تھے۔ اور پانی نکال لیتے تھے۔ جیسا کہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور وہب بن منبہ نے کہا ہے۔ اور الف لام کو جنس کا اشارہ قرار دیا۔ تو اس صورت میں یہ معجزہ بھی صرف عصا کے واسطہ سے پتھر کے واسطہ کے بغیر واقع ہوا یا ایک معین پتھر تھا۔ کیونکہ روایات میں یہی قول صحت کو پہنچا کہ وہ ایک معین پتھر تھا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک چمڑے کے تھیلے میں سنبھال رکھا تھا اور ضرورت کے وقت اس سے یہ کام لیتے تھے بعض کہتے ہیں کہ یہ وہی پتھر تھا جو کہ آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا۔ جیسا کہ اس کا واقعہ سورت احزاب میں اشارۃً مذکور ہے حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ اس پتھر کو اٹھا لیں اور ضروری حفاظت میں رکھیں کہ یہ پتھر کسی وقت اللہ تعالیٰ کی قدرتوں میں سے ایک عظیم قدرت کا مظہر اور آپ کے معجزات میں سے عمدہ معجزہ ہوگا۔ اور بعض نے کہا کہ ایک اور پتھر تھا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سے اٹھا کر لائے تھے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ پتھر بھی دراصل بہشت سے آیا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کے ہمراہ دنیا میں پہنچا اور وراثت کے طریقے حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا تھا اور آپ نے عصا کے ہمراہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا بہر صورت وہ ایک مرمر کا پتھر تھا گز در گز مکعب شکل رکھتا تھا جس کی چھ سطحیں محیط ہوتی ہیں اوپر نیچے اور چار دوسری سطحیں اور ہر سطح سے تین چشمے جاری ہوتے تھے۔

اور عطا اور دوسرے مفسرین سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عصا کو بارہ مرتبہ بارہ جگہ پر مارتے تھے۔ اور ہر جگہ ضرب کی جگہ پر عورت کے پستان کے سر کی طرح ظاہر ہو جاتا تھا پہلے پسینہ آتا تھا پھر بوندا باندی ہوتی پھر جاری ہو کر چل نکلتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکری بارہ قبیلے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ بارہ گہرے حوض کھودیں تا کہ ہر چشمے کا پانی اس حوض میں جمع ہو جائے۔ اور وہ پانی پئیں اور جب کوچ کے وقت اس پتھر کو اٹھاتے تو خشک ہو جاتا اور پانی رک جاتا تھا گویا عصا کے ساتھ اس پتھر کو مارنا اس پتھر میں ایک طاقت پیدا کرنے کا موجب ہو جاتا کہ اس کی وجہ سے اس سے دو عجیب فعل صادر

ہوتے ایک اس ہوا کو پے در پے جذب کرنا جو کہ پتھر کے ساتھ لگتی تھی۔ دوسرا اس ہوا کو انتہائی ٹھنڈا کر کے پانی کی شکل میں بدلنا اور اس قسم کے عجیب خواص پتھروں میں بہت دیکھے اور سنے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مقناطیس میں لوہے کا کھینچنا اور وہ جو حجر المطر وغیرہ کے خواص میں لکھتے ہیں مگر اس سے زیادہ عجیب وہ ہے کہ صحیحین میں انس بن مالک اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہوا کہ ایک دن حضور علیہ السلام مقام زوراء میں تشریف رکھتے تھے۔ پانی سے بھرا ہوا ایک چھوٹا برتن وضو کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رکھا گیا۔ پانی فوارے کی طرح مبارک انگلیوں سے جوش مارتا تھا کثیر لوگوں نے اس پانی کے ساتھ وضو کیا۔ اور بعض تبرک کے طور پر پی رہے تھے۔ حضرت قتادہ نے جو کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کتنے افراد تھے جنہوں نے اس پانی سے وضو کیا آپ نے فرمایا تین سو یا تین سو کے قریب۔ قصہ مختصر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اس پتھر کو عصا مارا۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۔ پس اس پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ اور اس پتھر کے چار رخ تھے۔ ہر رخ سے تین چشمے جاری ہو گئے بنی اسرائیل کے قبائل کی تعداد کے برابر تا کہ خود پانی پینے اور اپنے جانوروں کو پلانے کے وقت کوئی ہجوم اور جھگڑا نہ ہو۔ اور اس جھگڑے اور مزاحمت کو دور کرنے کیلئے چشموں کی تفریق ایسے نہیں ہوئی کہ جیسا بھی اتفاق ہوا ایک قبیلہ ایک چشمے سے پانی پیئے اور دوسرے دن یہ قبیلہ دوسرے چشمے سے بلکہ چشموں کو بھی معین کر دیا گیا۔ تا کہ ہر روز ہر قبیلہ پانی پینے کیلئے اسی چشمے پر آئے یہاں تک کہ

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ تحقیق بنی اسرائیل کے قبائل میں سے ہر قبیلے نے اپنی پانی پینے کی جگہ جان لی تھی۔ کہ پتھر کے فلاں رخ اور فلاں طرف سے ہمارا چشمہ ہے۔ اور غیبی پانی کے بہنے میں فرق اور اختلاف اس بنا پر تھا کہ ان کا ایک گھاٹ پر اجتماع حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات ظاہری میں باوجودیکہ آپ انہیں ایک مشرب پر جمع کرنے والے تھے ان کی استعداد میں کمی کی وجہ سے ممکن نہ ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد کہ ان ظاہری جمعیت کی صورت درہم برہم ہو گئی۔ ایک شریعت پر ان کا اجتماع کیا امکان رکھتا ہے؟

جواب طلب سوال

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ فَانْفَجَرَتْ کا عطف قُلْنَا پر نہیں ہو سکتا کیونکہ حرف فا تعقیب مع الوصل کیلئے ہے۔ اور چشموں کا جاری ہونا قول مذکور کے ساتھ متصل نہ تھا تو لامحالہ کسی محذوف پر عطف ہو گا یعنی فَضَرَبَهٗ بِعَصَاهُ فَانْفَجَرَتْ اس حذف کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حذف میں اس بات پر دلالت ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معصوم ہونے کی وجہ سے اس حکم کو بجالانے میں توقف نہ فرمایا۔ اور جو فرمان ہوا فی الفور اس پر عمل کیا۔ اور ان کا امر الٰہی کی تعمیل کرنا اس حد تک قطعی اور یقینی تھا کہ ذکر اور صراحت کی حاجت نہیں رکھتا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ان کے معصوم ہونے کی وجہ سے حکم الٰہی عموماً تعمیل کے ذکر سے بے نیاز ہوتا ہے۔

نیز بعض ارباب وقت پوچھتے ہیں کہ اس سورت میں فَانْفَجَرَتْ واقع ہوا اور سورت اعراف میں فَانْبَجَسَتْ جبکہ انفجار شدت کے ساتھ جاری ہونا ہے۔ اور انبجاس قلیل بوندا باندی کا نام ہے۔ یہ فرق کس لئے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ پہلے انبجاس تھا اس کے بعد انفجار۔ اور اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے پروردگار سے پانی مانگنا مذکور ہے۔ اور وہ زیادہ قوی ہے اس سے کہ امت اپنے نبی علیہ السلام سے پانی مانگے ناچار کام کی انتہا جو کہ انفجار ہے۔ اور مکمل قبولیت اور عام عنایت پر دلالت کرتا ہے مناسب ہوا۔ اسی لئے فقلنا جو کہ قول صریح کا مدلول ہے اس سورت میں لائے۔ اور سورت اعراف میں چونکہ بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگنا ذکر ہوا تو قبولیت کی ابتداء جو کہ قلیل بوندا باندی ہے کا ذکر کافی تھا اور اسی لئے وہاں لفظ اوحینا لائے جو کہ خفیہ اشارہ کے معنوں میں ہے۔ قصہ مختصر اس نعمت پر ان سے نافرمانی سے پرہیز کے سوا کوئی شکر طلب نہ فرمایا۔ اور فرمایا۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کھاؤ آسمانی کھانا جو کہ من و سلویٰ ہے۔ اور پیو پتھر کے چشموں سے جو کہ تم نے خود نہیں بنایا بلکہ تمہارے پاس پہنچتا ہے مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ خاص اللہ تعالیٰ کی روزی سے جو کہ اسباب کے وسیلہ اور کسی تگ و دو کے بغیر آتی ہے۔ اور اس کھانے اور پینے میں

اس کی نافرمانی نہ کرنا۔ بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مدد بنالینا اور اللہ تعالیٰ کے کرم اور مہربانی کی دلیل سمجھنا۔

وَلَا تَعْثَوْا اور تباہ کاری مت کرو ایسی کہ اس کا اثر سرایت کرے فِی الْاَرْضِ زمین [illegible] حالانکہ تم تفرقہ اور اختلاف کا سبب ہوئے ہو مُفْسِدِیْنَ یعنی فساد کرنے والے۔ لیکن [illegible]ی تمہارا فساد تمہارے دلوں میں چھپا ہوا ہے۔ اور تمہاری استعداد کو خراب کرنے کا موجب ہے۔ اس کا اثر زمین پر نہیں پہنچا اور تمہارے افعال میں ظاہر نہیں ہوا اگر تم احتیاط نہ کرو گے یہی فساد پوری شدت سے ظاہر ہو جائے گا۔ اور ایک جہان کو خراب کر دے گا۔ پس اے بنی اسرائیل معلوم ہوا کہ تمہارے اسلاف کے حق میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان کے مزید فساد کا سبب ہوئی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پیغمبر علیہ السلام کی بعثت کی وجہ سے ان کا زیادہ حال فساد تک پہنچا۔

دو سوالات اور ان کے جوابات

پہلا سوال یہ ہے کہ لَا تَعْثَوْا عثی سے مشتق فعل کا صیغہ ہے۔ اور عثی کا معنی فساد میں مبالغہ کرنا ہے۔ پس اس کے بعد مفسدین کا ذکر تکرار ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لاتعثوا فعل کا صیغہ ہے جو کہ فساد کے پیدا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور مفسدین جو کہ اسم کا صیغہ ہے اس کے ثابت رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ تو حاصل کلام یہ ہوا فلا تحدثوا المبالغة فی الافساد حال کونکم ثابتین فی الافساد یعنی فساد کرنے میں مبالغہ نہ کرو ان حال کہ تم فساد پیدا کرنے میں ثابت قدم ہو۔ گویا یوں فرمایا ہے کہ مطلق فساد سے پرہیز خود تم سے ممکن نہیں۔ کیونکہ فساد نے تمہارے دلوں میں اثر و نفوذ کر رکھا ہے۔ البتہ احتیاط کرو تا کہ وہ فساد زیادہ نہ بڑھ جائے۔ اور مبالغہ کی حد تک نہ پہنچنے پائے اور تفسیر میں اس کی وجہ گزر چکی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ظاہر کے اعتبار سے یوں مناسب معلوم ہوتا تھا کہ بادل کے سائبان اور من وسلویٰ اتارنے کے ساتھ ساتھ پتھر سے پانی کے چشمے جاری کرنے کو بھی ذکر فرمایا جاتا تا کہ دوران سفر ان کی ضروریات کو کھانے پینے اور سایہ حاصل کرنے کے ساتھ

ایک جگہ ذکر کر دیا جاتا کیونکہ سب ایک ہی جنس سے ہیں اس نعمت کو مستقل بیان کرنا اور بادل کے سائے اور من وسلویٰ اتارنے کو ایک جگہ لانا اور نعمت کے بقیہ میں صاعقہ کے عذاب سے نجات کو داخل کرنے میں کیا نکتہ ملحوظ رکھا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ان پر صاعقہ آسمان کی طرف سے اور سفید ابر کے درمیان سے جو کہ نور کا بادل تھا گری تھی۔ اور اس آفت سے نجات کی نعمت کے بقیہ میں اس بات کا ذکر کہ ہم نے اسی بادل کو جو کہ ہلاکت کا سبب ہوا تھا۔ اور اسی آسمان کی جو کہ اس آفت جان کا مصدر تھا ازراہ کرم وعنایت تمہارے کام میں لگا دیا یہاں تک کہ اس بادل سے سورج کی گرمی سے تمہاری حفاظت کی۔ اور اس آسمان نے تم پر من وسلویٰ برسایا مناسب معلوم ہوا۔ بخلاف پتھر سے چشمے جاری کرنے کی نعمت کے کہ وہ زمینی نعمت تھی نہ کہ آسمانی اور بادل اور آسمان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ نیز پتھر سے چشمے جاری کرنے کی یہ نعمت اگرچہ بظاہر نعمت تھی۔ لیکن انکے دلوں کے اختلاف اور تفرقہ کی دلیل ہو گئی تھی۔ پس وہ ایک مستقل واقعہ تھا اور اس چیز کی سند کہ ان میں آراء کا اختلاف اور تفرقہ کے محرکات پیدا ہوں گے۔ اور ان کی وجہ سے فساد کا مصدر ہو جائیں گے بخلاف بادل کے سایہ کرنے اور من وسلویٰ کے اتارنے کے کہ ان میں وہ سب شریک تھے۔ اور کسی وجہ سے بھی اختلاف وتفرقہ نہیں رکھتے تھے ، اسی لئے اس نمت کے ذکر پر نعمتوں کی گنتی ختم فرمائی اور آگے ان کی استعداد کی کمی۔ انبیاء علیہم السلام سے ان کا اختلاف اور نافرمانی دوں ہمتی اور پستی کی طرف میلان جو کہ ان سے بار بار رونما ہوتا تھا بیان فرمایا ہے۔ اور ارشاد ہوتا ہے کہ مذکورہ نعمتیں ان کے حق میں اس [illegible]ت سے کفر اور تفرقہ کا موجب ہو گئی تھیں کہ وہ نعمتیں سب آسمانی امور اور غیبی خصوصیات تھیں۔ ان امور پر صبر کرنا ان پر ناگوار اور بوجھل ہو گیا کیونکہ طبعی طور وہ پست زمینی امور کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ اور بلندی ہمت سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا تھا چنانچہ یہی نکتہ سمجھانے کیلئے چند واقعات کی یاددہانی کرائی جاتی ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ تم نے کہا اے موسیٰ! اور اس ندا میں تم نے کمال بےادبی تھا۔ کیونکہ تم نے کہا لَنْ نَّصْبِرَ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے۔ اور اس قسم کا

کلام اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ ہم صبر کر سکتے ہیں۔ لیکن اپنے اختیار کے باوجود نہیں کرتے ورنہ لن نستطیع الصبر یا لا یمکن منا الصبر کہنا چاہئے تھا۔

عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ ایک جنس طعام پر جو کہ آسمان سے آتا ہے چند وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ یہ آسمانی کھانا ہے۔ کیونکہ اگر من ہے۔ تو دراصل شبنم ہے۔ اور ہوا کے بعض طبقوں میں ذائقہ اور مزاج پیدا کر کے گری ہے۔ اور سلویٰ ہے۔ تو بھی ایک اڑنے والا جانور ہے۔ جسے ہوا نے چلا کر ہمارے سامنے ڈال دیا اور یہ زمین کی مخلوق سے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ اس چیز سے غذا میسر آئے جس پر زمین کا حکم غالب ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک قسم کا کھانا کھانے سے بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ اور نظام ہضم کمزور ہو جاتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ کھانا خلاف عادت تھا اور عادت کے خلاف کھانا اگرچہ کتنا ہی اعلیٰ اور اچھا ہو اتنا مرغوب نہیں ہوتا جتنا کہ وہ کھانا جس کی عادت ہو چکی ہو اگرچہ ادنیٰ اور عام سا ہو یہی وجہ ہے کہ کسانوں کو اہل شہر کا کھانا اور لذیذ چیزیں مرغوب نہیں ہوتیں اور وہ اس سے سیر نہیں ہوتے اگرچہ بطور تفریح طبع دو ایک بار استعمال کی ہو۔

یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ من اور سلویٰ دو کھانے تھے ایک طعام کیوں فرمایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وحدت سے مراد فرد یا جنس کی وحدت نہیں۔ بلکہ وحدت تکرار ہے کہ ہر روز وہی کھانا آتا ہے۔ اگرچہ دو جنس ہوں۔ ہر روز جنس سے دوسرا فرد آتا تھا۔ اور عرف میں رائج ہے کہ تکرار سے آنے والا کھانا اگرچہ مختلف قسموں کا ہو بغیر تبدیلی کے ایک کھانا ہی کہلاتا ہے۔ اور اس وحدت اعتباری کو وحدت حقیقی کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔

اور بعض مفسروں نے کہا ہے کہ جب طعام سالن کے ساتھ ملایا جائے تو ایک طعام ہو جاتا ہے۔ جیسے بھنا ہوا گوشت اور ابلے ہوئے چاول یا دال اور ابلے ہوئے چاول اور دودھ چاول اور روٹی کباب لیکن اس جواب میں ایک الجھن ہے۔ کیونکہ من اور سلویٰ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہ تھے تاکہ ایک کو کھانا اور دوسرے کو اس کا سالن قرار دیا جا سکے۔ قصہ مختصر بنی اسرائیل اس کھانے کو مسلسل کھانے سے عاجز آ کر کہنے لگے۔

فَادْعُ لَنَا۔ پس ہماری آسانی کیلئے دعا فرمائیں رَبَّكَ اپنے پروردگار سے کہ

دراصل اس کی پرورش اور عنایت آپ کے حال کی طرف متوجہ ہے۔ اور آپ کے پیچھے ہماری بھی پرورش ہو رہی ہے۔ اور اس اضافت میں بھی بے گانگی کی بو آ رہی ہے۔ کیونکہ فادع لنا ربنا نہیں کہا۔

یُخْرِجْ لَنَا ہمارے کھانے کیلئے نکالے۔ کاشتکاری' آبیاری اور گاہنے کے ظاہری اسباب کے بغیر کیونکہ سفر اور پریشانی کی حالت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرنے کے ساتھ یہ چیزیں ممکن نہیں ہیں۔ پس چاہئے کہ خلاف عادت جس طرح من وسلویٰ آسمان سے برستا ہے ہمارا لشکر جہاں بھی جائے وہاں ہم موجود اور مہیا پائیں۔

مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ اس سے جسے زمین اگاتی ہے مِنْ بَقْلِهَا اس کی ساگ سبزی سے جیسے خرفہ اور پالک جسے اسفاناخ کہتے ہیں۔ اور میتھی جسے حلبہ کہتے ہیں۔ اور شبت جسے سویہ کہتے ہیں۔ کھانے کی سبزی دو قسم پر ہے۔ ایک قسم وہ جسے کچا کھانا بھی رائج اور مشہور ہے۔ جیسے نعناع یعنی پودینہ کریزہ یعنی دھنیا' کرنس یعنی اجمود (مشہور دانہ جو دوا کے طور پر استعمال ہوتا ہے) جرجیر یعنی ترہ تیزک اور کراث یعنی گندنا (ایک قسم کا ساگ) اور اس قسم کی سبزیوں کو احرار البقول کہتے ہیں۔ اور ایک قسم وہ جسے پکا کر کھاتے ہیں نہ کہ کچا' جیسے میتھی' پالک اور سویہ وغیرہ اور ساگ اور سبزی کو طلب میں اس لئے پہلے رکھا کہ کھانا نہ ملنے کے وقت جو چیز جلدی نفع دینے والی اور زمین کی جنس سے ہے یہی جنس ہے۔ اس لئے کہ خود بھی دانہ اور غلہ اور میوہ کی انتظار کے بغیر کھائی جاتی ہے خصوصاً احرار البقول جنس جوش دینے اور نمک ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں ہے نقد سودا ہے۔

وَقِثَّائِهَا اور اس زمین کے کھیرے ککڑیاں' خواہ لمبی ہوں جسے ککڑی کہتے ہیں۔ اور چھوٹی جسے (بادرنگ) کہتے ہیں۔ اور یہ جنس بھی کچی کھائی جاتی ہے۔ اور غذا کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اور پکا کر روٹی کے ساتھ سالن کے طور پر بھی کام آتی ہے۔ اور اس کے ظاہر سے عمدہ نفع لینا ہے۔

وَفُوْمِهَا اور اس کی گندم۔ کیونکہ اس کے باطن سے نفع لینا ہے نہ کہ ظاہر سے اور پینے اور پکانے کی محتاج ہے۔

وَعَدَسِهَا اور اس کے مسور ہے کہ ایک دانہ ہے جو کہ گندم کی روٹی کھانے میں مددگار ہوتا ہے۔اور معقول سالن بنتا ہے۔اور اس دانے کا چھلکا اتارنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ چھلکے والے کی لذت بغیر چھلکے کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے بخلاف دوسرے دانوں کے جیسے چنا اور ماش وغیرہ جو کہ چھلکا اتارنے اور صاف کرنے کے محتاج ہوتے ہیں۔

وَبَصَلِهَا اور اس کے پیاز سے جو کہ اپنی مہک سے سارے سالن کی اصلاح کر دیتا ہے۔اور کبھی خود بھی سالن کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

اور بعض مفسرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بصل کی مناسبت کی وجہ سے فوم کا معنی لہسن کیا ہے اس بنا پر کہ یہ اصل میں کلمہ ثوم تھا اور ثا کو فا سے بدل دیتے ہیں۔اور اس کے برعکس بھی۔ جیسا کہ فروغ الدلو میں ثروغ الدلو کہتے ہیں۔اور جدث جس کا معنی قبر ہے جدف کہتے ہیں ورنہ فوم جو کہ اصل میں فا رکھتا ہے گندم کے معنوں میں ہے۔ابو محجن ثقفی نے کہا ہے کہ قد کنت احسبنی کاغنی واحد قدم المدنیة عن زراعته فوم اور عرب گندم کی روٹی مانگنے کی جگہ یہ کہتے ہیں فوموا لنا یعنی ہمارے لئے گندم کی روٹی پکاؤ اور اس کا عدس یعنی مسور کے متصل ہونا اور بصل سے جدا ہونا بھی دلالت کرتا ہے کہ فا اصلی ہے اور گندم کے معنی میں ہے۔ہاں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں فومہا کی بجائے ثومہا آیا ہے۔اور اس قرأت میں لہسن متعین ہے۔

ابوبکر ابن ابی الدنیا نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ فرماتے تھے مجھے زید بن ثابت کی قرأت پسند ہے مگر سولہ مقامات میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت اختیار کرتا ہوں اور ان میں سے مِنْ بَقْلِهَا وَ قِثَّائِهَا وَثُوْمِهَا پڑھتا ہوں۔اور عبداللہ بن مسعود کی قرأت سے اس حرف کو اختیار کرنے کا سبب آپ کا شبہ ہے جو کہ دل میں آیا ہے۔اور یہ شبہ پچھلے مفسرین کو بھی کھٹکا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کے مطلوبہ کھانوں کو پست' بے وقعت اور ردی فرمایا ہے۔اور ساگ' ککڑی اور مسور البتہ ردی کھانوں میں سے ہیں۔لیکن گندم دانوں میں سے اعلیٰ ہے اسے ردی کھانوں میں کس طرح داخل کیا جا سکتا ہے؟۔پس اس کے سوا کوئی صورت نہیں فاقا

کے بدل میں ہو۔ اور اصل کلمہ ثوم بمعنی لہسن ہے۔ جس کا ردی اور بدبودار ہونا پوشیدہ نہیں۔ اور اس شبہ کا حل یہ ہے کہ گندم کا جوہر فی نفسہ بلاشبہ اعلیٰ غلوں میں سے ہے۔ مگر جب سبزی' پیاز' مسور اور ککڑی کے ساتھ کھائی جائے تو ادنیٰ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ گندم کی روٹی اچھے اور ردی' اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے میں سالن کے تابع ہے جیسا بھی ہو۔ اور اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے جواب میں

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی فرمایا کیا چاہتے ہو کہ ادنیٰ چیز کو اعلیٰ کے بدلے میں لے لو۔ اور قدر و قیمت کے اعتبار سے بھی فائدہ اور نفع کے اعتبار سے بھی اور ذائقہ اور لذت کے اعتبار سے بھی۔

بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اس چیز کے عوض جو کہ ان اعتبارات سے بہتر ہے۔ اور اگرچہ یہ بدل چاہنا فی نفسہ شرعی گناہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اپنے نفس کی خوشی کو قوت دینا ہے۔ لیکن پستی اور دوں ہمتی آخر تمہیں یہاں تک کھینچ لے جائے گی کہ تم آخرت کے بدلے دنیا لے لو گے۔ اور منسوخ شریعت کو مقبول شریعت کے عوض اور ہر مقام پر پستی اور تنزلی کے عادی ہو کر عالی ہمت لوگوں والے کاموں سے پیچھے رہ جاؤ گے۔ پس میں یہ مقصد بارگاہ خداوندی میں پیش نہیں کروں گا کہ یہ مقصد پیش کرنے کے قابل نہیں ہے اگر اس تنبیہ اور جتلانے کے باوجود ان ردی کھانوں کی طلب پر اصرار رکھتے ہو تو اس کا علاج یہ ہے۔

اِهْبِطُوْا مِصْرًا کہ شام کے شہروں میں سے کسی شہر میں قیام کرو۔ اور عاصم کی قرأت میں اس فرعون کا مصر مراد نہیں۔ کیونکہ مصر جو کہ ایک معین شہر کا نام ہے غیر منصرف ہے۔ اس پر تنوین داخل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ فرمایا اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ (الزخرف آیت ۵۱) وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ (یوسف آیت ۹۹) اگرچہ ہند وغیرہ کے قاعدہ کے مطابق اس کا منصرف لانا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ نحو کی کتابوں میں موجود ہے۔

فَاِنَّ لَكُمْ ۔ پس تحقیق تمہارے لئے اس شہر میں میسر ہوگا مَا سَاَلْتُمْ جو کچھ تم نے مانگا ہے۔ مسور اور پیاز سے۔ کسی کی دعا کی ضرورت کے بغیر۔ اور میرے لائق نہیں کہ یہ سوال جناب الٰہی میں عرض کروں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمیشہ پستی کی طرف جھکاؤ اور دوں

ہمتی لازم رہی جب تک عالی ہمت لوگ ان میں موجود رہے۔ جیسے حضرت موسیٰ' حضرت ہارون' حضرت یوشع اور دوسرے عالی مرتبت انبیاء علیہم السلام اور ان کے احکام غالب رہے اس پستی اور کم ہمتی نے کوئی قابل ذکر اثر نہ کیا۔ اور جب بلند ہمت لوگوں کا وجود ان میں سے اٹھ گیا اس طبعی بدبختی کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اور وہ زراعت اور کاشتکاری کی طرف مائل ہوئے۔ اور جانور چرانے کو اختیار کیا۔ اور جہاد قتال اور دشمنوں کے ہاتھوں سے شہروں کو خلاصی دلانے سے جی چرانے لگے یہاں تک کہ گنواروں اور مزارعوں کی طرح ہلکے اور ذلیل ہو گئے۔ اور اس واقعہ نے جالوت کے ان پر غالب آنے اور بخت نصر اور سنجاریب کے حادثے کے بعد پورا رسوخ حاصل کر لیا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۔ اور خیمے کی طرح ان پر ذلت اور غربت مقرر کی گئی۔ ذلت اس جہت سے کہ ہمیشہ کیلئے مسلمانوں اور نصرانیوں کے محکوم رہتے ہیں۔ اور اپنی کوئی حکومت نہیں رکھتے۔ اور غربت' تاوان' باز پرس' جزیہ اور ٹیکس کے باعث جن کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور اگر کسی وقت ان میں سے بعض کو غنی ہونا نصیب ہوتا ہے۔ تو وہ شاہی تاوان کے ڈر سے اپنے آپ کو مفلسوں کی طرح قلاش' گھٹیا لباس پہننے والا اور تنگ دست ظاہر کرتے ہیں۔ تا کہ حکام اسے مالدار سمجھ کر ظلم کا ہاتھ دراز نہ کریں۔ اور یہ ذلت اور فقر ان کیلئے مسلمانوں کی ذلت وفقر کی طرح نہ ہوا جس پر صبر کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا اور درجات کی بلندی کا موجب ہوتا ہے۔ اور جنت میں پہلے داخل ہونے اور حساب کے ہلکا ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ بلکہ اس ذلت وفقر کی وجہ سے وہ زیادہ تر اللہ تعالیٰ کی رضا سے دور جا گرے۔

وَبَآءُوْا اور وہ لوٹے اس مرتبہ بلند سے جو کہ انہیں۔ ان میں انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کے پائے جانے کے طفیل میسر تھا اپنی ذلت وفقر کے ساتھ جس طرح کہ کوئی سفر سے واپس اپنے گھر پہنچتا ہے۔ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ اس غضب کے ساتھ جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں نصیب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا قہر مسلط فرمایا۔ اور ان سے اپنا لطف وکرم ظاہری اور باطنی طور پر روک لیا اور یہی وجہ ہے کہ ان پر کفر مسلط ہے۔ اور ہرگز انہیں ایمان میسر نہیں ہوتا اور انہیں یہ قبیح حالت صرف آسمانی طعام کو زمینی طعام سے بدلنے اور اس کی

مانند ان گستاخیوں اور بے ادبیوں کی وجہ سے جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئیں طاری نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ مدتیں گزر جانے نبوت کے زمانے سے دوری' استعدادیں باطل ہونے اور ان سے سخت قبیح اعمال اور بہت بڑے جرائم صادر ہونے کی وجہ سے خرابی کے مستحق ہوئے۔ جیسا کہ فرمایا:

ذَالِكَ غضب الٰہی کے ساتھ ملی ہوئی یہ ذلت اور فقیر بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے تھے۔ اور وہ ان آیتوں کا جو کہ تورات میں ان کی نفسانی خواہش کے خلاف ہوتی تھیں انکار کرتے تھے۔ اور لفظی یا معنوی تبدیلی کرتے تھے۔ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں اور زبور اور انجیل کو بھی انکار کا نشانہ بناتے تھے یہاں تک آیات قرآنی کے بھی منکر ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے جلووں کی آیات جو کہ ہر پیغمبر علیہ السلام کے ہاتھ مبارک پر معجزات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھیں جادو' کہانت اور استدراج کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور ان پر یقین نہیں کرتے تھے۔

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ اور پیغمبروں علیہم السلام کو قتل کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت شعیا' حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیٰ نبینا وعلیہم السلام کو قتل کیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنے گمان میں انہوں نے تختۂ دار پر کھینچا اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادو کر دیا۔ اور زہر دیا اور جو حیلہ بھی اس پاک نفس کو معاذ اللہ قتل کرنے میں ہو سکا بروئے کار لائے۔ اور حدیث شریف میں جسے امام احمد نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا وارد ہوا کہ اشد الناس عذابا رجل قتله نبی او قتل نبيا او امام ضلالة او ممثل من الممثلين لوگوں میں سے سب سے زیادہ سخت عذاب اسے ہوگا جسے کسی پیغمبر علیہ السلام نے قتل کیا یا جس نے پیغمبر علیہ السلام کو قتل کیا۔ یا گمراہی کا امام جس کے گمراہ کرنے کی وجہ سے بہت سے لوگ گمراہی میں پڑ گئے ہوں۔ یا جاندار کی تصویر بنانے والا۔ پس ان کے حق میں غضب کے اسباب پوری شدت کے ساتھ جمع ہو گئے تھے کہ کفر بھی کرتے تھے۔ اور قتل بھی جو کہ کفر کے بعد کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور قتل کی قسموں میں سے جو بدترین اور ناپاک قسم ہے اختیار کرتے تھے یعنی پیغمبر علیہ السلام کو قتل کرنا۔ جو کہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی ہدایت کو روکنا اور بہترین نعمت کا کفران شدید ہے۔اور فیض کے اس دروازے کو بند کرنا ہے جس سے عام نفع کی توقع تھی اور وہ بھی۔

بِغَيْرِ الْحَقِّ اپنے گمان میں بھی شرعی سبب کے بغیر اس لئے کہ فی نفسہ پیغمبر علیہ السلام کو قتل کرنا بغیر سبب شرعی ہی کے ہوتا ہے۔لیکن کبھی منکر پر طاری ہونے والے شبہ کی وجہ سے اس کا وجہ شرعی کے بغیر ہونا اس کے نزدیک یقینی نہیں ہوتا اور یہاں اس قسم کا شبہ بھی نہ تھا' جان بوجھ کر قتل کرتے تھے۔اور کسی کے ذہن میں یہ معنی بعید از مکان ہو کہ آخر وہ اہل کتاب تھے۔اور حضرت موسیٰ اور دوسرے پیغمبروں علیہم السلام پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے ان سے یہ کیسے ہو سکا کہ بغیر شرعی سبب کے اور بغیر شبہ کے کفر صریح اور پیغمبروں علیہم السلام کو قتل کرنے کا قدم اٹھائیں۔ہم کہتے ہیں۔

ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا یہ کفر اور پیغمبروں علیہم السلام کے قتل پر جرأت انہیں اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے پیغمبروں علیہم السلام کے احکام کی نافرمانی کی۔اور آہستہ آہستہ ان میں نافرمانی کی مہارت پکی ہوگئی۔اور وہ ایک دو نافرمانیوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے کہ ان کا تدارک توبہ اور ندامت کے ساتھ جلد ہو سکتا بلکہ اس نافرمانی میں وہ پورا مبالغہ کرتے تھے۔

وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ اور وہ تھے کہ نافرمانی میں حد سے تجاوز کرتے تھے۔پس گناہوں کو اچھا سمجھتے تھے۔اور جو شخص انہیں گناہوں سے روکتا اور باز رکھتا۔اسے دشمن سمجھتے تھے۔اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جو کہ ان گناہوں کی قباحت پر دلالت کرتی تھیں باطل تاویل کر کے رد کر دیتے تھے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے انہوں نے ان پیغمبروں علیہم السلام کو جو کہ گناہوں سے روکنے میں مبالغہ کرتے تھے قتل کر دیا۔اور کتاب الٰہی کی آیات کا صاف انکار کر دیا۔اور یہ نافرمانی کی نحوست ہے جو کہ آہستہ آہستہ اعتقاد میں بھی فتور بلکہ تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔اور اسی لئے علمائے ربانی نے گناہوں پر ہمیشگی' ان سے لذت حاصل کرنا اور ان کے ارتکاب کا عادی ہونے سے شدت کے ساتھ رد کا ہے۔اس لئے کہ آہستہ آہستہ ان کا اچھا لگنا اور جو ان سے رد کے اس کا برا لگنا دل میں جگہ پکڑ لیتا ہے۔اور نوبت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ شرعی احکام کو برا سمجھتا ہے۔اور یہ اسے کفر کی حد پر پہنچا دیتا ہے۔چنانچہ انہوں

نے فرمایا ہے کہ جس نے مستحبات کو حقیر سمجھا اسے سنت سے محرومی کی سزا ملتی ہے۔ اور جس نے سنت کو حقیر سمجھا اسے فرائض سے محرومی کی سزا ملتی ہے۔ اور جس نے فرائض کو حقیر جانا اسے معرفت سے محرومی کی سزا ملتی ہے۔

چند سوالات اور ان کے جوابات

یہاں چند سوالات باقی رہ گئے جن کے جوابات ضروری ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ ہم ایک قسم کے کھانے پر صبر نہیں کریں گے ہمیں ذائقہ بدلنے اور طبعی خوشی کیلئے زمینی کھانوں میں سے کوئی اور کھانا بھی کھلانا چاہئے۔ تو ان کا مقصد یہ تھا کہ من و سلویٰ کے ساتھ کوئی اور زمینی کھانا بھی آیا ہوتا نہ یہ کہ من وسلویٰ بالکل بند ہو جائے۔ اور اس کے بدلے زمینی کھانا آئے تو ان کا مقصد دونوں کھانوں کو جمع کرنا تھا نہ کہ ایک کو دوسرے سے بدلنے کا مطالبہ۔ ان کی گفتگو کو تبدیلی کی طلب پر کیوں محمول فرمایا گیا۔ اور فرمایا: اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر کہ کیا تم ادنیٰ کو اعلیٰ کے عوض بدلنا چاہتے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے آسمانی کھانے سے اپنی اکتاہٹ تکلیف کو بیان کیا۔ نیز انہوں نے کہا فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا

صریح طور پر معلوم ہوا کہ وہ اس کے بعد یا تو آسمانی کھانا بالکل نہیں کھائیں گے کہ اس سے عاجز آ گئے ہیں یا سیر ہو کر نہیں کھائیں گے۔ بلکہ وہ زمینی کھانے سے پیٹ بھر کر کھائیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ آدمی کا پیٹ اپنی مقرر مقدار کے سوا غذا برداشت نہیں کر سکتا جب بھی ایک کھانے کی کچھ مقدار کھاتا ہے تو اس کے اندازے کے مطابق دوسرے کھانے سے رک جاتا ہے۔ پس کھانے میں ادنیٰ کی تبدیلی اعلیٰ کے ساتھ لازم آئے گی اگرچہ انہوں نے صریح لفظوں میں بیان نہیں کیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ لغت میں ہبوط بلندی سے پستی کی طرف اترنا ہے۔ سفر سے شہر میں آنے کی ہبوط کیوں فرمایا کہ اِهْبِطُوْا مِصْرًا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لشکر جب تک سفر میں ہو اسباب اور سامان اونٹ یا خچر پر لاد کر اور خیمہ اور قناتیں چارپایوں پر رکھ کر سواری پر سوار ہوتا ہے۔ اور جب شہر میں پہنچ جاتا ہے۔ تو ان سب کو بلندی سے پستی کی طرف منتقل کرتا

ہے۔ اور خود بھی سواری سے نیچے آ جاتا ہے اس وجہ سے سفر سے شہر میں واپس آنے کو ہبوط' نزول مقام کرنے اور اترنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیز اس منتقل ہونے میں ان کا معنوی طور پر اترنا بھی تھا کہ بلند ہمتی سے پست ہمتی کی طرف انتقال کرتے تھے۔ اور آسانی کھانے کے بلند مرتبہ سے زمینی کھانے کی پستی میں اترتے تھے۔ لہٰذا لفظ ہبوط بہت مناسب ہوا۔

تیسرا سوال یہ کہ اس سورت میں وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ فرمایا ہے۔ اور حق کو لام کے ساتھ معرف لایا گیا۔ جبکہ سورت آل عمران (آیت ۲۱) میں بغیر حق ارشاد ہوا اور لفظ حق کو نکرہ رکھا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام اہل کتاب کے نزدیک معلوم حق جو کہ قتل کو واجب کرتا ہے تین چیزوں میں سے ایک ہے مرتد ہونا' ناحق قتل کرنا' شادی شدہ ہونے کے بعد بدکاری کرنا۔ پس یہاں جو حق کو معرفہ لایا گیا اس معلوم حق کی طرف اشارہ ہوا جبکہ سورت آل عمران میں بغیر حق کو نکرہ لانے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی نہ تھا۔ نہ یہ معلوم حق اور نہ ان کے گمان کے مطابق کوئی دوسرا حق اور اس سورت میں تخصیص اور اس سورت میں عام کرنے میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس کلام کو لانا بنی اسرائیل کے افعال کی برائی اور قباحت بتانے کیلئے ہے خصوصاً وہ اہل کتاب ہیں ان سے حق معلوم کے بغیر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا بہت قبیح ہے بخلاف سورت آل عمران کے کہ وہاں خاص فرقہ بنی اسرائیل کے متعلق کلام نہیں۔ بلکہ عام طریقے سے ایک قاعدہ کلیہ ارشاد ہوتا ہے۔ اور وہاں حق معلوم کی قید اور تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اگرچہ کبائر پر اصرار کرنا کفر تک کھینچ لے جاتا ہے۔ جیسا کہ یہودیوں کیلئے ہوا لیکن خدا تعالیٰ اور یوم آخرت پر صحیح ایمان لانا کفر کی ساری قسموں کو مٹانے والا ہے۔ اور اگر ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ملا ہوا ہو تو ہر طرح ڈر اور غم کو مٹا دیتا ہے۔ تو کسی کافر کو اور کسی گناہگار کو اپنے ایمان اور توبہ کی قبولیت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے چنانچہ فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تحقیق وہ لوگ جو کہ ایمان لائے۔ زبان کے ساتھ جبکہ دل کی گہرائی سے اس دین کی تصدیق نہیں کرتے اگرچہ ان کا کفر بہت برا ہے۔ کیونکہ کفر کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کو دھوکا دینے کا قصد کرتے ہیں۔ اور ان کی زبوں حالی سورت کی ابتداء میں گزر چکی۔

یہود کی وجہ تسمیہ اور الوہیت و نبوت کے متعلق ان کے عقائد

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اور وہ جو یہودی ہو گئے۔ اگرچہ ان کی برائیاں اعمال میں بھی' اعتقادات میں بھی اور اخلاق میں بھی حد سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ ان کا بڑا کفر یہ کہ حضرت حق جل مجدہ کو انسان کی شکل میں جسمانی اعتقاد کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ذات جسمیت سے پاک ہے۔ لیکن اس کا کسی جسم کے ساتھ تعلق لازمی ہے۔ بغیر جسم کے ہرگز نہیں رہتا اور جو جسم اسے لازم ہے مثالی نورانی ہے شعاع کی مانند کبھی جمع ہو جاتا ہے کبھی جدا جدا۔ اسی وجہ سے صورت' اونچی آواز' طور سینا پر اترنا' ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا' اپنے ہاتھ سے تورات لکھنا' عرش پر استواء کا معنی پوری طرح قرار پکڑنا' سمت و طرف میں اسے دیکھنا' طوفان نوح علیہ السلام پر رونا' ہنسنا' فکر و غم اور خوشی اور مسرت کو بغیر کسی تاویل کے اللہ تعالیٰ کیلئے جائز قرار دیتے ہیں اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بہت بدگمانی اور نافرمانی کی تہمت لگاتے ہیں حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام کے قتل کی تہمت لگاتے ہیں۔ اور صاف کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ' حضرت ہارون علیہما السلام سے حسد کرتے تھے۔ اور ان میں سے بعض کہتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام (معاذ اللہ) پیغمبر نہ تھے بلکہ ولی تھے اور ولایت کو نبوت سے افضل جانتے ہیں۔ اور ان کے خیال میں یہ بات جم گئی ہے کہ نبوت کا معنی صرف ایلچیوں کا کام کرنا اور خدا تعالیٰ کی پیغام رسانی ہے۔

(یہی عقیدہ مودودی کا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہودی اور مودودی کا عقیدہ اس بارے میں ایک ہے)

اور اس خدمت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب حاصل کرنا مراد نہیں۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبوت میں شریک نہیں مانتے۔ بلکہ ان کا خلیفہ کہتے ہیں۔ اور بچھڑا بنانے کی نسبت (معاذ اللہ) حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اوریا کے قتل کی تہمت بھی لگاتے ہیں۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو طلسمات' منتر اور جنوں کی تسخیر والا مانتے ہیں۔ اور انبیاء علیہم

السلام پر رجعت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور تورات کی ان آیات کی جھوٹی تاویل کرتے ہیں جو کہ پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچا ہونے پر صحیح دلالت کرتی ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان کے قبضہ اور حکومت کا اشارہ ہے نبوت و رسالت کا نہیں۔ شریعت کے منسوخ ہونے کو بالکل جائز نہیں سمجھتے۔ بلکہ شریعت الٰہیہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں منحصر خیال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کوئی شریعت نہ تھی نہ ان کے بعد کوئی شریعت ہوگی۔ اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ اور حضرت مریم کے بارے میں جھوٹی تہمتیں بیان کرتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے لئے یہود کا لقب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو سے گھڑا ہے کہ آپ نے مناجات اور دربار خداوندی سے رحمت طلب کرنے کے وقت **انا ھدنا الیك** (الاعراف آیت ۱۵۶) فرمایا یعنی ہم نے تیری طرف توبہ اور رجوع کیا۔

وَالنَّصَارٰی اور نصاریٰ کو جو کہ دراصل نصران کی جمع ہے۔ جیسے سکاری بمعنی ناصر اور یہ لقب نصرانیوں پرستوں نے اپنے لئے خود مقرر کیا ہے۔

نصاریٰ کی وجہ تسمیہ اور ان کے عقائد کا بیان

اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام نے یہود سے مدد مانگنے کے وقت فرمایا تھا۔ من انصاری الی اللہ اور حواریوں نے ان کے جواب میں کہا تھا **نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ** ۔ اور یہ فرقہ بھی اعتقاد اور اعمال میں بہت بے وقوف ہے۔ اور ان کی زیادہ تر حماقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور ان کے بدن کے ساتھ ان کی روح کے اتصال کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ پھر ان کے آسمانوں پر جانے اور ان کی روح کے عالم ملکوت سے متصل ہونے کی کفیت کے بارے میں ہے۔ اور ان دو کیفیتوں کے بیان کے حوالے سے ایسے عجیب و غریب کفریات بکتے ہیں کہ کان انہیں سننے سے بہت نفرت کرتے ہیں۔ اور یہ دونوں فرقے آخرت کے حال کے بارے میں بھی کفر کرتے ہیں اکثر یہودی کہتے کہ تورات' زبور اور دوسری آسمانی کتابوں میں گناہوں پر جو عذاب کے وعدے اور خوف دلایا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے علاوہ دوسروں کیلئے ہے۔ بنی اسرائیل اپنے آباؤ اجداد کی

سفارش کی وجہ سے جو کہ قدر والے انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں اس وعدہ عذاب سے کوئی خوف نہیں رکھتے۔ اور اکثری نصاریٰ کہتے ہیں کہ جزا اور پکڑنے کا معاملہ حساب لینے کا مسئلہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سپرد ہوگا بلکہ یوم جزا کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کا دن مانتے ہیں۔ پس اس نسبت سے وہ پورا اطمینان رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے پیروکاروں کو بغیر عبادت کے جنتی نعمتوں سے سرفراز فرمائیں گے۔

صابیوں کے مذہب اور خلاصہ

وَالصّٰبِئِیْنَ اور بے دین لوگ جو کہ کسی آسمانی دین کے پابند نہیں ہیں۔ اور ان کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو سعادت حاصل کرنے کیلئے کسی پیغمبر یا مرشد کی ضرورت نہیں وہ روحانیات جو کہ افلاک' عناصر اور حوالید کی تدبیر کرنے والی ہیں اس کی تکمیل اور ترتیب کیلئے کافی ہیں۔ ہاں آدمی کو چاہئے کہ روحانیات کے ساتھ کوئی مناسبت پیدا کرے تا کہ ان سے فیض لے۔ اور ان روحانیات سے مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے ان کے نام کے مجسمے اور بت بنائے جائیں۔ اور ان مجسموں اور بتوں کی بے حد تعظیم کی جائے۔ اور ان کے سامنے روحانیات اور ان کے اوصاف کے نام کا ذکر کیا جائے اسی وجہ سے اس فرقہ میں سے بعض لوگ سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے ان ستاروں کے نام کی مورتیاں تراشی ہیں۔ اور انہیں اپنا قبلہ بناتے ہیں۔ اور ان میں سے کلدانیین کی یہی روش تھی۔ جن کے مقابلہ کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا گیا۔ اور ان میں حرنانیین اور آبادیاں کا فرقہ اپنے اسلاف میں سے بعض کو پیغمبر بھی مانتے ہیں۔ اور اکثر صابی تین تین وقت نماز پڑھتے ہیں۔ اور جنابت سے غسل کرتے ہیں۔ اور میت کو چھونے کی وجہ سے بھی غسل کو واجب جانتے ہیں۔ اور گدھے' کتے' اڑنے والے جانوروں میں پنجے سے پکڑنے والے جانوروں' اونٹ اور کبوتر کا گوشت اور پیاز' باقلا (لوبیا کی قسم کا ایک دانہ جس کی دال کھائی جاتی ہے) اور سانپ کی شکل کی مچھلی کھانا حرام سمجھتے ہیں۔ شراب پینا جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن شراب سے نشہ کو حرام خیال کرتے ہیں۔ اور ختنہ حرام سمجھتے ہیں۔ اور حاکم کے حکم کے بغیر طلاق کو درست نہیں سمجھتے اور مرد کیلئے ایک سے

زیادہ بیویاں جائز قرار نہیں دیتے اور مجسمے بنانے میں باریکیاں پیدا کرتے ہیں علت اولیٰ، عقل، سیاست، صورت اور نفس جو کہ جواہر عقلیہ روحانیہ ہیں کہ مجسمے گول شکل کے بناتے ہیں۔ جبکہ زحل کا مجسمہ چھ جہتوں والا مسدس، مشتری کا مثلث، مریخ کا مستطیل، آفتاب کا مربع، زہرا کا مربع کے اندر مثلث۔ عطارد کا مثلث کے اندر مستطیل مربع۔ چاند کا مثمن یعنی آٹھ پہلوؤں والا بناتے ہیں قیامت کے منکر ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ قابل سکونت ولاتیوں میں سے ہر ولایت میں چھتیس ہزار چار سو پچیس سال گزرنے پر حیوان کی ہر نوع سے ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک جوڑا انسان کا بھی۔ پس ہر نوع اس مدت تک باقی رہتی ہے۔ اور جب دور پورا ہو جاتا ہے انواع ختم ہو جاتی ہیں پھر دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور انواع پیدا ہوتی ہیں۔ مردوں کے زندہ کرنے اور قبروں سے اٹھنے کا انکار کرتے ہیں۔ اور جزا اور سزا کو انہیں زمانوں اور اوقات میں تناسخ کے طور پر جانتے ہیں۔

قصہ مختصر ان چار قسم کے گروہوں میں ہر ایک نے راہ حق سے بہت دور ہونے کی وجہ سے گویا خراب، بدبودار کھانے کا حکم حاصل کر لیا ہے کہ ظاہری طور پر اس کی اصلاح کی کسی وجہ سے امید نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کامل مہربان ہے کہ

مَنْ اٰمَنَ ان میں سے جو بھی تہہ دلی اور اخلاص کے ساتھ ایمان لایا بِاللّٰہِ اللہ تعالیٰ پر تشبیہ، تعطیل اور شریک ٹھہرائے بغیر وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اور آخرت کے دن پر بھی ایمان لائے جو کہ روز جزا ہے۔ اور اس دن پر ایمان لائے بغیر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا پورا نہیں ہوتا اس لئے کہ جو شخص اس دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی ہمیشگی، عموم قدرت اور اس کے کمال حکمت و عدل کا منکر ہے۔ اور کتابوں، رسولوں علیہم السلام اور فرشتوں پر ایمان لانا ان دونوں ایمانوں کو لازم ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں ایمان پیغمبروں اور فرشتوں علیہم السلام کے واسطے کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔ اور آسمانی کتابوں کے بغیر اس کا علم باقی نہیں رہ سکتا اس وجہ سے ان تین چیزوں پر ایمان لانے کی صراحت نہیں فرمائی۔

اور فی الواقع جسے بھی دنیا و آخرت پر کما حقہ ایمان نصیب ہوا رسل علیہم السلام، فرشتوں اور کتابوں کے واسطے کے بغیر نہ ہوا اور صرف مبدء، دنیا، آخرت اور واسطوں پر ایمان لانا

اگرچہ نجات کی امید میں بہت اثر رکھتا ہے۔ لیکن کلی طور پر نجات کیلئے ایک اور چیز بھی چاہئے چنانچہ فرمایا ہے وَعَمِلَ صَالِحًا اور درست عمل کئے۔ اور درست عمل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ناسخ کو قبول کرے۔ اور منسوخ کو چھوڑ دے اور عقلی مصلحتوں کے مقابلہ میں احکام الٰہیہ کو ترجیح دے۔ اور جب ان چاروں فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ اس قانون کے مطابق صحیح ایمان لایا۔

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ۔ پس ان کیلئے ان کا پورا اجر ہے کہ اپنی ابتدائے ولادت سے لے کر اس وقت تک ہمیشہ کیلئے اختیار کرتے بھی اجر پاتے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کے پروردگار کے ہاں جو کہ ان کے ایمان اور عمل کی تربیت فرماتا ہے یہاں تک کہ ایک لمحہ کے ایمان اور ایک ساعت کے عمل کو ساری عمر کے کفر اور فسق کو مٹانے والا بنا دیتا ہے۔ اور اپنی اچھی تربیت سے ساری عمر کے ایمان اور عمل صالح کی مقدار تک پہنچا دیتا ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ اور ان پر کوئی خوف نہیں ہے۔ سابقہ کفر کے اثر کی وجہ سے کہ کہیں اجر میں نقصان کا موجب ہو۔ کیونکہ ان کے ناقص المدت ایمان کو لاحق ہونے والے ان کے عمل نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی وجہ سے تدارک فرمایا اور پورا کر دیا۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ غمگین ہوں گے ایام کفر میں عمل صالح فوت ہونے کی وجہ سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور حسن تربیت سے عمل لاحق نے اس کا تدارک کر لیا۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ اس سورت میں نصاریٰ کو صابئین سے پہلے بیان کیا۔ جبکہ سورۃ الحج میں اس کے برعکس صابئین کو نصاریٰ سے پہلے رکھا (آیت ۱۷) اور سورت مائدہ میں لفظاً پہلے رکھا اور تقدیراً پیچھے (آیت ۶۹) کیونکہ وہاں کلام کی تقدیر والصابئون کذالک ہے۔ اسلوب بیان کے گوناگوں ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں گفتگو بنی اسرائیل کے ساتھ ہے۔ اور خطاب اہل کتاب کے ساتھ اور نصاریٰ اصل میں بنی اسرائیل سے ہی نکلے ہیں۔ اور اہل کتاب ہیں۔ شرافت کی وجہ سے پہلے ہو گئے۔ اور سورت حج میں اہل حق کے ساتھ گمراہ فرقوں کے

اختلاف کو ختم کرنے کا بیان ہے۔ تو جن کا جھگڑا اور اختلاف زیادہ تھا مقدم ہو گئے۔ اور اسی لئے یہودیوں کو اس سورت میں صابیوں پر مقدم فرمایا۔ حالانکہ زمان کے اعتبار سے صابی ان سے پہلے ہیں اس وجہ سے کہ زیادہ تر یہودی مسلمانوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے تھے۔ اس کے بعد صابی جو کہ کسی دین اور شریعت کے شناسا نہ تھے۔ اس کے بعد نصاریٰ جو کہ اکثر رسولوں اور کتابوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے۔ اس کے بعد مجوسی کہ انہیں کتاب کا شبہ ہے۔ اس کے بعد مشرکین جو کہ اصلاً کتاب کے مدعی نہیں ہیں۔ اور تمام دینوں کے مخالف ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ صابی اگرچہ موحد ہیں۔ اور کسی وجہ سے بھی شرک نہیں کرتے لیکن ذات الٰہی کے روحانیات میں اترنے اور روحانیات کے اشخاص اور جسموں میں اترنے کا قول کرنے میں نصاریٰ کے پیشوا اور ان کے مقتدا واقع ہوئے ہیں گویا نصاریٰ ان سے سیکھنے کی وجہ سے حلولی مذہب والے ہو گئے ہیں۔ بخلاف یہود کے کہ ان کا مذہب حلول سے دور ہے۔ تو صابیوں کے استاذ ہونے اور نصاریٰ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے صابیوں کا ذکر پہلے لایا گیا۔

اور سورت مائدہ میں دونوں امروں کی رعایت کی گئی ہے کہ لفظاً پہلے اور معنی میں پیچھے کیا گیا۔ اور وہ جو وہب بن منبہ سے ابن ابی حاتم کی تفسیر میں مروی ہے کہ صابی وہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانتا ہے۔ اور اس کے پاس کوئی شریعت نہیں جس پر عمل کرے۔ اور اس نے کفر نہیں کیا۔ اور اسی تفسیر میں ابو الرماد سے ہے کہ صابی عراق سے متصل ایک قوم ہے تمام نبیوں علیہم السلام کے منکر ہیں۔ یہ اس کے مطابق ہے جو تفسیر میں مذکور ہوا اور پرانے مفسروں سے اس قول کے علاوہ کئی اقوال صابئین کے مذہب کے بارے میں منقول ہیں۔ لیکن کوئی بھی اس کے مطابق نہیں جو کہ ارباب مقالات اور مذاہب والوں نے لکھا ہے۔

ان میں وہ ہے جو سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ صابیہ نصرانیت اور مجوسیت کے درمیان ایک مرتبہ ہے۔ اور ابوالعالیہ سے منقول ہے کہ صابی اہل کتاب میں سے ایک قوم ہے۔ اور قتادہ سے منقول ہے کہ صابی وہ قوم ہیں جو ملائکہ کی پوجا کرتے ہیں۔ قبلہ سے ہٹ کر نماز پڑھتے ہیں۔ اور زبور پڑھتے ہیں۔

یہاں جاننا چاہیے کہ جس طرح کہ اس آیت کا مضمون ہر کافر سے ایمان اور عمل صالح کی قبولیت پر دلالت کرتا ہے۔ اگر چہ وہ کفر اور فسق کی انتہائی قبیح قسموں کا مرتکب ہو چکا ہو۔ اسی طرح اس آیت کا مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس حقیقت پر ایمان لانا واجب ہے اس کے بعض پر ایمان لانا نیز کفر اور صحیح مکمل ایمان نہ ہونے کی حالت میں تمام طاعتیں خواہ بدنی ہوں یا مالی قبول نہیں۔ جس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے اس وقت ارشاد فرمایا تھا جبکہ سلمان فارسی مسلمان ہوئے۔ اور آپ نے بارگاہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نصاریٰ کے راہبوں کا حال' ان کی مشقت طلب عبادتیں اور ان کی خلاف عادت چیزیں جو کہ وہ رکھتے تھے بیان کیں۔ اور اس آیت نے حضور علیہ السلام کے قول کی تصدیق کی۔ اور ابن جریر نے مجاہد سے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے قصہ میں جو کہ بہت طویل ہے کہا کہ حضرت سلمان نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان نصرانیوں اور ان کے اعمال کے متعلق جو دیکھے تھے پوچھا تو آپ نے فرمایا وہ اسلام پر نہیں مرے۔ سلمان کہتے ہیں کہ مجھ پر زمین تاریک ہو گئی۔ اور مجھے ان کے مجاہدے یاد آئے تو یہ آیت کریمہ اتری اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا الخ آپ نے سلمان کو بلایا اور فرمایا یہ آیت تیرے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہے پھر فرمایا جو میرے متعلق سننے سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر مر گیا تو وہ خیر پر ہے۔ اور جس نے میرے متعلق سنا اور مجھ پر ایمان نہ لایا وہ ہلاک ہوا۔ قصہ مختصر بنی اسرائیل نے نعمتوں کے اس تبادلہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی شروع کر دی تھی اور آخر کھل کر مخالفت ظاہر کر دی۔ چنانچہ ان سے مخالفت کے ظاہر ہونے کو یاد کرایا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پکا وعدہ لیا۔ اس بات کہ تم تورات کے مشکل احکام کو قبول کرو گے۔ اور احکام کی اطاعت سے گردن نہیں پھیرو گے۔ اور جب تم نے دیکھا کہ تورات کے احکام بہت مشکل اور بھاری ہیں تو ان ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے تم نے انکار کر دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے تم نے پورے مبالغہ اور تاکید کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ ہمارے پاس کوئی شریعت

اور دین نہیں ہے چاہئے کہ ہمارے لئے ایک کتاب آئے۔ اور اس کتاب میں شریعت کے قواعد اور طاعت وعبادت کا قانون تفصیلاً مذکور ہو۔ تاکہ اس کے مطابق ہر عمل کریں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چند بار تم سے تاکیدی عہد و پیمان پختہ کیا تھا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب جو کہ ذمہ داریوں اور احکام پر مشتمل ہو لے آؤں تو تم اسے ضرور قبول کرو گے۔ اور جب تم نے اس کتاب کے آنے کے بعد اسے قبول کرنے میں توقف کیا۔ اور عہد و پیمان پورے کرنے سے کنارہ کشی کی تو ہم نے تمہیں مجبور کر کے قبول کرایا کہ

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ اور ہم نے تمہارے سروں پر پہاڑ بلند کیا۔ اور طور لغت میں اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اور درخت ہوں۔ جیسا کہ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ **الطور ماينبت من الجبال وما لم ينبت فليس بطور** پہاڑوں میں سے طور وہ ہے جس پر سبزہ آگے۔ اور جس پر سبزہ نہیں اگتا وہ طور نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک معین پہاڑ مراد ہے۔ اور وہ وہی پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی تھی۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا تو وہ اس پہاڑ کو اس کی جگہ سے اپنے پروں پر اٹھا لائے اور بنی اسرائیل کے لشکر کے سروں کے مقابل آدمی کے ایک قدم کے برابر رکھا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت لشکر گاہ کا طول ایک فرسنگ اور عرض ایک فرسنگ تھا اور پہاڑ کی مقدار بھی اتنی ہی تھی۔ جب بنی اسرائیل نے اپنے سروں پر پہاڑ کو دیکھا تو ڈر گئے اور سجدے میں گر گئے۔ لیکن پیشانی کی ایک طرف کے ساتھ سجدہ کیا۔ اور دوسری طرف سے آنکھ کو پہاڑ کی طرف کر کے دیکھتے تھے کہ کہیں ہمارے سروں پر گر پڑے۔ اس وجہ سے سجدہ کرنے کا طریقہ بنی اسرائیل میں اسی طرز پر قرار پایا تاکہ اس ہولناک حالت کی یاد دہانی کرانے والا ہو۔ اور پہاڑ کو تمہارے سروں پر کھڑا کرنے کے بعد ہم نے کہا

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ پکڑو اسے جو ہم نے تمہیں دیا۔ تورات میں درج مشکل ذمہ داریوں سے جو کہ حقیقت میں ہماری عطا ہے۔

بِقُوَّةٍ پوری کوشش کے ساتھ۔ جس طرح کہ دنیا کی کمائیوں میں کوشش کو آخری حد

تک پہنچا دیتے ہو۔ اور دنیا کے تھوڑے سے سامان کیلئے دنیوی سختیاں برداشت کرنے میں جدوجہد کرتے ہو۔ کیونکہ یہ تکلیفیں عقل سلیم والوں کے نزدیک ان سختیوں سے کہیں زیادہ ضروری اور پسندیدہ ہیں۔ پس جب تمہارے اسلاف نے اس چیز کو جسے پورے مبالغہ اور تاکید سے طلب کیا تھا اور مشکل ہونے اور ناگوار ہونے کی وجہ سے انہوں نے انکار کر دیا یہاں تک کہ ان کے اوپر پہاڑ گرانے کے ساتھ ہم نے ڈرایا اور انہیں مجبوری کی حد تک پہنچا دیا۔ تم سے کیا بعید ہے کہ اس پیغمبر علیہ السلام کی پیروی رشوتوں اور نذر و نیاز کے ختم ہونے کی وجہ سے جو کہ تم جاہلوں سے لیتے تھے۔ اور اپنی سرداری اور مرتبے کے درہم برہم ہونے کی وجہ سے ترک کر دو اور انکار کر دو حتیٰ کہ ہم تمہیں قتل' لوٹ مار' قید اور جلاوطنی سے ڈرائیں۔ تم اس کی اطاعت نہ کرو۔ حالانکہ اگر غور کرو تو اس رسول علیہ السلام کی پیروی بھی ان ذمہ داریوں میں سے ہے جو تم نے اس پہاڑ کے نیچے قبول کی تھیں۔ اور اسی لئے ہم نے تم سے صرف تورات کے ظاہر پر عمل کرنے کے عہد پر اکتفانہ کی بلکہ ہم نے کہا تھا۔

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ اور بار بار یاد کرو ان اسرار و فوائد اور باطنی حکمتوں کو جو کہ ان تکلیفات کے اندر ودیعت رکھی گئی اور پوشیدہ ہیں۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ہوسکتا ہے کہ تم اس ذکر و فکر کی وجہ سے تقویٰ کا مرتبہ حاصل کرو اور ہر زمان اور ہر زبان میں جو رسول علیہ السلام تشریف لائیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت سے پرہیز کرو۔

ایک قوی الجھن

یہاں ایک قوی الجھن باقی رہ گئی اور وہ یہ ہے کہ تکلیفات الٰہیہ کی بنیاد بندوں کے اختیار پر ہے۔ اور ان تکلیفات کو قبول کرنے پر مجبور کرنا مکلف کرنے کی غرض کے خلاف ہے۔ کیونکہ بندوں کو امر اور نہی کے ساتھ مکلف کرنے کا مقصد ان کا امتحان ہے۔ تاکہ واضح ہو کہ ان میں سے کون اپنی خوشی اور رغبت کے ساتھ اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور کون اپنے اختیار سے معصیت اور نافرمانی کی راہ طے کرتا ہے۔ تاکہ اس کے مطابق اسے جزا دی جائے۔ جبکہ مجبور کرنے کی صورت میں اختیار' خوشی اور رغبت بالکل سلب ہو جاتی ہے۔ اور اطاعت کرنے والے کی نافرمانی کرنے والے سے تمیز نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ انسان اس جبلت

پر پیدا کیا گیا ہے کہ اپنی جان کے خوف اور خاندان کی ہلاکت کے وقت ہر چیز کو خوشی ناخوشی قبول کر لیتا ہے۔ اور اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا گیا آیت لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ آیت ۲۵۶) میں اور ظاہر ہے کہ طور کو اس طرح اٹھانا حد درجہ مجبور کرنا ہے۔ بنی اسرائیل سے اس طرح احکام تورات قبول کرانے کا کیا فائدہ تھا؟ کیونکہ حقیقت میں یہ قبول کرنا نہ تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے اس واقعہ سے پہلے اپنی خوشی اور رغبت کے ساتھ بارہا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ احکام پر مبنی کوئی کتاب ہمارے پاس لائیں تاکہ اس کے مطابق ہم عمل کریں۔ اور اس امر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پختہ وعدے اور تاکیدی عہد لئے تھے۔ اور جب وہ کتاب آ گئی اور اس کے احکام کو اپنی خواہش کے خلاف دیکھا تو انکار کر دیا۔ اور قبول کرنے سے سر پھیر لیا۔ پس حقیقت میں انہوں نے عہد کو توڑا اور گزشتہ وعدہ قبولیت کی مخالفت کی۔ طور کو ان کے اوپر کھڑا کر کے انہیں عہد توڑنے سے باز رکھا گیا۔ اور بدعہدی پر انہیں ڈرایا۔ پس یہ دین و ایمان میں مجبور کرنا نہ تھا بلکہ برے افعال میں سے ایک فعل سے ڈرانا تھا۔ جیسے کہ مسلمانوں کے حق میں حد اور تعزیر کہ مجبور کرنے کے باب سے بالکل نہیں کہ مکلف کرنے کی صحت میں خلل پڑے۔ اس شخص کی طرح جس نے کسی شخص کے ساتھ عہد باندھا ہو کہ اس شادی یا عمارت میں تیرا جو مال صرف ہو سب میرے ذمہ ہے۔ اور جب اس نے اس شادی یا عمارت کے جمع خرچ کو دیکھے تو عہد سے پھر جائے۔ اور کہے کہ اس قدر خرچ کو میں اپنے ذمہ نہیں لوں گا۔ کہ یہ صریح طور پر عہد توڑنا اور بدمعاملگی ہے۔ اسے ڈرا دھمکا کر پہلے عہد پر لوٹانا چاہئے۔ اور پہلے اقرار پر مواخذہ کرنا چاہئے۔

اور بعض مفسرین نے جواب میں کہا ہے کہ ذمی اور معاہد کے علاوہ ایمان و اسلام پر مجبور کرنا جائز ہے۔ اور حربی کافروں کے ساتھ لڑائی اور انہیں قتل اور لوٹ مار سے ڈرانا جو کہ بادشاہان اسلام کی طرف سے ہوتا ہے یہ سب اکراہ یعنی مجبور کرنے کے باب سے ہے۔ پس آیہ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہو گئی۔ اور ذمیوں اور عہد والوں کو دین پر مجبور کرنا اس وجہ سے حرام ہے کہ یہ نقض عہد ہے۔ اور نقض عہد حرام ہے۔ اور

دعوھم وما یدینون (انہیں ان کے دین پر چھوڑ دو) کے حکم کے خلاف واقع ہوتا ہے۔ پس اس جہت سے بھی حرام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ میں مجبور کرنے کی نفی بندوں سے ہے۔ کیونکہ یہ نفی بمعنی نہی ہے۔ یعنی لاتکرھوا احدا فی الدین دین کے بارے میں کسی کو مجبور نہ کرو جبکہ طور کو بلند کرنا خدا تعالیٰ کا فعل ہے۔ بندوں کے ساتھ مخصوص نفی کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

بہر حال تمہارے اسلاف نے وہ عہد و میثاق دیا اور تورات کے احکام کو قبول اور اس کی ذمہ داریوں کو لازم کیا۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ پھر تم نے تورات کے ظاہر و باطن سے منہ موڑ لیا۔ نہ تم تورات کے احکام بجالائے۔ اور نہ ہی مسیح اور اس رسول علیہما السلام کی پیروی کی۔ حالانکہ دونوں کی پیروی پر تورات کا باطن دلالت کرتا ہے۔

مِنْ بَعْدِ ذَالِكَ ان موثر تاکیدوں اور پختہ وعدے لینے کے بعد۔ جو کہ قطع نظر اہل کتاب اور اہل شرع کے عقل والوں کے نزدیک بھی ان عہدوں کی مخالفت نہایت قبیح اور بری ہے۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ تو اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم سے کوتاہیوں کی معافی اور توبہ قبول نہ فرماتا اور اس رسول علیہ السلام پر تمہارا ایمان صحیح قرار نہ دیتا۔

لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ البتہ تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے اب تک بھی تم پہ توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ اور تمہارے ایمان اور عمل صالح کو قبولیت کے لائق گردانا ہے۔ پس تمہیں چاہئے کہ اپنے خسارے کو پکا نہ کرو اور ہرگز روا نہ رکھو کہ اس رسول علیہ السلام کے ساتھ کفر کرنے کی حالت میں مرو۔ جن کی پیروی میں اب بھی تمہاری بیماری کی دوا منحصر ہے۔ اور اگر تم اس معنی کو محال سمجھتے ہو کہ انسانوں میں سے ایک شخص کی پیروی ترک کرنے کی وجہ سے ہمیں کلی طور پر خسارہ اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے ہمیشہ کیلئے محرومی کیسے لاحق ہوگی۔ حالانکہ ہم بہت سے پیغمبروں علیہم السلام کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور منسوخ شریعتوں پر بہت عمل کرتے ہیں تو ہم

کہتے ہیں کہ اس حقیقت کو محال سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تمہارے فرقہ میں سے وہ لوگ جو کہ مرتبہ میں تم سے اعلیٰ تھے تورات کے احکام میں سے ایک حکم کو ترک کرنے کی وجہ سے جو کہ اس رسول علیہ السلام کی پیروی ترک کرنے سے بدر جہا کم تر تھا انہوں نے اپنے لئے خسران کلی اور ہمیشہ کی محرومی جمع کر لی اور اپنے اوپر لعنت کی قبا ڈال لی۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا اور تحقیق تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے دریا کی مچھلیوں کا شکار کر کے حد کو توڑا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ تمہارے فرقہ سے ہفتہ کے دن میں کیونکہ تورات میں تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس دن دنیا کا کوئی کام نہ کرنا اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنا۔

ان لوگوں کا بیان جو کہ بندروں کی شکل میں مسخ ہو گئے تھے

اور وہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ تھا جو کہ شہر ایلیا میں رہتے تھے۔ اور وہ شہر دریا کے کنارے پر تھا انہیں ایک آزمائش پیش آئی کہ ہفتہ کے دن پانی کی سطح پر بہت مچھلیاں آتی تھیں۔ اور اس دن شکار حرام ہونے کی وجہ سے انہیں جال اور کانٹوں کے ساتھ پکڑ نہیں سکتے تھے۔ اور مچھلی کا گوشت کھانے کی حسرت میں جو کہ ساحلی علاقوں کے رہنے والوں کو زیادہ مرغوب ہوتا ہے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ اور جب ہفتے کا دن گزر جاتا تھا تو مچھلیاں چھپ جاتی تھیں۔ اور کسی مچھلی کا نام و نشان معلوم نہیں ہوتا تھا جب اس حسرت میں بے قرار ہو گئے تو انہوں نے اس کام میں باہمی مشورہ کیا کہ کوئی شرعی حیلہ نکالنا چاہئے تا کہ ہم حرام فعل سے بھی بچ جائیں۔ اور شکار سے محروم بھی نہ رہیں ان کے عقل مندوں نے یہ حیلہ کیا کہ جمعہ کے دن کے آخری حصہ میں دریا کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے حوض کھودتے اور ہفتہ کے دن کی ابتداء ہی میں جب مچھلیاں آنا شروع ہوتیں تو دریا سے ان حوضوں تک چھوٹی نالیاں بناتے تا کہ دریا کے پانی کے ہمراہ مچھلیاں ان حوضوں میں آئیں۔ اور جب مچھلیاں ان حوضوں میں بھر جاتیں تو ان نالیوں کو بند کر دیتے تھے تا کہ مچھلیاں واپس دریا میں نہ جائیں۔ اور جب اتوار کا دن ہوتا تو ان مچھلیوں کو حوضوں سے جال' کانٹوں اور ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اپنے گھروں کو لے جاتے اور کھاتے اور فروخت

کرتے اور کہتے تھے کہ ہم ہفتہ کے دن مچھلی کو پانی سے باہر نہیں لاتے بلکہ پانی میں اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کا بوجھ ہم پر نہیں ہوتا۔ اتوار کے دن چونکہ مچھلی کا شکار جائز ہے۔ اس لئے ہم انہیں پانی سے نکال لیتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اس برے کام پر فوری طور پر گرفت نہ فرمائی وہ سمجھے کہ یہ عمل حلال ہے۔

کہتے ہیں کہ چالیس یا ستر سال تک یہ عمل ان میں رائج رہا۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت اور خلافت کا زمانہ آیا۔ ان کے حالات پر مطلع ہو کر آپ نے انہیں نصیحت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تمہارا نالیوں کو بند کرنا اور حوضوں میں مچھلیوں کو روک لینا بھی شکار ہے۔ جو تم ہفتہ کے دن کرتے ہو اس کام سے فوراً باز آ جاؤ ورنہ تم سخت عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ وہ اس کام سے باز نہ آئے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم سالہا سال اور مدتوں سے اسی حیلہ کے ساتھ شکار کرتے چلے آئے ہیں۔ اور مچھلیوں کے شکار' لوگوں کے ہاتھوں ان کا نمک لگا خشک گوشت اور کسی کو مچھلی کی ہڈیاں' دانت اور چربی کی فروخت ہم مال دار ہوتے ہیں۔ اور روزی کے اسباب میں سے ایک ذریعہ حاصل کیا ہے اسے ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کی ہلاکت کی دعا اور ان پر لعنت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور ان سے بدلہ لیا۔ جیسا کہ فرمایا:

فَقُلْنَا لَهُمْ ۔ پس ہم نے انہیں فرمایا **كُوْنُوْا قِرَدَةً** بندر ہو جاؤ۔ اور یہ کہنا بنانے اور ایجاد کرنے کیلئے ہے نہ کہ مکلف کرنے اور امتحان کیلئے۔ تاکہ فعل کا مکلف کی طاقت میں ہونا درکار ہو۔ اور ان میں ان صفات کا بنانا اور ایجاد کرنا اس طرح رونما ہوا کہ مچھلیوں کے اسی گوشت نے ان کے شکموں میں فاسد ہو کر کوڑھ کا ناپاک مادہ پیدا کر دیا۔ اور یکبارگی ان کے چہرے پر اثر ڈالا اور ان کے چہرے نے بندروں کے چہرے کی شکل اختیار کر لی اور ان کی کمروں میں جھکاؤ اور کبڑا پن ظاہر ہو گیا' چہروں کا رنگ جل گیا۔ اور ان کے اصل بال گر گئے' چہرے کی شکل بدل گئی۔ جیسا کہ کوڑھ کے غلبہ کے وقت ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے قوت گویائی بھی زائل ہو گئی جبکہ انسانی فہم اور شعور باقی رہا' ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ اور روتے تھے۔ اور تین دن کے بعد مر گئے۔ اے کاش وہ اچھی شکل کے بندر

بن جاتے کہ لوگ انہیں ان کی پسندیدہ حرکات کی وجہ سے پالتے اور لذیذ کھانے کھلاتے اور سونے کے ہار اور ریشمی کپڑے پہناتے اور اچھی حرکتوں والے اطفال اور بچوں کی طرح ان سے پیار کرتے لیکن وہ بندر اس حالت میں بنے کہ وہ تھے۔

خَاسِئِينَ ذلیل وحقیر' بدن کی خلط کے بدبودار ہونے' اور ان کے بدنوں سے بدبو آنے کی وجہ سے اور جو کوئی عبرت کیلئے انہیں دور سے دیکھنے کیلئے آتا لعن طعن اور ملامت کرتا اور وہ کمال حسرت سے سر ہلاتے تھے۔ اور دیکھتے تھے۔

روایات میں آیا ہے کہ اس برے عمل کے عام ہونے کے وقت شہر والے تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے بارہ ہزار وعظ ونصیحت کے طور پر انہیں اس کام سے روکتے تھے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ادا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اور ان بدبختوں کے محلے کے درمیان دیوار کھینچ لی تھی اور اپنے میں سے کسی کو ان کے پاس جانے نہیں دیتے تھے۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی کو اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے تھے۔ اور تقریباً ستر ہزار آدمی مچھلیوں کے شکار میں گرفتار تھے۔ اور تیسرے گروہ والے نہ روکتے تھے نہ یہ کام کرتے تھے۔ خاموش تھے بلکہ نصیحت کرنے والوں کو روکتے تھے کہ تم اس تباہی کے قریب پہنچنے والوں کو بے فائدہ وعظ ونصیحت کرتے ہو۔ نصیحت کرنے والے پورے طور پر نجات پا گئے۔ اور مچھلی کا شکار کرنے والے سب مسخ ہو کر ہلاک ہو گئے۔ اور چپ رہنے والوں کے بارے میں اختلاف ہے۔

عکرمہ کا حسن استدلال

نقل ہے کہ ایک دن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سورت اعراف سے اس واقعہ کو پڑھ رہے تھے۔ اور رو رہے تھے۔ اور لوگ ان کے پاس بیٹھے حیران تھے۔ اور آپ کے رونے کی وجہ سے تعجب کر رہے تھے۔ اچانک عکرمہ جو کہ آپ کے خاص شاگرد تھے دروازے میں سے داخل ہوئے۔ اور پوچھا کہ یا حضرت اس گریہ وزاری کی کیا وجہ ہے فرمایا کہ میں اس واقعہ میں غور کر رہا تھا کہ مچھلی کا شکار کرنے والوں کو تو خود یہ آفت پہنچی اور جو اس برے کام سے روکنے میں مصروف ہوئے ان کے متعلق نص قرآنی سے نجات ثابت

ہوئی۔ خاموش رہنے والوں کا حال کیا ہوگا جب بھی یہ خیال آتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں گناہ کبیرہ کرنے والوں کے ساتھ عذاب میں شریک کر دیا ہو۔ کیونکہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا تھا تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اور بے اختیار رونا آتا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگوں سے اس قسم کی خاموشی اور کوتاہی صادر ہوتی ہے۔ عکرمہ نے پوری جرأت سے کہا کہ یا حضرت خاموش رہنے والوں کا حکم نصیحت کرنے والوں کا سا ہے کہ وہ بلاشبہ نجات پا گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تو یہ دعویٰ کس دلیل کے ساتھ کرتا ہے۔ تاکہ میرے دل کو تسلی ہو۔ عکرمہ نے عرض کی کہ میں نے آپ سے کئی بار سنا ہے۔ نیز شریعت کے قوانین میں سے ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ اور فرض کفایہ میں بعض کا بجالانا سب کے بجالانے کا حکم رکھتا ہے۔ اور جب ایک جماعت نے امر بالمعروف کیا تو سب کے ذمہ سے فرض گر گیا۔ اور خاموش رہنے والوں پر مواخذہ نہ رہا اگر سب کے سب خاموش رہتے تو لازماً گناہگاروں کے شریک ہوتے۔ اور نصیحت کرنے والوں کو ان کا روکنا اس بنا پر تھا کہ امر اور نہی قبول کرنے سے ناامید ہو چکے تھے نہ کہ کوتاہی اور گناہ پر راضی ہونے کی وجہ سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ گفتگو سن کر انتہائی مسرت ہوئی۔ اور آپ نے کھڑے ہو کر عکرمہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اسے پہلو میں لے لیا۔ اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ ہاں غلام اور کم مرتبہ لوگ علماء کرام کی صحبت کی وجہ سے دین و دنیا کی سرداری حاصل کرتے ہیں۔ اور کیا ہی خوب کہا گیا ہے۔ تیری غلامی کے داغ نے خسرو کا مرتبہ اونچا کر دیا وہ غلام ریاست کا سردار ہو جاتا ہے۔ جسے بادشاہ خرید لے۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا جو کہ ارباب معانی کے درمیان مروج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ مخاطبین کے اصحاب سبت کے واقعہ کو جاننے کی خبر دینا ہے۔ اور شک نہیں کہ المرء اعلم بحالہ (یعنی آدمی اپنے حال کو بہتر جانتا ہے) کے مطابق مخاطبین اس واقعہ کو خود جاننے کے عالم تھے۔ پس یہ خبر دینا مخاطبین کو جتلانے کیلئے نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح مخاطبوں کے علم کے متعلق متکلم کے عالم

ہونے کو جتلانا بھی مفید نہیں ہے۔ کیونکہ عقل مندوں میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔ پس خبر کا فائدہ جو کہ مخاطب کا حکم کو جاننا ہے۔ اور خبر کے فائدہ کو لازم جو کہ علم متکلم کے متعلق مخاطب کو جتلانا ہے اس اخبار میں دونوں مفقود ہیں۔ پس یہ خبر دینا صحیح نہ ہوگا کیونکہ دونوں فائدوں سے خالی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مخاطبین کے اس قصہ کو جاننے کو ایک چیز لازم ہے جو کہ عبرت پکڑنا اور نصیحت قبول کرنا ہے۔ اور یہاں اس لازم کو لزوم کا فائدہ دینا مراد ہے۔ پس کلام کا معنی یوں ہوا قد لزمتکم العبرة ووجب علیکم التحرز عن المعصیته حین علمتم بهذه القصه یعنی جب تم اس قصہ کو جانتے ہو تو تمہیں اس سے عبرت حاصل کرنا لازم تھا اور تم پر واجب تھا کہ نافرمانی سے پرہیز کرتے۔ پس مکنی عنه پر نظر کرتے ہوئے اس اخبار سے مقصود مخاطب کو حکم کے ثبوت کا فائدہ دینا ہے جو کہ خبر کا فائدہ ہے۔ اور جس طرح صریح معنی پر نظر کرتے ہوئے اخبار میں خبر کا فائدہ مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی معنی کنائی پر نظر کرتے ہوئے بھی مقصود ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت سے معمور کلام میں دودھ کے بارے میں وارد ہے ان له دسما ۔ اور یہ دودھ پینے کے بعد کلی کے مستحب ہونے سے کنایہ ہے۔ نیز حدیث پاک میں آیا ان ابراهیم ابنی وانه مات فی الثدی جو کہ اندوہگیں ہونے اور غمگین رہنے سے کنایہ ہے وغیرہ۔

اور اس جواب پر ایک اور سوال وارد ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ معنی کنائی کا فائدہ دینے میں تاکید قسمی جس پر لام تمہید دلالت کرتا ہے۔ اور لام اور قد کے ساتھ تاکید کی کیا حاجت ہے۔ اور ان تاکیدات بلیغہ کے ساتھ موکد جملہ وارد کرنا کیوں ضروری ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انہوں نے عبرت حاصل نہ کی۔ اور وہ نافرمانی سے پرہیز نہیں کرتے تھے گویا انہوں نے عبرت کے لازم ہونے اور معاصی سے پرہیز کے واجب ہونے کے معنی کا انکار کر دیا اس وجہ سے انہیں منکر کے بجائے انکار پر اصرار کرنے والے قرار دے کر اور انہیں اس کے مرتبہ پر رکھ کر کلام کو ان تاکیدوں کے ساتھ پکا فرمایا۔

ہم اس بات پر آ گئے کہ معتزلہ میں سے بعض بے وقوفوں نے اس واقعی مسخ کا جو کہ تواتر

کے ساتھ ثابت ہے انکار کیا ہے۔ اور اس آیت کے ظاہر کی تاویل کر کے مسخ معنوی مراد لیا ہے۔ یعنی دلوں اور عقلوں کا تبدیل کرنا۔ جیسا کہ دوسرے کفار کے بارے میں اس معنی کو ختم اور طبع یعنی مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ایک دوسری آیت میں واقع ہے کَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (الجمعہ) اس اور ایک اور آیت میں فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ (الاعراف ۱۷۶) جس طرح کہ استاد اپنے نالائق شاگرد کو کہتا ہے گدھا ہو جایا کتا۔ اور جس شبہ نے انہیں یہاں کھڑا کیا۔ اور تاویل کی پناہ لینے والا گردانا وہ یہ ہے۔ کہ مسخ حقیقی انسان کو انسانیت سے باہر لے آتا ہے۔ بہیمیت یعنی جانوروں کی سرشت تک پہنچا دیتا ہے۔ پس وہ عذاب چکھنے اور سزا پانے کے قابل نہیں رہتے۔ کیونکہ عذاب چکھنے اور جزا پانے کیلئے انسانیت شرط ہے۔ جس طرح کہ مکلف ہونے کیلئے بھی شرط ہے۔ کیونکہ جزا پانا مکلف ہونے اور اس کے نتیجے پر بطور فرع لازم آتا ہے۔ اور جو اصل کی شرط ہے فرع کی بھی شرط ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہاں تین چیزیں جدا جدا ہیں۔ مسخ حقیقی، مسخ صوری اور مسخ معنوی، مسخ حقیقی کے باطل ہونے سے مسخ معنوی لازم نہیں آتا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی حقیقت یہ محسوس جثہ، عوارض اور اس مخصوص جثے کی صفات نہیں ہے ورنہ موٹاپے کے لاغری میں۔ جوانی کے بڑھاپے سے بدلنے اور اس کے برعکس سے حقیقت بدل جاتی۔ تو جب اس جثے کو باطل کر کے اس کی جگہ بندر کی ترکیب پیدا کر دی گئی تو انسان کی حقیقت نہ بدلی۔ بلکہ جن اعراض پر اس انسانی جثے کا دارومدار تھا انہیں معدوم کر دیا گیا۔ اور ان کے بجائے دوسرے اعراض جو کہ بندر کے جثہ کا مدار ہیں ایجاد کر دیئے گئے۔ پس مسخ صوری متحقق ہوا اس کے بغیر کہ روح انسانی جو کہ اس کی حقیقت ہے بدلی گئی ہو۔ اور عقل اور فہم اپنی جگہ برقرار رہے۔ تاکہ تخلیق کے بدلنے، صورت کے مکروہ ہونے، بولنے پر قدرت نہ رکھنے بلکہ تمام انسانی خاصیتوں کے ختم ہونے سے جو کہ اس جثے کے ساتھ متعلق تھیں دکھ محسوس کریں۔ اور سزا اور جزا دینے کا معنی متحقق ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ مسخ معنوی میں بھی بعض انسانی صفات میں تبدیلی ضرور آتی ہو گی جیسے ذہن کی تیزی کا کند ذہنی، قناعت کا حرص اور پاکیزگی کا نجاست سے بدلنا وغیرہ اور عقل کے نزدیک صفات نفسانیہ اور صفات محسوسہ کے

بدلنے میں کوئی فرق نہیں اس کا یقین کرنا اس کا انکار کرنا معنوی مسخ کے اثر سے خالی نہیں۔

یہاں جاننا چاہئے کہ مسخ ہونے والی تمام قومیں مسخ کے بعد ہلاک ہوگئیں۔ اور ان کی کوئی نسل باقی نہ رہی۔ یہ بندر جو ہم دیکھتے ہیں ان مسخ ہونے والوں کی نسل میں سے نہیں۔ بلکہ سارے حیوانات کی طرح اصلی بندر ہیں۔ اور روایت وعقل کے اعتبار سے یہی معنی زیادہ صحیح ہے۔ اور اس کے اعتبار سے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخر میں منکشف ہوا۔ ہاں ابتداءِ میں جبکہ ابھی مسخ کئے جانے والوں کی اخروی دنیوی احکام میں ملعونیت حضور علیہ السلام پر منکف نہیں ہوئی تھی مسخ کی گئی اقوام کی نسل کی بقا میں تردد فرماتے تھے۔ جیسا کہ چوہوں کے بارے میں وارد ہوا کہ وہ اونٹ کا دودھ نہیں پیتے کہیں بنی اسرائیل کا کوئی فرقہ ہو جو کہ اس صورت میں مسخ کئے گئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے صحیح سند سے روایت کی ہے کہ مسخ ہونے والے تین دن سے زیادہ نہیں رہے۔ نہ کھایا۔ نہ پیا۔ اور نہ نسل چلی۔ قصہ مختصر بنی اسرائیل کو ان کے اسلاف میں گزرا ہوا۔ واقعہ یاد کرایا جا رہا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ جب مچھلی کے شکار کی طمع کی وجہ سے جس کی اتنی مالیت بھی نہیں منسوخ شریعت کے احکام میں سے ایک حکم کی پیروی کو چھوڑنا اس مکمل خسارے کا موجب ہوا ہو۔ تو رشوت' نذر و نیاز اور فتوح جو کہ وہ اپنے کمینہ قسم کے لوگوں سے لیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اپنی سرداری اور مرتبہ کو برقرار رکھتے ہیں کے شکار کی طمع کی وجہ سے اس عظیم الشان رسول علیہ السلام کی پیروی چھوڑنا اور آپ کی اصل شریعت کا انکار کرنا جو کہ تمام گزشتہ شریعتوں کی ناسخ ہے ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ جبکہ ہم نے تمہارے اسلاف میں یہ واقعہ صرف عبرت کیلئے ظاہر فرمایا تھا۔

فَجَعَلْنَاهَا ۔ پس ہم نے اس واقعہ اور اس عذاب کو کر دیا نکالًا عبرت اور گناہوں سے روکنے کا سبب۔ جیسا کہ حقیقی نکال جو کہ زنجیر ہے جانے اور بھاگنے سے روکنے والی ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ آدمیوں کو اس قسم کے عذاب دینے سے مقصود ہوتا ہے کہ غصہ کو مدہم کرتے' غضب کی آگ کو بجھاتے اور دل کی تکلیف کو نافرمان سے بدلہ لینے کی انتظار سے

دور کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ نہ تھا۔ کیونکہ ہماری کبریائی کی عزت کا میدان ان امور سے متاثر ہونے اور سفلی جذبات کا شکار ہونے سے منزہ اور پاک ہے۔ اور یہ عبرت اور گناہوں سے روکنا بھی عرف ہم زمانہ لوگوں کے بارے میں نہ تھا اور نہ انتقام اور عذاب کی کسی دوسری قسم پر ہم اکتفا کرتے جس کی عادت ہو جیسے وبا' قحط' غرق اور جلانے کے ساتھ ہلاک کرنا' بلکہ ہم نے عام عبرت کا قصد فرمایا۔

لَمَا بَیْنَ یَدَیْهَا ان شہروں اور بستیوں کیلئے جو کہ اس شہر کے سامنے تھے۔ اور اس وقت موجود تھے۔ اور ان گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے **وَمَا خَلْفَهَا** اور ان بستیوں اور شہروں کیلئے جو کہ اس شہر کے۔ پس پشت تھے۔ اور زمانے یا مکان کے اعتبار سے غائب تھے۔ اور گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ کیونکہ یہ بہت بڑا واقعہ نادر ہونے کی وجہ سے اس پر مطلع ہونے والوں کو اس کی نقل اور حکایت کرنے کا باعث ہے کہ اسے تواریخ اور عجیب واقعات میں لکھیں اور مسافروں اور تاجروں کی زبانیں دور دراز علاقوں اور شہروں میں نقل کریں۔ تا کہ عام عبرت ثابت ہو۔

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ اور متقین کیلئے نصیحت کا سبب ہو۔ جو کہ تقویٰ کی وجہ سے گناہ کے ارتکاب سے باز رہے ہیں مگر جبلت بشریہ کی وجہ سے ان کے نفس گناہوں کی طرف قدرے جھکاؤ رکھتے ہیں۔ جب بھی وہ اس واقعہ میں غور وفکر کریں تقویٰ کی حد سے باہر نہ جائیں۔ اور یہ واقعہ ان کیلئے بمنزلہ ایک واعظ کے ہو کبھی بھی اس کے خوف دلانے اور ڈرانے کی وجہ سے سیدھی راہ سے نہ پھسلیں اور نکال اور موعظۃ میں فرق اس لئے منظور ہوا کہ نکال مانع فعل ہے۔ اور موعظۃ مانع قولی اور مانع فعلی' مانع قولی سے زیادہ قوی ہے۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو مانع قوی کے بغیر باز نہیں رکھا جا سکتا جبکہ متقین کو مانع قولی کافی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا **العبد یقرع بالعصا والحر تکفیہ الملامۃ** یعنی غلام کو ڈنڈے کے ساتھ روکا جاتا ہے جبکہ آزاد کے لئے ملامت کافی ہے۔

قابل بیان نکتہ

یہاں ایک اور نکتہ محتاج بیان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قردۃ غیر ذوی العقول کی جمع ہے۔

اور غیر ذوی العقول کی صفات میں تانیث کا صیغہ آتا ہے۔ خواہ مفرد ہو یا جمع۔ پس اس قاعدے کے مطابق قردۃ خاسئات یا خاسئہ فرمانا چاہئے تھا اور خاسئین جو کہ ذوی العقول کا صیغہ ہے کیوں ارشاد ہوا؟ اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں خاسئین قردۃ کی صفت کے طور پر واقع نہیں ہوا تا کہ اس قاعدہ کے مطابق اسے مونث لانا ضروری ہو بلکہ اس ضمیر سے حال ہے جو کہ کونوا میں ہے۔ تو معنیٰ یہ ہے کونوا قردۃ حال کونکم خاسئین فی ھذا المسخ والتبدیل یعنی بندر بن جاؤ اس حال میں کہ تم اس مسخ و تبدیل میں ذلیل ہو۔

اور اگر بنی اسرائیل یہ واقعہ سننے کے بعد کہیں کہ ہمارے اسلاف میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس قسم کی روگردانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے زمانے سے دوری کے سبب سے اور غلط فہمی کی وجہ سے ہوئی کہ شکار کے جواز کیلئے حیلہ شرعی کو دلیل واقعی سمجھ لیا۔ اور کوئی رسول علیہ السلام جن کی طرف رجوع کرنے کی وجہ سے یہ شبہ زائل ہو جاتا موجود نہ تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام غائبانہ طور پر انہیں کچھ لکھتے تھے۔ اور وہ کچھ اور سمجھتے تھے۔ نیز یہ واقعہ ہم میں سے تھوڑی سی جماعت کو پیش آیا تھا تو بنی اسرائیل کے سارے گروہ کو تھوڑی سی جماعت کے کام کی وجہ سے کیوں طعن و ملامت کی جائے۔ اور سارے فرقہ کو بعض پر کیوں قیاس کیا جائے ہم کہیں گے کہ احکام الٰہی سے روگردانی اور ان احکام کو رد کرنا تمہارے اسلاف سے کئی بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اور ان کے زمانے میں ان کے فرمانے سے ایک مقدمہ میں واقع ہوا۔ پس اس مقدمے کو یاد کرو۔

گائے ذبح کرنے کے واقعہ کے بیان کا آغاز

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا۔ اس وقت جبکہ ایک مالدار آدمی کو اس کے بھتیجے یا چچازاد نے جس کے سوا اس مالدار آدمی کا کوئی وارث نہ تھا۔ اور وہ مدت دراز تک اس کی موت کا انتظار کرتا رہا تا کہ اس کی وراثت کے مال سے اپنی غربت دور کرے۔ اور اسے خوشحالی نصیب ہو اور وہ مرتا نہ تھا' تنگدل ہو کر اس نے اسے قتل کر دیا۔ اور اسے قتل کرنے کے بعد اٹھا کر دوسرے محلے میں ڈال دیا اور صبح کے وقت فریاد کرتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور اس محلے

والوں پر اس مقتول کے خون کا دعویٰ کر دیا۔ اور چاہا کہ اس محلے والوں سے خون بہا لے۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں قسامت کا حکم ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس محلے والوں سے پوچھا انہوں نے صاف انکار پیش کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم قسامت جاری کرنے اور محلے والوں سے قسم لینے میں توقف فرما کر بارگاہ خداوندی میں دعا کی تاکہ حقیقت حال ظاہر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی اور حضرت موسیٰ نے اس وحی کے مضمون کو بنی اسرائیل کے سرداروں کو جمع کر کے تبلیغ فرمائی کہ

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً تحقیق اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ اور اس گائے کے گوشت کا ایک حصہ اس مقتول پر مارو جو کہ زندہ ہو جائے گا۔ اور اپنے قاتل کا نشان دے گا۔ اور اس طریقے کو اس وجہ سے اختیار فرمایا کہ اگر وحی کے ذریعے سے قاتل کا نام معین کر کے خبر دی جاتی تو یہ بے باک جماعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹ کی تہمت لگاتے اور صریح کفر میں پڑ جاتے پھر انہیں کسی عذاب کے ساتھ آنکھیں دکھانا ضروری ہوتا۔ پس پہلے انہیں ایک معجزہ جو کہ مردہ اعضاء میں سے ایک عضو کو مارنے کی وجہ سے میت کو زندہ کرنا ہے۔ اور ان دونوں میں سببیت اور مسببیت کا تعلق کسی کے خیال میں بھی نہیں گزرتا دکھایا گیا اس کے بعد مقتول کی زبان سے جو کہ ابھی جہان غیب سے آیا ہے۔ اور دار الجزا کو دیکھ کر لوٹا ہے لازماً بات کا سچا ہو گا مقتول کا تعین کرایا گیا۔ تاکہ بالفرض اگر قاتل اس کا بھی انکار کر دے تو وہ مقتول اس سے جھگڑا اور تنازع کرے۔ اور قرائن اور آلودگی سے ثابت کرے۔ نیز چونکہ واقع میں اس مقتول کا قاتل اس کے وارث کے سوا کوئی نہ تھا اور اس مقتول کا اور کوئی وارث نہیں تھا اور قاعدہ شرعی ہے کہ وارث کے دعویٰ کے بغیر قصاص طلب کرنا درست نہیں ہوتا اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بذریعہ وحی قاتل کا تعین معلوم کر کے اس کا نام بتا دیتے تو قصاص لینا ہرگز ممکن نہ ہوتا۔

اب ہم اس بات پر آتے ہیں کہ گوشت کا ٹکڑا مار کر مردے کو زندہ کرنا بغیر سببیت اور مسببیت کے تعلق کے جب صرف اللہ تعالیٰ کا فعل تھا تو اس جانور کو ذبح کرنے کی تخصیص کیوں ہوئی؟

گائے کی تخصیص کی وجہ

اس کا جواب یہ ہے کہ اس واقعہ میں یہ بھی منظور تھا کہ ایک نیک شخص کے بیٹے کو جس نے اس کے کام کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔ اور اس جہاں سے کوچ کر گیا تھا۔ اور ایک گائے کے بچھڑے کے سوا اس بیٹے کیلئے میراث بھی نہیں چھوڑی تھی نمایاں نفع حاصل ہوتا کہ ساری زندگی اس نفع سے روزی کا سلسلہ پورا ہو سکے۔ نیز اس جانور کو جو کہ بیل ہے زمین' نباتات اور درختوں کو کاشتکاری اور زراعت اور آبپاشی کے ذریعے زندہ کرنے میں پورا دخل ہے۔ اور زمین آدمی کی خلقت کی اصل ہے۔ اور نباتات اور درخت اس کی غذا کی اصل ہیں۔ پس اس جانور کو زیادہ خصوصیت حاصل ہوئی۔ اور اگر زندہ بیل کے مس کرنے سے اس مردہ کو زندہ کیا جاتا تو اس غریب کو کوئی نفع نہیں پہنچتا تھا جسے نفع پہنچانا منظور تھا۔ علاوہ ازیں زندہ کرنے میں مردہ کو مردہ سے مس کرنا' زندہ کو مردہ سے مس کرنے سے زیادہ عجیب ہے۔ حاصل کلام یہ کہ بنی اسرائیل نے اس صریح حکم سے روگردانی کی۔ اور کمال بے ادبی کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کہنے لگے کہ آیا آپ ہمیں مذاق کرتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس مردہ کے قاتل کو بیان کریں۔ اور آپ کہتے ہیں کہ ایک بیل ذبح کرو۔ اس سوال و جواب میں کیا مناسبت ہے؟ ایک جاندار کو بے جان کرنے سے دوسرے بے جان کے قاتل کا کس طرح پتہ چل سکتا ہے۔ اور اس روگردانی اور اعتراض کی وجہ سے بنی اسرائیلیوں نے اپنے آباؤ اجداد کے اطوار سے بہت دوری حاصل کر لی' جس کی وجہ سے وہ ناز اور فخر کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خواب میں فرمایا کہ اپنے بیٹے کو ہمارے لئے ذبح کیجئے۔ وہ فی الفور تیار ہو گئے۔ اور جب اپنے بیٹے سے کہا تو اس نے بھی بغیر تامل اور توقف کے گردن رکھ دی اور نہ کہا کہ خواب کا مدار خیال پر ہوتا ہے۔ جبکہ انہوں نے بیل کے ذبح کرنے میں اس قدر تردد اور توقف کیا یہیں سے ان کی احکام الٰہی کی اطاعت کو قیاس کرنا چاہئے۔

کیا یہ گفتگو موجب کفر ہے؟

اب ہم یہاں پہنچے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی یہ گفتگو ان کے کفر کا سبب ہوئی یا نہ ہوئی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ کافر ہو گئے۔ اس لئے کہ ان سے یہ گفتگو اگر مردوں کو زندہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کی وجہ سے صادر ہوئی تو صریح کفر ہے۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی میں خیانت کی تہمت رکھتے تھے تو بھی کفر ہے۔ واضح یہ ہے کہ ان دونوں امور میں سے کوئی چیز بھی انہیں اس گفتگو پر ابھارنے والی نہ تھی۔ بلکہ اس جواب سے جس کی سوال سے مطابقت ان کے ذہن میں نہیں آتی تھی تعجب کے طور پر انہوں نے بطریق تشبیہ کہا کہ گویا آپ ہمارے ساتھ مذاق اور تمسخر کرتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام پر خوش طبعی اور دل لگی جائز سمجھ کر یہ بات کی ہو اگرچہ انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ اس سے کہیں عالی ہے کہ اس قسم کے موقع پر خوش طبعی اور مذاق کی طرف متوجہ ہوں۔ لیکن انہیں ابھی تک اس منصب کی بلندی کا علم نہیں ہوا ہوگا۔ اور اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ فرمایا: میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہوں۔ اور سوال کے مطابق جواب نہ لاؤں یا آپس میں مقدمہ بازی‘ فیصلہ اور قصاص طلب کرنے کے وقت مذاق کروں بلکہ اگر انبیاء علیہم السلام سے اظہار مسرت اور تفریح خاطر کیلئے خوش طبعی ظاہر ہو تو تبلیغ احکام اور جھگڑے چکانے کے علاوہ دوسرے مقام پر واقع ہوتی ہے۔ جیسا کہ آخر الزمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اس قسم کی قابل تعریف خوش طبعیاں منقول ہیں۔ اور یہ جہالت اور نادانی کی جنس سے نہیں۔ کیونکہ اپنے موقع پر ہے۔ جہالت یہ ہے کہ اپنے افعال کو بے موقع ظاہر کرے۔ اور جس وقت مسرت اور تفریح خاطر مقصود ہو اس کا قصد کرتا ہے۔

قصہ مختصر جب بنی اسرائیل نے جان لیا کہ ہو سکتا ہے کہ گائے ذبح کرنے میں کوئی خاصیت ہو جس کی وجہ سے گوشت کا ٹکڑا مردے کو لگانے سے وہ مردہ زندہ ہو جائے۔ اور ہر گائے کی یہ خاصیت نہیں۔ اس لئے اس عجیب گائے کے اوصاف کی تحقیق میں دور دور تک

گئے۔ اور حدیث شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایت کے ساتھ وارد ہوا کہ اگر بنی اسرائیل ادنیٰ گائے پکڑ کر ذبح کر دیتے تو کافی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ پر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سخت حکم فرمایا۔ اور حقیقت میں دربار خداوندی میں اس گائے کے مالک کو ایک عظیم نفع پہنچانا منظور تھا۔ اسی لئے بنی اسرائیل کے دل میں ڈالا کہ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَاهِيَ انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کریں۔ تا کہ ہمارے لئے بیان فرمائے کہ اس گائے کی حقیقت کیا ہے۔ کیونکہ اس معروف گائے کی حقیقت یہ خاصیت نہیں رکھتی اور نہ ہی وحشی گائے جسے نیل گاؤ کہتے ہیں۔ اور نہ ہی پہاڑی گائے جسے سورگاؤ کہتے ہیں۔ اور نہ ہی دریائی گائے۔ پس لازماً جس گائے کی خاصیت یہ ہے ان قسموں کے سوا کوئی دوسری حقیقت رکھتی ہے۔ اگرچہ نام میں گائے کے ساتھ شریک ہو جیسے جنگلی بیر اور باغ کا بیر کہ ہر ایک کے خواص و آثار جدا جدا ہیں اگرچہ نام میں شریک ہیں۔

اور اس تقریر سے وہ سوال دور ہو گیا جو مفسرین یہاں وارد کرتے ہیں۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لغت عرب میں لفظ ما کے ساتھ شے کی حقیقت طلب کرنے کیلئے سوال کیا جاتا ہے۔ اور تعریف حقیقت نہیں ہوتی مگر اس شے کے ذاتی اجزاء یا اس کے نوعی خواص اور لوازم کے ساتھ نہ کہ جدا ہونے والی صفات کے ساتھ۔ پس جواب سوال کے مطابق نہیں ہوتا اور اس کے باوجود یقینی طور پر معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کے اس سوال سے غرض اس کی ماہیت نوعیہ کی طلب نہ تھی کیونکہ انہوں نے سنا تھا کہ وہ گائے ہے۔ اور نہ ہی اس کے ذاتی اجزاء کی طلب کیونکہ وہ گائے کی حقیقت کو بھی جانتے تھے۔ پس سوال صرف افراد کے متعلق تھا جبکہ غیر ذوی العقول کے افراد سے سوال لفظ ای کے ساتھ آتا ہے نہ کہ لفظ ما کے ساتھ اور اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حقیقت نوعیہ کے بجائے حقیقت شخصیہ کو قائم کر کے ما کے ساتھ سوال کیا ہو۔ کیونکہ شخص من حیث ہو شخص بھی حقیقت نوعیہ کے علاوہ ایک حقیقت رکھتا ہے یا مــاهی اس لئے کہا کہ ذوی العقول میں ان کے جزئیات و عوارض مشخصہ سے سوال لفظ من کے ساتھ آتا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں من زید' من عمر اور چونکہ یہاں غیر

ذوی العقول کی جزئی کے متعلق سوال منظور تھا تو من کے بجائے ما لے آئے۔

اور اس سوال کو اصل سے دور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جب اس گائے کے عجیب خواص سنے تو انہوں نے گمان کیا کہ اس گائے کی حقیقت معروف گائیوں کی حقیقت سے جدا ہے۔ اگرچہ صورت اور نام گائے کا ہے اسی بناپر لفظ مَاهِيَ کے ساتھ سوال کیا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس معنی کی وضاحت طلب کرنے کیلئے پھر بارگاہ خداوندی میں عرض کی۔ اور اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس گائے کا نشان دریافت کر لیا۔

قَالَ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ گائے معروف گائیوں سے جدا حقیقت نہیں رکھتی اور اس گائے میں یہ عجیب خاصہ کسی خاص ماہیت یا کسی صفت کے اعتبار سے نہیں ہاں اِنَّهٗ يَقُوْلُ تحقیق حق تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهَا تحقیق وہ گائے جو کہ علم الٰہی میں ذبح کیلئے معین ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے بعض اجزاء کو اس مردے کے جسم پر مار کر اسے زندہ کرنے کے ساتھ متعلق ہو چکا ہے بَقَرَةٌ ایک گائے ہے۔ معروف گائیوں کی جنس سے اس کی حقیقت کوئی اور نہیں۔ اور اس میں صفات کمال میں سے بھی کوئی صفت جو تمہارے خیال میں اس عجیب خاصہ کا موجب موجود نہیں مگر یہ کہ عمر کے اعتبار سے اس میں ایک کمال ثابت ہے۔ کیونکہ لا فارض ولا بکر نہ پرانی عمر کی بوڑھی ہے کہ کمزوری کی وجہ سے گائیوں کے مشقت والے کاموں سے معطل رہے۔ اور نہ ہی چھوٹی عمر کی نوجوان کہ ابھی بچہ پیدا نہ ہوا ہو یا مادہ پر جست نہ کی ہو اس لئے کہ چھوٹی عمر کی وجہ سے اس کی طبیعت میں شوخی اور سرکشی ہوتی ہے۔ پس خوبی کے ساتھ کاموں میں مطیع نہیں ہوتی جس طرح کہ وہ بوڑھی اور نوجوان نہیں اسی طرح بڑھاپے اور جوانی کی طرف کوئی میلان نہ ہو بلکہ

عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ درمیانی عمر کی ہے جو کہ بڑھاپے اور جوانی کے حقیقی وسط میں واقع ہے۔

چند جواب طلب سوالات

اور یہاں چند جواب طلب سوالات ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ بعینہٖ عوان کا مدلول ہے۔ تو عوانٌ کے ذکر کی کیا ضرورت ہوئی پھر عَوَانٌ کا مدلول اور بَيْنَ

ذَالِكَ کا مدلول بھی ایک ہی شے ہے۔ تو تکرار پر تکرار لازم آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لَافَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ کا مدلول یہ ہے کہ بوڑھی ہے نہ جوان اور یہ معنی اس سے زیادہ عام ہے کہ نہایت چھوٹا بچھڑا ہو۔ اور اس سے کہ درمیانی عمر کا ہو۔ پس عَـــوَانٌ کو ذکر کرنے کی ضرورت پہلے احتمال کو دور کرنے کیلئے ثابت ہوئی۔ اور جب درمیانی عمر کا ہونا بھی زیادہ عام ہے اس سے کہ دونوں عمروں کے وسط حقیقی میں واقع ہو یا پیری یا جوانی کی طرف مائل ہو تو باقی دو احتمالوں کو دور کرنے اور پہلے احتمال کو معین کرنے کیلئے لفظ بَيْنَ ذَالِكَ لانا لازم ہوا۔ پس کسی وجہ سے تکرار نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ لفظ بین کے خواص میں سے ہے کہ متعدد پر داخل ہوتا ہے۔ اور یہاں لفظ ذالک پر داخل ہوا ہے جو کہ متعدد نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بین کا مضاف الیہ اس سے عام ہے کہ تعدد لفظی ہو یا تعدد معنوی۔ یہاں تعدد معنوی ثابت ہے۔ کیونکہ لفظ ذَالِكَ دو چیزوں کا اشارہ ہے فَارِضٌ اور بِكْرٌ۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ گائے دو حال سے خالی نہیں نر تھا یا مادہ اگر نر تھا تو لا بکر اس کے بارے میں کس طرح مقرر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ گائے کا نر بکر نہیں ہے۔ کیونکہ حیوانات میں بکر کا معنی عدم کے مقابلہ کے طور پر نہ جننے والا ہے۔ جبکہ جننے کی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور نر میں جننے کی بالکل صلاحیت نہیں ہوتی۔ پس بکر کے ساتھ موصوف نہیں ہو سکتا۔ نیز واقعہ کی ابتداء سے لے کر انتہا تک تواتر کے ساتھ جو تانیث کی ضمیریں واقع ہیں اس کے نر ہونے سے انکار کرتی ہیں۔ اور اگر مادہ تھی تو لا بکر کی صفت اور سب ضمیریں درست واقع ہوتی ہیں۔ لیکن لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ اس کی تعریف نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ہر مادہ گائے عرف و عادت کے اعتبار سے ہل جوتنے اور پانی کھینچنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اگر چہ عقلی طور پر ممکن ہو اس کا جواب یہ ہے کہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ گائے نر تھا اور ضمائر کی تانیث لفظ بقرہ کی بنا پر ہے جو کہ تانیث لفظی کے ساتھ مونث ہے۔ اگر چہ اس میں تا وحدت کیلئے ہے نہ کہ تانیث کیلئے جیسے تمرة، حمامة، عصفورة وغیرہ جہاں جنس اور اس کے واحد میں تا کے ساتھ فرق کیا جاتا ہے۔ اور لغت عرب کا قاعدہ ہے کہ جب مذکر کی لفظ مونث کے ساتھ

تعبیر کرتے ہیں تو ضمائر کو مونث لاتے ہیں۔ جیسے لفظ دابۃ میں اگرچہ گھوڑا مراد لیں۔

ضمائر کو مونث کر دیتے ہیں۔ اور بکر کا معنی جو کہ نہ جننے والا ہے مونث جانوروں میں ہے۔ لیکن نر جانوروں میں اس کا معنی وہ جانور ہے جس نے ابھی مادہ پر جست نہ کی ہو۔ اور اسے باردار نہ کیا ہو۔ اور اگرچہ عرفی اور عادی اغراض کا نر حیوانات کی بکارت دریافت کرنے کے ساتھ بہت کم اور نادر تعلق ہے اہل لغت بکر کے معنی کی تحقیق کے مقام میں مادہ حیوانات کی بکارت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

اور بعض مفسرین ضمائر کی تانیث اور اس کے بکارت سے موصوف ہونے کی دلیل کی وجہ سے اس طرف گئے ہیں کہ مادہ گائے تھے۔ اور لَا ذَلُوْلٌ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ کے منطبق نہ ہونے کا جواب یہ دیتے ہیں کہ زمانوں اور شہروں کے مطابق رواج اور عادت مختلف اور جدا جدا ہوتی ہے اس وقت ان علاقوں میں مادہ گائے کا ہل جوتنے اور پانی کھینچنے میں استعمال کرنے کا رواج ہوگا۔ بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یہ نشان بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ تم اس گائے کے خواص اور صفات پر نظر مت کرو بلکہ اپنی نظر کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی طرف متوجہ کرو اور جس نے اشیاء میں خواص ودیعت رکھے ہیں اسے دیکھو۔

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۔ پس بجالاؤ اسے جو تمہیں دربار خداوندی سے حکم دیا جاتا ہے۔ کیونکہ خواص اور عجائب کی ایجاد اسی کی مشیت سے وابستہ ہے جس گائے میں چاہے گا یہ عجیب خاصہ پیدا فرمادے گا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قدر نشان دینے کے باوجود بنی اسرائیل کی تسلی اور تشفی نہ ہوئی۔ اور انہوں نے پھر کھوج اور تفتیش شروع کر دی۔

قَالُوْا انہوں نے کہا کہ جانور کا کمال جس طرح عمر کی وجہ سے ہوتا ہے رنگ اور صورت کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے۔ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کریں۔ تاکہ ہمارے لئے بیان فرمائے کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہے؟ تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ اس کے رنگ اور صورت میں بھی کوئی کمال ہے۔ جو کہ اس میں اس عجیب خاصیت کا موجب ہوا ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تحقیق حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے زرد رنگ جس کی زردی صاف اور تیز ہے۔ اور یہ رنگ جانوروں کا بہترین رنگ ہے۔ اس لئے کہ اس رنگ کی وجہ سے تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ وہ گائے دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے اس لذت کی وجہ سے جو اسے دیکھنے کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔ اور ہر خالص زرد رنگ کی خاصیت ہے کہ لوگوں کو خوش کرنے اور غموں کو دور کرنے میں نافع ہے۔

زرد جوتا پہننے کی فضیلت اور رنگوں کے خصائص

طبرانی، خطیب اور دیلمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جو زرد رنگ کا جوتا پہنے جب تک وہ جوتا پہنے ہوئے ہے خوش رہے گا۔ اور تفسیروں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ جس نے زرد جوتا پہنا اس کا غم قلیل ہوا اور بعض روایات میں دیکھا گیا ہے کہ جس نے زرد رنگ کے سات جوتے پے در پے پہنے ہوں اس کے غم اور فکر ختم ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر پانچ رنگ یعنی سرخی، زردی، سیاہی، سفیدی اور سبزی مختلف خاصیتیں رکھتے ہیں جنہیں اہل تجربہ اور قیاس نے۔ الحمرة اجمل والصفرة اشكل والخضرة انبل والسواد اهول والبياض افضل یعنی سرخی خوبصورت ہے۔ اور زردی دیکھنے میں اچھی لگتی ہے۔ اور سبزی، بزرگی اور وقار کا سبب ہے۔ اور سیاہی ہولناک ہے۔ اور سفیدی فضیلت اور خوبی رکھتی ہے۔ اور لغت عرب میں ہر رنگ کی قوت اور صفائی بیان کرنے کیلئے کسی لفظ کے ساتھ جو تاکید کرے کہتے ہیں احمر قانی واصفر فاقع واسود حالك واخضر وارق و ناضر دابيض ناصع۔ پس نقوع کا معنی خاص زرد رنگ کی صفائی اور تیزی ہے۔ دوسرے رنگ میں اس کا استعمال جائز نہیں۔

گائے کے رنگ کا نشان دینے کے باوجود بنی اسرائیل نے پھر سوال کیا قَالُوْا کہا کہ اگرچہ اس گائے کا کمال عمر، رنگ اور خوبصورتی کے اعتبار سے ہم نے دریافت کر لیا لیکن یہ کمال بہت سی گائیوں میں مشترک ہے۔ ایک فرد کی ترجیح کا باعث نہیں ہو سکتا جس کی وجہ سے اس عجیب خاصیت کے پائے جانے کی علت ہمارے ذہن میں آسکے۔ پس

اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کریں۔ تاکہ ہمارے لئے بیان فرماتے کہ اس گائے کی معینہ حقیقت کیا ہے جو کہ خصوصاً اس میں اس خاصیت کے ایجاد کو ترجیح دینے والی ہو۔ کیونکہ

اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا تحقیق گائے کی جنس ایک دوسرے کے مشابہ ہے ہماری حس اور خیال میں اس خاصہ عجیب کی ایجاد کیلئے اس قدر تخصیصات کے باوجود ترجیح دینے والی کوئی چیز حاصل نہیں ہوئی۔ وَاِنَّا اور تحقیق جب ہم اس ترجیح دینے والی چیز کو دریافت کرلیں گے۔ اور ہمارے ذہن نشین ہو جائے گی اِنْشَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا دریافت کرلیں اور مطلع ہو جائیں گے۔ کہ اس میں اس خاصہ عجیب کا منشا یہ ہے۔ پھر ہم آپ کے فرمان کی پیروی کی راہ میں سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ اور پوری بصیرت کے ساتھ آپ کے حکم کی تعمیل کریں۔

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر بنی اسرائیل انشاء اللہ کا کلمہ نہ کہتے تو اس گائے کو کبھی نہ پا سکتے۔ اور ان کی دلی تسلی نہ ہوتی۔ اس کلمہ کی برکت سے حیرت اور تردد سے رہا ہوئے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ اس مبارک کلمہ کی مدد لینا ہر نیک کام میں جسے حاصل کرنے کی غرض ہے مبارک اور استحباب شرعی کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ یہ کلمہ خدا تعالیٰ کی ذات سے استعانت اور اپنے کاموں کو اس کی مشیت کے سپرد کرنا بھی ہے۔ اور اس کی قدرت اور اس کے ارادہ کے نافذ ہونے کا اقرار واعتراف بھی ہے۔ اور ان دونوں امور میں اعتقاد اور عمل کی اصلاح ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تحقیق حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ مرجح جو تمہارے ذہن نشین ہو جائے۔ اور اس عجیب خاصیت کی ایجاد کا موجب اس میں ہو دو چیزیں ہیں۔ پہلی چیز اس گائے کا خالص اپنی عزت پر ہونا کہ اس نے کبھی بوجھ اٹھانے اور بنی آدم کے دوسرے اعمال کی ذلت کا منہ نہ دیکھا۔ دوسری چیز اپنی نوع کے عیوب سے اس کا پاک ہونا کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ کیونکہ

اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تحقیق وہ ایسی گائے ہے جو کہ کسی کام میں کبھی نہ چلی اور ذلیل

نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ تُثِیْرُ الْاَرْضَ زمین کو ہل چلانے اور بار برداری میں مضطرب کیا ہو۔
وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے۔ اور کنویں سے ڈول کھینچتی ہے مُسَلَّمَةٌ سالم رکھی گئی ہے۔ اس سے کہ آدمیوں کے ہاتھ اسے لگیں۔ یا کسی کام میں اسے ذلیل کریں یا اس کے بدن میں کاٹ کر سوراخ کر کے اور داغ لگا کر تصرف کرے جس طرح کہ جانوروں میں عمل کرتے ہیں یہاں تک کہ لَّاشِیَةَ فِیْهَا اس کے بدن میں مخالف رنگ کا کوئی داغ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر کام میں ذلیل ہوتی تو لازماً اس کے بدن کے بعض اجزاء کا رنگ بدل جاتا۔ جیسا کہ جانوروں میں مجرب ہے۔ اور وہ بدلا ہوا رنگ نظر آتا ہے۔
قَالُوا الْاٰنَ بنی اسرائیل کہنے لگے کہ اب اور وہ اصل میں زمانے کے غیر منقسم جز کا نام ہے خواہ وہ غیر منقسم جز وگزشتہ زمانے میں ہو یا آئندہ فرض کر لیا جائے لیکن جب اسے لام عہد کے ساتھ معرفہ کرتے ہیں تو اس سے وہی خاص جز و مراد لیتے ہیں جسے متکلم اور مخاطب پہنچانتا ہے۔ اور وہ نہیں ہے مگر جز و موجود اور لام عہد داخل کرنے کے بعد اس لفظ کو مبنی ظرفوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ منصوب لاتے ہیں۔ جیسے کہ الیوم اور الساعۃ میں بھی اسی قسم کا عمل کرتے ہیں۔
جِئْتَ بِالْحَقِّ آپ نے صحیح فرمایا کہ حقیقت میں اس میں اس نادر صفت کی ایجاد کا سبب یہی ہے۔ اور اب ہمارا تردد بالکل زائل ہو گیا۔ اس لئے کہ تمام حیوانات اور انسانوں میں فیضان حیات عالم غیب سے سب سے پہلے روح حیوانی پر ہوتا ہے۔ اور اس روح کے وسیلے سے زندگی کا اثر بدن کے تمام اجزاء گوشت پوست وغیرہ میں پہنچتا ہے۔ اور حیوانات کی دو قسمیں ہیں وحشی اور اہلی وحشیوں کی حیات متعدی نہیں۔ بلکہ ان کی ذات کو لازم ہے ان کی حیات سے انسان کو اثر کیسے پہنچے۔ کیونکہ وہ اس سے پوری نفرت رکھتے ہیں۔ اور بھاگتے ہیں یا اسے قتل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ پس زندگی جس کا فیض انسان کو پہنچے اور اسے زندہ کرے نہیں ہوگی مگر اہلی جانوروں کی زندگی' اور اہلی جانوروں سے بھی ہماری نظر میں جس چیز نے غیبی حیات کو قبول کیا ہے' متعارف اسباب نطفہ ڈالنے اور گائے کے جسم کے رحم کی تربیت کے وسیلے کے بغیر ہے کہ سامری کے بچھڑے میں جبریل علیہ السلام کی

سواری کے پاؤں کے نیچے خاک ڈالنے کی وجہ سے وہ بولنے لگا تھا تو ہمارے مردے کو کسی گائے کے جسم پر فائض زندگی کے وسیلے سے زندہ کرنا حکمت خداوندی کے مطابق ہے۔ پھر دوسری گائیاں جو کہ آدمیوں کی قیدی ہیں۔ اور آدمی ان کے جسموں میں انہیں مطیع و ذلیل کر کے اور کان کاٹ کر اور سوراخ کر کے اور داغ لگا کر تصرف کرتے ہیں۔ اور اپنے کاموں میں انہیں بھگاتے ہیں۔ اپنی خالص غیبی حیات پر نہیں رہتیں۔ اور ان کی روح حیوانی اس صفائی کی حالت اور قوت پر نہیں رہتی جس کی وجہ سے مردے کو زندہ کرنے کا واسطہ بن سکے۔ مگر ہل جوتنے اور پانی کھینچنے وغیرہ کے پردے میں اور جو غیبی حیات کی ایجاد کا بے پردہ واسطہ ہے لازماً اپنی صفائی' قوت اور خالص ہونے پر باقی رہے گا۔

نیز اس قسم کی گائے جس کا رنگ زرد' صاف' بے داغ اور آدمیوں کی خدمت کرنے سے اور ذلت سے پاک ہو۔ اور اس عزت کے ساتھ معزز ہو کہ کسی کے تابع فرمان نہ رہی۔ سامری کے بچھڑے کے ساتھ پوری مشابہت رکھتی ہے۔ جو کہ خالص سونے سے بنایا گیا تھا اور اسے پوری تعظیم اور توقیر کے ساتھ رکھا اور وہ بچھڑا ہمارے سامنے بولتا تھا اور اس سے حیات غیبیہ کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ پس حکم المثلین واحد یعنی دو ایک جیسی چیزوں کا حکم ایک ہوتا ہے کے مطابق اس قسم کی گائے میں اس اثر کی ایجاد ذہن نشین ہو گی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اور اگر کوئی کہے کہ انسانی حیات' انسانی حیات کے ساتھ ایک ایسی مناسبت رکھتی ہے جو کہ حیات حیوانی کی حیات انسانی سے مناسبت سے زیادہ قوی ہے۔ پس افراد انسانی میں سے بعض کو اس مردے کے جسم کے ساتھ مس کرنے کو اس خلاف عادت کام کا وسیلہ کیوں نہ فرمایا۔ ہم کہیں گے کہ اجزائے انسانی کو حیوان کے ساتھ مس کرنا اس ممسوس میں زندگی ایجاد کرنے کا وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس وقت جب مس کرنے والے سے زندگی جدا ہو جائے۔ اور ممسوس میں سرایت کرے۔ اور مس کرنے والے کی روح حیوانی ممسوس کے بدن کے ساتھ تعلق پکڑے۔ پس مس کرنے والے سے روح کا نکلنا ضروری ہوتا۔ اور ایک انسان کو دوسرے انسان میں گویائی پیدا کرنے کیلئے قتل کرنا اسی قبیلے سے ہوا کہ بنی قصر او ہدم مصرا یعنی

محل بنایا۔ اور شہر ڈھادیا۔ اس لئے کہ شرعی سبب کے بغیر کسی انسان کو قتل کرنا کسی وجہ سے جائز نہیں ہے بخلاف حیوان کے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذبح کرنا ایک قسم کی عبادت ہے۔ اور جب شرعاً انسانی زندگی منتقل کرنا مشکل ہوا تو ایسے حیوان کا منتقل کرنا ضروری ہوا جو کہ عالم غیب سے زندگی قبول کرنے میں انسان کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے کہ اس کے حمل کی مدت انسان کی مدت حمل کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دودھ سب سے افضل ہے۔ اور حمل انسانی کی مدت کے ساتھ اس کے حمل کی مدت کا برابر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان پر روح حیوانی کی مدت فیضان میں اس پر بھی روح حیوانی فائض ہوتی ہے۔ اور اس کی جسمانی ساخت اسی مدت میں پوری ہوتی ہے۔

اس گائے کا واقعہ جسے بنی اسرائیل نے مردے کو زندہ کرنے کیلئے ذبح کیا تھا

قصہ مختصر جب بنی اسرائیل کو اپنی سمجھ اور استعداد کی مقدار کے مطابق اس امر الٰہی میں حکمت کی وجوہ پر اطلاع ہوئی تو سرگرم عمل ہو گئے۔ اور ان صفات کے ساتھ موصوف گائے کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اتفاقاً جو گائے کہ ان صفات سے موصوف ہو ان علاقوں میں صرف ایک تھی اور اس کا قصہ یوں تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بہت نیک آدمی تھا اور اس کا چھوٹی عمر کا ایک بیٹا تھا اور زمانے کے حادثوں کی وجہ سے اس نیک آدمی کے پاس مال کی جنس میں سے گائے کے ایک بچھڑے کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس بچھڑے کو پکڑ کر اس کی گردن پر مہر لگا کر حضرت ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب علیٰ نبینا علیہم السلام کے معبود کے نام سے برکت لے کر جنگل میں چھوڑ دیا اور عرض کی بار خدایا! میں نے یہ بچھڑا تیرے پاس اپنے بیٹے کیلئے امانت رکھی ہے یہاں تک کہ میرا بیٹا بڑا ہو۔ اور یہ بچھڑا اس کے کام آئے وہ بچھڑا اس جنگل میں چرتا تھا اور درختوں کے پتوں سے پلتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے درندوں کے شر سے محفوظ رہتا تھا اور جب جنگل سے باہر آتا اور آدمیوں میں سے اسے کوئی دیکھتا اور پکڑنے کا قصد کرتا تو اس طرح بھاگتا اور چھپ جاتا کہ کسی کے ہاتھ بالکل نہیں آتا تھا جب یہ لڑکا بڑا ہوا اپنے باپ کی طرح صلاح و تقویٰ کے ساتھ پروان چڑھا۔ رات کے تین حصے کرتا تھا ایک حصہ میں اپنی والدہ کے پاس بیٹھتا۔ اور اس کی

خدمت کرتا۔ ایک حصہ میں آرام کرتا اور ایک حصہ میں نماز پڑھتا اور جب صبح ہوتی' رسی اور کلہاڑا لے کر جنگل کی راہ لیتا۔ اور بہت سا ایندھن اکٹھا کر کے دن کے آخری حصے میں بازار میں آ کر فروخت کر دیتا اور اس ایندھن کے بھی تین حصے کرتا تھا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے نام پر دے دیتا ایک حصہ خود کھاتا اور ایک حصہ اپنی ماں کے پاس چھوڑ دیتا اور ساری عمر اسی مصروفیت میں گزاری۔ یہاں تک کہ اس کی والدہ نے اسے کہا کہ تمہارے باپ نے تمہارے لئے فلاں جنگل میں ایک بچھڑا چھوڑا تھا اور حضرت ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے معبود نام کے ساتھ امانت کر دیا تھا۔ اب وہ بچھڑا پوری جوانی کو پہنچ چکا ہوگا۔ جوان جانوروں کی طرح شوخی نہیں رکھتا اور نہ ہی بوڑھوں کی سی کمزوری' تجھے چاہئے کہ اس جنگل سے اس بچھڑے کو لے آئے۔ اور جنگل سے لکڑیاں لانے کے کام میں استعمال کرے تاکہ ہر روز ایندھن اٹھانے کی وجہ سے تیری پشت زخمی نہ ہو جائے۔

بیٹے نے کہا کہ اس بچھڑے کی نشانی کیا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس جنگل میں جاؤں اور کوئی اور گائے دوسرے کے مال سے پکڑ کر لے آؤں۔ اور وہ میرے لئے حلال نہ ہوگی۔ اس کی ماں نے کہا ہے کہ اس کی علامت یہ ہے کہ اس کا رنگ تیز چمکدار زرد ہے۔ اگر کوئی اسے دور سے دیکھتا ہے۔ تو یوں لگتا ہے کہ آفتاب کی کرن اس کی کھال سے باہر آ رہی ہے۔ اور اسی لئے ہم نے اس کا نام سونے کا بچھڑا رکھا ہوا تھا۔ بیٹے نے کہا کہ ابھی مجھے بچھڑے کی یقینی پہچان نہیں ہوئی کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی رنگ کی کسی اور شخص کی گائے اس جنگل میں چرتی ہو۔ اس کی ماں نے کہا کہ اس کی دوسری علامت یہ ہے کہ وہ گائے جب آدمی کو دیکھتی ہے۔ تو بھاگ جاتی ہے۔ اور بالکل قابو نہیں آتی جب تو اسے دور سے دیکھے تو تجھے چاہئے کہ بلند آواز سے کہے کہ اے گائے حضرت ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے خدا کے نام کے ساتھ مطیع ہو جا۔ اور میرے پاس آ۔ بیٹا اس علامت کو دل میں رکھ کر اس جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے دیکھا اسی صفت والی گائے چر رہی ہے۔ اور بیٹے نے ماں کی تعلیم کئے ہوئے طریقے کے مطابق آواز دی۔ وہ گائے چراگاہ چھوڑ کر اس لڑکے کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس لڑکے کو اس کی ماں نے وصیت کی تھی کہ تو اس گائے کو

گردن سے پکڑ کر کھینچ کر لے آ اور اس پر سوار نہ ہونا تاکہ وہ گائے انسانی تصرف میں نہ آئے۔ اور مستعمل نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آدمی کے استعمال کرنے سے اس سے برکت زائل ہو جائے۔

ماں کی فرماں برداری کی برکت

لڑکا اسے ماں کی نصیحت کے مطابق گردن پکڑ کر کھینچ کر لا رہا تھا۔ وہ گائے اذن خداوندی سے بولنے لگی اور اس نے کہا اے نیک بخت جوان مجھ پر سوار ہو جا تاکہ آسانی کے ساتھ اپنے گھر پہنچ سکے کیونکہ یہاں سے تیرے گھر تک ایک دن کی راہ ہے۔ اس لڑکے نے کہا کہ میری ماں نے مجھے تجھ پر سوار ہونے کا حکم نہیں دیا ہے۔ بلکہ کہا ہے کہ اس کی گردن سے کھینچ کر لے آ۔ اس نے کہا تجھے آفرین اور شاباش۔ میں نے تیرا امتحان لیا تھا اگر تو مجھ پر سوار ہو جاتا تو میں تجھے اپنی پشت سے گرا کر بھاگ جاتی کیونکہ میری یہ سب فرمانبرداری اسی وجہ سے ہے کہ تو اپنی ماں کے ساتھ نیکی اور اچھا سلوک کرتا ہے۔ اور اس کے حکم سے آگے نہیں بڑھتا۔ اسی راستے میں اس لڑکے کو ابلیس لعین ایک مسافر کی شکل میں ملا اور کہنے لگا اے جوان تو بہت نیک بخت معلوم ہوتا ہے مجھے ایک حادثہ پیش آیا ہے اس میں میری مدد فرمایا کہ اس پہاڑ کی اس طرف میرا گائیوں کا ریوڑ ہے۔ اور میں وہ ریوڑ چرا رہا تھا کہ اچانک مجھے بشری حاجت ہوئی۔ اور قضائے حاجت کیلئے میں اس پہاڑ میں داخل ہو گیا۔ اب میرے پیٹ میں بہت درد ہے یہاں تک کہ چلنے سے عاجز ہو گیا ہوں۔ اور اپنے ریوڑ تک نہیں پہنچ سکتا اگر تو مجھے حکم دے میں اس گائے پر سوار ہو جاؤں اور میں اپنے ریوڑ میں سے چنی ہوئی دو گائیں اس گائے پر سواری کی اجرت کے طور پر تیرے حوالے کر دوں گا۔ پس مجھے بھی ایک نفع حاصل ہو جائے گا۔ اور تجھے بھی نمایاں فائدہ ملے گا اور تیری گائے کو کسی قسم کا نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔

اس لڑکے نے کہا کہ میری ماں نے خود مجھے اس گائے پر سواری کی اجازت نہیں دی ہے میں تجھے کرایہ کے ساتھ کس طرح اس پر سوار کروں؟ ابلیس نے کہا کہ تیری ماں کو کیا عقل ہے؟ تجھے چاہئے کہ تو اپنی عقل کے ساتھ اس کام کی اچھائی برائی کو تولے اور اپنے نفع کو ہاتھ

سے نہ جانے دے اور میری نصیحت کو قبولیت کے کان سے سن کہ میں سراسر تیری خیر خواہی کر رہا ہوں۔لڑکے نے کہا کہ میں اپنی ماں کے حکم کی مخالفت بالکل نہیں کروں گا۔شیطان نے اس کا پیچھا کیا یہاں تک کہ لڑکا عاجز آ گیا۔اور اس نے بلند آواز کے ساتھ کہا اے ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے خدا مجھے اس برے ساتھی سے چھڑا ابلیس نے جب یہ آواز سنی اپنے آپ کو ایک جانور کی شکل میں کر کے اڑا اور دفع ہو گیا۔اس گائے نے اس جوان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کچھ پتہ ہے کہ یہ کون تھا؟ یہ ابلیس تھا چاہتا تھا کہ کسی حیلے سے مجھ پر سوار ہو جائے۔اور اس کے سوار ہونے سے برکت مجھ سے دور ہو جائے۔ پھر میں تیرے کام نہ آ سکوں۔ جب تو نے حضرت ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے خدا کا نام لیا اور فریاد کی ایک فرشتہ اس شیطان کو دفع کرنے کیلئے حاضر ہوا اور شیطان کمال بے قراری کے ساتھ اپنے آپ کو جانور کی صورت میں ڈھال کر اڑ کر چلا گیا۔

قصہ مختصر شام کے وقت وہ جوان اس گائے کو پکڑے ہوئے اپنی ماں کے پاس پہنچا اور اسے اس عجیب ماجرا اور دو مرتبہ گائے کے بات کرنے کی خبر دی۔اس کی ماں نے کہا کہ یہ گائے اس جنس سے نہیں ہے کہ ہم اسے بوجھ لاد کر ذلیل کریں۔اور ہم سے اس گائے کی تعظیم کا حق پورا نہیں ہو سکے گا۔بہتر یہ ہے کہ اس گائے کو فروخت کر دے تا کہ اگر کوئی اس گائے کی خوبی کے ساتھ حفاظت نہیں کرے گا تو اس کا وبال اس کی گردن پر ہو گا۔اور تجھے بھی ایندھن بیچنے کی تکلیف سے چند روز کیلئے فراغت مل جائے گی جب صبح ہوئی تو یہ جوان گائے کو لے کر گھر سے باہر آیا اور منڈی کی طرف روانہ ہوا اور اپنی ماں سے پوچھ کر کہ کس قیمت پر فروخت کروں اس نے کہا کہ اس گائے کی اس شہر میں اس وقت تین دینار قیمت ہے جو کہ خالص سونے کے ۱۴ ماشے ہوتے ہیں۔لیکن یہ گائے عجیب ہے اگر اس قیمت پر کوئی سودا کرے تو تجھے چاہئے کہ مجھ سے پوچھنے کی شرط کرے۔اور ایک نہ بیچنا۔اللہ تعالیٰ نے اس گائے کی قیمت مقرر کرنے کیلئے ایک فرشتہ بھیجا۔جو کہ اس جوان کو راستے میں ملا اور اس نے کہا کہ اے جوان یہ گائے تو کتنے میں بیچتا ہے؟ جوان نے کہا تو کتنی قیمت دیتا ہے فرشتے نے کہا تین دینار جوان نے کہا کہ اس شرط پر کہ میری ماں راضی ہو جائے تین دینار

میں بیچ دوں گا۔ فرشتے نے کہا کہ اس شرط ختم کر دے۔ اور مجھ سے چھ دینار لے لے۔ جوان نے کہا کہ چھ دینار کے ساتھ بھی یہی شرط ہے۔ فرشتے نے کہا کہ بارہ دینار لے لے۔ لیکن اس شرط سے دستبردار ہو جا۔ جوان نے کہا اے پیارے اگر تو اس گائے کے وزن کے مطابق مجھے خالص سونا بھی دے میں اپنی والدہ کی مرضی کے بغیر اسے نہیں بیچوں گا۔ کیوں دردسر بنتا ہے۔ فرشتے نے کہا میں آدم زاد نہیں ہوں میں تیرے امتحان کیلئے آیا تھا کہ تو اپنی ماں کی کس قدر اطاعت کرتا ہے۔

اب اس گائے کو اپنے گھر لے جا اور بازار میں کسی کو نہ دکھانا۔ بنی اسرائیل کو ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ اور اس کا علاج ان کے رسول حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے یہی فرمایا ہے کہ اس قسم کی گائے ذبح کریں۔ بنی اسرائیل جستجو اور تلاش میں ہیں۔ اور تیری گائے کے سوا کوئی اور گائے ان صفات کے ساتھ موصوف نہیں۔ اگر بنی اسرائیل تجھ سے اس گائے کے خواہاں ہوں تو ان کے ہاتھوں ہرگز فروخت نہ کرنا یہاں تک کہ اس کی کھال میں سونا بھر کے تیرے حوالے کریں۔ تا کہ ساری زندگی کیلئے روزی کمانے سے فراغت حاصل ہو۔ اور لوگوں کو پتہ چل جائے کہ جو شخص اپنے بیوی بچوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے جاتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح پرورش فرماتا ہے۔ اور جو شخص اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس مال کو بابرکت اور بارآور کرتا ہے۔ یہ جوان گائے کو پکڑے ہوئے گھر آیا اور تمام ماجرا اپنی ماں کے سامنے ظاہر کیا۔ رفتہ رفتہ اس گائے کی خبر شہر میں مشہور ہوگئی۔ اور بنی اسرائیل اسے خریدنے کیلئے اس کے گھر ہجوم کر کے آئے۔ اور گائے کی قیمت بڑھانے لگے۔ وہ جوان اور اس کی والدہ راضی نہیں ہوتے تھے حتیٰ کہ یوں قرار پایا کہ گائے کو ذبح کرنے اور کھال اتارنے کے بعد اس کی کھال کو سونے سے بھر کر ان کے حوالے کریں اس جوان اور اس کی ماں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ضامن لے کر گائے بنی اسرائیل کے سپرد کر دی۔ **فَذَبَحُوْهَا** ۔ پس بنی اسرائیل نے وہ گائے ذبح کی۔

ذبح اور نحر کا مفہوم

اور ذبح گردن کے اوپر کے حصے کو کاٹنے سے عبارت ہے جو کہ ٹھوڑی کی کھال کے

متصل ہوتا ہے۔ اور اسے حلق کہتے ہیں۔ اور بھیڑ' بکری' گائے اور بھینس میں یہی مسنون ہیں۔ اور نحر گردن کے نچلے حصے کو کاٹنے سے عبارت ہے جو کہ چیز سے متصل ہے۔ اور اسے لبہ کہتے ہیں۔ اور اونٹ میں وہی مسنون ہے۔ اور دونوں صورتوں میں حلق' مری کا کاٹنا منظور ہے۔ اور خون کی دونوں رگیں کاٹنا لازم ہے۔ لیکن اونٹ کی گردن لمبی ہوتی ہے اگر اوپر کے حصے یعنی حلق سے کاٹیں تو روح دیر سے نکلتی ہے۔ اور جانور کو تکلیف دینے کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ خون کا خزانہ جو کہ روح حیوانی کی سواری ہے دل' جگر اور ان کے مضافات ہیں۔ اسی لئے اونٹ کیلئے نحر کا حکم آیا۔ اس کے باوجود اگر کوئی اونٹ کو بھی ذبح کرے جائز ہے۔ جس طرح کہ بھیڑ' بکری اور گائے کی نحر بھی جائز ہے۔ لیکن ترک ادی اور خلاف مستحب ہے۔

وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ اور بنی اسرائیل یہ کام کرنے کے قریب نہ تھے۔ کیونکہ اس گائے ئی خصوصیات کی وضاحت کیلئے سوال پر سوال کئے جاتے تھے اس حد تک کہ ان کی تفتیش کا طویل رشتہ منقطع ہونے کو نہ تھا۔ نیز اس گائے کی قیمت کی گرانی کی وجہ سے اس قدر وافر سونا خرچ کرنے سے بخل کرتے تھے۔ نیز ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مقتول زندہ ہونے کے بعد کسی ایسے کا نام لے دے جس سے رسوائی ہو۔ اور اس سے قصاص لینا مشکل ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے چار و ناچار یہ کام کر لیا۔

اگر بنی اسرائیل کہیں کہ ہمارے اسلاف نے اس واقعہ میں وحی الٰہی سے روگردانی نہیں کی ہے۔ بلکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کے تعین کو گائے ذبح کرنے کے ساتھ وابستہ فرما دیا اور ان دونوں امور میں کوئی مناسبت نہ تھی تو انہوں نے از رہ تعجب اس قدر توقف کیا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ابتداء ہی سے قاتل کا تعین فرما دیتے تو ہمارے اسلاف کبھی روگردانی نہ کرتے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سب غلط ہے۔ بلکہ تمہارے اسلاف شروع واقعہ سے ہی وحی الٰہی کا اقرار نہیں رکھتے تھے۔ اور اسے بعید سمجھتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس امر غیبی پر وحی کے ذریعے اطلاع واقع ہو گی ورنہ وہ ایک دوسرے پر خون کی تہمت نہ لگاتے اور قاتل خود اقرار کر لیتا۔ اور اگر تمہیں اس کا یقین نہیں تو شروع قصہ کو یاد کرو۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم نے ایک جان کو قتل کر دیا جس کا نام عامیل تھا اور اگر چہ قتل کرنے والا تم میں سے ایک تھا لیکن چونکہ یہ قتل تمہارے درمیان واقع ہوا اور قاتل کی تحقیق سے تم باز رہے گویا تم سب قتل میں شریک ہو گئے اور کاش صرف قتل کا ایک گناہ تم سے صادر ہوتا تم نے اس پر ایک اور گناہ بڑھا دیا۔

فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۔ پس تم میں سے ایک آدمی دوسرے کو اس مقدمے میں ڈالتا تھا اور کہتا تھا کہ فلاں آدمی اس کام کا مرتکب ہے نہ کہ میں اور اس صیغہ ادراءتم کا اس تدارءتم ہے تا کو دال میں مدغم کر دیا۔ اور ہمزہ وصل کی ضرورت پیش آئی۔ تدارء بمعنی تَدَافع هے ۔ یعنی ایک آدمی دوسرے کو دھکیلے اور کسی کنویں یا گڑھے میں پھینک دے۔ پس یہ تدارء دوسرا گناہ ہوا کہ ایک دوسرے پر ناحق تہمت لگائی۔ اور اس بات کی دلیل ہوئی کہ تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی آنے کا پورا یقین نہیں۔ اور انہیں غیب کی طرف سے قاتل کی اطلاع کو تم بعید از امکان جانتے ہو۔ (اقول و باللہ التوفیق: یہی عقیدہ خوارج زمانہ کا ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کو تسلیم نہیں کرتے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ اور خدا تعالیٰ چھپے ہوئے پردے سے باہر لانے والا ہے مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ اس چیز کو جسے تم چھپاتے تھے۔ قاتل کے حال' نفاق اور اپنے یقین کی کمزوری کو۔ اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم نہ فرمایا کہ قاتل کا نام لیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم تکذیب کرو اور قاتل جھوٹی قسم کھالے کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ پس مقدمہ پھر پردے میں رہ جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ کی یہی عادت ہے کہ جب اس کے بندوں میں سے کوئی بندہ کسی چیز پر ہیشگی کرتا ہے خواہ وہ اچھی ہو یا بری اللہ تعالیٰ اسے لوگ پر ضرور ظاہر فرما دیتا ہے۔ اور اس کا حال چھپا نہیں رہنے دیتا۔ بخلاف اس کے کہ بندے سے ایک دو بار کوئی کوتاہی واقع ہو اس پر وہ نادم ہو۔ اور اسے چھپانے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ بھی اسے اپنی رحمت کے پردے میں چھپائے رکھتا ہے۔ اور پردہ دری نہیں فرماتا۔

عمل صالح اور سر دمومن کا بیان

مستدرک حاکم میں سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت

آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے: لو ان رجلا عمل عملانی صخرۃ صحاء لاباب لها ولاکوۃ خرج عمله الی الناس کائنا ماکان۔ یعنی اگر کسی آدمی نے کسی چٹان میں کوئی کام کیا جس میں کوئی دروازہ ہو نہ سوراخ۔ اس کا عمل لوگوں کی طرف ضرور ظاہر ہو کر رہے گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اور بیہقی نے امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کی کوئی عادت ہو اچھی یا بری اللہ تعالیٰ اس پر چادر ظاہر کر دیتا ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے بیہقی نے کہا کہ موقوف زیادہ صحیح ہے۔

اور ابوالشیخ نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ مومن کون ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ اللہ اور رسول بہتر جانتا ہے۔ فرمایا مومن وہ ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ اس جہان سے نہیں لے جاتا جب تک اس کے کانوں کو اس ثنا اور صفت سے پر نہ کر دے جو اسے پسند ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ پرہیز گاری کا کام مکان میں بجا لاتا ہے جو کہ ستر مکانوں کے اندر ہو۔ اور ہر مکان پر لوہے کا دروازہ ہو اللہ تعالیٰ اسے اس کے عمل کی چادر پہنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ اس عمل کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اس کے کئے ہوئے کام سے زیادہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ عمل کی مشہوری اور اظہار تو اس کے تقویٰ کا بدلہ ہوا۔ زیادہ کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: اگر متقی آدمی زیادہ طاقت پائے تو اپنے عمل کی حد سے زیادہ کام کرے۔ اللہ تعالیٰ زیادہ کی شہرت کرنے میں اس کی اس نیت کا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

فاجر کا بیان

پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فاجر کون ہے۔ لوگوں نے عرض کی خدا اور رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا کہ فاجر وہی ہے جو اس جہان سے گزرنے سے پہلے اپنی بدگوئی کو اپنے کانوں سے سنے اگر اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ کسی مکان میں جو کہ ستر مکانوں کے اندر ہو۔ اور ہر مکان اور ایک مضبوط لوہے کا دروازہ بند ہو کوئی کام کرے اللہ

تعالیٰ اسے اس کے عمل کی چادر پہنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ اس عمل کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اس کے کیے ہوئے کام سے زیادہ کو اس کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ یہاں زیادہ کہنے کی وجہ کیا ہوگی۔ فرمایا فاجر آدمی اس چیز پر مستعد ہے کہ اگر طاقت پائے تو زیادہ فسق و فجور کرے اللہ تعالیٰ اس بری نیت کا بدلہ دیتا ہے۔

مشہور نحوی سوال

یہاں ایک مشہور نحوی سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ مخرج اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور اس نے مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ میں عمل کر کے اسے مفعولیت کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ حالانکہ ماضی کے معنوں میں ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کی چھپائی ہوئی چیزوں کے اظہار کو خصوصاً عامیل مذکور کے مقدمہ قتل میں ہزاروں سال گزر گئے۔ اور اسم فاعل کے عمل کے صحیح ہونے کیلئے معنائے مستقبل شرط ہے یہاں شرط عمل کے ثبوت کے بغیر کس طرح عامل ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی چھپائی ہوئی چیزوں کو ظاہر کرنا اگرچہ خطاب کے وقت کے اعتبار سے ماضی ہے۔ لیکن تدافع اور اختلاف کے اعتبار سے مستقبل ہے۔ اور اسم فاعل کے عمل کے صحیح ہونے میں مستقبل کے معنی کا اعتبار خطاب کے وقت کی نسبت سے ضروری نہیں گزشتہ واقعہ کے وقت کی نسبت سے درکار ہے۔ اور بس لیکن اس جواب پر ایک اور سوال متفرع ہوتا ہے کہ جملہ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ حال ہے فَادّٰرَءْتُمْ سے۔ پس چاہیے کہ اس جملہ کا مضمون تدافع و اختلاف کے ساتھ ملا ہوا ہو نہ کہ اس سے مستقبل میں اور اس میں شک نہیں کہ مکتومات (یعنی مخفی امور) کا اظہار تدافع و اختلاف کے ساتھ ملا ہوا نہ تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ حال مقدرہ ہے۔ اس قبیلے سے کہ جاء نی زید مع صقر وھو صاعد به غدا مختصر کلام یہ کہ خطاب کے وقت اس چیز کی جو کہ تدارء اور تدافع کے وقت مستقبل تھی حکایت فرمائی ہے۔ جیسا کہ آیت وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ میں حکایت حال فرمائی ہے۔ اور احتمال ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہو۔ پس اشکال وارد ہی نہ ہو قصہ مختصر قاتل کو ظاہر کرنے کیلئے ہم نے تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا جب گائے ذبح ہوگئی۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ ۔ پس ہم نے فرمایا اس نفس مقتولہ کو مارو اور ضمیر کا مذکر لانا قتیل کے

اعتبار سے ہے۔ اور ضمیر کے مرجع کیلئے نفس کا اعتبار نہ کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ بدن میت سے جدا شدہ نفس کو مارنا ممکن نہیں۔ پس اگر اضربوھا فرمایا جاتا تو بظاہر تکلیف مالا یطاق ہوتی۔ اور تاویل کی ضرورت ہوتی۔ بخلاف قتل کے کہ مذمت اور سزا کا مورد ہی قتل ہے جو کہ نفس پر وارد ہوتا ہے۔ اور اس کے تعلق کو بدن سے جدا کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت میں قتل وہی ہے۔ اور بس۔

بِبَعْضِهَا اس گائے کے اعضاء میں سے بعض کے ساتھ۔ تا کہ وہ زندہ ہو جائے۔ اور اپنے قاتل کی خبر دے اور اس سے قصاص طلب کرے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ وہ عضو کونسا عضو ہے' بعض کہتے ہیں کہ اس گائے کی زبان تھی کیونکہ مردے کو زندہ کرنے کا مقصد صرف اسے گویا کرنا تھا اور اس معنی کو زبان کے ساتھ مناسبت زیادہ ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اس گائے کی ریڑھ کی ہڈی تھی اور عجب الذنب اس ہڈی کا نام ہے جس پر جانوروں کا خون اگتا ہے۔ کیونکہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ روز حشر تک آدمی اور جانوروں کے تمام اجزاء گر جائیں گے۔ اور پرانے ہو جائیں گے مگر یہ ہڈی جو کہ باقی رہے گی اور اسی ہڈی سے قیامت کے دن لوٹانے کیلئے تخلیق کی ترکیب شروع کریں گے۔ اور جسم کا ستون یہی ہڈی ہے۔

اور بعض نے کہا کہ اس گائے کی دائیں طرف کی ران تھی کیونکہ زیادہ تر حرکت اسی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں کندھوں کے درمیان کا گوشت کا ٹکڑا ہو سکتا ہے۔ اور زیادہ تر روح حیوانی کا مسکن جو کہ دل اور جگر کے مضافات میں پھیلا ہوا ہے وہی ہے۔ جبکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ بعض معین نہ تھا بلکہ اس میں اختیار دیا گیا تھا کہ جس بعض کے ساتھ ماریں اللہ تعالیٰ مارنے کے ساتھ مردے کو اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ زندہ فرمادے گا۔ ہاں جب انہوں نے گائے ذبح کی ہوگی کسی نے زبان کو کسی نے ران کو اور کسی نے گوشت کا کوئی اور ٹکڑا مارا ہوگا۔ نقل کرنے والوں نے یہ سب کچھ نقل کر دیا۔ اور انہوں نے سمجھا کہ یہ سب امر الٰہی تھا۔

قصہ مختصر گائے کو ذبح کرنے کے بعد بنی اسرائیل نے گائے کے اعضاء کے ساتھ مارا۔ اور وہ زندہ ہو گیا۔ اور اس حالت میں کھڑا ہوا کہ اس کے حلق کی رگیں فوارے کی طرح خون

کے ساتھ جوش مار رہی تھیں۔ اور اس نے اپنے قاتل کی خبر دی کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔ تا کہ میرے مال کا وارث ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قاتل سے اقرار کرایا اور اقرار کے بعد قصاص تک پہنچایا۔ اور اس کے بعد شریعت کا حکم آیا کہ قاتل، مقتول کی وراثت سے محروم ہوگا اگرچہ باپ، بیٹے یا بھائی کا تعلق رکھتا ہو۔ حدیث پاک میں وارد ہے کہ ماورث قاتل بعد صاحب البقرہ یعنی گائے والے کے بعد کوئی قاتل وارث نہیں ہوا۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ قاتل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقرار کرنے کا ذکر اخبار میں نہیں آیا اور مقتول کے کہنے سے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ اکثر فقہاء نے اس سوال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ جب مقتول موت کے بعد زندہ ہو گیا تھا اور وہ برزخ کا حال اور عذاب اخروی کا نمونہ دیکھ کر آیا تھا اس لئے اس کا قول دو معتبر گواہوں کی جگہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اونچا ہو گیا۔ ہاں جب تک مقتول نہیں مرا ہے۔ اور اس نے برزخ کے حال کا معائنہ نہیں کیا اس وقت تک اس کے کلام میں سچ اور جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اور قاتل کے تعین میں اس کا کہنا معتبر نہیں ہوتا۔ لیکن علم کلام والوں کے قاعدے کے مطابق اس جواب میں ایک قوی خدشہ ہے۔ کیونکہ اہل کلام نے معجزات کی بحث میں یوں تقریر کی ہے کہ اگر کسی رسول علیہ السلام کی دعا سے مردہ زندہ ہو جائے۔ اور اس رسول علیہ السلام کی نبوت کی صداقت پر گواہی دے۔ یا اس رسول علیہ السلام کی تکذیب کرے معتبر نہیں ہوگی بلکہ اس رسول علیہ السلام کا معجزہ صرف مردے کو زندہ کرنا ہے۔ اس کی گواہی کو دعویٰ نبوت کی موافقت اور اس کی مخالفت میں کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ مردہ انسان ہے جب زندہ ہوا انسانی عقل، شعور، خیال اور وہم جو کہ معرفت میں غلطی کا محل ہے اسے حاصل ہوا اس کا حکم دوسرے افراد انسانی کا حکم ہے کہ ان کی گواہی کام نہیں آتی۔ اور اگر کوئی جانور یا پتھر یا درخت رسول علیہ السلام کی دعا سے بولنے لگے۔ اور دعویٰ نبوت کے سچے ہونے کی گواہی دے تو معتبر ہے۔ اور اگر تکذیب کرے تو معتبر ہے۔ اور یہ نبوت کے جھوٹے مدعی کے حق میں رسوائی ہوئی۔ جیسا کہ مسلمہ کذاب اور اس کے ساتھیوں کی رسوائی

کیونکہ پتھروں اور حیوانات کا بولنا خیال اور وہم کی بناوٹ سے نہیں ہے۔ بلکہ غیبی گفتگو ہے اس میں صدق و کذب کی گنجائش نہیں۔ پس اس قاعدے کے مطابق چاہئے کہ مردے کی گفتگو زندہ ہونے کے بعد صدق و کذب کا احتمال رکھے کیونکہ کلام میں جھوٹ بولنا اور فریب دینا انسان کا شیوہ ہے۔ اور اس کا کہا ہوا قاتل کے تعین میں معتبر نہ ہو جب تک کہ قاتل کا اقرار درمیان میں نہ ہو۔

پس صحیح جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے بعض اعضاء کو مارنے سے مردہ زندہ ہو جائے گا۔ اور اپنے قاتل کے حال کی خبر دے گا۔ پس اس مردے کی گواہی کی سچائی خصوصیت کے ساتھ درحقیقت بارگاہ خداوندی سے ثابت ہوئی۔ لہٰذا اس مردے کے کہنے پر قصاص کا فیصلہ قاتل کے اقرار کے بغیر جائز ہوا۔ اور دوسرے مردوں کو اس مردے پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ خصوصاً اس خبر میں اس کی سچائی نص سے ثابت تھی۔ اگرچہ التزاماً ہی سہی۔ اور یہ بھی اس صورت میں ہے کہ یہ معجزہ ظاہر اور ہولناک حالت دیکھنے کے بعد قاتل کا اقرار ثابت نہ ہو۔ اور وہ حد امکان سے بہت زیادہ دور ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ قاتل نے بھی اقرار یا ایسی خاموشی اختیار کی ہو گی جو کہ اقرار کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اور صحیح حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں انصار کی ایک بچی جس نے گلے' ہاتھ اور پاؤں میں چاندی کا زیور پہن رکھا تھا کھیلنے کیلئے باہر آئی ایک لعین یہودی نے اسے ایک ویران جگہ میں قتل کر دیا۔ اور اس کا زیور اتار لیا جب اس کے وارثوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے بچی کو پا لیا اور ابھی اس میں کچھ جان باقی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس یہودی کو بلا کر قصاص لیا اور بعض روایات میں آیا کہ یہودی نے اقرار بھی کیا۔ پس احتمال ہے کہ جس قاتل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قصاص لیا اس نے بھی اقرار کیا ہو لیکن روایات میں اقرار کا ذکر رہ گیا۔

مسئلہ دیت اور قصاص کا بیان

اب اس مسئلہ کا حکم شریعت میں دریافت کرنا چاہئے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

شریعت بھی اس مسئلہ میں اسی شریعت کے مطابق ہے جیسا کہ تورات مقدس نے بیان کیا ہے۔ اگر کوئی مردہ کسی جگہ پڑا ہو جس کے جسم پر قتل کا اثر اور زخم پائے جائیں۔ اور اس کے قاتل کا پتہ نہ ہو۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس محلہ والوں یا اس بستی والوں کو جہاں مقتول پڑا ہو یا قریبی بستی اگر مقتول جنگل میں پڑا ہو میں سے پچاس نیک او معتبر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی قسم دینی چاہئے کہ نہ ہم نے اس مقتول کو قتل کیا۔ اور نہ ہمیں اس کے قاتل کی خبر ہے۔ اگر انہوں نے قسم کھالی تو تمام محلہ والوں یا بستی والوں سے خون بہا لینا چاہئے۔ اور چھوڑ دینا چاہئے۔ اور اگر وہ قسم کھانے سے انکار کریں تو انہیں قید میں رکھنا چاہئے حتیٰ کہ قسم کھائیں یا تحقیق کر کے قاتل کا پتہ دیں۔ کیونکہ اس قدر زیادہ لوگ ایک محلہ یا ایک بستی میں سے اس واقعہ سے بے خبر نہیں ہو سکتے جو اسی محلہ یا بستی میں رونما ہوا۔

اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک تفصیل ہے اگر اس محلہ یا بستی کی ایک جماعت پر قتل کی تہمت ہو اس طرح کہ غالب گمان حکم کرتا ہے کہ انہوں نے قتل کیا ہوگا جیسا کہ وہ جو کہ ایک گھر یا جنگل میں جمع ہوئے تھے اس کے بعد منتشر ہو گئے۔ اور ایک کو قتل کر کے چھوڑ گئے یا اس محلہ یا بستی والوں کو اس مقتول کے ساتھ دشمنی تھی۔ اور اس کے ساتھ ان کی دشمنی مشہور تھی۔ پس مقتول کے وارثوں کو کہنا چاہئے کہ اس جماعت میں سے ایک شخص کا نام مقرر کر کے پچاس آدمی قسم کھائیں کہ فلاں آدمی اس شخص کا قاتل ہے۔ اور ان کے قسم کھانے کے بعد اس شخص کے مال سے خون بہا دلانا چاہئے۔ اور قصاص نہیں ہے۔ اور امام مالک اور امام احمد کہتے ہیں کہ اگر جان بوجھ کر قتل کرنے کو مدعی قسم کھا کر ثابت کر دیں تو قصاص لینا چاہئے۔ اور اگر تہمت نہ ہو تو امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے طریقے پر اس محلہ یا بستی والوں سے قسمیں لے کر اور خون بہا دلا کر چھوڑ دینا چاہئے۔

قصہ مختصر اللہ تعالیٰ نے گائے کو ذبح کرنے کا حکم فرمانے' اس کے بعض اجزاء کے ساتھ میت کو مارنے' اس مردے کے زندہ ہونے اور اپنے قاتل کی خبر دینے اور پھر مردہ ہو کر گرنے کے بعد بنی اسرائیل سے فرمایا۔

كَذَالِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى جس طرح اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت سے اس

مردے کو تمہارے سامنے زندہ فرمایا۔ اور تم نے اس کا کلام سنا اسی طرح مردوں کو زندہ فرمائے گا' صور پھونکنے کے وقت' اس صور پھونکنے یا کسی دوسرے سبب سے نہیں۔ بلکہ صرف جزا دینے' عدل قائم کرنے اور قصاص جاری کرنے کیلئے۔ کیونکہ یہاں بھی مذبوحہ گائے کے اعضاء کو بدن میت کے ساتھ مس کرنے کے سوا کوئی سبب واقع نہ ہوا اور ظاہر ہے کہ مردے کو مردے کے ساتھ مس کرنا سبب حیات نہیں ہوسکتا۔ ہاں چونکہ قاتل سے عدل اور بدلہ لینا منظور تھا اور مقتول کو اس کے بغیر تسلی و تشفی حاصل نہیں ہوتی تھی اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس سے متعلق ہوا کہ مردے کو زندہ کر کے اس کی زبان سے قاتل کا تعین اور قصاص کا دعویٰ کرائے اور اس کے عوض میں قاتل کو قتل کرنے کا حکم فرمائے۔ اور یہ معنی آخرت میں عدل قائم کرنے اور تمام حقوق کا بدلہ لینے کیلئے مردوں کو زندہ کرنے کا قوی سبب ہے۔

وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی قدرت' حکمت اور عدالت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔ تاکہ تم سمجھو اور سوچو۔

چند کارآمد چیزوں کا بیان

پس ان نشانات میں سے جو کہ اس واقعہ سے روشن ہوئے چند کام آنے والی چیزیں ہیں۔ پہلی یہ کہ میت کے اعضاء کو دوسری میت کے اعضاء سے مارنا جب حیات کا سبب ہوا تو یقین سے معلوم ہوا کہ ایجاد عالم میں موثر وہی ذات مسبب ہے نہ کہ اسباب۔ دوسری چیز یہ کہ جب کوئی چاہے کہ اپنے آپ پر یا اپنے خاندان پر عالم غیب کا کوئی فیض اتارے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ذبح' قربانی اور دوسری نیکیاں اور خیرات کرے تاکہ ان کی برکت سے اس کا مطلب حاصل ہو جائے۔ تیسری چیز یہ کہ اپنی طرف سے سخت گیری اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت گیری کا موجب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں فی الفور جلدی کرنا سہولت' آسانی اور قبولیت کا ذریعہ ہے۔ چوتھی چیز یہ کہ یتیموں کو اللہ تعالیٰ اپنے لطف و رحمت کا مقام بنا دیتا ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کے حکم کے مطابق یتیموں کے حال پر توجہ' ان کے مال کی حفاظت اور ان کی تجارت کو نفع بخش بنانا ساری مخلوق پر لازم ہے۔ پانچویں چیز یہ کہ جس نے اپنے اہل و عیال کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑا اور اپنے مال کو اللہ تعالیٰ

کی حفاظت اور نگہبانی کے سپرد کیا اللہ تعالیٰ اسے اس طرح نفع بخشتا ہے۔ چھٹی چیز یہ کہ والدین کے ساتھ نیکی اور ان کی خدمت کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت و برکت کے نزول کا سبب ہے۔ ساتویں چیز یہ کہ وہ مال جس سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا قرب تلاش کریں۔ اور اسے خرچ کر کے ثواب جزیل چاہیں چاہئے کہ مالوں میں سے بہترین ہو۔ مرغوبات میں سے نفیس ترین اور ان میں سے سب سے زیادہ قیمتی ہو۔ جیسا کہ مذکورہ گائے تھی اور اسی لئے قربانی کے متعلق پوری تاکید آئی ہے کہ کمزور اور عیب دار نہ ہو۔

آٹھویں چیز یہ کہ بنی اسرائیل کو عبرت حاصل ہو کہ جب وہ اس سونے کے بچھڑے سے تعظیم کے ساتھ پیش آئے جو کہ سامری کا بنایا ہوا تھا اس کے بدلے اپنے رشتے داروں اور دوستوں میں سے ستر ہزار کو قتل کرنا پڑا تا کہ ان کی توبہ صحیح ہو۔ اور یہ زریں گائے جسے انہوں نے ڈھیروں سونے کے ساتھ خریدا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے ذبح کیا اس قسم کے عجیب خلاف عادت کام کے ظاہر ہونے کا سبب ہوئی کہ ایک مردہ اس کے عضو کے مس کرنے سے زندہ ہو گیا۔ تا کہ وہ جانیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف گوسالہ پرستی کا یہ وبال اور عذاب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق گائے کو ذبح کرنے اور اس کی بارگاہ کے قرب کا قصد کرنے کی یہ برکت نمایاں ہے۔ اور کیا ہی اچھا کیا گیا۔ (بیت) بے حکم شرع آب خوردن خطاست و گر خون بفتوی بریزی رواست یعنی حکم شریعت کے خلاف پانی پینا گناہ ہے۔ اور اگر فتویٰ شرعی کے ساتھ قتل کر دے تو جائز۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ عامیل کے قتل کے واقعہ کو جو کہ اس واقعہ کا سر ہے۔ گائے کے ذبح کے حکم سے پہلے کیوں نہ فرمایا گیا۔ واقعہ کا جیسے حق تھا اس کا لحاظ کیوں نہ کیا گیا؟ اس سوال کا ایک لطیف جواب بیان تفسیر میں گزرا ہے۔ سوچ لینا چاہئے لیکن جو دوسرے مفسرین نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ اگر اس طرح کیا جاتا تو سارا ایک واقعہ ہو جاتا اور جو غرض تھی پوری نہ ہوتی کیونکہ یہاں اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد پہلے تو یہ ہے کہ تمہارے اسلاف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے

ایک حکم کی تبلیغ میں جس کی حکمت کی وجہ ان کے ناقص فہم میں نہیں آتی تھی مذاق اور تمسخر کی تہمت لگائی اور پھر انہوں نے اس امر مقدس کی تعمیل میں جلدی نہ کی بلکہ بار بار موشگافیاں شروع کر دیں اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک وحی الٰہی کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرمان سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور یہی گزشتہ امتوں کی سخت بیماری ہے کہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کمزور اعتقاد رکھتے تھے۔ اور عقلی مصلحتوں کو احکام شرعیہ پر مقدم کر دیتے تھے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ تم اس قدر برے اعمال والے واقع ہوئے ہو کہ اس زمانے میں تمہارے اسلاف حرکت والی جان کو قتل کر کے ایک دوسرے پر تہمت رکھتے تھے۔ اور اس واقعہ کو چھپانے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ وحی نازل ہو رہی تھی اور اسے عظیم اولوالعزم رسول اللہ علیہ السلام ان کے درمیان موجود تھے۔ پس اس واقعہ کو دونوں مقاصد پر ترتیب کے مطابق جدا جدا بیان کرنا ضروری ہے۔

ہاں واقعہ کو جدا جدا بیان کرنے سے ایک شبہ ہوتا تھا اور وہ یہ ہے کہ کوئی اس ایک قصے کے دو واقعات کو دو قصے سمجھ کر غلطی میں نہ پڑ جائے اس کا علاج یوں فرمایا ہے کہ بِبَعْضِهَا کی ضمیر کو بقرہ کی طرف راجع کر کے گویا قصہ کے ایک ہونے کی تصریح کر دی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم باسرار کلامہ

میراث سے محرومی کا بیان

نیز یہاں جاننا چاہئے کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والا۔ اور غلطی سے قتل کرنے والا علماء کے اجماع کے مطابق دونوں مقتول کی وراثت سے محرومی میں برابر ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ اگر قاتل حق پر ہو۔ اور مقتول ناحق تو پھر بھی مقتول کی میراث سے محرومی ثابت ہے یا نہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر عدل کرنے والا کسی باغی کو قتل کرے یا دفاع کرنے والا حملہ آور کو قتل کرے تو میراث سے محروم نہیں ہوگا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی میراث سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ گناہ اور بوجھ نہیں ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے انکار کے ساتھ ان کی عبرت کے باب میں بنی اسرائیل کے ساتھ کلام کا خاتمہ ہے۔

اب فرمایا ہے کہ تمہارے حال میں سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ جو چیز دلوں کی نرمی اور نصیحت کو قبول کرنے کا سبب ہے تمہارے حق میں اس کے برعکس دلوں کی سختی اور نصیحت نہ سننے کا ذریعہ ہوئی۔ کیونکہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں کبھی کفر اختیار کرتے تھے۔ اور کبھی ایمان لاتے تھے' کبھی نافرمانی کرتے تھے۔ اور کبھی توبہ وندامت' کبھی تم سے عہد و میثاق کو توڑنا رونما ہوتا ہے۔ اور کبھی اسے قبول کرنا۔ اور اس کی تاکید وتجدید ہوتی اور کبھی تم اپنے پیغمبر علیہ السلام کو اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کہتے اور کبھی تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی آرزو کرتے وَاِنَّـا اِنْ شَـآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۔ ان مختلف حالات اور غیر مستقل طبائع میں تمہارے دل پھر کچھ نرم تھے۔ اور نیکوں کی وعظ ونصیحت کو قبول کرنے اور نصیحت وخیر خواہی کی بات سننے کے قابل تھے۔ اور تمہاری بیماری اگرچہ سخت ہو جاتی تھی۔ لیکن ہلکی بھی ہو جاتی تھی اور برائی میں مزاج کی پختگی کی حد تک نہیں پہنچتی تھی۔

ثُـمَّ پھر مذکورہ واقعات کے ظاہر ہونے اور پیش نظر غالب نشانات کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہ ان میں سے ہر ایک سمجھانے اور بیدار کرنے میں ایک جامع نسخہ تھا خصوصاً قصاص ثابت کرنے اور عدل قائم کرنے کیلئے دنیا میں مردے کو زندہ کرنے کو دیکھنا جو کہ آخرت میں جزا دینے کیلئے زندہ کرنے کی واضح دلیل ہوتی تھی۔ قَسَـتْ قُـلُوْبُـكُـمْ تمہارے دل سخت ہو گئے۔

مِـنْ بَعْدِ ذَالِكَ ان تمام خلاف عادت کمالات اور آیات کے بعد جو کہ دلوں کی نرمی اور مواعظ اور نصیحتوں کو قبول کرنے کا سبب تھے۔ فَهِـيَ ۔ پـس وہ دل سختی اور درشتی میں كَـالْحِجَارَةِ پتھر کی مانند ہیں۔ نہ کہ لوہے کی طرح کیونکہ لوہے کو کسی آگ کے ساتھ نرم کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ تمہارے دل خوف دلانے' ڈرانے اور عذاب کے وعدے کے ساتھ بھی نرم نہیں ہوتے۔

اَوْ اَشَـدُّ قَسْـوَةً یا وہ دل سختی اور درشتی میں پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ پس وہ اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں پتھر کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔ کیونکہ وَاِنَّ مِـنَ الْـحِجَارَةِ اور تحقیق پتھر کی جنس سے ایسے پہاڑوں کی مانند بھی ہوتے ہیں لَـمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ کہ جن سے

نہریں جاری ہوتی ہیں۔ جس طرح کوہ سوالک وغیرہ۔ اس طریقے سے کہ اس پہاڑ کے بعض اجزاء ہوا کے ساتھ پھر پانی کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ اور دوسری ہوا کو اپنی اطراف سے کھینچتے ہیں۔ اور اس کھینچی ہوئی ہوا کو ٹھنڈا کرنے کی اس قوت کے ساتھ جو کہ ان میں ہے اپنی طرح پانی بنا لیتے ہیں یا اس طریقے سے کہ بہت سے بخارات زمین کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ پہاڑ کے پتھریلا ہونے کی وجہ سے زمین کا ظاہری حصہ نرم اور مسام دار نہیں ہوتا کہ اس راہ سے نکل کر چلے جائیں ناچار پوری قوت کے ساتھ سخت پتھریلے اجزاء کو دھکیلتے ہیں۔ اور اس حرکت کی وجہ سے وہ بخارات پانی ہو جاتے ہیں۔ اور پہاڑ کے اجزاء میں وسیع کھلے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان شگافوں میں بہہ کر اور جاری ہو کر زمین کو چیرتے ہوئے ایک نہر بن جاتے ہیں یا اس طریقے سے کہ بعض پتھر اس روحانیت کی وجہ سے جو کہ وہ رکھتے ہیں حق تعالیٰ کے حکم کو قبول کر کے جو کہ انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ان تک پہنچتا ہے ہوا کے پانی کی شکل اختیار کرنے میں وہی عمل کرتے ہیں جو کہ پہاڑ کرتا ہے۔ نہروں کے جاری ہونے کا موجب ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر کہ عصا مارنے سے اس سے چشمے جاری ہو جاتے تھے تم نے دیکھا اور سنا ہے۔

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ اور تحقیق پتھر کی جنس سے ایسے بھی ہیں جو کہ پھٹ جاتے ہیں ان کے پیچھے سے بڑی قوت کے ساتھ جاری ہونے والے پانی کے دھکیلنے سے۔ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءَ ۔ پس اس سے پانی نکل آتا ہے۔ اگرچہ چلنے میں کمزور ہو جس طرح کہ تھوڑا تھوڑا چلنے والے چشموں میں کیونکہ اس کا مادہ پتھر کے پیچھے سے آتا ہے پہاڑوں میں دیکھا جاتا ہے۔ اور پہلی صورت اور اس صورت میں چند وجہ سے فرق ہے۔ جس طرح کہ تفسیر کے بیان سے معلوم ہوا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ وہاں کئی مقامات پر کھلے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور پہاڑ کے اندر کا ہوا مادہ پانی کی شکل میں بدل کر باہر آتا ہے۔ اور یہاں ایک جگہ میں لمبا شگاف جس کا عرض کم ہوتا ہے مادہ کی مدافعت کی وجہ سے پچھلی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور مدافعت کرنے والا مادہ راہ پا کر ٹپکتا ہے۔

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ اور تحقیق پتھر کی جنس سے وہ بھی ہے جو پہاڑ کی بلندی سے نیچے گر

پڑتا ہے۔ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ سخت آندھی سے جو کہ قہر الٰہی کے نشانوں سے ہے۔ اور اس دربار سے خوف آنے اور ڈرنے کا باعث ہے۔ اور تمہارے دل نرم نہیں ہوتے چہ جائیکہ پانی ہو جائیں۔ اور شق نہیں ہوتے کہ ان میں ہند و نصیحت داخل ہو چہ جائیکہ وعظ و نصیحت کے اثر کو راہ دیں تا کہ اعضاء و آلات تک پہنچے اور نہ ہی اپنی نخوت' تکبر اور غرور کے مرتبہ سے حوادث اور مصیبتوں کی آندھیوں کی وجہ سے نیچے گرتے ہیں۔ یہ ہے تمہارے دلوں اور تمہاری قلبی صفات کا حال۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اس سے جو تم عمل کرتے ہو اعمال بدن سے اور اپنی ان صفات قلبیہ اور اندرونی حالات کو ان اعمال کے ساتھ مقام ظہور میں جلوہ گر کرتے ہو۔ پس تمہارے دل اور اندرونی حالات بھی خراب ہے۔ اور تمہارے اعمال او ظاہری حالات بھی کسی گنتی میں نہیں ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہیں پتھروں کے افعال اور آثار جو کہ مجموعی طور پر نرمی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال و افعال سے غافل نہیں ہے کہ تمام سختی کے نشان ہیں۔ اور نرمی کا بالکل نشان نہیں ملتا۔

چند تحقیق طلب باتیں

یہاں چند تحقیق طلب باتیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بات یہ کہ پتھروں کو خشیت جو کہ ڈرنے کے معنی میں ہے موصوف کیا ہے۔ اور شک نہیں کہ ڈرنا زندگی اور عقل کے بغیر نہیں ہوتا جبکہ پتھر ان دونوں چیزوں سے خالی ہیں۔ پس انہیں اس صفت سے موصوف کرنا کیونکر درست ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک جمادات اور حیوانات میں سے ہر ایک روح مجرد ہے جس سے آیت فَسُبْحَانَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ (یٰس) میں مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ سے تعبیر کی گئی ہے۔ اور وہ روح زندہ شعور رکھنے والی اور ادراک کرنے والی ہے۔ اور ہر جماد اور حیوان کی صلوٰۃ اور تسبیح جو کہ کلام الٰہی سے بہت سی آیات میں معلوم ہوتی ہے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (النور آیت ۴۱) وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (الاسراء آیت ۴۴) اسی روح کے ساتھ ہے۔ لیکن اس روح کو ان کے جسموں میں تدبیر اور تصرف کرنے کا تعلق حاصل

نہیں ہے۔ اور نہ ہی روح حیوانی کے وسیلے سے اس روح کا اثر پہنچتا ہے۔ بلکہ فرشتوں کی روحوں کی طرح جو کہ اپنے جسموں میں روح حیوانی کے وسیلے کے بغیر تصرف کرتی ہیں یہ روح بھی اپنے خاص جسم پر شعاعوں کا عکس ڈالتی ہے۔ اور اس وقت اس جسم سے شعور و ارادہ کے فعل رونما ہوتے ہیں۔ اور یہ تعلق دائمی نہیں ہے۔ تاکہ ذمہ داری' ثواب اور عذاب کی جگہ ہوں۔ اور عام آخرت میں ان ارواح کے آثار کا اپنے بدنوں میں ظہور دائمی ہوگا۔ اور اسی وجہ سے گواہی دیں گے۔ اور بولیں گے۔ اور جنت کی شاخیں اور پھل بہشتیوں کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ اور اس جہان میں جبکہ ارواح کا حکم غالب نہیں ہے نفس قدسیہ کی قوت کی وجہ سے وہ تعلق پرتو ڈالتا ہے۔ اور پھر چھپ جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے درختوں' پتھروں اور گونگے حیوانات نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اور انبیاء علیہم السلام کے فرمان پر گفتگو' گواہی کی ادائیگی اور ان کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ اور اس میں سے قدر متواتر انبیاء علیہم السلام سے منقول اور مروی ہے۔

پتھروں کا ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کلام کرنے کا بیان

ان میں سے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہ ثبیر پر تشریف فرماتے تھے۔ اور کفار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں تھے۔ پہاڑ نے عرض کی یا رسول اللہ یہاں سے اتر جایئے کہیں ایسا نہ ہو کہ میری پشت پر سے آپ کو پکڑ لیں اور مجھے شرمندگی ہو۔ اور صحیح مسلم میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہوا کہ آپ نے فرمایا میں مکہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو کہ بعثت سے پہلے مجھ پر سلام کہتا تھا اور حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے بھی مکہ کے پتھروں کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلام پڑھنا صحیح ہوا (اقول وباللہ التوفیق: ان بے نصیبوں کیلئے لمحہ فکریہ جو کہ انسان بلکہ مسلمان بلکہ اس کے علاوہ مبلغ محدث مفسر اور جانے کیا کیا کہلاتے ہیں۔ لیکن انہیں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلام پڑھنا نصیب نہیں۔ پتھر قبل بعثت سلام پڑھتا ہے مگر انہیں بعثت شریفہ پر ہزاروں برس گزرنے کے باوجود اس سے محرومی ہے۔ پتھر کو وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کا خطاب بھی نہیں مگر وہ پھر بھی سلام پڑھتا ہے۔ اور ان ایمان کا دعویٰ کرنے

والوں کو وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کا خطاب ہے۔ لیکن انہیں پھر بھی عمل کی توفیق نہیں۔ نیز سلام کہنے کو حضور علیہ السلام نے وجہ تعارف قرار دیا۔ حالانکہ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ کے مطابق پتھر تسبیح بھی پڑھتے ہیں۔ پتہ چلا کہ بارگاہ رسالت مآب روحی وقلبی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تعارف کا اصل ذریعہ سلام پڑھنا ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احد پہاڑ کو دیکھا تو فرمایا هذا جبل يحبنا ونحبه یعنی یہ پہاڑ ہے ہم سے محبت کرتا ہے۔ اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہ اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی روایت سے آیا کہ حضور علیہ السلام ایک بیل کا واقعہ بیان فرما رہے تھے کہ اسے ایک شخص لے جا رہا تھا اس کے دل میں خیال آیا وہ اس پر سوار ہو گیا۔ بیل نے کہا کہ حق تعالیٰ نے ہمیں سواری کیلئے نہیں کھیتی باڑی کرنے کیلئے پیدا فرمایا ہے۔

اسی طرح بھیڑیئے کا باتیں کرنا بھی حدیث شریف میں وارد ہے۔ اور صحیحین میں موجود ہے۔ اور اسی طرح صحیحین میں کئی روایات سے آیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کوہ حرا پر تشریف فرما تھے اس کی چٹانیں زلزلے کی طرح ہلنے لگیں۔ حضور علیہ السلام نے چٹان کو ٹھوکر ماری اور فرمایا باادب رہ اس لئے کہ تیری پشت نہیں ہے مگر رسول علیہ السلام، صدیق اور دو شہید رضی اللہ عنہم اور صرف آپ کے فرمانے سے ہی پہاڑ ساکن ہو گیا۔ اور استن حنانہ کا حضور علیہ السلام کی جدائی کی وجہ سے آواز کرنا اس قدر مشہور ہے کہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اور اس ستون کا رونا اور اس کا چپ ہونا جب اسے حضور علیہ السلام نے بغل میں لے لیا صریح طور پر اس کے شعور اور زندگی پر دلالت کرتا ہے۔ اور آیت لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر آیت ۲۱) اس باب میں سب سے زیادہ صریح آیت اور تاویل سے بہت دور ہے اس کے علاوہ اور بھی واضح ظاہر دلائل ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اگر اس آیت سے مراد سنگدل کافروں اور فاجروں پر طعن کرنا ہے اس

طرح کہ پتھر اللہ تعالیٰ کے احکام بجالاتے ہیں۔ اور اس سے ڈرتے ہیں۔ جبکہ تم اس کے احکام کو بجانہیں لاتے ہو۔ اور اس سے ڈرتے نہیں ہو تو یہ واضح نہیں۔ کیونکہ جبلی الہامات اور طبعی تقاضوں سے نہ انسان انکار کرتا ہے نہ حجر و شجر۔ شرعی اوامر و نواہی اور ان کی ذمہ داری قبول کرنا پتھروں اور درختوں سے کب ثابت ہوا تاکہ اس کی وجہ سے الزام دیا جا سکے۔ اور اسے قبول کرنے کی وجہ سے انہیں پتھر سے زیادہ سخت کیا جا سکے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جبلی الہامات کو قبول کرنا اگرچہ پتھروں اور سنگدل فاجروں کے درمیان مشترک ہے۔ لیکن پتھروں کے کمال اور ان کے تعمیل کرنے میں صرف اتنا ہی کافی ہے۔ کیونکہ ان کی پیدائش ایک بے حس و حرکت کی پیدائش ہے۔ اور سنگدل فاجروں کا ان محرکات اور الہامات کو قبول کرنا ایک جو کے برابر نہیں۔ کیونکہ انسان کا کمال ایک فرشتہ کے الہام کی موافقت اور احکام تکلیفیہ کو قبول کرنا ہے جو کہ رسول علیہم السلام اور ان کے وارثوں کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ پس جمادات اپنے کمال کی حد کو پہنچتے ہیں۔ اور اس الہام کی اطاعت کرتے ہیں جو ان کے لائق ہے۔ اور سنگدل فجار اپنے کمال کی حد کو نہیں پہنچتے اور اس الہام کی اطاعت نہیں کرتے جو کہ ان کے لائق ہے۔ پس سختی اور درشتی میں پتھر سے زیادہ سخت ہوئے۔ اور یہ اس بات کے مشابہ ہے کہ کہیں کہ اس سال موسم گرما موسم سرما سے زیادہ گرم ہے۔ یعنی موسم گرما کی گرمی شدت اور کمال میں موسم سرما کی سردی سے زیادہ ہے جو کہ اس نام والے کا تقاضا ہے۔

تیسری بات یہ ہے سنگدل کافروں کے دلوں اور پتھروں کے درمیان فرق بیان کرنے کے مقام میں پتھروں کی تین اقسام یاد فرمائیں۔ حالانکہ ایک قسم کا ذکر کرنا بھی اس مقصد کیلئے کافی تھا اس طول دینے کی کیا وجہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پتھر کی تین قسموں کے ذکر کرنے میں سلوک کی معرفت کا اشارہ ہے۔

قلوب کے چار مرتبوں کا بیان

کیونکہ اہل سلوک کے نزدیک قلوب کے چار مرتبے ہیں۔ پہلے وہ دل جو کہ نور الٰہی میں مستغرق اور نابود ہو۔ اور ایک علم کے سمندر میں فانی اور اس دل سے معرفت کی نہریں جوش مارتی ہیں۔ اور طالبان رشد و فیض کے دلوں کی حیات کا باعث ہوتی ہیں۔ اور یہ قلب

اہل اللہ اور سابقین کے دلوں میں سے ہے۔

دوسرا قلب وہ ہے جو کہ علم کے دریا سے سیر ہو کر مخلوق کو نفع پہنچانے کا باعث ہوا اور یہ قلب علمائے راسخین کے قلوب میں سے ہے۔

تیسرا قلب وہ ہے جو کہ جھکنے تسلیم کرنے اور اطاعت کرنے کے ساتھ موصوف ہے۔ اور یہ قلب زاہدوں عابدوں اور پرستش کرنے والوں کے قلوب میں سے ہے۔ اور پتھر کا ادنیٰ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہبوط اختیار کرے یعنی طبعی حکم کی فرمانبرداری کرنا جسے حق تعالیٰ نے اس پر حاکم کیا ہے۔ اور وہ استقامت کے ساتھ مرکز کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور جب وہ اس حد سے ترقی کرتا ہے۔ تو پانی کو راہ دیتا ہے۔ اور اس کے جوہر کے تکاثف کی لطافت کی وجہ سے اس میں تنگ مسام پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس راہ سے پانی کا ٹپکنا ممکن ہو جاتا ہے پھر جب اس حد سے بھی ترقی کرتا ہے۔ تو احاطہ کرنے اور ہوا کو پانی میں بدلنے کی اس میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نہروں کے نکلنے کی جگہ بن جاتا ہے۔

چوتھا قلب اثر قبول نہ کرنے والا جو کہ کمال سرکشی اور تکبر کی وجہ سے خوف اور ڈر کے بغیر یا نرمی اور ملائمت کے ساتھ کسی علم کے فیض کو قبول کرنے سے موصوف نہیں ہوتا اور اپنے آپ کو اطاعت میں نہیں دیتا اور یہ قلب کافروں اور فاجروں کے قلوب میں سے ہے۔ اور جواہر محسوس اور سخت اشیاء میں سے کوئی چیز اس دل کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہدایت اور علم عطا فرمایا ہے ایک زبردست بارش کی مانند ہے جو کہ کسی زمین پر برستی ہے۔ پس اس زمین میں سے ایک قطعہ پاک اور نرم تھا۔ پانی کو جذب کیا۔ اور بہت گھاس اور ایندھن پیدا ہوا اور اس کی وجہ سے عام نفع متحقق ہوا اور دوسرا قطعہ سخت تھا اور پست۔ پانی کو اپنے میں جمع کیا۔ اور سنبھال رکھا اس سے بھی لوگوں کو ایک مالی منفعت ملی کہ پانی پیا اور اپنی کھیتیوں کو پانی دیا اور اپنے مویشیوں کو سیر کیا۔ اور ایک اور قطعہ تھا شور اور ناہموار نہ تو پانی جذب کیا ہے۔ اور نہ پانی اس میں جمع ہو کر باقی رہتا ہے۔ تا کہ کسی کے کام آئے یا ایندھن اور گھاس اگائے اور بھی ہے مثال اس کی جس نے ہدایت قبول کی۔ اور خود بھی علم حاصل کیا۔ اور دوسروں کو بھی پڑھایا اور مثال اس کی جس

نے ادھر توجہ ہی نہیں کی۔ اور کسی قسم کا فائدہ نہ لیا۔

اور بعض مفسرین نے اس طرف گئے ہیں کہ پتھر کی یہ تینوں قسمیں ان احکام الٰہیہ کا اشارہ ہیں۔ جنہوں نے غیب کے حکم کے ساتھ پتھروں میں ظہور کیا ہے۔ پس وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ اس پتھر کی طرف اشارہ ہے جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب سے جاری ہونے والی نہروں کے نکلنے کی جگہ اور بارہ چشموں کا منبع بن جاتا تھا اور وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآء اس پتھر کی طرف اشارہ ہے۔ جسے سیل عرم کی روک بنایا گیا تھا اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھٹ گیا۔ اور اس نے سیلاب کے پانی کو راستہ دیا اور ملک سبا کو خراب کیا وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ سنگ سجیل کا اشارہ ہے جو کہ آسمانی فضا سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے گرا اور لوط علیہ السلام کی قوم کو زیر وزبر کر دیا۔

چوتھی بات یہ کہ او کا کلمہ شک کیلئے ہے۔ اور عَلَّامُ الْغُيُوْب کے کلام میں شک کی کیا گنجائش ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کلمہ او شک کیلئے نہیں۔ بلکہ تخییر یعنی اختیار دینے کیلئے ہے۔ یعنی ان کا حال سننے والا اس بات میں اختیار دیا گیا ہے کہ ان کی اصل قساوت پر نظر کرتے ہوئے ان کے دلوں کو پتھر کے ساتھ تشبیہ دے یا ان کی قساوت کے مرتبہ میں لوٹ کر انہیں پتھر کی قساوت سے بالاتر جانتے ہوئے یہ تشبیہ چھوڑ دے اور کلام کو ترجیح اور تفصیل میں لے آئے۔

اور اگر کہیں کہ تخییر انشاءات میں ہوئی ہے اخبار میں نہیں۔ ہم کہیں گے کہ ہر انشاء کیلئے ایک ضمنی خبر لازم ہے۔ جس طرح ہر خبر کو ایک انشاء بھی لاحق ہے کبھی بلغاء مقام کے تقاضا کی وجہ سے اس لازم ضمنی پر نظر کرتے ہیں۔ اور اس اعتبار کی رعایت کرتے ہیں جو کہ اس حال کے لائق ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اَشَدُّ قَسْوَةً کیوں فرمایا۔ حالانکہ اسم تفصیل کا صیغہ ممکن تھا اور اقسیٰ کہا جا سکتا تھا لفظ اشد' اکثر' ازید اور ان جیسے الفاظ کے ساتھ وہاں مدد لیتے ہیں جہاں افعل التفضیل کا صیغہ ممکن نہ ہو' جیسے رنگ اور عیوب؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ سختی پر اقسیٰ کی دلالت اجمالی ہے۔ جبکہ اَشَدُّ قَسْوَةً کی دلالت تفصیلی ہے۔ یہاں تعبیر کی ممکنہ صورتوں

میں سے سب سے زیادہ واضح صورت کے ساتھ ان کی حال کی قباحت بیان کرنے کیلئے دلالت تفصیلی منظور ہوئی۔ نیز اقسی قسوۃ کے مدلول میں ایک دقیق فرق ہے۔اور وہ یہ ہے کہ اقسی' قسوت کی افراط پر دلالت کرتا ہے خواہ کیفیت کے اعتبار سے خواہ کمیت کے اعتبار سے جبکہ اشد خاص افراط کیفیت پر دلالت کرتا ہے۔اور اسی کا فائدہ یہاں منظور تھا۔

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جہاں کسی فعل کی افراط کمیت کا فائدہ دینا منظور ہوا کثر اور ازید کہنا چاہئے۔اور جہاں افراط کیفیت کا فائدہ دینا پیش نظر ہو اشد اور اقوی کہنا چاہئے۔ اور افعل التفصیل ان دونوں سے زیادہ عام ہے۔افراط کیفی اور کمی کا احتمال رکھتا ہے اس کے استعمال کا مقام وہ جگہ ہے جہاں ابہام منظور ہو نہ کہ دونوں حیثیتوں میں سے ایک کی تصریح

چھٹی بات یہ ہے کہ **وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَار** الخ ظاہری طور پر سخت قلوب کی حالت کا بیان ہے۔ کیونکہ پتھر سے مشابہ وہی دل ہیں نہ کہ نرم دل۔ہاں وہ کفار جن سے گفتگو اور خطاب ہے سختی کے مرتبوں میں اعلیٰ اور انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔اور تمام سخت دلوں سے ترقی کر گئے ہیں۔اور اسی وجہ سے ان کے دلوں کی تشبیہ پتھروں کے ساتھ موزوں نہیں۔ پس ان تینوں صفات کو قلوب قاسیہ میں تصور کرنا چاہئے نہ کہ قلوب صافیہ میں۔جیسا کہ اہل سلوک سے نقل کرتے ہوئے پہلے گزرا اس کا جواب یہ ہے کہ قلوب کے درجے سختی کے اعتبار سے بھی مختلف ہے۔ان میں سے بعض انہار کا منبع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان لوگوں کے دل ہیں۔جنہوں نے مدتیں اور زمانے لذتوں اور خواہشات کی ترک میں گزارے ہیں۔اور اس ترک کی وجہ سے ان پر روح کے انوار نے غلبہ کیا۔اور ان کرامات سے مشابہہ بعض خلاف عادت کام صادر ہوتے ہیں۔جیسا کہ ہندوستان کے راہب اور ان میں سے بعض علوم غیبیہ کے پانی کو راہ دیتے ہیں۔اور ان علوم کی گزرگاہ واقع ہوتے ہیں۔اور وہ ان لوگوں کے قلوب ہیں۔جنہوں نے بعض بشری حجاب چیر کر روح ملکوت کے عالم کا ایک عکس حاصل کیا ہے۔اور بعض آیات الٰہی اور معقولہ معانی ان پر ظاہر ہوئے۔جیسا کہ اشراقی حکماء کیلئے۔اور ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت سے متصف ہو جاتے ہیں۔اور وہ ان لوگوں کے قلوب ہیں جو حجابات سے ماوراء کی ارواح میں

سے بعض کے قریب ہونے کی وجہ سے اس عالم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت کے بطریق عکس عالم ہوکر اس کیفیت سے لبریز ہو کر خوف اور خشیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہ درجے مسلمانوں اور کافروں میں مشترک ہیں۔ لیکن عالم غیب کی طرف توجہ اور ریاضات' عبادات اور وجہ روح کا تصفیہ ضروری ہے۔ اسی لئے ہر دین کے اور ہر مشرب کے فاسق لوگ ان امور سے بالکل محروم ہیں۔ کیونکہ غفلت اور غرور والے ہیں۔ اور اس طرف ان کی بالکل توجہ نہیں ہے۔

فرق یہ ہے کہ یہ مراتب مسلمانوں میں نور ایمان کے ساتھ موید ہو کر قبولیت' ترقی درجات اور ملاء اعلیٰ میں پسندیدہ ہونے کا سبب ہوتے ہیں۔ اور کفار میں نور ایمان سے موید نہیں ہوتے۔ اور قبولیت اور ملاء اعلیٰ کی رضا مندی کا باعث نہیں ہوتے۔ ہاں جو اہل اسلام سے مخصوص ہے وہ مقام شریعت میں پختہ قدم ہوتا۔ ملاء اعلیٰ کی خوشنودی اور اس عالم کے انوار کے فیضان کو حاصل کرنا ہے نہ کہ تصفیہ لذتوں کی ترک اور تعلقات سے جدا ہو کر انوار روحیہ کا فیضان حاصل کرنا۔ اور کیا ہی اچھا کیا گیا۔ بیت۔ صفا با خبث باطن نیز گاہے جمع میگردد' برد بالوعہ راچوں درد بنشیند تماشہ کن' یعنی خبث باطن کے ساتھ کبھی صفائی جمع ہو جاتی ہے جب میل کچیل بیٹھ جائے تو گندے پانی کے چو بچہ کو دیکھا۔

قصہ مختصر جب بنی اسرائیل کی ملامت سے ان کے اسلاف کے حالات یاد دلا کر جو کہ دم بدم تعدی اور تکبر میں بڑھتے تھے۔ اور جس قدر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور حضور نبی پاک علیہ السلام کے معجزات دیکھتے تھے اسی قدر ناشکری' تہمت اور احکام شرعیہ پر ان کی بے اعتمادی زیادہ ہوتی تھی فراغت ہوئی اب مسلمانوں سے خطاب فرمایا۔

عَ - اے مسلمانو! تم ان کی سنگدلی کو جانتے ہو کہ جس قدر ان پر زیادہ دلائل قائم کئے جاتے تھے وہ کفر و انکار میں بہت دور چلے جاتے تھے پھر کیا تم چاہتے ہو کہ وعظ و نصیحت کے ساتھ انہیں راہ راست پر لے آؤ۔

فَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ ۔ پس تم طمع کرتے ہو اس پر کہ ان کے بقیہ لوگ جو کہ تمہارے زمانے میں ہیں تمہارے دلائل اور تمہاری وعظ و نصیحت کی وجہ سے ایمان لے

آ ئیں گے۔ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ حالانکہ ان کا زمانہ گزشتہ میں ایک گروہ تھا جبکہ ابھی تمہارے پیغمبر علیہ السلام مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ اوران لوگوں کی سرداری کے خواہاں نہیں ہوئے تھے۔ اور المعاصرة اصل المنافرہ کے مطابق تمہارے رسول علیہ السلام کی طرف سے نفرت کی کوئی وجہ رونما نہیں ہوئی تھی اور ظاہری علم والوں کو مناظرہ کے وقت جو بات پالنے اور جانب داری کرنے کا تعصب لاحق ہوتا ہے ابھی ان لوگوں کو لاحق نہیں ہوا تھا اوران ساری چیزوں کے باوجود۔

يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی کلام سنتے تھے تورات میں جو کہ تمہارے رسول علیہ السلام کی صداقت' تمہارے دین کی دوستی اور تمہارے بے شمار فضائل و کمالات پر دلالت کرتی تھی۔ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ پھر اس کلام کو بدل دیتے تھے کبھی لفظ بدل کر۔ جیسا کہ ابیض جو کہ تمہارے رسول علیہ السلام کے صورت کے بیان میں تھا کی بجائے آدم کر دیا۔ اور ربعه مائلا الی الطول کی بجائے طـوالا لکھ دیا۔ اور کبھی فاسد تاویل کے ساتھ بدلا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام کی امت کے فضائل اور بزرگی کو اوران کی نیکی اوراچھے اطوار کو جو کہ تورات اور زبور میں بیان ہوئے ہیں دنیوی امور کے انتظام ان کی تدبیر کے تقدیر کے ساتھ موافق ہونے' قبضے' غلبے اور ظاہری خوش نصیبی پر محمول کیا۔

مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ اس کے بعد کہ انہوں نے اس کلام کے لفظ اور معنی کو سمجھ لیا تھا۔ کیونکہ اگر انہیں اس کلام کے لفظ سننے میں شبہ پڑتا اور ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ سمجھتے یا اس کے معنی میں غلطی ہوتی کہ اس لفظ سے ایسا معنی لیتے جو کہ مراد نہیں تھا تو البتہ معذور ہوتے لیکن وہ سمجھ تول کر دوسرا لفظ لائے جو کہ تورات کے لفظ کے ساتھ بالکل مشتبہ نہ تھا یا انہوں نے دوسرا معنی گھڑ لیا جس پر لفظ بالکل دلالت نہیں کرتا تھا۔

وَهُمْ يَعْلَمُونَ اور وہ تحریف کے وقت بھی جانتے تھے کہ یہ لفظ تورات کے لفظ کا غیر ہے یا یہ معنی بالکل اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے۔ پس وہ اس تحریف میں کسی طرح معذور نہ تھے۔ کیونکہ تحریف کلام میں انہیں دو وجہوں کے ساتھ عذر ہو سکتا تھا یا کلام سننے کے وقت لفظ اور معنی اچھی طرح سمجھ نہ آئیں یا اس کلام کو نقل کرتے وقت لفظ اور معنی اس کے ذہن سے

نکل جائے انہیں ان دو عذروں میں سے ایک بھی نہ تھا۔ پس وہ اسی مثال کی جگہ بن گئے جو کسی شخص نے لکھنے والے کی مذمت میں کہی ہے یسمع غیر مایقال له ویفهم غیر مایسمع ویکتب غیر ما یفهم ویقرء غیر مایکتب ویترجم غیر مایقرء جو اسے کہا جاتا ہے اس کے خلاف سنتا ہے' جو سنتا ہے اس کے خلاف سمجھتا ہے' جو سمجھتا ہے اس کے خلاف لکھتا ہے' جو لکھتا ہے اس کے خلاف پڑھتا ہے' جو پڑھتا ہے اس کے خلاف ترجمہ کرتا ہے۔ اور احتمال ہے کہ جب اسی طرح ہوگا۔ اور وہ جانتے تھے کہ کلام الٰہی کی تحریف میں وہ اللہ تعالیٰ کے کسی قسم کے شدید غضب کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور برے کام کو برا جاننا اور پھر اس کا مرتکب ہونا اس سے زیادہ برا ہے کہ برا نہ جانے اور مرتکب ہو۔ اور روایات میں آیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام احکام تورات کی تصدیق کیلئے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو جو کہ ستر افراد تھے اپنے ہمراہ لے گئے انہوں نے بغیر واسطہ کے اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو سنا پھر اپنے لشکر اور قوم میں آئے۔ اور کہنے لگے کہ ہم نے کلام کے آخر میں یہ بھی سنا تھا کہ ان استطعتم ان تفعلوا هذه الاشياء فافعلوا وان لم تفعلوا فلا باس یعنی اگر تم یہ کام کر سکو تو کرو اور اگر نہ کرو تب بھی کوئی حرج نہیں۔ پس ان الفاظ کو اپنی طرف سے بڑھا دیا اور جو کلام سنی تھی اسے ایجاب سے تخییر میں بدل دیا۔ اور آیت میں مذکور فریق سے مراد وہی گروہ ہے۔

حاصل کلام یہ کہ تمہیں ان لوگوں سے جو کہ تمہارے زمانے میں ہیں۔ اور ہم عصر ہونے کی وجہ سے تم سے کمال نفرت کرتے ہیں۔ اور اپنے اسلاف کی تقلید میں حد درجہ سرگرم عمل ہیں کیا توقع ہے کہ تمہاری وعظ و نصیحت پر ایمان لے آئیں گے۔ اور اگر دل میں آئے کہ یہ کام ان کے اسلاف سے وقوع پذیر ہوا۔ ہمارے ہم عصر اس جنس سے نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایمان کا اقرار کرتے ہیں بلکہ اپنی زبان سے اپنے اسلاف کی تحریف کا اظہار کرتے ہیں۔ پس انہیں اس اظہار میں سچا مت جانو اور ان کے ایمان پر یقین کرو کیونکہ وہ چھپانے میں بہت مبالغہ کرتے ہیں۔ اور ان میں سے جو شخص ایمان یا اسلاف کی تحریف کا اظہار کرتا ہے اسے تنہائی میں شدید ملامت کرتے ہیں۔ اور اس بات کا گواہ یہ ہے

کہ ان کی ایک جماعت۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا اور جب وہ ایمان والوں سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں تمہارے دین پر اور دل میں اس دین کی تصدیق کرتے ہیں۔ لیکن ظاہری طور پر اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ ہم اپنے قریبیوں اور بزرگوں سے ڈرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر ظاہر میں تورات کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔

وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ اور جب خلوت کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض جو کہ اس رسول علیہ السلام کی نعت اور اس دین کی صحت کو چھپانے والے ہیں۔ بعض دوسروں کے پاس جا کر جن کی زبان سے کبھی کبھی اپنے اسلاف کی تحریف کا اظہار' اس رسول علیہ السلام کی نعت اور اس کے دین کا صحیح ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اور مجلس میں مسلمانوں میں سے کوئی نہیں ہوتا۔ قَالُوْا چھپانے والے ظاہر کرنے والوں کو کہتے ہیں اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ کیا تم مسلمانوں سے باتیں کرتے ہو۔

بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ایسی جو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر لی ہیں اپنے علم سے تورات' زبور اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کے صحائف میں۔ اور وہ اس رسول علیہ السلام کی تعظیم' اس کی رسالت کی صداقت' اس کی شرافت وجلالت' اس کی امت کے فضائل اور اس پختہ وعدے اور عہد پر دلالت کرتی ہیں جو کہ تم سے اس کے احکام قبول کرنے اور اس کے دین کی مدد کرنے پر لیا گیا ہے۔

لِيُحَاجُّوْكُمْ بِهٖ انجام کار یہ ہوگا کہ یہ مسلمان دلیل اور سند کے ساتھ تمہارا مقابلہ کریں۔ اور تمہیں ہلکا اور ملزم گردانیں عِنْدَ رَبِّكُمْ تمہارے پروردگار کے نزدیک جو کہ ہر کسی سے دلیل اور سند طلب فرمائے گا یعنی کیا تم انہیں اپنی طرف سے اپنے خلاف دلیل کی تلقین کرتے ہو۔ فلا تعقلون۔ پس نہیں سمجھتے ہو کہ اس کام کا انجام کیا ہے۔ اور تمہاری ان سرسری باتوں سے پختہ سند ہو جائے گی۔

یہاں جاننا چاہئے کہ اکثر مفسرین نے عِنْدَ رَبِّكُمْ کے معنی بہت تردد کیا ہے۔ اور

سے فائدہ تاویلیں کی ہیں۔اس بنا پر کہ اگر انہیں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں قیامت کے دن رسوائی کا خوف اس کلام کا باعث تھا تو اس کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام حجتوں' دلیلوں اور سندوں کو جانتا ہے۔اظہار کو ترک کرنے سے یہ خوف کس طرح دور ہوتا ہے۔لیکن تحقیق یہ ہے کہ انکار سے انہیں منظور یہ تھا کہ اگر ہم خود بھی اپنی زبان سے اقرار کریں کہ یہ رسول اور یہ دین برحق ہے۔تو قیامت کے دن ربّ العالمین کی بارگاہ میں اگلوں پچھلوں کے سامنے بہت ذلت اور رسوائی کا باعث ہوگا۔اور جب تک کہ ہم نے خود اقرار نہیں کیا ہے صرف حاکم کا ان حجتوں اور دلائل کو جاننا اتنی ذلت اور رسوائی کا باعث نہیں ہے۔جس طرح کہ دنیوی مقدمات اور جھگڑوں میں بھی یہ بات تجربہ میں آئی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زبان سے کسی کے حق کا اقرار کرے یا سند لکھ کر دے دے اور پھر حاکم کے سامنے انکار کرے تو بہت رسوا ہوتا ہے۔اور اگر حاکم خود اس حق کو جانتا ہے یا دوسرے گواہوں کی زبان سے حق ثابت ہوتا ہے۔تو انکار کرنے والے کیلئے اتنی رسوائی کا مقام نہیں بنتا اور جو لوگ اس فرق سے غافل ہیں کبھی عِنْدَ رَبِّکُمْ کو فِیْ کِتَابِ رَبِّکُمْ کے معنی ڈھالتے ہیں کبھی بمعنی فِیْ حُکْمِ رَبِّکُمْ اور کبھی بمعنی بَیْنَکُمْ وَبَیْنَ رَبِّکُمْ کرتے ہیں۔یہ تمام معید تاویلات اور نادرست احتمالات ہیں۔جیسا کہ ظاہر ہے۔اور ان تاویلات کے بعید ہونے کا گواہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام پر انکار کے مقام میں انکار فرماتا ہے کہ

کیا تم گمان کرتے ہو کہ اگر وہ لوگ ان چیزوں کو چھپائیں گے تو تمہارے لئے ان پر کوئی حجت نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کو انہیں پکڑنے کیلئے کوئی سند نہیں ملے گی وَلَا یَعْلَمُوْنَ اور وہ نہیں جانتے اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ کہ تحقیق اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس چیز کو جسے وہ چھپاتے ہیں۔اور اس چیز کا اعلان کرتے ہیں۔پس اسے حق پہنچتا ہے کہ ان کی تمام حجتوں کو خود مسلمانوں پر ظاہر کردے کہ تمہاری فلاں فلاں سند اس کی فلاں فلاں کتاب میں موجود ہے اس سند سے تم انہیں ملزم گردانوں۔نیز اللہ تعالیٰ پر پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔پس ان کے پوشیدہ انکار کو بھی جو کہ وہ غیروں سے خلوت کے وقت میں ظاہر کرنے والوں پر کرتے ہیں تم پر ظاہر فرمادیا حتیٰ کہ ایک عام سند تمہارے ہاتھ آگئی۔کیونکہ جب

تک کہ انہوں نے خلوت میں انکار نہیں کیا تھا صرف ظاہر کرنے والوں کی زبان سے اظہار واقع ہوا تھا۔ پس اس انکار میں ان کی اپنی زبان سے بھی اظہار واقع ہوگیا۔ پس سب اظہار کر کے پھر گئے اور مسلمانوں کیلئے بات کرنے کی جگہ بن گئی کہ تم سب نے اقرار کیا تم میں سے ایک گروہ نے ہمارے سامنے اور تمہارے دوسرے گروہ نے خلوت میں۔ پس ان کا یہ کام مزید ذلت اور رسوائی کا باعث ہوا۔ پس اس انکار میں ان کی مثال اسی بے وقوف کی سی ہے کہ خر من المطر د وقف تحت المیزاب جو کہ بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ یہ ہے حال ان کے علماء کا جو کہ اپنے گمان میں کتاب جاننے اور عقل مندی میں بڑا مضبوط قدم رکھتے ہیں۔ جبکہ حد درجہ کند ذہن ہونے کی وجہ سے سمجھتے نہیں کہ جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ تو اظہار و اخفاء یکساں ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ اور ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں اصلاً لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ اور جیسا کہ ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اسی طرح ہیں۔ اسی لئے انہیں ماں کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ اور امی کہا جاتا ہے گویا کہ وہ صرف ماں کے بیٹے ہیں باپ نہیں رکھتے ورنہ وہ ان کی پرورش کرتے اور لکھنا پڑھنا سکھاتے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ کتاب کو نہیں جانتے نہ اس کے لفظ کو پہچانتے ہیں۔ اور نہ اس کے معنی کو سمجھتے ہیں۔ اور اس سب کے باوجود وہ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں اِلَّآ اَمَانِيَّ سوائے چند آرزوؤں کے جو کہ انہوں نے کتاب کی تحریف کرنے والوں سے سن رکھی ہیں۔ اور انہیں اپنی خواہش دل کے مطابق پا کر دل نشیں کر رکھا ہے۔ اور اپنے گمان میں ان آرزوؤں کو مضمون کتاب کا خلاصہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے کتاب کا نچوڑ حاصل کر لیا ہے ان آرزوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی اور مخلوق ہونے کا تعلق جو سب لوگ رکھتے ہیں ہمیں ایک دوسرا تعلق حاصل ہے کہ ہم محبوب اور اس کے منہ بولے بیٹے ہیں۔ پس ہم سے جو گناہ بھی سرزد ہو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کثرت محبت کی وجہ سے درگزر فرماتا ہے۔ دوسری آرزو یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد بلند مرتبہ رسول ہو گزرے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا مرتبہ حاصل کر چکے کہ اس کی مرضی کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ بالفرض اگر

ہمیں گناہوں کا مواخذہ ہوگا بھی تو ہمارے آباؤ اجداد کوشش کر کے چھڑا لیں گے۔ تیسری آرزو یہ کہ یہودی فرقہ کو اگرچہ وہ سب کفار سے بڑا کافر ہو سات روز یا چالیس روز کے سوا عذاب نہیں ہوگا۔ چوتھی آرزو یہ ہے کہ یہود کی شریعت قیامت تک واجب العمل ہے۔ اور منسوخ ہونے والی نہیں۔ پانچویں آرزو یہ ہے کہ نبوت اور رسالت کی استعداد صرف بنی اسرائیل کے خاندان میں ہے۔ کسی دوسرے میں اس کام کی ہرگز لیاقت نہیں۔ جس طرح عوام اور جاہلوں کو اپنے ملک کی سلطنت کے قدیم خاندانوں کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ عَلٰی هٰذَا الْقِيَاس اس قسم کی بہت سی جھوٹی باتوں کے محکم تقلید کے ساتھ معتقد ہیں۔ لیکن اس اعتقاد تقلیدی کے ساتھ جو کہ انہوں نے اپنے علمائے سو سے حاصل کیا ہے کفر سے چھٹکارا نہیں پاتے ہیں۔ اور معذور نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے علماء جھوٹ بولنے والے ہیں جب دنیوی معاملات میں ان کی کذب بیانی اور رسوت ستانی کا تجربہ رکھتے ہیں تو انہیں اپنے علماء کے کہے پر یقین حاصل نہیں ہے کہ معذور ہوں۔

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ اور نہیں ہیں وہ مگر گمان کرتے ہیں۔ اور ان کا عقیدہ نہیں پہنچتا مگر حد گمان غالب تک کہ اصول دین میں اس کا اعتبار نہیں۔ پس ان کے علماء اور ان کے جہلاء دونوں گمراہی اور جھوٹ میں برابر ہیں۔ کیونکہ عالم پر فرض ہے کہ اپنے علم کے مطابق عمل کرے۔ اور جھوٹ بولنے اور کتاب میں تحریف کرنے سے پرہیز کرے۔ اور عام آدمی پر فرض ہے کہ پیچھے لگنے اور گمان کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ یقین حاصل کرنے کا قصد کرے ہاں فرق یہ ہے کہ جاہلوں کا عذاب ان عالموں کے عذاب کو نہیں پہنچتا جنہوں نے انہیں گمراہ کیا کیونکہ جاہلوں کا عذاب صرف گمراہی پر ہے۔ جبکہ ان عالموں کا عذاب گمراہی اور گمراہ کرنے پر ہے۔

فَوَيْلٌ ۔ پس بہت بدحالی ہے لِلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ان برے عالموں کیلئے جو کہ تحریف کی ہوئی کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں یہ دیکھتے جانتے ہوئے کہ یہ ہمارے ہاتھ کا عمل ہے۔ اور اَيْدِيْهِمْ کا لفظ زیادہ کرنا ان کے فعل کی قباحت کی زیادتی کو بیان کرنے کیلئے ہے۔ کیونکہ اگر کتاب کے محرف نسخے سے جو کہ ان کے زمانے سے پہلے کسی نے تحریف کر کے لکھا تھا مادانی اور معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نقل کرتے تو اس قدر

سزا کے مستحق نہ ہوتے۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے کلام محرف کو کتاب میں لکھتے تھے۔

ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا پھر کہتے ہیں کہ یہ ہمارا لکھا ہوا وہی نازل شدہ ہے مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے۔ پس دو وجہ سے گناہ عظیم کے مرتکب ہوئے۔ پہلی وجہ یہ کہ کلام محرف کو کتاب میں لکھتے ہیں جس کا صرف لکھنا گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ اگر وہ لکھا ہوا اگر کسی کے ہاتھ آ جائے تو وہ اس سب کو اللہ کا کلام خیال کرے گا۔ اور گمراہ ہوگا اگرچہ انہوں نے نہ کہا ہو کہ یہ کلام خدا ہے۔ اور اسی وجہ سے مسئلہ یہ ہے کہ تفسیر' ترجمہ' آیات کی گنتی اور سورتوں کے نزول کے مقام کو اور وقف' ربع' نصف' عشر اور خمس کی علامت کو قرآن کے خط میں اس طرح لکھنا کہ امتیاز ظاہر نہ ہو حرام ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لکھنے کے بعد اس محرف کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ جو کہ صراحتاً خدا تعالیٰ پر بہتان ہے۔ پھر وہ اس لکھت پڑھت میں ایک اور وجہ سے گناہ عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ سب بے ایمانی نہیں کرتے مگر

لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اس لئے تا کہ اس کہنے اور لکھنے کی وجہ سے تھوڑی سی قیمت خریدیں کیونکہ انہیں اس تحریف سے اپنے رئیسوں اور دنیاداروں کی دل جوئی منظور ہوئی تھی یا جاہلوں سے رشوت لینا کہ ان کے مطلب کے مطابق کتاب سے روایات لکھ کر دیتے تھے۔ اور یہ کمال بدبختی ہے کہ حقیر فانی نفع کو ہمیشہ رہنے والے اجر عظیم کے عوض حاصل کرتے تھے۔

کتاب اللہ کی تحریف کرنے والوں' بے دین چودھریوں' بے ایمان سرداروں اور شرابیوں کے عذاب کا بیان

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ پس سخت برا حال ہے ان کا اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھ کر چھوڑا ہے۔ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ اور سخت برا حال ہے ان کا اس وجہ سے جو اس لکھنے اور کہنے کی وجہ سے کماتے ہیں کہ دنیوی رشوت ہے اور تھوڑی اور فانی۔

☆☆☆☆☆